سچی کہانیاں، آپ بیتیاں، جگ بیتیاں

ماہنامہ

سرگزشت

کراچی

مارچ 2026

قیمت 200 روپے

بانی

معراج رسول

ہرجائی: دھوکے باز بیوی کی عجب سچ بیانی

یادِ ماضی: ایک صاحب طرز ادیب کی خود بیتی

مرجع خلائق: اس ولی کامل کی داستان جس کے نام میں کرامت تھی

سرگزشت
07
نعت کا نقاد
ادارہ
ایک صفحہ میں مکمل، مختصر، مختصر
ایک نادرروزگار کا تعارف

گفت و شنید
08
شہرِ خیال
مدیر/قارئین
آپ کی باتیں آپ کے خیال آپ
کے مشورے اور آپ کے سوال

شخصیت
12
مرجع خلائق
ساجد امجد
ایک ولی کامل
کی داستانِ دلپذیر

تاریخ
41
مجبور شہنشاہ
زویا صفوان
وہ والی ہند ہو کر
بھی مجبور تھا

حادثات
53
شاپ نمبر 144
واجد رضا اصفہانی
گل پلازا کی آتش زدگی
سے ابھری تحریر

جرم و سزا
57
فریبِ ناتمام
دانیال حسن چغتائی
وہ بیوی کو قتل کرانا چاہتا
تھا...... مگر کیوں؟

فلم نگری
61
باکمال اداکارہ
علی سفیان آفاقی
پاکستان کی مقبول اداکارہ
کی کہی ان کہی داستان

شکاریات
75
شکاری کا شکار
اے اور راجپوت
ایک دلچسپ انداز
کی شکار کہانی

لالچ
83
دفینہ
سید احتشام
جب زمین میں سے
دفن خزانہ باہر آیا تو......!

خود بیتی
89
یادِ ماضی
انوار احمد
ایک معروف قلم کار
کی دلچسپ آپ بیتی

ماہنامہ سرگزشت میں شائع ہونے والی ہر تحریر کے جملہ حقوقِ طبع و نقل بحق ادارہ محفوظ ہیں، کسی بھی فرد یا ادارے کے لئے اس کے کسی بھی حصے کی اشاعت یا کسی بھی طرح کے استعمال سے پہلے تحریری اجازت لینا ضروری ہے۔ بصورتِ دیگر ادارہ قانونی چارہ جوئی کا حق رکھتا ہے۔

● تمام اشتہارات نیک نیتی کی بنیاد پر شائع کیے جاتے ہیں۔ ادارہ اس معاملے میں کسی بھی طرح ذمے دار نہ ہوگا۔

زمرہ	عنوان	صفحہ	مصنف	تعارف
ایمان افروز	غیبی میزبان	107	حسن رزاقی	بیابان میں اللہ والوں کی میزبانی کس نے کی؟
معاشرت	جان بچا	110	زین مہدی	اس کی زندگی خطرات میں گھر گئی تھی
پہلی سچ بیانی	ہرجائی	122	زاہد نسیم	قسمت نے موقع دیا اور اس نے خود قسمت خراب کرلی
دوسری سچ بیانی	مجبوری	145	اقرا عرش	حیران کن انجام کی دلپذیر سچ بیانی
تیسری سچ بیانی	خاموش جدُوجہد	151	ارشاد العصر جعفری	باپ کی محنت کا صلہ کون ادا کرسکتا ہے
چوتھی سچ بیانی	حوریہ	157	شاہین کمال	ایک معمولی سی نیکی کسی کی زندگی بدل دیتی ہے
پانچویں سچ بیانی	جوا	163	عمار حسین ایڈووکیٹ	وہ سگی بیٹی کو بیچنا چاہتا تھا
چھٹی سچ بیانی	فون کال	167	صدف آصف	لڑکی کا اندازہ بالکل غلط تھا
ساتویں سچ بیانی	جھوٹا حلف	173	نسرین	جہیز واپس نہ کرنے والے کا عبرت انگیز انجام
آٹھویں سچ بیانی	قربانی	181	عرفان رضا	دل میں درد بھر دینے والی دلچسپ سچ بیانی

قرآن حکیم کی مقدس آیات و احادیث نبوی آپ کی دینی معلومات میں اضافے اور تبلیغ کے لئے شائع کی جاتی ہیں۔ ان کا احترام آپ پر فرض ہے لہذا جن صفحات پر آیات درج ہیں ان کو صحیح اسلامی طریقے کے مطابق بےحرمتی سے محفوظ رکھیں۔

جلد 35 ❖ شمارہ 10 ❖ مارچ 2026ء

ماہنامہ سرگزشت کراچی

مدیرہ اعلیٰ : عذرا رسول
مدیر : پرویز بلگرامی
نائب مدیرہ : نبیلہ اظہر

◈◈◈

مارکیٹنگ و سرکولیشن منیجر
مرزا ثمر عباس
0301-2454188

◈◈◈

قیمت فی پرچہ 200 روپے ❖ زرِ سالانہ 3000 روپے

پبلشر و پروپرائٹر: عذرا رسول
مقامِ اشاعت: C-63، فیز II ایکس ٹینشن ڈیفنس کمرشل ایریا مین کورنگی روڈ، کراچی 75500
پرنٹر: جمیل حسن
مطبوعہ: ابنِ حسن پرنٹنگ پریس، ہاکی اسٹیڈیم کراچی
خط کتابت کا پتا ● پوسٹ بکس نمبر 982 کراچی 74200
Phone :35804200
E-mail: jdpgroup@hotmail.com

MEMBER
APNS
CPNE

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

قارئین کرام!
السلام علیکم!

کبھی ہماری پہچان ہماری ثقافت تھی۔ لحاظ، مروت اور دوسروں کو خود پر ترجیح دینا جسے ہم بھولتے جا رہے ہیں۔ حلیمی تو گویا ہم سے روٹھ چکی ہے اب تو ہم دوسروں کو تکلیف میں دیکھ کر خوش ہونے لگے ہیں۔ اگر یقین نہ آئے تو سماجی رابطوں کی سائٹس پر جا کر پوسٹ ملاحظہ کریں۔ چالیس فیصد پوسٹ دوسروں پر غصہ اتارنے والی نظر آئے گی۔ عصبیت کے گند میں لتھڑی ملے گی۔ اب ذرا غور کریں، ایسا کیوں ہو رہا ہے؟ عدم برداشت کیوں کم ہوتا جا رہا ہے؟ وجہ جلد بازی ہے، کم علمی ہے۔ شارٹ کٹ ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ہم اوج پر پہنچنے کی بجائے تحت الثریٰ میں اترتے جا رہے ہیں۔

نعت کا نقاد

کانپور ایک صنعتی و تاریخی شہر ہے۔ 1857ء میں جب پہلی جنگ آزادی کا میرٹھ سے بگل بجا تو میرٹھ، دہلی، لکھنو کی طرح اس شہر نے بھی تاریخ میں ایک مقام بنایا۔ انگریزوں سے برسرپیکار بھی ہوا۔ اسی شہر میں شاہ محمد اکبر کا گھرانا آباد تھا۔ شاہ محمد اکبر شہر کے معروف علما میں شمار ہوتے تھے۔ عربی، فارسی اور اردو پر انہیں دسترس حاصل تھی۔ شاہ محمد اکبر کے صاحبزادے سید ابو محمد ثاقب کو بھی شہر میں شہرت حاصل تھی۔ اس وقت کے بڑے شعرا میں شمار ہوتے تھے۔ ان کے گھر 12 مارچ 1932ء میں ایک بچے نے جنم لیا۔ اس وقت کے رسوم کے مطابق خوشیوں کا اہتمام کیا گیا۔ ننھا شیر خوار وقت کے ساتھ بڑا ہوتا گیا۔ اسے گھر سے قریب مسجد میں قائم مدرسے میں داخل کیا گیا۔ ابتدائی اسباق کے بعد اسے سرکاری اسکول میں بھیجا جانے لگا۔ اسی اسکول سے میٹرک کرنے کے بعد شہر کے معروف کالج سے انٹرمیڈیٹ کیا۔ گھرانا ادبی ذوق کا حامل تھا اس لیے اسے بھی ادب سے لگاؤ تھا۔ ہلکی پھلکی شاعری بھی کرنے لگا تھا کہ سیاسی افق گدلا گیا۔ قیام پاکستان کا اعلان ہوگیا۔ اسی مخدوش حالات میں اس نے حلیم مسلم کالج سے انٹرمیڈیٹ پاس کیا تھا کہ مسلم لیگی گھرانوں نے ہندوستان سے رشتہ توڑنا شروع کر دیا۔ پاکستان کی طرف ہجرت شروع ہوگئی۔ اس کے گھر والے بھی ہجرت کے لیے پر تولنے لگے۔ لیکن سوال یہ تھا کہ اگر وہاں گئے تو پھر واپسی دشوار ہے۔ پھر نئی جگہ پاؤں جمانا بھی آسان نہیں۔ یہ سوال بیگم نے کیا تھا جواب میں یہی کہا گیا کہ رزق کا مالک اللہ ہے۔ اتنی مشکلوں سے مسلمانوں کے لیے وطن بنا ہے ہم سب مل کر اسے سنواریں گے۔ وہاں ابھی ہنرمند آٹے میں نمک برابر ہوں گے۔ ایک ملک چلانے کے لیے ہنرمندوں کی ضرورت ہوگی۔ دفاتر کی کرسیاں بھرنے والے تجربہ کار نہیں رہیں گے تو پھر ملک کیسے چلے گا؟ وہاں سے غیر مسلم انڈیا آرہے ہیں تاکہ پاکستانی حکومت کو پریشانی لاحق ہو جائے۔ ملک چلانے والے نہ رہیں گے تو ملک ٹوٹ جائے گا۔ ہم ایسا ہونے نہیں دیں گے۔ یہ نکتہ سب کی سمجھ میں آگیا تھا۔ اس دن کے بعد پھر کسی نے یہ سوال نہیں اٹھایا بلکہ وہاں جانے کے تیاری کرنے لگے۔ 1948ء میں پورا گھرانا پاکستان آگیا۔ وہ بھی انٹر کر چکا تھا۔ یہاں آتے ہی اس نے رکی ہوئی پڑھائی کو دوبارہ شروع کر دیا۔ 1952ء میں اس نے جامعہ کراچی سے ایم اے پاس کیا اور پی ایچ ڈی کی تیاری کرنے لگا۔ موضوع چنا اردو شاعری کا سیاسی و تاریخی پس منظر۔ ڈاکٹریٹ کی ڈگری ملتے ہی اس نے تدریس کے شعبہ کو پسند کیا اور اسلامیہ کالج میں لیکچرار منتخب ہوگیا۔ اب وہ پیشے کی وجہ سے قابل احترام سمجھے جانے لگے۔ اسلامیہ کالج میں زیادہ عرصہ گزار نہ سکے اور جامعہ کراچی کے شعبہ اردو سے منسلک ہوگئے۔ پی ایچ ڈی کا مقالہ کتابی شکل میں آیا تو لوگوں نے بہت پسند کیا۔ انہوں نے اس کے بعد "جدید اردو ادب کے دو تنقیدی جائزے" پیش کیے۔ اردو ادب کے حلقے میں اسے بھی خوب پزیرائی ملی۔ اسی درمیان انہوں نے خاکوں کا مجموعہ "یہ لوگ بھی غضب تھے" پیش کیا پھر "اردو شاعری کا سیاسی و تاریخی پس منظر"۔ "نعت اور تنقید نعت" اس کے بعد "نعت شناسی" پیش کیا۔ طویل عرصہ تک اردو ادب کی خدمت کرنے کے بعد 15 مئی 2008ء کو انہوں نے اس دنیا سے رشتہ توڑ لیا اور جامعہ کراچی قبرستان میں مدفون ہوئے۔ انہیں ہم سب ڈاکٹر ابوالخیر کشفی کے نام سے پہچانتے ہیں۔

☆☆☆........................

گفت و شنید

شہرِ خیال

مدیر/قارئین

☆ اعجاز حسین سٹھار نے نور پور تھل سے لکھا ہے۔ ''پورے آٹھ دن کی سیاحت کے بعد پرچا میرے ہاتھ آیا ہے اب خود بتایئے کہ 5 تاریخ تک تبصرہ کس طرح دفتر پہنچے گا۔ رانا محمد شاہد ہر ماہ سراہتے، تعریف کرتے ہیں۔ ارشد نظامانی نے بھی سراہا، یاد کیا اور احمد ممتاز نے تو بانس پر چڑھا دیا لیکن پھر یکسانیت کا شکار ہونے کی بات کر کے میری ساری محنت پر پانی پھیر دیا۔ سب دوستوں کا شکریہ۔ ''خونی مسودہ'' دہشت طاری کر دینے والی کہانی ہے میں نکولس کی دلیری، قوت ارادی اور منصوبہ بندی پر حیران بیٹھا ہوں، وہ جنونی تھا یا دماغ چل گیا تھا جسے انجام کی پروا نہ تھی۔ ''تخلیقِ عشق'' کو ذاتی حالات، جذبات اور خیالات رکھنے والی تحریر ہے جن میں پاکیزگی، وارفتگی اور والہانہ پن ہے۔ بے لوث محبت، عقیدت کی معراج پر پہنچی ہوئی ہے، سہیل بیوی کی محبت میں مغل بادشاہوں کے مدمقابل کھڑے ہیں کیونکہ اپنے وسائل میں رہتے ہوئے کوئی کمی، کسر نہیں رہنے دی، بس اللہ کو انتالیس سال کا ساتھ منظور تھا، مشیت ایزدی سے انکار نہیں، مرحومہ نے بھرپور زندگی گزاری، اپنی اولاد، خوشیاں، پوتے، پوتیاں، نواسے، نواسیاں دیکھیں، بہنوں، خاوند، اولاد کی محبت سمیٹی اب اس کے لیے لواحقین کی دعائیں کارآمد تحفہ ہیں۔ ''اکی'' ناقابل یقین واقعات ہیں آخر ایکی شیرنی تھی، انسان کے گوشت کا ذائقہ چکھ چکی تھی اس پر اعتماد کرنا خطرناک عمل تھا لیکن جاز اور کونی جانوروں کی عادات، نفسیات اور حرکات سے واقف تھے، وہ آسانی سے اعتبار کر گئے، اسے چڑیا گھر والوں کو دینا مناسب فیصلہ تھا۔ ''قاتل کہانی'' میں واقعات الجھے ہوئے تھے اسی وجہ سے بارہ ارکان جیوری نے گواہوں کے بیانات سے جو ظاہر ہے درجنوں ہوں گے۔ 26 گھنٹے تک غور و فکر کیا، پچاس کے قریب اعلیٰ سوچ کے حامل دماغوں سے زائد لیکن حتمی فیصلہ غلط ثابت ہوا، برام کو بے گناہی کے باوجود 14 سال قید بھگتنا پڑی۔ گویا انصاف کی آنکھیں حقیقت دیکھنے سے چوک گئیں۔ ''باکمال اداکارہ'' میں باربرہ شریف کے فلمی کیریئر، ٹی وی اشتہار میں کام اور عروج حاصل کرنے کے حالات ہیں۔ آخر اس میں صلاحیت تھی تو تمام نامور ہیروز کے مدمقابل کامیاب ٹھہری۔ کسی موقع پر گھبراہٹ کا اظہار نہ کیا بلکہ فن میں بہتری آتی گئی پھر اپنی چالاکی، عقل مندی اور ہوشیاری سے سب کو خوش فہمی میں مبتلا رکھا اور اپنی کمزوریوں پر قابو پا کر غیر معمولی کامیابیاں سمیٹیں۔ اب ان کا خاندان، پیدائش، پیشہ اور مصروفیات کا پس منظر دیکھیں، پڑھیں گے تو پس منظر کی معلومات سے لطف لیں گے۔ ''گواہ'' کی سنسنی خیزی، تسلسل، روانی اور جاسوسی انداز تحریر نے ہماری سوچ، انداز ے اور انصاف پسندی کے جذبہ کو ہلا کر رکھ دیا ہے، ہر لمحہ حالات گویا ریگستانی علاقہ کے کچے، ناہموار راستے پر سفر کرتے رہے، خوش گمانی اور بدگمانی آپس میں دست و گریبان رہیں۔ دونوں میاں بیوی نے ایک ڈراما تخلیق کیا جس کی تشکیل، اداکاری، صداکاری، ریکارڈنگ، ہدایت کاری خود کی اور پیش بھی کرنے میں دونوں کا حصہ ہے، جتنے تماشائی تھے سب اعلیٰ تعلیم یافتہ، تجربہ کار اور زمانہ شناس تھے۔ وہ بھی تیسرے درجے کے دو عام شہریوں کے ہاتھوں بے وقوف بن گئے۔ ''جان بچا'' میں نذر محمد سومرو کے ایک مشن کی تکمیل ہوگئی کہ رشیدہ مل گئی ہے اس کے غیاب کے بعد کتنی مصیبتیں، پریشانیاں، اور آزمائشیں بھگتنی پڑیں اور جانیں گئیں اس کا شمار ممکن نہیں، خوشی کی بات ہے کہ صحیح سلامت ہاتھ آگئی ہے۔ وہ کھرا، ستھرا مال تھی اسی حساب سے رقم وصول ہونا تھی جس وجہ سے چھیڑ چھاڑ نہ کی گئی ورنہ درندے جسم کا سارا گوشت نوچ کر کھا چکے ہوتے، دو بے گروپ نے اس کے ساتھ دوسری قید لڑکیوں کو آزادی دلائی ہے جو ممکنہ طور پر برباد ہونے سے بچ گئی ہیں۔ اب روشن اپنے جرائم کی دنیا میں داخلے کی وجوہات سنا رہا ہے۔ دلچسپ

اور پر تجسس واقعات ہیں پڑھتے ہوئے لطف آرہا ہے۔ وہ کالی چرن سے کیسے ٹکرایا، انتقام لے پایا، گینگ کس طرح تباہ ہوا، آگے چل کر حالات کی پٹاری کا ڈھکن کھلے گا تو کئی سنسنی خیز انکشافات ہوں گے تب تک صبر سے دل تھام کر، نظریں جما کر اور ذہن کو بیدار رکھ کر انتظار کرنا ہوگا۔ سچ بیانیوں میں دکھوں، آہوں اور سسکیاں سننے کے لیے ''بددعا'' تک پہنچے وقار کو بددعا لگنے میں زیادہ وقت نہ لگا، وہ جلد آزمائشوں میں جکڑا گیا پھر حرام کی رقم نے ایسا راستہ دکھایا گویا بربادی کے کئی راستے کھل گئے لیکن واپس قدم ہٹانے میں بات بن جاتی وہ راستے قدرت نے بند کردیے، بددعائیں آہنی دیواریں بن کر راستے میں کھڑی ہوگئیں۔ میں سرورق کی بھیانک، ڈراؤنی تصاویر دیکھ کر سمجھ گیا تھا کہ انہونی ہونے والی ہے، نیک والدین کی اولاد ایسی بدکردار ہوتی ہے دیکھ کر حیران بیٹھا اور توبہ کررہا ہوں۔ ''ضد، محبت اور وہ'' میں دل میں خوف رہا کہ کہیں جنی، ولید کو رقابت میں نقصان نہ پہنچا دے۔ شکر ہے تمام معاملات بخیر و خوبی طے پا گئے۔ یہ کوئی نیک، مسلمان جنی تھی جس نے حقیقت کو تسلیم کرکے ولید کا پیچھا چھوڑ دیا اور اپنی دنیا میں واپس چلی گئی اور نشانی کے طور پر لنگڑاہٹ دے گئی تاکہ اسے بالکل بھول نہ جائے۔ ''طلاق'' میں کسی حد تک شہنیلا نے جلد بازی سے کام لیا، رشتے مقدر سے بنتے، جڑتے ہیں، کسی کو درمیان میں ڈالتے، ولید کے ذہن سے شک نکالنا، پرخلوص بھرے، منصوبے رشتوں میں بے تکلفی دیکھ کر شک میں مبتلا ہوجاتے ہیں۔ ہر بندہ اپنے گریبان میں جھانک کر فیصلہ کرسکتا ہے۔ دونوں طرف سے نادانی بلکہ بچوں جیسا فیصلہ کیا گیا رشتے جوڑ لیتے ہیں، شکر ہے شہنیلا کو نیک نیت بہنوئی ملا، بیٹے کی صورت مستقبل کا سہارا میسر ہے۔ ''مار آستین'' میں ایک شکیل کی بات نہ کریں، یہاں ہمارے معاشرے میں جس شعبہ میں جس کا داؤ چل گیا اس نے جڑیں کاٹنے میں دیر نہیں لگائی، گھریلو نوکر، مالی، باورچی اور کام کرنے والی عورتیں تک دوسری کی شکایت لگاتی اور کمزوری پر نظر رکھتی ہیں جب ایک بھکاری دوسرے کا دشمن ہے تو دفتری ورکرز، دوستوں پر کیسا گلہ، ہم سب کو دوسروں سے متعلق بھلائی کا سوچنا چاہیے، نیکی کی ترغیب دیں۔ ''جنم جلی'' میں بھائی مخلص، ایماندار ہوتے اور بہن کی محبت ہوتی تو خود سے حصہ نکال دیتے وہ والدین کی بجرم تھی بھائی تو چھوٹے تھے۔ انصاف، امانت، دیانت اور رشتوں کی کشش کہاں گئی۔ یہاں بات منہ پر کالک ملنے کی نہیں بلکہ دنیاوی لالچ نے بہن کے حق کو درانتی سے جڑوں سمیت کاٹ دیا، اگر اپنے ضمیر کو ٹٹولا جائے تو شرمندگی سر اٹھانے کے قابل نہ رہنے دے۔ ''جھوٹی کہانی'' میں جہاں آرا کے فیصلہ پر حیرانی بلکہ پریشانی میں مبتلا بیٹھا ہوں کہ جانور بھی اپنے بچوں کے لیے ممکنہ حد تک لڑتا بھڑتا رہتا اور اسے خطرے سے نکالنے کے لیے اپنی جان پر کھیل جاتا ہے وہ کیسی ماں تھی جس نے آسانی سے پیار کرنے والا شوہر، پُرتعیش گھر، نوکر، سہولیات، باعزت زندگی اور حتیٰ کہ اولاد تک کو چھوڑ دیا کیا اس کے جسم میں دل، ماتا کا جذبہ، انسان سے محبت، رواداری اور رشتوں کی اہمیت نہ تھی۔ بہن شاہدہ شاہ نے نازک رشتوں کی منافقت سے پردہ اٹھا کر رہنمائی کی ہے، شکریہ قبول کرلیں۔ ''غلطی'' میں شیریں ایک اچھی سوچ رکھنے والی لڑکی تھی جسے غلطی کا احساس ہوا تو اپنی انا کا مسئلہ نہیں بنایا بلکہ پہلی فرصت میں واپس آکر غلطی تسلیم کرلی اسے بڑا پن کہتے ہیں وہ شہر میں رہنے والی بے باک لڑکی ضرور تھی لیکن والدین نے صحیح خطوط پر پرورش اور تربیت کی یہی وجہ ہے کہ اسے اپنی زیادتی کا احساس ہوا تو آشیانے کی طرف لوٹ آئی۔ ''حسرت ناتمام'' کیا ماضی یاد دلانے والی تحریر ہے، وہ روایات، رسمیں، رواج، وضع داری اور قول و فعل نبھانے والے لوگ کہاں گئے ہم نے مجلس، نوحہ خوانی اور تعزیہ کی تزئین و آرائش کا کام مقامی گھرانوں میں دیکھا ہے۔ ایک فن ہے تاریخ ہے جو اپنی رسموں کے ساتھ آج بھی زندہ ہے لیکن وہ ماحول، بے لوث تعلق داری، بے غرض لوگ اور بجو جیسے خاموش، بے ضرر، عزت کے پاسبان اور پجاری کہاں سے آئے، سب خواب و خیال ہے بس گزری رتوں کا ماتم کیا جاسکتا ہے ان محفلوں کی دھول بھی نہیں ملتی، انوار احمد نے آٹھ دہائی پرانے گزرے زمانے کا صحیح نقشہ کھینچا ہے جیسے کرداروں کے ساتھ لکھنؤ کے گلی محلوں میں جنے، پلے بڑھے اور ہم سفر ہوکر یہاں تک قدم ملا کر ساتھ آئے، بجو کے روز و شب پر نظر رہی، ہر دکھ، سکھ، بیماری اور آخری وقت بیماری میں زہرا کے جذبات اور فکر کی کیفیات چہرے سے محسوس کرکے لوٹ کرتے رہے، اس منظر کشی، جذبات نگاری اور حالات کے مشاہدہ پر میری طرف سے ڈھیروں مبارک باد قبول کریں۔ ''رضامندی'' میں امتیاز خوش قسمت ہے کہ زمیندار خاندان کا ہوتے ہوئے شہر میں لڑکی پسند کی، خاندانی روایات کو ملحوظ خاطر رکھنے والے چوہدری نفاست، بیگم سمیت بخوشی مان گئے۔''

☆ احسن احتشام، بنوں سے رقمطراز ہیں۔ ''اس بار شمارہ ہاتھ آیا تو سب سے پہلے ''خوش قسمت'' پڑھی۔ نور جہاں جیسی ملکہ کی ابتدائی زندگی اتنی دکھ بھری تھی یہ پہلی بار پڑھی۔ واقعی سرگزشت کا یہ خاصہ ہے کہ ایسی معلومات پر تحقیق پیش کرتا ہے جو مخفی رہا ہو۔ ''خوش قسمت'' کے بعد ایک بدقسمت انجینئر کا احوال پڑھا۔ شیلا بارگ ایک ایسا مقام ہے جہاں سیاحوں کے انٹرلین کا مرکز ہونا

چاہیے لیکن ہمارا محکمہ سیاحت پاکستان کے ان مراکز کی جانب توجہ ہی نہیں دیتا۔ محکمہ کو چاہیے تھا کہ وہاں تک پہنچانے ٹھہرنے کا معقول انتظام کرکے بڑے شہروں سے سیاحت کے شوقینوں کو متوجہ کرے تاکہ آمدنی کے مواقع پیدا ہوں گے۔ دشمن ملکہ ہمارے لیے اہمیت کی حامل نہ تھی اس لیے آگے بڑھ گئے۔ عاقب نواز کے خونی مسودے پر پہنچے۔ یہ ایک حیرت انگریز واقعہ ہے۔ ''شکیب عشق'' اردو کے ایک ادیب کی سوانح حیات اختتام کو پہنچی۔ اپنی زندگی کے واقعات کو انہوں نے جس خوبصورت انداز میں پیش کیا ہے وہ قابل تعریف ہے۔ آخر تک قارئین کو جکڑے رہے ہیں۔ ایک پالتو شیرنی کا فرار اور جنگل کے آدم خور شیر سے ملاپ، اچھی کہانی ہے۔ علی سفیان آفاقی ہمیشہ اندر کی بات اجاگر کرتے ہیں۔ بابرہ شریف کی وہ داستان بیان کررہے ہیں جو ہمارے جیسے بہتوں کے لیے حیران کن ہے۔ اب اگلے شمارے میں دیکھتے ہیں کہ وہ کن رازوں سے پردہ اٹھائیں گے۔ نگاہ حسیب نے گواہ میں الجھا کر رکھ دیا تھا۔ غضب کی کہانی ہے۔ بلوچ بھی معلوماتی داستان ہے۔ جان بچا بھی اچھی جارہی ہے۔ قارئین کو الفاظ کے سحر میں جکڑی ہوئی ہے۔ اب دیکھنا ہے کہ اگلے شمارے میں کہانی کس کروٹ بیٹھتی ہے۔ ''بددعا'' کی جتنی تعریف کی جائے کم ہے۔ بہت عمدہ سچ بیانی ہے۔ ''ضد، محبت اور وہ'' پراسرار لیکن دلچسپ سچ بیانی ہے۔ ایسی کہانیاں ہمیں دادی نانی سنایا کرتی تھیں۔ غلام قادر کی ''طلاق'' بس گزارے لائق تھی۔ ''مار آستین'' بھی کوئی خاص اثر نہ ڈال سکی۔ نادیہ عنبر لودھی کی سچ بیانی بالکل عام سی ہے۔ ہمارے ہاں خاص کر گاؤں دیہات میں بھائی بہنوں کے حق ہضم کرنے میں بہت آگے ہیں۔ ''جھوٹی کہانی'' اچھی ہے۔ ''غلطی'' بہت عمدہ سچ بیانی ہے۔ انوار احمد کی ''حسرت ناتمام'' نے بہت مزہ دیا۔ پرانے وقتوں میں ایسی داستان محبت عام تھی۔ لوگ محبت کرتے اور دل میں چھپائے دنیا سے چلے جاتے۔''

☆ احمد پرنس نے لاہور سے لکھا ہے ''ہر بار کی طرح اس بار کا سرگزشت بھی معلوماتی تحاریر اور دلچسپ سچ بیانیوں سے سجا سنورا تھا۔ اس بار مجھے سچ بیانیوں میں بددعا بہت پسند آئی۔ آخری صفحات پر ہمیشہ کی طرح سے دلچسپ سچ بیانی تھی۔ ''حسرت ناتمام'' جتنے اچھے، دلچسپ انداز میں پھیلائی گئی ہے۔ اس کا جواب نہیں۔ محبت وہ جذبہ ہے جس میں ترجیح کی کوئی گنجائش نہیں۔ یہ آفاقی جذبہ ہے جسے آج بازاری بنادیا گیا ہے۔ جتنے بہتر انداز میں انوار احمد نے سچ بیانی پیش کی ہے یہی اس کہانی کا حسن ہے۔ ''غلطی'' بھی اچھی کہانی ہے۔ فرح انیس کی سچ بیانیاں دل کو چھولیتی ہیں۔ اچھی سچ بیانی ڈھونڈتی ہیں لیکن اس بار انہوں نے بہت عام سی پُراسرار واقعہ بیان کیا ہے۔ شکیب عشق بھی پسند آئی ہے۔''

☆ رفعت مسعود، سیالکوٹ سے لکھتی ہیں ''پچھلے سال کے جنوری سے سرگزشت ڈائجسٹ باقاعدگی سے لے رہی ہوں۔ ڈائجسٹ دیر سے ملتا۔ کبھی آٹھ، سات، پانچ کبھی بارہ کو ملتا۔ ایک بار تین کو ملا۔ اس بار ایک فروری کو مل گیا۔ بہت حیرت ہورہی تھی کہ اتنی جلدی آگیا۔ شہرخیال میں اپنا تبصرہ دیکھا تو نہیں ملا، سوچا کہ شاید کم روشنی کی وجہ سے نظر نہ آیا ہو۔ تین بار ڈھونڈا نہیں ملا۔ حیرت اور افسوس تھا کہ میرا تبصرہ کیوں شائع نہیں ہوا۔ سرورق تو عمران سیریز جیسا لگ رہا تھا۔ لڑکی جولیانا لگ رہی تھی، آدمی ولن لگ رہا تھا۔ ایک طرف کسی خاندان کی تصویر تھی۔ اداریہ میں اچھی تجویز تھی کہ مایوسی پھیلانے والی پروپیگنڈا پوسٹس پر پابندی لگنی چاہیے۔ یک صفحی سرگزشت فلکار غدر، ظہیر دہلوی کی اچھی لگی۔ شہرخیال میں سب کے خطوط اچھے تھے۔ اعجاز حسین اور رانا محمد شاہد تبصرے کی پسندیدگی کا شکریہ۔ سچ بیانیوں سے پہلے ''جان بچا'' آتی ہے۔ اس بار بھی قسط اچھی تھی۔ بہت سال پہلے بیس لاکھ تو بہت بڑی رقم ہوگی۔ شکر ہے کہ اس قسط میں رشیدہ تو مل گئی۔ خط بھیجنے کی آخری تاریخ پہلے دس تھی۔ اب آپ کہتے پانچ ہے۔ خط بھیجنے کی آخری تاریخ اتنی جلدی کی نہ رکھیں۔ بددعا میں پہلے اسے اس لڑکی سے شادی کرنے کا شوق تھا پھر بیوی بیچ دی۔ اچھے بھلے گھر کا لڑکا کتنے غلط کاموں میں پڑ گیا۔ فرح انیس کی ضد، محبت اور وہ ماورائی کہانی تھی۔ اس کہانی پر زیادہ یقین نہیں آیا۔ غلام قادر کی سچ بیانی طلاق میں بہنوئی اچھا تھا تو شوہر نے اس کے ساتھ بدکاری کا الزام لگادیا۔ کچھ لوگ محرم نامحرم کے چکر میں پاک دامن عورتوں پر تہمت لگادیتے ہیں، یہ بھی سخت گناہ ہے۔ عاطر شاہین کی مار آستین میں جس دوست نے نوکری دلوائی اسی کو سازشیں کرکے نکلوا دیا اور شکر ہے کہ اسے فوراً اچھی نوکری مل گئی۔ جنم جلی میں اس عورت نے مرضی سے شادی کی تو اس کا وراثتی حق ختم نہیں ہوتا، بہن بھائیوں نے زبردستی عدالتی کاغذات پر دستخط کرا کر اس کا حصہ کھایا۔ سیدہ شاہدہ شاہ کی جھوٹی کہانی میں افغانیوں کی چالاکیوں کا بتایا گیا تھا۔ ان لوگوں کو جنگ کے وقت پاکستان نے پناہ دی لیکن وہ نمک حرامی کرکے پاکستان کے خلاف بولتے ہیں۔ شوہر اور بچے بھی پاکستانی تھے اس لیے وہ عورت انہیں چھوڑ گئی۔ وہ اپنے شوہر کو اعتماد میں لیتی تو وہ ضرور اس کے کام آتا۔ کچھ لوگوں کی فطرت ہی دھوکے باز ہوتی ہے۔ رضامندی میں ماں باپ بیٹے کی ہر بات ہی مان رہے تھے۔ مجاہد لغاری کی سچ بیانی غلطی میں بیوی اتنی بری اور خودسر

ہوتی ہے لیکن پھر معافی مانگنے پر شوہر اور سسرال والے اسے معاف کر دیتے ہیں۔ حسرت ناتمام بھی اچھی ہے۔ اب یہ شروع کی کہانی چھوٹی کیوں ہونے لگی ہے، پہلے تو کبھی ہوتی تھی۔ (صفحات کی کمی کے سبب بحالت مجبوری ایسا کرنے پر مجبور ہیں) زیڈ اے گیلانی کی خوش قسمت میں ملکہ نور جہان کی داستان اچھی تھی۔ وہ ملکہ بادشاہ سے زیادہ بااثر تھی۔ عمران قریشی کی شیلا باغ کی سیر اچھی رہی۔ عاقب نواز کا خونی مسودہ حیرت انگیز تھا۔ شکیب عشق کے تیسرے اور آخری حصے میں رخسانہ کی موت نے دکھی کیا۔ اس قسط نے مری اور راولپنڈی کی بھی سیر کرادی۔ خالد قریشی کی شکاریات میں کہانی ایک اچھی تھی۔ پالتو شیرنی کا اپنے مالک کو پہچان کر ملنا بہت اچھا لگا۔ علی سفیان آفاقی کی تحریر باکمال اداکارہ میں بابرہ شریف کے بارے میں پڑھنا اچھا لگا، اب اگلی قسط کا انتظار ہے۔ ندیم اقبال سیاحت یا قلم نگری کے لیے کیوں نہیں لکھ رہے؟ نگاہ حبیب کی کہانی گواہ اور ماسٹر عبدالصمد بلوچ کی تحریر بلوچ اچھی تھیں۔''

☆ مجاہد حسین لغاری، ٹنڈو الہیار سے لکھتے ہیں۔ ''سلام محبت قبول کیجیے امید ہے سب بخیر و عافیت ہوں گے۔ سرگزشت کا فروری کا شمارہ ابھی زیر مطالعہ ہے مگر خط بھیجنے تک جتنا پڑھا ہے اس پر تبصرہ حاضر ہے لیکن آپ کا مشکور و ممنون ہوں کہ آپ نے میری سچ بیانی کی نوک پلک سنوار کے شائع کی! جناب معراج رسول مرحوم پر لکھی تحریر رنجیدہ کر گئی۔ کیسے ولی سے اعلیٰ ظرف لوگ تھے جنھیں اجل کھا گئی۔ محترمہ عذرا رسول صاحبہ کی ہمت اور محنت کو سلام، اللہ انہیں اور طاقت دے۔ شہر خیال میں ہمیشہ کی طرح صدارت کی کرسی اعجاز حسین سٹھار صاحب نے سنبھال رکھی تھی۔ وہ جب تبصرہ اتنا جاندار اور شاندار کرتے ہیں تو میرا خیال ہے انہیں کہانی لکھنی چاہیے۔ رانا محمد شاہد جنوری کے شمارے پر اچھی رائے دیتے نظر آئے۔ باقی دوستوں کے تبصرے بھی اچھے تھے۔ سچ بیانیوں میں زاہدہ پروین کی ''بددعا'' بہت اچھی تھی۔ ان کے لکھنے کا انداز اور الفاظ کا چناؤ زبردست ہوتا ہے۔ وقار جیسے مرد انسان کے روپ میں بھیڑیے ہیں جو ہمارے معاشرے میں پائے جاتے ہیں۔ عاقب نواز کی ''خونی مسودہ'' پڑھ کے حیرت ہوئی کہ ایک لکھاری جسے ہم حساس سمجھتے ہیں وہ کسی کا قتل کر لیتا ہے اور وہ بھی اتنی چھوٹی سی بات پر، عاطر شاہین کی ''مار آستین'' میں دوست واقعی آستین کا سانپ نکلا جبکہ دوست کو بہت بڑی نعمت کہا گیا ہے مگر جو حقیقی اور سچا ہو۔ شکیل نے احسان کرنے والے کا ہی پتا صاف کر دیا مگر اسے اپنے کیے کی سزا ملی۔ بہت جلد ایک اور سچ بیانی ارسال کروں گا اُمید ہے پسند آئے گی۔''

☆ رانا واصف نے مظفر گڑھ سے لکھا ہے۔ ''شمارہ فروری بروقت ملا، ہر بار کی طرح یہ شمارہ بھی اعلیٰ تحریروں کی وجہ سے اعلیٰ ثابت ہوا۔ سمجھ میں نہیں آ رہا ہے کہ کس کی تعریف کروں اور کس کی نہ کروں۔ شمارے کی پہلی تحریر ادارے کے بانی، ڈائجسٹوں کی دنیا میں انقلاب لانے والے جناب معراج رسول پر تعزیتی نوٹ تھا۔ مختصر جملوں میں تاریخ رقم کر دی ہے۔ ہم نے 2001ء میں دفتر فون کیا، معراج رسول صاحب سے بات کرنے کی خواہش کا اظہار کیا۔ پتا چلا وہ علیل ہیں پھر 2007ء میں کیا پھر وہی جواب محترمہ نے دیا۔ اپنا بھلا سا نام بھی بتایا تھا۔ حیرت ہوئی اور دکھ بھی کہ بیس پچیس روپے خرچ کر کے فون کال پر پی سی او والا وصول کرتا تھا۔ پھر دو ہزار نو میں فون کیا، وہی جواب ملا تھا اور ان کی آواز سننے کا ارمان دل میں رہ گیا۔ واقعی وہ سیلف میڈ شخص تھے۔ پھر پہنچے خطوط کی محفل میں۔ کرسی صدارت پر سٹھار صاحب بہترین تبصرے کے ساتھ حاضر تھے۔ رانا محمد شاہد کا تبصرہ بھی پسند آیا۔ باقی تبصرے بھی اچھے تھے۔ پہلی داستان خوش قسمت نور جہاں پر تھی۔ بہت سی باتیں پہلے سے علم میں تھیں۔ اس ملکہ پر پچاسوں تحریر پڑھ چکا ہوں لیکن اس تحریر میں بہت سی باتیں پہلی بار علم میں آئیں۔ بہت سے راز منکشف ہوئے۔ شیلا باغ میں بھی کئی باتیں آشکار ہوئیں۔ شاید ہماری عمر کے لوگ بھولے نہیں ہوں گے کہ پانچ روپے کے نوٹ پر اس سرنگ کی تصویر ہوتی تھی۔ شکیب عشق نہایت اچھے انداز میں اختتام پذیر ہوئی۔ سرگزشت کا یہ خاصہ ہے کہ اردو ادب کے معماروں کی کاوشیں، احوال زندگی سامنے لاتا ہے۔ کیسے کیسے نابغہ روزگار ادیبوں، شاعروں کی حالات زندگی سامنے لائے۔ ہر قاری پسندیدہ قلم کار کی نجی زندگی بھی پڑھنا چاہتا ہے۔ شکریہ کہ سہیل پرواز عرف آغا جی جو ''کتاب چہرہ'' میں میرے دوست بھی ہیں ان کی حالات زندگانی پڑھ کر خوب مزہ آیا۔ آخری صفحات کی آخری سچ بیانی ''حسرت ناتمام'' کا کیا کہنا ایسا لگا جیسے میں ماضی میں پہنچ گیا ہوں۔ بہت عمدہ تحریر تھی۔''

تاخیر سے موصول خطوط:

احسن احتشام، بنوں۔ امتیاز الدین، کراچی۔ ناہید اسلم، لاہور۔ فیصل خان، پشاور۔ ثناء اللہ، سرگودھا۔ شاہد علی، دینہ۔ پیرزادہ فاروق کوٹری۔ احتشام اکرم جنجوعہ، جہلم۔ جلال الدین، ٹوبہ ٹیک سنگھ۔ محمد نسیم، جہلم۔ صلاح الدین، گوجرہ۔ عاشق حسین، بھکر۔ ابراہیم دانش کراچی۔ حمیرا یاسمین، گوجرہ۔ خلیل احمد، لاہور۔

مرجعِ خلائق

ساجد امجد

انسان خاک کا پتلا ہے، اسے خاک میں مل جانا ہے۔ انہی خاک کے پتلوں میں سے کوئی ایک عبادت و ریاضت کی بدولت، فہم و فراست کی وجہ سے باطنی طور پر اوج حاصل کر لیتا ہے۔ انسانوں میں رہ کر بھی بلند مقام کا حامل ٹھہرتا ہے۔ ولیِ کامل کہلانے لگتا ہے۔ ایسے ہی لوگوں میں پیران پیر دستگیر کا شمار ہوتا ہے۔ رشد و ہدایت، خلق و صداقت میں انہیں اوج ثریا حاصل تھا۔ آپ کی بے شمار کرامات مشہور ہیں۔ انہی میں سے چند ایک کا ذکر۔

ایک ولیِ کامل کی کرامات کہ عقل ماؤف ہو جائے

پوری تاریخوں کے چاند نے جب بغداد سے چار سو میل کی دوری پر علاقہ گیلان کے ایک دریا کی طرف جھانکا تو کنارے پر ایک نوجوان کو عبادت میں مشغول دیکھ کر ٹھٹک گیا۔ یہ میری چاندنی ہے یا اس نوجوان کے چہرے سے پھوٹنے والی روشنی جو دریا کو روشن کیے ہوئے ہے۔

نوجوان نے سجدے سے سر اٹھایا اور شاید بھوک سے بے تاب ہو کر ادھر اُدھر دیکھنے لگا۔ اسے آج بغیر کچھ کھائے تین دن اور تین راتیں گزر چکی تھیں۔ دریا کے پانی پر گزارہ تھا۔ اس وقت بھی وہ بہ مشکل اپنی جگہ سے اٹھا اور لڑکھڑاتا ہوا پانی کے قریب پہنچ گیا۔ اچانک اس کی نظر ایک سیب پر پڑی جو پانی کے بہاؤ کے ساتھ ساتھ اس کی طرف بہتا چلا آ رہا تھا۔ سیب کو دیکھتے ہی بھوک نے ایسا زور باندھا کہ بلا سوچے سمجھے ہاتھ بڑھا کر سیب اٹھا لیا۔ بسم اللہ پڑھی اور دانتوں سے لگا لیا۔ اس ایک سیب میں کچھ ایسی برکت تھی کہ بھوک یوں جاتی رہی جیسے اسے کبھی لگی ہی نہیں تھی۔ پیٹ بھرا تو نوجوان نے اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کیا اور اپنی جگہ واپس آ کر بیٹھ گیا۔ جب بھوک جاتی رہی تو اس پاک نفس کو اب احساس ہوا کہ اس نے کسی کی امانت میں خیانت کی ہے۔ کیا خبر اس کا مالک کون ہے۔ میں نے اس کی اجازت کے بغیر اس کا سیب کھا لیا۔ اس خیال کا آنا تھا کہ بے قراری نے شور مچا دیا۔ ”سیب کے مالک کو تلاش کر۔ اس کی اجازت کے بغیر یہ سب تجھ پر حلال نہیں ہو سکتا۔“ نوجوان اسی وقت اٹھ کھڑا ہوا۔ کپڑے جھاڑے اور اس طرف چل دیا جس طرف سے یہ سیب آتا دکھائی دیا تھا۔ تماشائی چاند اس نوجوان کے ساتھ ساتھ چل رہا تھا کہ کہیں اندھیرے میں یہ نوجوان راستہ نہ بھٹک جائے لیکن اسے کیا معلوم تھا کہ نیکی کی تیز روشنی اس نوجوان کے ساتھ ہے۔ بالآخر چاند کے چھپنے کا وقت آ گیا اور نوجوان بھی اپنی منزل کے قریب پہنچ گیا۔ اس نے ایک جگہ لب دریا ایک وسیع باغ دیکھا۔ ایک درخت کی شاخیں پانی کو چوم رہی تھیں۔ نوجوان کے دل نے گواہی دی۔ ”یہی وہ درخت ہے جس کا سیب اس نے کھایا ہے۔“ درخت تو مل گیا مگر اب مالک کا پتا کیسے معلوم ہو؟ اجازت

کے بغیر باغ میں داخل کیسے ہو۔ کوئی ملے تو اس سے پوچھا جائے۔ اس نے دریا کے کنارے مصلیٰ بچھایا اور یہاں بیٹھ کر دن نکلنے کا انتظار کرنے لگا۔

دن نکلا تو اسے کچھ لوگ باغ کی طرف جاتے ہوئے دکھائی دیے۔ ''یہ لوگ یقیناً اس باغ کے ملازم ہیں۔'' دل نے ایک بار پھر گواہی دی۔ وہ بے تابانہ اٹھا اور دوڑتا ہوا ان لوگوں کے پاس پہنچ گیا۔

''کیا تم بتا سکتے ہو کہ اس باغ کا مالک کون ہے؟''

''اس باغ کے مالک سید عبداللہ صومعی ہیں۔''

اس نے پھر بے تابی سے سوال کیا۔ ''کیا میں ان سے مل سکتا ہوں؟''

''کیوں نہیں مل سکتے۔ وہ رئیس ضرور ہیں لیکن کثرت عبادت کی وجہ سے خاصان خدا میں شمار ہوتے ہیں۔ ان کے دروازے غربا و مساکین کے لیے ہر وقت کھلے رہتے ہیں۔ جاؤ تم بھی مل لو۔''

''ان کا گھر کہاں ہے؟''

''آؤ میرے ساتھ آؤ۔''

ایک شخص آگے بڑھا اور اس نوجوان کو لے کر عبداللہ صومعی کی خدمت میں پہنچ گیا۔ وہ یہی سمجھے ہوں گے کہ کوئی ضرورت مند ہے، ان کے پاس امداد لینے کے لیے آیا ہے لیکن جب نوجوان نے زبان کھولی تو وہ سنبھل کر بیٹھ گئے۔

''آپ کے باغ کا ایک سیب پانی میں بہتا چلا جا رہا تھا۔ میں بہت بھوکا تھا اس لیے حالتِ اضطرار میں وہ سیب اٹھا کر کھالیا۔ میں آپ سے معافی کا خواستگار ہوں۔''

''برخوردار، تمہارا نام کیا ہے اور کہاں سے آئے ہو؟''

''میرا نام ابوصالح ہے اور جیلان کے ایک قصبے نیف کا رہنے والا ہوں۔''

''وہ سیب تم نے درخت سے تو نہیں توڑا تھا۔ تم نہ کھاتے تو کوئی اور کھالیتا۔ تم اتنے نادم کیوں ہو؟''

''دوسروں میں اور مجھ میں بہت فرق ہے۔ میں اسے امانت میں خیانت سمجھتا ہوں۔ جب تک آپ معاف نہیں کردیں گے، میرا ضمیر مجھے ملامت کرتا رہے گا۔'' نوجوان نے روتے ہوئے کہا۔

نوجوان کی یہ حالت دیکھ کر سید عبداللہ سمجھ گئے کہ یہ کوئی معمولی نوجوان نہیں، ولی کامل ہے۔ اگر اس کی تربیت کی جائے تو یہ آسمان ولایت پر چاند بن کر چمکے گا۔ اگر اسے اپنے سایہ عاطفت میں رکھ کر قرب الٰہی کے مدارج طے کراؤں تو یہ بہت بڑی نیکی ہوگی۔

''دس سال تک اس باغ کی رکھوالی کرو اور مجاہدہ نفس کرو پھر معاف کرنے کے متعلق سوچوں گا۔''

''مجھے منظور ہے۔ سیب آپ کی امانت تھا، آپ اس کی جو بھی اجرت وصول کریں۔''

ابوصالح نے اس شرط کو منظور کرتے ہی باغ کی رکھوالی شروع کردی۔ رات بھر جاگ کر باغ کی رکھوالی بھی کرتے اور تنہائی کا فائدہ اٹھا کر عبادت الٰہی میں مشغول رہتے تھے۔ دن میں کچھ دیر آرام کرتے اور پھر سید عبداللہ کی خدمت میں حاضر ہوجاتے۔

سید عبداللہ کی صورت میں انہیں ایک رہبر کامل میسر آگیا تھا۔ وہ ان کی نگرانی میں سلوک کی منزلیں طے کرتے رہے۔ یہاں تک کہ دس سال گزر گئے اور تب انہوں نے پوچھا۔

''میں نے آپ کی شرط پوری کردی ہے۔ دس سال گزر چکے ہیں۔ اب تو میری خطا بخش دیں۔''

''نہیں۔ ابھی دو سال اور میری خدمت میں رہو پھر تمہارے معاملے کے متعلق سوچیں گے۔''

ابوصالح نے ان کی یہ خواہش بھی پوری کردی۔ جب مزید دو سال اور گزر گئے تو سید عبداللہ صومعی نے انہیں طلب فرمایا۔ وہ خوشی خوشی خدمت میں پہنچے کہ اب بخشش کا پروانہ ہاتھ آنے ہی والا ہے۔

''فرزند! تو آزمائش کی کسوٹی پر پورا اترا ہے۔'' سید عبداللہ نے فرمایا۔ ''لیکن ابھی ایک خدمت اور باقی ہے، وہ یہ کہ میری ایک لڑکی ہے جو پاؤں سے لنگڑی ہے۔ ہاتھوں سے لنجی اور کانوں سے بہری ہے اور آنکھوں سے اندھی ہے۔ اس بے چاری کو اپنے نکاح میں قبول کرو تو میں سیب تمہیں بخش دوں گا۔''

یہ شرط نہایت کڑی تھی۔ ایسی معذور لڑکی سے کوئی بھی نکاح پر تیار نہیں ہوسکتا تھا لیکن ابوصالح کو اپنی خطا معاف کرانی تھی انہیں اس شرط کو بھی ماننا پڑا اور انہوں نے ان کی بات مان لی۔

سید عبداللہ نے اپنی بیٹی سیدہ فاطمہ کا نکاح ان سے کردیا۔ جب مہمان رخصت ہوئے اور ابوصالح اپنی دلہن کے کمرے میں گئے تو یہ دیکھ کر حیران رہ گئے کہ لڑکی کے تمام اعضا صحیح سالم ہیں۔ دل میں وسوسہ پیدا ہوا کہ شاید یہ کوئی اور لڑکی ہے۔ فوراً کمرے سے باہر نکل آئے اور عبداللہ

سومعی کی خدمت میں حاضر ہوکر تمام ماجرا بیان کیا۔

"صاحب زادے، اس میں وہ تمام باتیں موجود ہیں جو میں نے تمہیں پہلے بتادی تھیں۔ وہ اندھی اس لیے ہے کہ اس نے آج تک کسی نامحرم کو نہیں دیکھا۔ بہری اس لیے ہے کہ اس گھر میں آج تک اس نے حق کے سوا کچھ نہیں سنا۔ آج تک گھر سے باہر قدم نہیں نکلا اس لیے لنگڑی ہے اور آج تک خلاف شرع کوئی کام نہیں کیا ہے اس لیے لُنجی ہے۔"

اب ابوصالح پر روشن ہوا کہ ایک سیب کی بخشش کے صلے میں انہیں کیا کچھ عطا کیا گیا ہے۔ عبادتوں کا صلہ کیسی پاک باز بیوی کی صورت میں ملا ہے۔ آپ نے بیوی کو ساتھ لیا قصبہ نیف میں چلے آئے۔ گھر برکتوں سے اور راتیں عبادتوں سے بھر گئیں۔

☆☆☆

سیدہ فاطمہ کی عمر ساٹھ سال ہو چکی تھی۔ کم و بیش یہی عمر حضرت ابوصالح کی بھی تھی۔ اولاد کی نعمت سے محرومی اب ناامیدی میں بدل چکی تھی۔ بھلا اس عمر میں گھر کا چراغ کیا روشن ہوگا۔ کسی وقت کی دعا قبول ہوئی اور پیدائش کے آثار ظاہر ہوئے۔

رات کا آخری پہر تھا۔ حضرت ابوصالح تہجد کے لیے اٹھنے ہی والے تھے کہ تمام گھر نور کا گہوارہ بن گیا۔ خوشبوؤں سے بس گیا۔ آپ نے عالم خواب میں دیکھا کہ آقائے دو جہاں رسول مقبول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم تشریف لائے ہیں اور ارشاد فرما رہے ہیں۔

"اے ابا صالح! اللہ تعالیٰ نے تجھ کو فرزند صالح عطا کیا ہے۔ وہ میرا محبوب ہے اور خدائے پاک و برتر کا محبوب ہے اور تمام اولیا و اقطاب میں اس کا مرتبہ بلند ہے۔"

آپ کی آنکھ کھلی تو زوجہ محترمہ تہجد کے لیے بیدار ہو چکی تھیں۔ آپ نے یہ خواب انہیں سنایا۔ دونوں نے اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کیا کہ وہ اتنی بڑی نعمت سے بہرہ ور ہونے والے ہیں۔

اللہ کے ولی کے استقبال کی تیاریاں شروع ہو گئیں۔ آخر وہ شب آ گئی جس کی صبح رمضان المبارک کی سعادتوں اور برکتوں کو اپنے جلو میں لیے ہوئے تھی۔ چاند ہو چکا تھا۔ رمضان المبارک کی پہلی تاریخ شروع ہو چکی تھی۔ ہجری سال کا ۴۷۱واں سال تھا کہ عالم قدس سے عالم امکان کی طرف بخششوں کا نزول ہوا۔ اللہ کے ولی کی ولادت عمل میں آئی۔

سال مولودش ز اوج کبریا
گفت ہاتف زیب تاج اولیا

ابوصالح نے آپ کا اسم مبارک عبدالقادر رکھا۔ سید عبداللہ صومعی کو خبر پہنچی تو وہ بھی نواسے کو دیکھنے آ پہنچے۔ ان کا کوئی فرزند نہیں تھا لہٰذا نواسے کو دیکھ کر فرزند کی خوشی حاصل ہوئی۔

نومولود نے سحری کے وقت ماں کا دودھ پیا اور بے خبر سوگیا۔ جب دن چڑھا تو آپ کی والدہ نے آپ کی بھوک کا خیال کر کے دودھ ان کے منہ سے لگانے کی کوشش کی۔ عبدالقادر نے منہ دوسری طرف پھیر لیا۔ جب کئی مرتبہ کی کوشش کے بعد ایسا ہی ہوا تو انہوں نے سوچا، ابھی بھوک نہیں ہوگی۔ جب روئے گا تو دیکھا جائے گا۔ دوپہر کے قریب انہیں پھر خیال آیا کہ بچہ ابھی تک خاموش ہے۔ وہ گھر کے کام کاج چھوڑ کر دوڑتی ہوئی بچے کے پاس آئیں۔ گلاب کھلا ہوا تھا۔ بچے کے ہونٹوں پر تبسم کی چاندی بکھری ہوئی تھی۔ انہوں نے پھر کوشش کی کہ بچہ دودھ پی لے۔ بچے نے ایک مرتبہ پھر اپنا منہ دوسری طرف پھیر لیا۔ اب وہ گھبرا گئیں۔ ننھی سی جان اتنی دیر سے بھوکی ہے۔ انہوں نے اپنے شوہر سے تذکرہ کیا۔ انہوں نے بھی مشاہدہ کیا۔ پاک باز روح کے آئینے پر سب کچھ ظاہر ہوگیا۔

"یہ بچہ مادر زاد ولی ہے۔ اس کی بشارت مجھے پہلے ہی ہو چکی ہے۔ یہ بچہ تارک صوم نہیں ہو سکتا۔ تم گھبراؤ نہیں۔ یہ حضرت روزے سے ہیں۔ افطار کا وقت ہوگا تو یہ بھی افطار کریں گے۔"

ماں نے بے تحاشا اپنے لال کو چوم لیا۔ اسے گود میں لے کر یوں اس سے باتیں کرنے لگیں جیسے اس کا روزہ بہلا رہی ہوں۔ بچے نے بھی سوچا ہوگا کہ ماں کو کیوں مصروف رکھے۔ انہیں اور ہزار کام ہیں۔ رفتہ رفتہ آنکھیں بند کیں اور سو گیا۔

افطار کا وقت ہوا تو سیدہ فاطمہ نے روزہ افطار کیا اور ننھے عبدالقادر کو چھاتی سے لگا لیا۔ اب بچے کو دودھ پینے میں کوئی عذر نہیں تھا۔ سیر ہو کر دودھ پیا۔

پورے رمضان شریف میں یہی حالت رہی کہ دن بھر دودھ نہیں پیتے تھے۔ جس وقت افطار کا وقت ہوتا دودھ منہ میں لے لیتے۔

سید عبدالقادر جیلانی نے زمانہ رضاعت میں دو

رمضان گزارے۔ ان دونوں مقدس مہینوں میں آپ کا یہ حال تھا کہ آغاز سے اختتام ماہ تک پورے دن روزے سے رہتے اور افطار کے وقت سے پہلے دودھ کی طرف بالکل توجہ نہیں دیتے تھے۔ عام بچوں کی طرح نہ روتے تھے، نہ چلاّتے تھے۔ پھول ابھی کھلا نہیں تھا کہ خوشبو کا چرچا ہر طرف پھیل گیا۔ گہوارے میں روزہ رکھنے کا قصہ عام ہوگیا۔ لوگ دور دور سے اس بچے کا دیدار کرنے کے لیے آنے لگے۔

عہد طفولیت کی شان ہی نرالی تھی۔ گھر سے باہر قدم نکالنا اور عام بچوں کی طرح گلی میں کھیلنا اسے اپنی شان کے خلاف نظر آتا تھا۔ شام ہوتے ہی گلی میں بچوں کا ہجوم لگ جاتا لیکن کسی بچے کو آج تک یہ معلوم ہی نہ ہوسکا کہ اس گھر میں کوئی عبدالقادر بھی رہتا ہے۔ عبدالقادر کے بعد عبداللہ نے سیدہ فاطمہ اور ابوصالح کو ایک اور بیٹا عطا کیا مگر عبدالقادر جیسا وقار اور منصب پھر کسی کو نہیں ملا۔ ہر ماں کی طرح ان کی ماں کو بھی کبھی کبھی شوق ہوتا کہ اس کا عبدالقادر بھی دوسرے بچوں کے ساتھ مل کر کھیلے۔ وہ ہر شام تقاضا کرتیں کہ جاؤ باہر جاکر بچوں کے ساتھ کھیلو۔ آخر ایک دن سن و سال نے رغبت دلائی اور آپ گلی میں نکل آئے۔ بچوں نے کھیل کود سے سر اٹھایا تو اپنے ایک ہم سن کو الگ تھلگ کھڑے دیکھا۔ ایک بچے نے عبدالقادر کو بھی کھیل کی دعوت دی۔ آپ کے ہونٹوں پر انکار آیا لیکن کھیل کی طرف قدم بڑھنے لگے۔ اچانک ایک زوردار آواز نے آپ کی سماعت کا احاطہ کرلیا۔

''برکت والے میری طرف آ۔ برکت والے میری طرف آ۔''

۔اس آواز کو سن کر آپ پر ایسا خوف طاری ہوا کہ پورا بدن کانپنے لگا۔ گلے میں پڑا کرتہ اس طرح تھرتھرانے لگا جیسے تیز ہوا چل رہی ہو۔ بچے حیران تھے کہ عبدالقادر کو کیا ہوا۔ پھر آپ دوڑتے ہوئے گھر میں گئے اور ماں کی آغوش میں سر چھپالیا۔ ماں کو خیال ہوا کہ شاید کسی بچے نے کچھ کہا ہے۔

''کیا ہوا۔ بچوں سے جھگڑا ہوا ہے؟''

''نہیں۔ یہ بچے تو بہت اچھے ہیں۔ مجھے کھیلنے کی دعوت دے رہے تھے۔''

''پھر کیا بات ہے۔ تم کانپ کیوں رہے ہو۔ چہرے کا رنگ پیلا کیوں پڑا ہوا ہے؟''

''جب میں کھیلنے کا ارادہ کررہا تھا تو ایک آواز نے مجھے ڈرادیا۔''

''کیسی آواز بیٹا۔''

''کوئی مجھ سے کہہ رہا تھا، برکت والے ادھر آ۔ یہ کون تھا امی جان۔''

''یہ ندائے غیبی تھی جو تمہیں کھیل کود سے دور رکھنا چاہتی ہے۔ غلطی میری تھی کہ میں نے تمہیں کھیلنے کے لیے باہر بھیجا۔ تم سے اللہ تعالیٰ کوئی اور کام لینا چاہتا ہے۔ آئندہ کھیل کود کے قریب بھی مت جانا۔'' سیدہ فاطمہ نے کہا اور پھر بارگاہ رب العزت میں اپنے بیٹے کے لیے دعاگو ہوگئیں۔

''اے اللہ! میرے بچے کو ہر امتحان میں کامیاب کرنا۔ مجھے معلوم ہے وہ جس راہ کا مسافر ہے وہ راستہ آزمائشوں سے بھرا ہوا ہے۔ تو اسے ثابت قدم رکھنا۔''

اس واقعے کے بعد سید عبدالقادر کی تربیت ایک نئے انداز سے ہونے لگی۔ انہیں اب مستقبل کی آزمائشوں کے لیے تیار کرنا مقصود تھا۔

پہلی آزمائش کا ظہور اس وقت ہوا جب آپ کے والد ابوصالح نے اچانک اجل کو لبیک کہا۔ انہوں نے ابھی ہوش بھی نہیں سنبھالا تھا کہ یتیم ہوگئے۔ خوش قسمتی سے آپ کے نانا حضرت عبداللہ صومعی اس وقت حیات تھے جو اپنے وقت کے ایک بہت بڑے ولی اللہ تھے۔ یہ انہی کا فیضان تھا کہ حضرت ابوصالح نے علم و عرفان کی بلندیوں کو چھولیا تھا۔ اب عبدالقادر جیلانی کا ان کے سایہ عاطفت میں آنا کسی غیبی اسرار کی غمازی کررہا تھا۔

حضرت عبداللہ صومعی کا کوئی فرزند نہیں تھا۔ انہوں نے اپنی تمام پدرانہ شفقت یتیم نواسے کے لیے وقف کردی۔ ان کی فراست باطنی نے معلوم کرلیا تھا کہ اس نونہال کی جبین سعادت میں نور ولایت چمک رہا ہے۔

مکتب جانے سے پہلے ہی مرشد عارف کی تربیت گاہ خاص میں انہوں نے اسرار الٰہی کے بہت سے گوشوں کی سیر کرلی اور جب ظاہری علوم سے واقفیت کا وقت آیا تو آپ کی والدہ محترمہ نے آپ کو مکتب میں بٹھادیا۔

اس روز ہمیشہ کی طرح تاروں کی چھاؤں میں آپ کو اٹھادیا گیا۔ خوب اچھی طرح بنا سنوار کے آپ کو مکتب کی طرف روانہ کردیا گیا۔ ابھی وہ گھر سے نکلے ہی تھے کہ نورانی صورتوں کا ہجوم دائیں بائیں چلنے لگا۔ ملازم ساتھ تھا اس لیے ڈرنے کا سوال ہی نہیں تھا۔ مکتب قریب آیا تو آپ کا دل حصول علم کی خوشی سے دھڑکنے لگا۔ مکتب میں قدم رکھا تو یہی نورانی صورتیں پکار پکار کر کہنے لگیں۔ ''اللہ کے ولی کو جگہ

دو۔ اللہ کے ولی کو جگہ دو۔'' آپ حیران تھے کہ یہ آوازیں دوسرے لوگ کیوں نہیں سن رہے ہیں اور جو شکلیں میں دیکھ رہا ہوں دوسرے لوگ انہیں کیوں نہیں دیکھ رہے۔ وہ اسی کشمکش میں تھے کہ شفیق استاد نے ہاتھ پھیلا کر استقبال کیا اور اپنے قریب جگہ دی۔ استاد کو ان کی عظمت کا احساس نہ ہوا لیکن اسے یہ تو معلوم تھا کہ یہ بچہ کس خانوادہ بابرکت کا چراغ ہے۔ ابوصالحؒ کی ولایت میں کس کو شک تھا۔ حضرت عبداللہ صومعیؒ سے کون واقف نہیں تھا۔

بچے نے پاکیزہ صورت سے استاد کی طرف دیکھا اور استاد کی دنیا ہی بدل گئی۔ اسے یہ معلوم ہوا جیسے اس کا سینہ علوم کے خزینے سے بھر گیا ہو۔ یہ بچہ تعلیم دینے آیا تھا یا تعلیم حاصل کرنے؟

دوسرے دن وہ مکتب گئے تو وہی نورانی صورتیں پھر نظر آئیں۔ وہی آوازیں پھر سنیں۔ ''اللہ کے ولی کو بیٹھنے کی جگہ دو۔'' اور جب یہ سلسلہ کئی دن تک چلتا رہا تو آپ نے اپنی والدہ ماجدہ سے اس بات کا ذکر کیا۔ والدہ کے چہرے پر خوشی کے کئی رنگ آئے اور چلے گئے۔

''میرے بچے، ان آوازوں سے ڈرا مت کر۔ یہ اللہ کے فرشتے ہیں جو تیری نگرانی پر مامور ہیں۔ خبردار! کوئی ایسا کام نہ کرنا کہ ان فرشتوں کو شرمندگی ہو۔ دین کا علم حاصل کرتے رہو اور ہمیشہ سچ بولو۔ یہی میری نصیحت ہے۔''

آپ نے والدہ کی نصیحت کو غور سے سنا اور ہر خوف کو دل سے نکال دیا۔ ابھی آپ تعلیم کی منزلیں طے کر رہے تھے۔ ابتدائی تعلیم کے دن تھے۔ مکتب کے در و دیوار آپ کی ہم نشینی سے لطف اندوز ہو رہے تھے کہ شفیق نانا کا انتقال ہو گیا اور تربیت کا تمام بار والدہ کے کاندھوں پر آ پڑا۔

والدہ بھی قسمت سے ایسی ملی تھیں جو عارفہ کاملہ تھیں۔ زندگی کا ایک ایک لمحہ عبادت الٰہی میں گزر رہا تھا۔ شوہر کی موت اور پھر والد کے انتقال کا صدمہ کمال صبر سے برداشت کیا اور بیٹے کی تربیت میں مشغول ہو گئیں۔ تعلیم کے مراحل تو مدرسے میں طے ہو رہے تھے، تربیت کا مدرسہ گھر میں کھل گیا۔ باطنی تعلیم ماں کی آغوش میں مکمل ہونے لگی۔

سید عبدالقادر نے شباب کی منزلوں پر قدم رکھا تو پاکیزگی کو بھی رشک آنے لگا۔ حسن و جمال کا پیکر اور ایسی بے داغ جوانی۔ جس طرف سے گزر جاتے، دیکھنے والی آنکھیں ادب سے جھک جاتیں۔

آپ کی عمر عزیز اٹھارہ سال کی ہوئی اور تمام ضروری علوم حاصل کر لیے تو تحصیل علوم کے لیے بغداد جانے کا خیال آیا۔ ایک روز تہجد کی نماز کے لیے والدہ سے پہلے اٹھے تو والدہ کی طرف غور سے دیکھا۔ وہ بہت ضعیف ہو گئی تھیں۔ اٹھہتر سال کی عمر ہو چکی تھی۔ آپ نے دل میں سوچا اب تو میں، میں ہی ان کی امیدوں کا مرکز ہوں۔ کیا یہ مجھے بغداد جانے کی اجازت دے دیں گی؟ کیا انہیں چھوڑ کر مجھے بغداد کا سفر اختیار کرنا چاہیے؟ آپ اسی کشمکش میں تھے کہ پاک باطن ماں نے بیٹے کی پریشانی کو بھانپ لیا۔

''عبدالقادر، مجھے تم پریشان نظر آ رہے ہو۔ کیا بات ہے؟''

''جی ہاں، ایک بات ایسی ہے جس نے مجھے پریشان کر دیا ہے۔''

''مجھے نہیں بتاؤ گے؟''

''میں تعلیم حاصل کرنے کے لیے بغداد جانا چاہتا ہوں لیکن آپ کی ضعیف العمری کا خیال دامن گیر ہے۔''

''محبت کو فرائض پر حاوی نہیں ہونے دینا چاہیے۔ بغداد کے مکاتب و اساتذہ کا ایک عالم میں شہرہ ہے۔ تمہیں ضرور جانا چاہیے۔ زیادہ سے زیادہ یہی ہوگا کہ لوٹ کر آؤ گے تو مجھ سے ملاقات نہیں ہوگی۔ یہ سب تو یہاں رہ کر بھی ہو سکتا ہے۔ تم میری فکر نہ کرو اور جانے کی تیاری کرو۔''

''آپ میرے بغیر کیسے رہیں گی؟''

''میری آنکھوں کے نور! تیری جدائی تو ایک لمحے کے لیے بھی مجھ سے برداشت نہیں ہو سکتی لیکن جس مبارک مقصد کے لیے تم بغداد جانا چاہتے ہو، میں اس کے راستے میں حائل نہیں ہوں گی۔ تکمیل علم ایک مقدس فریضہ ہے۔ میری دعا ہے کہ تم ہر قسم کے علوم ظاہری و باطنی میں درجہ کمال حاصل کرو۔ میں تو شاید اب جیتے جی تمہاری شکل نہ دیکھ سکوں لیکن میری دعائیں ہر حال میں تمہارے ساتھ رہیں گی۔''

اجازت کا ملنا تھا کہ تمام رات شکرانے کے نفل ادا کرتے ہوئے گزار دی۔ صبح ہوتے ہی کسی ایسے قافلے کی تلاش میں نکل گئے جو عنقریب بغداد جانے کی تیاری کر رہا ہو۔ خوش قسمتی سے ایک قافلہ انہیں مل بھی گیا۔

عبدالقادر جیلانی نے کچھ کتابیں اور کھانے کا کچھ سامان ساتھ لیا اور قافلے میں شامل ہونے کی غرض سے والدہ کی خدمت میں حاضر ہوئے۔

''کوئی زادِ راہ بھی ساتھ لیا؟'' والدہ نے پوچھا۔

''میری کتابیں میرے ساتھ ہیں۔''

"میرے پاس بھی تمہیں دینے کے لیے کچھ ہے۔" والدہ نے کہا اور ایک تھیلی اٹھا کر لائیں۔ "تیرے والد مرحوم کے ترکے سے اسی دینار میرے پاس ہیں۔ چالیس دینار تیرے بھائی کے لیے رکھتی ہوں اور چالیس زادِراہ کے لیے تیرے سپرد کرتی ہوں۔"

ان کی والدہ نے مذکورہ رقم آپ کی بغل کے نیچے گدڑی میں سی دی تاکہ محفوظ رہے۔ آپ نے یہ گدڑی پہنی اور ایک مرتبہ پھر والدہ سے عاجزانہ اجازت طلب کی۔

"اے میرے لختِ جگر! میری ایک نصیحت کو ہمیشہ کے لیے حرزِ جاں بنا لے۔ ہمیشہ سچ بولنا اور جھوٹ کے نزدیک بھی نہ پھٹکنا۔"

"مادرِ محترمہ! میں عہد کرتا ہوں کہ آپ کی نصیحت پر ہمیشہ عمل کروں گا۔"

اس کے بعد کسی کے پاس کہنے کے لیے کچھ نہیں تھا۔ عجیب منظر تھا۔ والدہ کی بوڑھی آنکھوں سے ٹپ ٹپ آنسو گر رہے تھے۔ شاید اس خیال سے کہ اب وہ انہیں کبھی نہیں دیکھ سکیں گے۔ وہ انہیں رخصت کرنے گھر سے باہر تشریف لائیں۔

"جاؤ، تمہیں خدا کے سپرد کیا۔ وہی تمہارا حافظ و ناصر ہے۔"

آپ نے بادیدہ نم والدہ کی طرف دیکھا۔ چھوٹے بھائی کو شفقت سے گلے لگایا اور علم کی عظمت کو سلام کرتے ہوئے بغداد جانے والے قافلے میں پہنچ گئے۔

قافلہ سفر کے لیے تیار تھا بس آپ کا انتظار تھا۔ آپ کے پہنچتے ہی اہلِ قافلہ نے پائے سفر دراز کیا۔ رہزنوں سے دفاع کے لیے ضروری انتظامات کر لیے گئے تھے لیکن پھر بھی طویل بیابانی راستوں کے خطرات سے ہر شخص ہراساں تھا۔

یہ قافلہ سفر طے کرتا ہوا جب ہمدان تک پہنچ گیا تو اہلِ قافلہ نے سکون کا سانس لیا۔ چند روز کے پڑاؤ کے بعد یہ قافلہ ہمدان سے روانہ ہوا۔ سنسان کوہستانی علاقہ تھا۔ خطروں کی یہ آخری قسط تھی۔ اس کے بعد بغداد کی منزل دور نہیں تھی۔ ہر شخص محتاط تھا۔ سرگوشیوں میں باتیں ہو رہی تھیں۔

"سنو! اس وقت ہم قزاق احمد بدوی کے علاقے سے گزر رہے ہیں۔"

"ہاں بھائی، بڑا طاقت ور قزاق ہے۔ اللہ ہماری مدد کرنے والا ہے۔"

"تم لوگ ڈرتے کیوں ہو؟" ایک اور شخص نے کہا۔ "قافلے میں ایسے لڑنے والے موجود ہیں جو اس کا مقابلہ کر سکتے ہیں۔"

"خدا کرے تمہارا اندازہ درست ہو لیکن احمد بدوی کا گروہ نہایت خطرناک ہے۔"

"اللہ مالک ہے۔"

تھوڑی دیر کے لیے پھر خاموشی طاری ہو گئی۔ جانور سر جھکائے چل رہے تھے جیسے انہیں کسی خطرے کا احساس ہو۔ اچانک ایک پہاڑی کے عقب سے قزاق برآمد ہوئے اور بجلی کی سی تیزی کے ساتھ قافلے پر ٹوٹ پڑے۔ یہ حملہ اتنا اچانک تھا کہ کسی کو سنبھلنے کا موقع نہ مل سکا۔ یہ سمجھنے میں کسی کو دیر نہیں لگی کہ یہ احمد بدوی کا جتھہ ہے جو ان پر ٹوٹ پڑا ہے۔ ان طاقت ور قزاقوں سے لڑنے کی ہمت کسی میں بھی نہ ہو سکی اور پورا قافلہ پتھر کی طرح ایک جگہ جم گیا۔ نہ مقابلے کی طاقت تھی نہ فرار کی راہ سوجھ رہی تھی۔

قزاقوں نے قافلے کو پسپا کرتے ہی لوٹ مار کا بازار گرم کر دیا۔ ہر شخص کا مال و اسباب لوٹ کر ایک جگہ ڈھیر کرتے چلے گئے۔ عبدالقادر جیلانی ایک طرف کھڑے ہو کر نہایت اطمینان سے تماشا دیکھ رہے تھے۔ چہرے پر گھبراہٹ تھی نہ خوف کے آثار۔ کسی ڈاکو نے لڑکا سمجھ کر آپ سے کوئی باز پرس نہیں کی۔ پھر ایک ڈاکو کی نظر آپ پر پڑی۔

"اے لڑکے تیرے پاس بھی کچھ ہے۔" ڈاکو نے بطور تمسخر آپ سے پوچھا۔

"ہاں میرے پاس چالیس دینار ہیں۔" آپ نے کہا اور ڈاکو نے یہ سن کر قہقہہ بلند کیا اور پھر اپنے ایک ساتھی کو آواز دی۔

"لو بھئی اس کی بھی سنو۔ یہ کہتا ہے کہ اس کے پاس چالیس دینار ہیں۔"

"اس کے پیٹ میں ہوں گے۔" دوسرے ڈاکو نے قریب آ کر کہا۔ "سچ کہہ رہا ہے؟ واقعی تیرے پاس چالیس دینار ہیں؟"

"میں جھوٹ کیوں بولوں گا۔ میں نے کہا نا، میرے پاس چالیس دینار ہیں۔"

"یہ تو بڑا دلچسپ لڑکا ہے۔ اسے سردار کے پاس لے چلو۔ اس کی تلاشی وہی لیں گے۔"

یہ ڈاکو آپ کو پکڑ کر اپنے سردار احمد بدوی کے پاس لے

گئے اور تمام ماجرا اس کے سامنے بیان کیا۔ اس نے آپ کو سر سے پاؤں تک دیکھا اور آپ سے پوچھا۔ ''لڑکے سچ بتلا۔ تیرے پاس کیا ہے؟''

''میں پہلے بھی تیرے دو ساتھیوں کو بتا چکا ہوں کہ میرے پاس چالیس دینار ہیں۔''

''کہاں ہیں؟ نکال کر دکھاؤ؟''

''میری بغل کے نیچے گدڑی میں سلے ہوئے ہیں۔''

سردار نے گدڑی کو ادھیڑ کر دیکھا تو اس میں سے واقعی چالیس دینار نکل آئے۔ ابھی تک یہ ڈاکو سمجھ رہا تھا کہ لڑکا مذاق کر رہا ہے۔ تلاشی کے دوران اس کے پاس سے کچھ نہیں نکلا تھا۔ وہ چاہتا تو وہ یہ دینار چھپا بھی سکتا تھا۔

''لڑکے تمہیں معلوم ہے کہ ہم رہزن ہیں اور مسافروں کو لوٹ لیتے ہیں پھر بھی تم ہم سے خوف زدہ نہیں ہو۔''

''میں خدا کے سوا کسی سے نہیں ڈرتا۔''

''تم خوف زدہ نہیں تھے تو ان دیناروں کا بھید ہم پر ظاہر کیوں کر دیا۔ تم انہیں چھپا بھی سکتے تھے۔''

''میری والدہ محترمہ نے گھر سے چلتے وقت مجھے نصیحت کی تھی کہ ہمیشہ سچ بولنا۔ بھلا والدہ کی نصیحت ان چالیس دیناروں کی خاطر کیوں فراموش کر دیتا۔''

''تم ان دیناروں کے بغیر بغداد جا کر کیا کرو گے؟''

''خدا رازق ہے۔ وہ اور دے گا۔''

یہ الفاظ نہیں تھے، حق و صداقت کے ترکش سے نکلے ہوئے وہ تیر تھے جو آپ کے منہ سے ادا ہوئے اور احمد بدوی کے سینے میں پیوست ہو گئے۔ اس کی آنکھوں سے بے اختیار آنسو بہہ نکلے۔

''اے بچے! تم نے اپنی ماں کے عہد کا اتنا پاس رکھا۔ افسوس ہے مجھ پر کہ اتنے عرصے سے اپنے خالق کا عہد توڑ رہا ہوں۔''

احمد بدوی کی تو کایا ہی پلٹ گئی۔ وہ دھاڑیں مار مار کر رو رہا تھا۔ کبھی اٹھ کر کھڑا ہو جاتا اور کبھی بیٹھ جاتا۔ جوش وحشت میں اس نے اپنا گریبان تک چاک کر لیا اور پھر آپ کے قدموں پر گر پڑا اور رہزنی کے پیشے سے توبہ کر لی۔

''میں برسوں سے مخلوق خدا کو لوٹ رہا ہوں۔ کتنے مظلوموں کی بددعاؤں میں گھرا ہوا ہوں۔ جانتا ہوں کہ یہ گناہ ہے لیکن باز نہیں آتا لیکن اب تو نے میری آنکھیں کھول دی ہیں۔ میں تجھے گواہ بنا کر اپنے پیشے سے توبہ کرتا ہوں۔'' پھر وہ اپنے ساتھیوں سے مخاطب ہوا۔ ''آج سے میرا تمہارا کوئی ساتھ نہیں۔ تم جہاں جا ہو جا سکتے ہو۔''

اس کے ساتھیوں نے اپنے سردار کا یہ حال دیکھا تو ان کے بھی دل پگھل گئے۔ ''اے سردار! تو رہزنی میں ہمارا قائد تھا اور اب توبہ میں بھی ہمارا پیش رو ہے۔ ہم نے بھی اس کام سے توبہ کی۔''

تمام گروہ نے توبہ کی اور تمام قافلے کو ان کا مال لوٹا کر اپنی راہ چل دیے۔ قافلے والوں نے یہ منظر اس طرح دیکھا جیسے کوئی خواب دیکھ رہے ہوں۔ جب ہوش آیا تو سب آپ کے شکرگزار تھے۔ قافلے نے پھر چلنا شروع کیا اور بخیر و خوبی بغداد تک پہنچ گیا۔

آپ بغداد میں داخل ہوئے تو چالیس دیناروں میں سے کچھ خرچ ہو گئے تھے کچھ جیب میں تھے۔ آپ نے اللہ پر بھروسا کیا اور جس مقصد کے لیے آئے تھے اس کی تکمیل کے لیے سرگرداں ہو گئے۔ مدرسہ نظامیہ میں داخل ہوئے تو ایک چھوٹا عمامہ سر پر تھا اور صوف کا ایک جبہ زیب تن تھا۔ بھری جوانی میں یہ زہد بے نشان فقر۔ اساتذہ نے ہاتھوں ہاتھ لیا اور جب یہ معلوم ہوا کہ یہ وہی نوجوان ہے جس کی راست گوئی سے پورے قافلے کی جاں بخشی ہوگئی تھی تو اساتذہ کی نظروں میں ان کا احترام اور بڑھ گیا۔

مدرسہ نظامیہ دنیائے اسلام کا مرکز علوم و فنون تھا اور بڑے بڑے نامور اساتذہ اس سے متعلق تھے۔ آپ نے خدا کا شکر ادا کیا کہ آپ صحیح جگہ آ گئے ہیں۔ آپ نے دل لگا کر تعلیم حاصل کرنی شروع کر دی۔

☆☆☆

۴۸۸ھ میں جب عبدالقادر جیلانی بغداد تشریف لائے تو دنیائے اسلام طرح طرح کے فتنوں میں مبتلا تھی۔ ایک طرف فتنہ خلق قرآن اور باطنیت کی تحریکیں مسلمانوں کے لیے خطرۂ ایمانی بنی ہوئی تھیں۔ دوسری طرف علمائے سو اور نام نہاد صوفی لوگوں کے دین و ایمان پر ڈاکے ڈال رہے تھے۔ مرکز اسلام بغداد ان فتنوں سے سب سے زیادہ متاثر ہو رہا تھا۔ بدکاری، فسق اور منافقت کا بازار گرم تھا۔ سلجوقی آپس میں لڑ رہے تھے۔ جس سلطان کی طاقت بڑھ جاتی تھی بغداد میں اسی کے نام کا خطبہ پڑھا جاتا تھا۔ عباسی خلیفہ دم نہ مار سکتا تھا۔ کسی اہل حق کی عزت و آبرو محفوظ نہ تھی۔ عبدالقادر جیلانی نے بغداد پہنچتے ہی ان حالات کا بغور مطالعہ کیا اور خود کو بے دست و پا پایا۔ ابھی تو ان کی تعلیم بھی مکمل نہیں ہوئی تھی کہ رشد و ہدایت کی مجالس سنبھالتے اور لوگوں کو

یمین الدولہ، آصف خان

(1569ء۔1641ء)

شہنشاہ جہانگیر کی بیوی نور جہاں کے بھائی اور شاہ جہان کی بیوی ممتاز محل کے والد اور مرزا غیاث بیگ اعتماد الدولہ کے فرزند تھے۔ اصل نام الحسن تھا۔ مغل شہنشاہ اکبر اعظم کے عہد میں وہ صوبہ بہار کے صوبہ دار تھے۔ جہانگیر کے عہد میں مہر النساء (بعد میں نور جہاں) سے جہانگیر کی شادی ہوئی۔ اپریل 1612ء میں ان کی بیٹی ارجمند بانو (جو بعد میں ممتاز محل کے نام سے مشہور ہوئیں) سے شاہجہان کی شادی ہوئی تو دربار میں ان کا وقار بھی بڑھ گیا۔ 1614ء میں انہیں آصف خاں کا خطاب ملا۔ جہانگیر کی وفات کے بعد جب اس کی میت کو لاہور لایا گیا تو نور جہاں نے اپنے بھائی آصف خاں اور شاہجہان کے دیگر ساتھیوں کو تدفین کے وقت گرفتار کرنے کا منصوبہ بنایا۔ جہانگیر کو دفن کرنے کے بعد نور جہاں نے اپنے داماد شہریار کو لاہور میں شاہ جہاں کے لقب سے تخت نشین کردیا۔ آصف خاں نے جہانگیر کی وفات کے بعد شاہجہان کو دکن سے بلایا اور مرکز پر قبضہ کرنے کی تلقین کی۔ تخت نشین ہونے کے بعد شاہجہان نے آصف خاں کو یمین الدولہ کا خطاب دیا اور انہیں وزیر اعظم کے منصب پر فائز کیا۔ بہتر سال کی عمر میں انتقال کیا۔ مقبرہ شاہدرہ لاہور میں ہے۔

اخلاقی برائیوں سے محفوظ رکھنے کی کوشش کرتے۔ شہر میں جس طرف نکل جاتے، یہ برائیاں عام نظر آتیں۔ چند ہی روز میں ان کا دل اچاٹ ہوگیا لیکن تعلیم ادھوری چھوڑ کر واپس بھی نہیں جاسکتے تھے۔ اب ایک ہی صورت تھی کہ دل جمعی سے تعلیم حاصل کرتے رہیں اور حالات سے کنارہ کش ہوجائیں۔

ایک روز ایسا دل اچاٹ ہوا کہ سبق سے فارغ ہوتے ہی جنگل کی طرف نکل گئے۔ مطالعے میں مصروف ہوئے تو ہوش ہی نہ رہا اور اندھیرا پھیل گیا۔ اب کتابوں سے حروف غائب ہوگئے تھے۔ آپ نے کتابیں ہاتھ سے رکھیں اور دجلہ کے کنارے پہنچ گئے۔ خودرو جڑی بوٹیاں اور سبز دور تک پھیلی ہوئی تھیں۔ ان جڑی بوٹیوں سے آپ نے اپنی بھوک مٹائی اور پانی سے وضو کرکے عبادت میں مشغول ہوگئے۔ رات گہری ہوئی تو شہر کی طرف لوٹنے کے بجائے اسی زمین کو اپنا بستر بنایا اور آرام کرنے کے لیے لیٹ گئے۔

اس رات ان کی طبیعت میں شامل زہد نے ایسا سکون تلاش کیا کہ یہی ان کا معمول زندگی بن گیا۔ سبق سے فارغ ہوتے ہی جنگل کی طرف نکل جاتے۔ ویرانوں میں رات گزارتے۔ زمین بستر ہوتی اور اینٹ یا پتھر، تکیہ۔ آندھی جھکڑ، طوفان، سردی، گرمی ہر چیز سے بے نیاز ہوکر برہنہ پا رات کی تنہائیوں اور تاریکیوں میں دشت نوردی کرتے رہتے۔ خودرو جڑی بوٹیاں آپ کی خوراک ہوتی۔

ان مصائب کی لذت سے آشنا ہوئے کچھ ہی روز ہوئے تھے کہ بغداد ایک ہولناک قحط کا شکار ہوگیا۔ لوگ اناج کے ایک ایک دانے کو ترسنے لگے۔ حالت یہ ہوگئی کہ لوگ جھاڑیوں کے پتوں سے تنور شکم کی آگ بجھانے پر مجبور ہوگئے۔ شہر چھوڑ کر جنگلوں کی طرف دوڑ پڑے اور جڑی بوٹیاں، درخت کے پتے نوچ نوچ کر کھانے لگے۔

عبدالقادر جیلانی کی گزر اوقات انہی چیزوں پر تھی۔ اب ان پتوں کا ملنا مشکل ہوگیا۔ آپ دجلہ کے کنارے جاتے لیکن وہاں پہلے ہی لوگوں کا ہجوم ہوتا۔ کمال صبر کے ساتھ واپس تشریف لے آتے۔ آپ کی ہمت نہ پڑتی تھی کہ لوگوں سے چھینا جھپٹی کریں۔ اس طرح کئی دن فاقوں کی آگ میں جلتے ہوئے گزر گئے۔ برداشت کی طاقت اٹھ گئی تو کسی مباح چیز کی تلاش میں نکل کھڑے ہوئے۔ بغداد کی ایک منڈی کی مسجد کے قریب پہنچے تو قدموں نے اٹھنے سے انکار کردیا۔ لڑکھڑاتے ہوئے مسجد کے ایک گوشے میں جاکر بیٹھ گئے کہ سکون تو اللہ کے گھر ہی میں ملتا ہے لیکن ضعف ایسا تھا کہ بیٹھنا دوبھر ہوگیا۔ آپ فرش پر لیٹ گئے۔ کچھ دیر اس عالم میں گزری تھی کہ ایک شخص گوشت اور روٹی لے کر مسجد میں داخل ہوا اور ایک طرف بیٹھ کر کھانے لگا۔ یہ منظر دیکھ کر بھوک نے مزید شدت اختیار کی۔ بے اختیار جی چاہا کہ

آغا اشرف
(1914ء۔1996ء)

افسانہ، ڈراما نگار، محقق اور نقاد وہ آغا ارشد حسین کے ہاں لاہور میں پیدا ہوئے۔ انہوں نے سینئر کیمبرج تک تعلیم حاصل کی، وہ سعادت حسن منٹو، مختار صدیقی، سلطان کھوسٹ، سید امتیاز علی تاجور شوکت تھانوی کے ہمعصر تھے۔ انہوں نے تین ہزار سے زائد کتابیں لکھیں گویا ایک سال میں انہوں نے اوسطاً 50 کتابیں لکھیں۔ ان میں آدھی سے زیادہ بچوں کے لیے ہیں۔ قیام پاکستان سے قبل کئی فلموں میں سائیڈ ہیرو کا رول ادا کیا، متعدد فلموں، ریڈیو اور ٹی وی کے لیے اسکرپٹ لکھے۔ لکھنو، دہلی اور لاہور ریڈیو اسٹیشنوں پر بطور اداکار اور اسکرپٹ رائٹر کے کام کیا۔ انہوں نے اپنی خودنوشت ''ایک دل ہزار داستان'' بھی لکھی۔ اہم تصانیف میں افق سے افق تک، کرن کرن اندھیرا، لمحوں کے بھنور ہمارے غازی ہمارے شہید، لہولہو مٹی، ایک جنگ ایک المیہ، اسلامی کانفرنس کی کہانی، اجتماع ملت اسلامیہ، بدلاں دی چھاں، جہاد، پاکستان، دل ایک دیوا (ناولٹ) شامل ہیں۔ اسلامی کانفرنس کی کہانی پر انعام بھی ملا۔ زندگی کے آخری ایام انتہائی کسمپرسی کی حالت میں گزارے۔ لاہور میں انتقال ہوا۔

انھیں اور اس شخص کے ساتھ کھانے میں شامل ہو جائیں لیکن فوراً ہی اپنے نفس کو ملامت کی کہ بے صبر مت بن۔ خدا پر توکل کر۔ وہ خود ہی کوئی انتظام کر دے گا۔

اس شخص کی طرف سے بے نیاز ہو کر آپ نے آنکھیں بند کرلیں۔ اس شخص نے چند لقمے کھا کر اِدھر اُدھر دیکھا تو اس کی نظر آپ پر پڑی۔ اللہ ہی نے اس کے دل میں ڈالا اور اس نے آپ کو دعوت دی۔ پہلے تو آپ نے انکار کیا لیکن اس شخص کا اصرار بڑھتا گیا تو آپ نے اشارہ غیبی سمجھ کر دعوت قبول کرلی اور اس کے ساتھ کھانے میں شریک ہوگئے۔

''آپ بغداد کے تو معلوم نہیں ہوتے۔'' اس شخص نے کھانے کے دوران دریافت کیا۔

''آپ نے درست اندازہ لگایا۔ میں جیلان کا باشندہ ہوں اور یہاں حصول علم کی غرض سے مقیم ہوں۔''

''ارے، یہ تو تم نے بڑی خوشی کی خبر سنائی۔ میں بھی جیلان کا رہنے والا ہوں۔''

''یہ تو واقعی خوشی کی بات ہے۔''

''تم اتنے عرصے سے یہاں ہو تو جیلان کے رہنے والے ایک نوجوان عبدالقادر کو بھی جانتے ہو گے۔ وہ بھی تعلیم کی غرض سے یہاں آیا ہوا ہے۔''

''وہ عبدالقادر تو میں ہی ہوں۔''

''بھائی، میں نے تمہاری امانت میں خیانت کی ہے۔ خدا کے لیے مجھے بخش دو۔'' وہ شخص آنسوؤں سے رونے لگا۔

''بھائی، کیسی امانت اور کیسی خیانت۔ اپنی بات کی وضاحت کرو۔ تم نے مجھے الجھن میں ڈال دیا۔''

''آپ کی والدہ نے آپ کے لیے میرے ہاتھ آٹھ دینار بھیجے تھے۔ میں کئی روز تک آپ کو تلاش کرتا رہا کہ امانت آپ کو پہنچا دوں لیکن آپ کا کچھ پتا نہ چلتا تھا۔ میرا ذاتی خرچ ختم ہوگیا۔ نوبت فاقوں تک پہنچ گئی۔ آپ کو معلوم ہے اناج سونے کے بھاؤ مل رہا ہے۔ میں نے بھوک کی شدت سے مجبور ہو کر آپ کی امانت میں سے کھانا خرید لیا۔ مجھے اس گناہ عظیم کے لیے بخش دو۔''

''تم میرے بڑے بھائی کی طرح ہو۔'' آپ نے اسے گلے سے لگالیا۔ ''کسی کا کچھ نہیں ہے۔ سب اللہ کا دیا ہے۔ تم نے جو کچھ خرچ کرلیا، میں صدق دل سے معاف کرتا ہوں۔''

وہ شخص آپ کے اس حسن سلوک سے اور بھی متاثر ہوا۔ آپ نے اسے تسلی دی۔ اس شخص نے آپ کی امانت میں سے کچھ دینار آپ کو دیے اور آپ نے اسے نہایت محبت سے رخصت کیا۔

ان دیناروں سے کچھ دن اور کٹ گئے لیکن اناج اتنا

مہنگا ہوگیا تھا کہ یہ رقم ساتھ نہ دے سکی۔ کئی کئی دن بعد کچھ ساگ پتے مل جاتے اور کچھ وقت گزر جاتا۔ پردیس تھا، کسی سے قرض مانگتے ہوئے بھی شرم دامن گیر ہوتی تھی۔ اپنا حال ظاہر کیے بغیر حصول علم میں مگن رہے۔

قرض مانگتے ہوئے شرم آتی تھی لیکن علم کی خیرات طلب کرنے میں کوئی عار نہیں تھی۔ مدرسے سے باہر بھی کسی استاد کی شہرت سنتے تو اس کے پاس پہنچ جاتے اور جھولی پھیلا دیتے۔ پورے بغداد میں شہرہ تھا کہ ایسا طالب علم نہ دیکھا نہ سنا۔ بھوک تو جیسے اسے لگتی ہی نہیں ہے۔ کتابیں ہی اس کا اوڑھنا بچھونا ہیں۔ کتابیں ہی اس کا کھانا پینا۔ وہ تمام صعوبتوں کو فراخ دلی سے برداشت کررہے تھے اور منازل علم بڑی تیزی سے طے کررہے تھے۔

ایک دن ایک بیابان میں بیٹھے سبق یاد کررہے تھے کہ غیب سے آواز آئی۔ ''عبدالقادر! تجھے کئی دن سے فاقہ ہے اور حصول علم میں دقت ہورہی ہے۔ جا سنت انبیاء پر عمل کر اور کسی سے قرض لے۔''

آپ اس آواز کو سن کر چونکے ضرور لیکن گھبرائے نہیں۔ بچپن سے ان آوازوں کو سنتے چلے آرہے تھے اس لیے کوئی نئی بات نہیں تھی۔ آپ نے اس آواز کو جواب دیا۔

''میں ایک نادار شخص ہوں، قرض لے کر ادا کیسے کروں گا؟''

''تو اس کی فکر نہ کر۔ تیرے قرض کی ادائیگی کے ذمے دار ہم ہیں۔''

اس آواز کو اشارہ غیبی سمجھ کر آپ نے ویرانے سے باہر قدم رکھا۔ اب قحط کا زمانہ گزر چکا تھا لہٰذا نان بائیوں کی دکانیں کھل چکی تھیں۔ آپ ایک دکان کے سامنے جاکر کھڑے ہوگئے۔ کچھ دیر ہمت جمع کرنے میں خرچ ہوئی پھر نان بائی سے مخاطب ہوئے۔

''بھائی، اگر ہوسکے تو مجھے ہر روز ڈیڑھ روٹی قرض دے دیا کرو۔ جب قدرت ہوئی تو تیرا قرض ادا کردوں گا۔ اگر مرگیا تو بخش دینا۔''

وہ نان بائی بھی کوئی مردحق تھا۔ آپ کا سوال سنتے ہی زاروقطار رونے لگا۔ ''جب آپ چاہیں اور جو چاہیں میری دکان سے لے جایا کریں۔''

قرض کا انتظام ہوگیا تھا۔ آپ روزانہ اس نان بائی سے ڈیڑھ روٹی لے آتے لیکن یہ فکر ہمیشہ رہتی کہ قرض اترے گا کیسے۔ سال پر سال گزرتے رہے۔ قرض اتنا ہوگیا کہ نان بائی کے پاس جاتے ہوئے شرم آنے لگی۔

آپ نے اس نان بائی کے پاس جانا چھوڑ دیا۔ فاقوں کا دور پھر شروع ہوگیا۔ ایک دن آپ اسی عالم میں ویرانے کے فرش کو بستر بنائے لیٹے تھے کہ اسی آواز نے آپ کو پھر جھنجوڑا۔

''پریشان کیوں ہے۔ یہاں سے شمال کی طرف جا۔ وہاں جو کچھ ملے، نان بائی کو دے آ۔''

آپ نے کپڑے جھاڑے۔ کتابوں کو وہیں چھوڑا اور شمال کی طرف چل دیے۔ کچھ دور چلنے کے بعد چمکتی ہوئی کوئی چیز نظر آئی۔ قریب جاکر دیکھا تو سونے کا ایک ٹکڑا تھا۔ آپ نے اسے اٹھالیا اور واپس چلے آئے۔ اسی وقت نان بائی کے پاس پہنچے اور یہ ٹکڑا اسے دے کر قرض سے سبک دوشی حاصل کرلی۔

آپ کو بغداد میں رہتے ہوئے آٹھ سال کا عرصہ گزر چکا تھا۔ علم قرات، علم تفسیر، علم حدیث، فقہ، لغت، شریعت، طریقت غرض کوئی علم ایسا نہ تھا جو آپ نے باکمال اساتذہ سے حاصل نہ کرلیا ہو۔

بغداد فتنہ وفساد کی آماجگاہ بنا ہوا تھا۔ وہ فطری طور پر فتنہ وفساد سے متنفر تھے۔ اب جبکہ تعلیم بھی مکمل ہوگئی تھی۔ نان بائی کا قرض بھی اتر گیا تھا تو اب بغداد کا قیام گراں گزرنے لگا۔

ایک دن پختہ ارادہ کرلیا کہ بغداد چھوڑ دوں گا۔ قرآن کریم بغل میں دبایا اور اس راستے کی طرف چل دیے جو صحرا کی طرف جاتا تھا۔ اپنے خیالوں میں چلے جارہے تھے کہ یکایک ٹھوکر لگی اور گر پڑے۔ ابھی اٹھنے بھی نہیں پائے تھے کہ ایک غیبی آواز نے تعاقب کیا۔

''یہاں سے مت جاؤ۔ خلق خدا کو تم سے فیض پہنچے گا۔''

''مجھے خلق خدا سے کیا واسطہ ہے۔ مجھے تو اپنے دین کی سلامتی مطلوب ہے۔'' آپ نے لیٹے لیٹے جواب دیا۔

''نہیں نہیں۔ تمہارا یہاں رہنا ضروری ہے۔ تمہارے دین کو کچھ ضرر نہیں پہنچے گا۔''

جب میزبان اتنا تقاضا کررہا ہو تو مہمان کی کیا مجال کہ کہیں چلا جائے۔ آپ نے منشائے الٰہی کے سامنے سر جھکا دیا۔ سب دروازے کھلے ہوئے تھے لیکن پیروں میں ایسی زنجیر پڑی کہ واپسی کا ارادہ ترک کرنا پڑا۔

دوسرے دن ایک محلے سے گزر رہے تھے کہ ایک دروازہ کھلا۔ ایک شخص نے اپنا سر باہر نکالا اور ان سے مخاطب ہوا۔ ''کیوں عبدالقادر کل تو نے رب سے کیا مانگا

تھا۔"

خطاب اتنا اچانک ہوا تھا اور پھر یہ حیرانی بھی تھی کہ یہ شخص مجھے کیسے جانتا ہے۔ میرا نام لے کر پکار رہا ہے۔ قوت گویائی جواب دے گئی۔ کوئی جواب نہ بن پڑا۔ اس شخص نے نہایت غصے کے عالم میں دروازہ بند کرلیا۔ گلی پھر سنسان ہوگئی۔ دروازہ پھر خاموش ہوگیا جس طرح دوسرے دروازے چپ چاپ کھڑے، راہگیروں کو گزرتے ہوئے دیکھ رہے تھے۔ آپ نے بھی خاموشی کے حلقے سے باہر قدم رکھا اور آگے بڑھ گئے۔ راستے بھر وہ اس شخص اور اس دروازے کے بارے میں سوچتے رہے۔ اچانک آپ کے قدم ٹھہر گئے۔ یہ شخص تو اولیا اللہ ہی سے تھا ورنہ اسے کل کے واقعے کا علم کیونکر ہوتا۔ مجھے نام لے کر کیوں پکارتا۔ ہائے، میں نے کیسی دولت سے منہ پھیرلیا۔ میں نے اس دروازے کی چوکھٹ کیوں نہ تھام لی۔ میں وہاں سے چلا کیوں آیا۔ چلو، اب بھی کون سا راستہ طے ہوگیا۔ واپس جا کر اس دروازے پر دستک دیتا ہوں۔ وہ واپس آئے لیکن اپنے حجاب حائل ہوئے کہ ہزار کوشش کے باوجود مطلوبہ دروازہ نہ مل سکا۔ اس گلی کے صدہا چکر لگا لیے لیکن سب دروازے ایک جیسے تھے، کہاں دستک دیتے۔

وہ دروازہ تو نہ مل سکا لیکن جس شخص نے اپنا سر دروازے سے باہر نکالا تھا، اس کا چہرہ نظر میں تھا۔ آپ نے اس چہرے کی تلاش شروع کردی۔ صبح ہوتے ہی بازاروں میں نکل جاتے۔ ایک ایک چہرے کو غور سے دیکھتے۔ کئی دن گزر گئے۔ مایوسی طاری ہونے لگی کہ ایک روز گل مراد کھل اٹھا۔ ایک شخص کو انہوں نے شیرے کی دکان پر بیٹھا دیکھا۔ صاف معلوم ہوتا تھا کہ یہ دکان اسی شخص کی ہے۔

"بھائی، یہ جو صاحب دکان پر بیٹھے ہیں، ان کا نام کیا ہے۔" انہوں نے ایک راہ گیر سے پوچھا۔

"ارے، تم انہیں نہیں جانتے۔ یہ مشہور شیرہ فروش شیخ حماد ہیں۔"

حضرت عبدالقادر کو یہ سن کر سخت مایوسی ہوئی اور انہیں اپنے اندازے پر شک ہونے لگا کہ شاید مجھے پہچاننے میں غلطی ہوئی ہے۔ یہ بزرگ وہ نہیں ہوسکتے۔ بھلا ایک شیرہ فروش ولی اللہ کیسے ہوسکتا ہے۔ یہ تو کوئی دنیادار ہے۔ ابھی وہ تذبذب میں تھے کہ راہگیر نے ان کا شک رفع کردیا۔

"ان کی دکان داری پر نہ جایئے۔ یہ بہت پہنچے ہوئے بزرگ ہیں۔ بڑے بڑے بزرگ علم طریقت میں ان ہی

روٹی

فن کا منبع، فن کی روح ہے۔ جب روٹی اور فن مل جاتے ہیں تو انسان تاج محل تعمیر کرتا ہے۔ اہرام مصر بناتا ہے۔ الحمرا کے طلسمی محلات کی بنیاد ڈالتا ہے۔ کالی داس 'شکنتلا' ملٹن 'گمشدہ جنت' اور اقبال "جاوید نامہ" لکھتا ہے لیکن جب فن سے روٹی بچھڑ جاتی ہے تو شکنتلا مرجاتی ہے اور جاوید نامہ ردی میں بکنے لگتا ہے پھر حسن مرجاتا ہے مذہب مرجاتا ہے' بھوک سب کا گلا گھونٹ دیتی ہے۔

ماہتاب راؤ' جہانیاں منڈی

کے تربیت یافتہ ہیں۔ شام کے رہنے والے ہیں لیکن بغداد کی برکت بن کر یہاں رہائش پذیر ہیں۔"

وہ راہگیر اور کچھ بتاتا لیکن اب سننے کی تاب کہاں تھی۔ منزل سامنے تھی۔ جسے ڈھونڈتا تھا وہ مل گیا تھا۔ آپ آگے بڑھے اور سلام کر کے دکان کے سامنے کھڑے ہوگئے۔

"آخر لوٹ آئے نا۔" شیخ حماد نے آپ کو دیکھ کر فرمایا۔

"میں کل کی بات کا جواب دینے حاضر ہوا ہوں۔"

"تم حاضری کے لیے نہیں، حکومت کے لیے دنیا میں آئے ہو۔ قطاب زمانہ نے تمہارے ظہور کی پیش گوئیاں کی ہیں اور تم خالی ہاتھ بغداد سے چلے جارہے تھے۔"

"میں نے آٹھ سال کی بے پناہ مشقت کے بعد تمام علوم ظاہری حاصل کرلیے ہیں۔ خالی ہاتھ کب ہوں۔"

"یہ کام تو ہر مدرسے میں ہورہا ہے۔ تمہارا سینہ تو علوم باطنی کا دفینہ بننے والا ہے۔ ریاضات و مجاہدات کی بھٹی میں جلو گے تو کام کے بنو گے۔"

"حضرت، پھر دیر کس بات کی ہے۔ میرا ہاتھ تھام لیجیے۔"

"لو، ہمارا بنایا ہوا شیرہ پیو پھر باتیں ہوں گی۔"

اس شیرے میں ایسی تاثیر تھی کہ بیٹھے تو اٹھنا بھول گئے۔ شیخ حماد کا دامن پکڑ کر جھول گئے کہ حضرت اب آپ ہی مجھے منزل تک پہنچائیں گے۔ شیخ حماد ہونٹوں ہی ہونٹوں میں مسکرا رہے تھے اور آپ کی حالت دیکھ دیکھ کر لطف اندوز ہورہے تھے۔

"دیکھو، کتابوں کا علم راستوں کے علم کی طرح ہے لیکن جب تک چلنے کی ہمت نہ ہوگی۔ اس علم کا کیا فائدہ۔"

"یہ ہمت کیسے نصیب ہوگی۔"

''مجاہدوں اور ریاضت سے۔ خلق خدا کی طرف سے منہ موڑ کر یاد الٰہی میں ڈوب جاؤ۔ ہر محبت کو دل سے نکال دو۔ اپنے نفس کو اس طرح قابو میں کرلو جیسے چابک سوار بیل کو ہانکتا ہے۔''

''آپ کی رہنمائی کے بغیر یہ راستہ کیسے طے ہوگا۔''

''اب جس طرف منہ اٹھے چلے جاؤ۔ تیسرے سال میں تمہارا انتظار کروں گا۔''

شیخ کا حکم تھا، رکتے تو کیسے رکتے۔ بادیدہ نم اٹھے اور صحرا کی طرف چل دیے۔ شباب کا زمانہ تھا۔ صرف ۲۶ سال عمر تھی۔ دنیائے رنگ و بو کی رنگینیاں ہر طرف سے دعوت نظارہ دے رہی تھیں لیکن آپ نے ہر دعوت کو ٹھکرا کر عراق کے وسیع و عریض بے آب وگیاہ بیابانوں کو اپنا مسکن بنالیا۔ آج یہ صحرا قیام گاہ ہے تو کل وہ جنگل۔ درختوں کے پتے اور خودرو جڑی بوٹیاں آپ کی غذا تھی۔ کہیں پانی مل گیا تو پی لیا ورنہ اللہ کا نام۔ سرکش نفس کو دبانے کے لیے کانٹوں کو بستر بنالیا۔ زخموں سے بدن چور ہوگیا۔ نہ وہ لوگوں کو جانتے تھے اور نہ لوگ انہیں پہچانتے تھے۔ رفتہ رفتہ یہ حالت ہوئی کہ لوگ انہیں عبدالقادر دیوانہ کے نام سے پکارنے لگے۔ بغداد کے جنگلات آپ کی آہ وزاری سے گونجتے رہے۔

تین سال اسی عالم میں گزرے تو آپ شہر میں داخل ہوئے۔ کمزوری اور زخموں کی شدت سے آپ ایک سڑک پر گر گئے۔ لوگ جمع ہوگئے۔ چند ایک نے آپ کو پہچان لیا۔

''ارے یہ تو عبدالقادر دیوانہ ہے۔''

''یہ اس کی کیا حالت ہو رہی ہے۔''

''یہ تو مرچکا۔''

''بھوک اور کمزوری کا کب تک مقابلہ کرتا۔ آخر مر گیا۔''

''اس کی تجہیز و تکفین اب ہماری ذمے داری ہے۔''

چند مخیر حضرات آگے بڑھے۔ کفن وغیرہ کا انتظام بھی ہوگیا۔ غسل دینے کے لیے تختے پر رکھا ہی تھا کہ انہیں ہوش آگیا۔ سب لوگ گھبرا کر پیچھے ہٹ گئے۔

''یہ سب کیا ہو رہا ہے؟'' آپ نے فرمایا۔

''تم مرگئے تھے۔ تمہیں غسل دیا جارہا تھا۔''

''میں حالت سکر میں تھا لیکن چھوڑو، تم نہیں سمجھو گے۔ شیخ حماد کو خبر کردو کہ عبدالقادر ایفائے عہد کے لیے واپس آگیا ہے۔''

لوگ دوڑتے ہوئے گئے اور شیخ حماد کو لائے۔ آپ کی نظر جیسے ہی شیخ حماد پر پڑی آپ ان کے قدموں میں گر گئے۔ مرغ بسمل کی طرح تڑپنے لگے۔

''عبدالقادر، تم نے عہد پورا کیا لیکن یہ تماشا کیسا ہے۔ اٹھو میرے ساتھ چلو۔''

آپ سر جھکائے ان کے ساتھ چلتے رہے اور ایک دکان پر جاکر بیٹھ گئے۔ حضرت شیخ نے ایک پیالے میں شیرہ بھرا اور ان کے آگے رکھ دیا۔

''بہت کمزور ہوگئے ہو۔ لو یہ شیرہ پی لو۔''

شیرہ پیتے ہی کمزوری رفع ہوگئی۔ بھوک ایسی جاتی رہی جیسے کبھی لگی ہی نہیں تھی لیکن انہیں ایسا محسوس ہوا جیسے یہ دکان کسی ویرانے میں ہے۔ ان کے اور شیخ کے علاوہ کوئی موجود نہیں۔''

''کیا محسوس کررہے ہو؟''

''تنہائی۔''

''کیسی تنہائی۔''

''میرے اور آپ کے سوا کوئی موجود نہیں۔''

''جب میں بھی نہ رہوں اس وقت آنا۔''

''اب میں کہاں جاؤں۔''

''آبادی میں مگر آبادی سے دور۔''

اس سے زیادہ پوچھنے کی ہمت نہیں تھی۔ تھے ور اس معمے کو حل کرتے ہوئے ایک طرف کو چل دیے۔ قدرت خود رہنمائی کررہی تھی۔ چلتے چلتے محلہ کرخ کی طرف نکل آئے۔ یہاں سلجوقیوں کی پامالی کے بعد کئی مکان بے آباد پڑے تھے۔ آبادی میں مگر آبادی سے دور۔ یہ نکتہ آپ کے کانوں میں گونجا اور معاملہ حل ہوگیا۔ آپ نے ان مکانوں میں سے ایک کو اپنی قیام گاہ بنالیا۔ کبھی کوئی بھولا بھٹکا راہی اس طرف نکل آتا اور آپ کو دیکھتا تو آپ کی حالت پر افسوس کرتا ہوا آگے بڑھ جاتا۔ بے چارہ دیوانہ۔

پندرہ روز کے فاقوں کے بعد جب پیٹ میں آگ سی اور بھوک ناقابل برداشت ہوگئی تو آپ خوراک کی تلاش میں نکلے۔ ایک خودرو بوٹی پر آپ کی نظر پڑی جسے مقامی لوگ کوندلی کہتے تھے۔ آپ نے اسے اپنی خوراک بنالیا۔ اس بوٹی کو کھالیتے اور عبادت الٰہی میں مشغول رہتے۔

اس عالم میں کئی سال گزر گئے تھے کہ ایک روز عجیب کیفیت طاری ہوئی۔ بے خبری کے عالم میں ایک طرف دوڑنا شروع کردیا۔ نہ جانے کب تک دوڑتے رہے۔ جب ہوش آیا تو اپنے آپ کو بغداد کے نواح شستر میں پایا جو

بغداد سے بارہ دن کی مسافت پر تھا۔
وہ اپنی حالت پر تعجب کر رہے تھے کہ یہاں تک کیسے پہنچ گئے۔ اچانک ایک عورت سامنے آئی۔
''تم شیخ عبدالقادر ہو کر اپنی حالت پر متعجب ہو۔'' اس عورت نے کہا اور غائب ہوگئی۔
آپ مقام حیرت سے باہر نکل آئے۔ جب میں یہاں تک دوڑتا ہوا آسکتا ہوں تو حج بیت اللہ کے لیے مکہ معظمہ کیوں نہ چلا جاؤں۔ ایک ہوک سی دل میں اٹھی اور پیدل ہی چل پڑے۔ منزلوں پر منزلیں طے کرتے ہوئے ٹیلوں اور وادیوں کو عبور کرتے ہوئے جب آپ بغداد اور مکے کے درمیان ایک مقام مینارۃ القرون پر پہنچے تو ایک شخص سے ملاقات ہوئی جو انہی کی طرح تیز تیز قدم اٹھاتا ہوا چل رہا تھا جیسے بہت جلدی میں ہو۔
''دوست، کہاں کا قصد ہے؟'' اس شخص نے پوچھا۔
''حج بیت اللہ کے لیے مکہ معظمہ جا رہا ہوں۔'' آپ نے فرمایا۔
''کیا میں بھی آپ کے ساتھ جا سکتا ہوں؟''
''بصد شوق۔''
یہ شیخ عدی بن مسافر تھے جو اس دور کے مشہور اولیا میں سے تھے۔ شیخ عبدالقادر آپ کے احوال سے ناواقف تھے۔ راستے میں صرف اتنا معلوم ہوسکا کہ ان کا نام شیخ عدی ہے البتہ قرائن سے یہ جان لیا کہ یہ نوجوان بھی اللہ کے خاص بندوں میں سے ہے۔
وہ دونوں اکٹھے سفر کرتے ہوئے آگے بڑھنے لگے۔ ابھی کچھ ہی دور گئے ہوں گے کہ ایک نقاب پوش حبشیہ لڑکی سامنے آکر کھڑی ہوگئی اور حضرت شیخ عبدالقادر سے مخاطب ہوئی۔ ''اے جوان! تو کہاں کا رہنے والا ہے؟''
''ارض گیلان کا باشندہ ہوں۔''
''اے مرد خدا! آج تو نے بہت تھکا دیا ہے۔''
''کیوں۔ وہ کیسے؟''
''میں حبش میں تھی کہ مجھے حالت کشف میں معلوم ہوا کہ اللہ تعالیٰ نے تیرے دل کو اپنے نور سے بھر دیا ہے اور اپنے فضل و کرم سے تجھے وہ کچھ عطا کیا ہے جو کسی دوسرے ولی اللہ کو نہیں دیا۔ اس مشاہدے کے بعد میرے دل نے کہا کہ تیری زیارت کروں۔ اب میں نے تجھے دیکھا ہے تو جی چاہتا ہے کہ آج تیرے ساتھ رہوں۔'' یہ کہہ کر وہ اس راستے کے ایک طرف چلنے لگی اور یہ دونوں دوسری طرف۔

ایک سادہ طبع نوجوان کی کہانی..... جو نامساعد حالات کی طنابیں گرفت میں رکھنا جانتا تھا۔

وادی مہران کے ایک دور دراز خطے سے جس کا تعلق تھا......

ایک پراسرار واقعے نے اس کی زندگی کا رخ ہی بدل دیا۔

جانگلی

جس میں محبت کی دیوانگی بھی ہے اور نفرتوں و عداوتوں کے دہکتے انگارے بھی۔

بہت جلد ... سسپنس کے صفحات کی زینت

دن گزر گیا تو وہ عارفہ رخصت ہوگئی اور یہ دونوں منزلوں پر منزلیں طے کرتے ہوئے مکہ معظمہ پہنچ گئے۔ دونوں کے دلوں پر انوارالٰہی کی بارش شروع ہوگئی۔

ایک دن دونوں طواف کررہے تھے کہ حضرت عدی پر انوارالٰہی کا ایسا نزول ہوا کہ وہ غش کھا کر گر پڑے اور ایسے بے ہوش ہوئے کہ ان پر مردہ ہونے کا گمان ہونے لگا۔

وہی عارفہ جو راستے میں ملی تھی پھر ظاہر ہوئی اور حضرت عدی کے سرہانے کھڑی ہوگئی۔ کچھ دیر انہیں دیکھتی رہی پھر انہیں ہلا ہلا کر کہنے لگی۔

''جس اللہ نے تجھے مارا ہے وہی تجھے زندہ کرے گا۔ پاک ہے وہ ذات کہ جس کے نورجلال کے سامنے کسی شے کو ٹھہرنے کی مجال نہیں سوائے اس کے کہ وہ خود اسے قائم رکھے۔ اس رب ذوالجلال کے انوار مقدس نے ذہن کو منجمد کردیا ہے اور اہل عقل وعلم کی آنکھیں چندھیا دی ہیں۔''

اس عارفہ حبشیہ کے منہ سے یہ الفاظ نکلتے ہی حضرت عدی کو ہوش آ گیا اور وہ اٹھ کر کھڑے ہوگئے۔ پھر شیخ عبدالقادر نے ہاتف غیبی کی آواز سنی جو انہیں مخاطب کرکے کہہ رہا تھا۔

''اے عبدالقادر ہم تجھے اپنے نشانات سے عجائبات دکھائیں گے۔ پس اپنی مراد کو ہماری مراد سے مت ملا۔ ثابت قدم رہ۔ میری رضا کے سوا کسی کی رضا نہ مانگ۔ تیرے لیے ہمارا شہود دائمی ہے۔ خلق خدا کی فیض رسانی کے لیے بیٹھ جا کیونکہ ہمارے کچھ خاص بندے ہیں جنہیں ہم تیرے وسیلے سے اپنا مقرب بنائیں گے۔''

اسی وقت اس عارفہ حبشیہ کی آواز آئی۔

''اے جوان صالح! آج تیرا عجب رتبہ ہے۔ میں دیکھتی ہوں کہ تیرے سر پر ایک نورانی شامیانہ ہے اور اس کے اردگرد آسمان تک فرشتوں کا ہجوم ہے اور تمام اولیا اللہ کی نظریں تجھ پر لگی ہوئی ہیں۔''

حج بیت اللہ کے دوران آپ نے فیوض وبرکات کے وہ خزانے سمیٹے کہ دنیا ہی بدل گئی۔ تحیر خیز کیفیات کے ایسے ایسے مناظر سامنے آئے کہ آپ کسی اور دنیا کے مسافر نظر آنے لگے۔

حج بیت اللہ سے واپس ہوئے تو شہر میں داخل ہونے کے بجائے عراق کے بیابانوں ہی کو اپنا مسکن بنالیا۔ آپ نے سن لیا تھا کہ ''میری رضا کے سوا کسی کی رضا نہ مانگ۔'' آپ نے شدومد کے ساتھ اس پر عمل شروع کردیا۔ اب انہیں کسی سے غرض نہیں تھی۔ اس کی رضا کے لیے مجاہدوں میں راتیں گزار رہے تھے۔

ایک روز کسی ویرانے میں بیٹھے تھے کہ آپ کی ملاقات ایک نورانی صورت شخص سے ہوئی جسے آپ نے پہلے کبھی نہیں دیکھا تھا۔ اس شخص میں ایسی کشش تھی کہ دل بے اختیار اس کی طرف کھنچتا تھا۔

''کیا تو میرے ساتھ رہنا چاہتا ہے؟'' اس شخص نے پوچھا۔

''اگر میرے مالک کی رضا ہو۔'' آپ نے فرمایا۔

''عہد کرو کہ میری مخالفت نہیں کروگے اور جو میں کہوں گا اس پر عمل کروگے۔''

''میں آپ کی مخالفت نہ کرنے اور کہا ماننے کا عہد کرتا ہوں بشرطیکہ خلاف شرع کوئی بات نہ ہو۔''

''اچھا، تو پھر اس جگہ بیٹھا رہ۔ جب تک میں نہ آؤں یہ جگہ مت چھوڑنا۔''

وہ شخص تو چلا گیا اور آپ اسی جگہ بیٹھ کر عبادت الٰہی میں مشغول ہوگئے۔ خیال یہی تھا کہ آج نہیں تو کل وہ شخص لوٹ کر آجائے گا۔ کئی دن گزر گئے وہ شخص لوٹ کر نہیں آیا۔ بھوک نے برداشت کا دامن چھوڑا تو آپ تلاش رزق میں نکلے۔ ایک جگہ کچھ روٹیاں پڑی ہوئی ملیں۔ غالباً کسی کی ضرورت سے زیادہ تھیں جو وہ یہاں پھینک گیا تھا۔ آپ نے وہ روٹیاں اٹھالیں۔

دن پر دن گزرتے گئے۔ لوگ جو چیزیں بیکار سمجھ کر پھینک دیتے، آپ انہیں اٹھا کر جینے کا سامان کرلیتے اور پھر اسی جگہ آکر بیٹھ جاتے جہاں وہ اجنبی بیٹھنے کو کہہ گیا تھا۔ اپنا عہد نبھاتے ہوئے ایک سال گزر گیا تو وہ شخص اچانک نمودار ہوگیا۔ شیخ عبدالقادر خوش ہوگئے کہ اب بھید کھلے گا کہ ماجرا کیا ہے۔ وہ شخص اس مرتبہ بھی نہایت جلدی میں تھا۔ چند ساعت ہی آپ کے پاس بیٹھا ہوگا کہ اٹھ کر کھڑا ہوگیا بلکہ چلنا شروع کردیا۔

''جب تک میں پھر تیرے پاس نہ آؤں یہیں بیٹھا رہ۔'' اس شخص نے کہا اور چلا گیا۔

اُمید نے پھر دلاسا دیا کہ یہ شخص ایک مرتبہ ایک سال بعد آیا تھا لیکن شاید اس مرتبہ جلدی ہی لوٹ آئے۔ اسے روک بھی نہیں سکتے تھے کہ حکم ماننے کا عہد کرچکے تھے۔ ناچار جہاں بیٹھے تھے وہیں بیٹھے رہے۔

امتحان پھر شروع ہوگیا۔ سردی، گرمی، طوفان، بارش

سب یہیں گزر... گرحتیٰ کہ ایک سال اور بیت گیا۔ وہ شخص پھر آیا۔ ...ی دیر بیٹھا اور پھر وہیں بیٹھے رہنے کی تلقین کر کے چلا گیا۔

جب تیسرا برس بھی گزر گیا تو وہ شخص پھر نمودار ہوا۔ اس مرتبہ اس کے پاس روٹی اور دودھ تھا اور معلوم ہوتا تھا اس مرتبہ وہ کچھ زیادہ دیر بیٹھنے آیا ہے۔

"مرحبا اے جوان صالح!" اس شخص نے کہا۔ "میرا نام خضر (علیہ السلام) ہے۔ مجھے حکم ہوا ہے کہ روٹی اور دودھ تیرے ساتھ بیٹھ کر کھاؤں۔"

یہ سننے کی دیر تھی کہ سب کچھ سمجھ میں آ گیا۔ حضرت خضر علیہ السلام کا منصب رہنمائی کرنا ہے۔ بھٹکے ہوؤں کو راہ دکھانا ہے۔ قدرت کو میری رہنمائی مقصود تھی اسی لیے ان سے میری ملاقات کرائی گئی ہے۔

دونوں نے ساتھ بیٹھ کر دودھ اور روٹی کھائی۔ یہ غذا کوئی معمولی غذا نہیں تھی۔ جنت سے آیا ہوا سامان تھا۔ اس غذا کا پیٹ میں اترنا تھا کہ عالم بالا سے تحت الثریٰ تک ہر منظر صاف نظر آنے لگا۔

خضر علیہ السلام نے کچھ دیر اپنے قرب سے فیض یاب کیا اور پھر رخصت ہو گئے۔ اس مرتبہ کوئی تقاضا نہیں ہوا تھا۔ حضرت شیخ عبدالقادر آزاد تھے۔ جس طرف چاہتے چلے جاتے لیکن ایک مسحور کن خوشبو نے پورے جنگل کو اپنے حصار میں لیا ہوا تھا۔ وہ اس خوشبو کو بستر بنا کر وہیں قیام پذیر ہو گئے۔ اک محفل نورانی تھی جو تصور میں ہر طرف آباد تھی۔ خضر علیہ السلام غیر حاضری میں بھی ہر جگہ حاضر تھے۔

تو ہی ہوتا ہے دیر تک موجود
بزم میں تو جہاں سے اٹھتا ہے

حضرت خضر علیہ السلام جو راہ دکھا گئے تھے، اب اس راہ پر چلنے کا وقت آ گیا۔ یہ دکھانے کا وقت آ گیا کہ عروج کی کس منزل پر تمہارا قیام ہے اور ابھی کس منزل تک جانا ہے۔

ایک روز کیفیات کی موسلا دھار بارش ہوئی۔ پورا بدن تھر تھر کانپنے لگا جیسے سردیوں کی بارش میں کوئی کھلی جگہ بیٹھ گیا ہو۔ پھر آپ پر بے ہوشی طاری ہو گئی۔ اس نیم بے ہوشی کے عالم میں آپ کو آپ کے باطن کا مشاہدہ کرایا گیا۔ آپ نے اپنے باطن کو بہت سے علائق سے ملوث پایا۔

ندا آئی۔ "یہ تیرے اختیار اور ارادے ہیں۔ ان سے دامن چھڑا لے تو باطن صاف ہو جائے گا۔"

کپکپی کم ہوتے ہوتے تھم گئی۔ نیم بے ہوشی، بے ہوشی میں بدل گئی۔ چاہا کہ اٹھ کر بیٹھ جائیں۔ پھر دنیائے باطن کا خواب یاد آیا۔ اختیار اور ارادوں سے تو دامن چھڑانا ہے۔ یہ ارادہ بھی کیوں کیا کہ اٹھ کر بیٹھا جائے۔ اپنے ارادے اور اختیارات ترک کر کے خالی برتن کی طرح ہو جانا ہے تاکہ خدا کے ارادے سے چلتا پھرتا دکھائی دوں۔ جب وہ اٹھائے گا تو اسی وقت اٹھوں گا۔ کتنے ہی دن گزر گئے۔ اپنی جگہ سے جنبش تک نہیں کی۔ اختیار میں تھا کہ اٹھ کر بیٹھ جائیں لیکن اختیار کو مفلوج کر دیا۔ ذات کی نفی اسی کو کہتے ہیں۔

غذا کا ایک ذرہ تک پیٹ میں نہیں گیا تھا۔ نقاہت بڑھتی جا رہی تھی۔ ہاتھ ہلانے تک کی جرأت نہیں تھی کہ کہیں حکم عدولی نہ ہو جائے۔ بار بار اٹھنے کا ارادہ کرتے تھے اور توبہ کرتے تھے۔

کئی ہفتوں بعد انہیں یقین ہو گیا کہ اب موت قریب ہے۔ ارادے اور اختیار کی ایسی نفی کی تھی کہ اب انہیں یہ بھی یاد نہیں رہا تھا کہ وہ بھوکے ہیں۔ آنکھیں کھلی تھیں، پورا وجود بے جان تھا۔ غیب سے آواز آئی۔ "عبدالقادر اٹھ اور زندہ رہنے کا سامان کر۔"

جب یہ آواز کئی مرتبہ آپ کی سماعت سے ٹکرائی تو بے اختیار اٹھنے کی کوشش کی لیکن اتنی طاقت کہاں تھی۔ حالت اضطرار میں ایک طرف ہاتھ مارا تو کچھ گھاس ہاتھ میں آ گئی۔ بے ارادہ اس گھاس کو منہ میں رکھ لیا۔ اب انہیں معلوم ہوا کہ ارادے کی نفی کا کیا مطلب ہے۔ یہی کہ جب مالک کھلائے تو کھالو، وہ جتنا اختیار دے بس وہی تمہارا اختیار ہے۔ ایسی طبیعت بنالو کہ اس کا اختیار تمہارا اختیار بن جائے۔

گھاس کی شکل میں یہ جڑی بوٹیاں پیٹ میں اتریں تو کچھ طاقت آئی۔ اچانک دل میں خیال آیا کہ پیر و مرشد شیخ حماد سے ملے کتنے دن ہو گئے۔ شہر جا کر ان سے ملا جائے۔ یہ خیال آتے ہی توبہ کے الفاظ زبان پر آ گئے۔ دنیاوی علائق سے دامن چھڑا کر ہی تو باطن کی صفائی ممکن ہو گی۔ پھر یہ محبت بھی کیوں درمیان میں آئی۔ ترک دنیا یہی تو ہے کہ مالک کی محبت ہر محبت پر غالب آ جائے۔

انہوں نے ایک سال اسی مجاہدے میں گزار دیا۔ اللہ کے سوا کسی کا خیال دل میں پھٹکنے بھی نہ پائے۔ ارادے، منصوبے، خواہشات، رفتہ رفتہ سب سے کنارہ کش ہو گئے۔

ایک روز پھر یہ کیفیت طاری ہوئی۔ اس مرتبہ انہیں ان کے نفس کا مشاہدہ کرایا گیا۔ یہاں بھی کئی امراض دکھائے

گئے۔ آپ نے سال بھر تک ان امراض کے خلاف جنگ کی حتی کہ یہ امراض جڑ سے اکھڑ گئے اور آپ کا نفس تابع الٰہی ہوگیا۔

ایک سال بعد آپ کو توکل کے دروازے پر لایا گیا۔ وہاں بہت بڑا ہجوم دیکھا۔ اولیائے کبار قطار در قطار کھڑے تھے۔ آپ اس ہجوم کو چیر کر نکل گئے پھر شکر کے دروازے پر آئے۔ وہاں بھی یہی حال تھا۔ آپ اس سے بھی گزر گئے۔ پھر غنا اور مشاہدہ کے دروازے پر لایا گیا۔ اندر داخل ہوئے تو وہاں روحانی خزائن کی انتہا نہیں تھی۔ وہاں سے آپ کو حقیقی غنا، عزت اور مسرت میسر ہوئی۔

اب دل میں کسی انسان کی محبت آباد نہیں تھی۔ خلوت ہی خلوت تھی۔ خدا کی محبت کے سوا کچھ نہیں تھا۔ وہ اپنا سب کچھ خدا کی رضا کے لیے نثار کر چکے تھے۔

ہر قسم کے علوم ظاہری و باطنی میں کامل دست گاہ اور کثرت مجاہدات و ریاضات نے آپ کو نہ صرف استقامت کا پہاڑ بنا دیا تھا بلکہ حق و باطل اور نور و ظلمت میں امتیاز کرنے کی تمیز کلی عطا کر دی تھی۔ آپ اس حقیقت سے پوری طرح آگاہ ہوگئے تھے کہ شریعت حقہ میں قیامت تک تغیر و تبدل نہیں ہوسکتا۔ جو احکام شریعت کا مخالف ہو وہ بلاشبہ شیطان ہے۔

علائق دنیوی سے نجات مل گئی تھی۔ اب شہر میں گزر کرنے اور لوگوں کے درمیان رہنے میں کوئی حرج نہیں تھا۔ دشت نوردی کرتے ہوئے 13 سال گزر چکے تھے۔ سینہ معرفت الٰہی سے لبریز تھا۔ آپ جنگل سے نکلے اور شہر کی طرف چل دیے۔ ابھی شہر پہنچے نہیں تھے کہ ویرانے میں ایک برج نظر آیا جو کسی وقت کسی بادشاہ نے بنوایا ہوگا اور اب ویران پڑا تھا۔ آپ کا دل بے اختیار اس کی طرف کھنچتا چلا گیا۔ آپ اس برج میں داخل ہوئے اور منشائے الٰہی سے اسی برج میں قیام کیا۔

ہر تمنا دل سے رخصت ہوگئی
اب تو آجا، اب تو خلوت ہوگئی

کوئی تمنا ساتھ نہیں تھی۔ کوئی ارادہ پاس نہیں تھا۔ برج کا سناٹا تھا اور وہ تھے۔ عشا کے وضو سے نماز پڑھنے کھڑے ہوتے تو صبح ہو جاتی۔ کبھی ایک پاؤں پر کھڑے ہو جاتے اور قرآن شریف پڑھتے پڑھتے صبح کر دیتے۔ اگر بہ تقاضائے بشری سونا ناگزیر ہوتا تو اول شب کسی قدر سو رہتے۔ پھر جلد ہی اٹھ کر عبادت الٰہی میں مشغول ہو جاتے۔ کئی کئی دن بعد جب بھوک بہت ستاتی تو شہر کی طرف نکل جاتے۔ کوئی مباح چیز مل جاتی تو کھا لیتے ورنہ درخت کے پتوں، جنگلی بوٹیوں پر گزارہ فرماتے۔ کوئی ملنے آتا تو مل لیتے ورنہ کسی سے ملنے کی آرزو بھی نہیں تھی۔

اسی عالم میں گیارہ سال گزر گئے۔ پچیس سال کی بے مثال ریاضت کے بعد جب آپ کو پورا تزکیۂ نفس حاصل ہوگیا تو قدرت کو منظور ہوا کہ اب آپ کا ہاتھ کسی پیر طریقت کے ہاتھ میں دے دیا جائے چنانچہ قدرت نے اس کے اسباب مہیا کرنے شروع کر دیے۔

ایک مرتبہ آپ نے اللہ سے عہد کیا کہ میں اس وقت تک کھانا نہیں کھاؤں گا جب تک مجھے کوئی منہ میں لقمہ دے کر نہیں کھلائے گا اور اس وقت تک پانی نہیں پیوں گا جب تک مجھے پانی نہیں پلایا جائے گا۔

یہ بڑا صبر آزما عہد تھا لیکن آپ کو اپنے اللہ پر پورا بھروسا تھا کہ وہ آپ کی لاج رکھے گا۔ آپ نے کھانا پینا چھوڑ دیا۔ کس کو ہوش تھا کہ دن گنتا۔ نہ جانے کتنے دن گزر گئے۔ پھر ایک دن ایک شخص آیا۔ ایک برتن میں روٹی اور سالن آپ کے سامنے رکھ کر چلا گیا۔ کئی دن کی بھوک تھی، کھانے کو دیکھتے ہی چمک اٹھی۔ بے اختیار کھانے کی طرف ہاتھ بڑھا لیکن پھر اپنا عہد یاد آیا۔ عہد تو یہ تھا کہ جب تک کوئی اپنے ہاتھ سے لقمہ دے کر نہیں کھلائے گا، نہیں کھاؤں گا۔ آپ نے ہاتھ کھینچ لیا۔ خدا کی قسم میں اپنا عہد نہیں توڑوں گا۔ جب تک کھانا مجھے کھلایا نہیں جائے گا، نہیں کھاؤں گا۔

کھانے سے ہاتھ کھینچتے ہی آپ نے اپنے اندر ایک شور سنا جس سے ہائے بھوک، ہائے بھوک کی آواز سنائی دیتی تھی۔ یہ آپ کا نفس تھا جو شور مچا رہا تھا۔ سماعت اتنی تیز ہوگئی تھی کہ اس آواز کو صاف سن رہے تھے۔

قاضی ابوسعید مبارک مخزمی ولی کامل تھے۔ انہوں نے حالت کشف میں اس شور کو سنا۔ منکشف ہوا کہ عبدالقادر بھوک کی شدت سے بے تاب ہیں۔ آپ اسی وقت اٹھے اور برج تک پہنچ گئے۔ آوازیں اب اور زیادہ صاف سنائی دے رہی تھیں۔ ہر طرف ہائے بھوک، ہائے بھوک کی واویلا مچی ہوئی تھی۔

''اے عبدالقادر، یہ شور کیسا ہے؟'' حضرت ابوسعید مخزمی نے آپ کے قریب جا کر دریافت کیا۔

''یہ خواہش نفس کا اضطراب ہے ورنہ روح تو مطمئن

ہے اور یادالٰہی میں مشغول ہے۔"

"باب ازج تک آؤ۔ وہاں میرا گھر ہے۔" حضرت ابوسعید نے فرمایا اور اٹھ کر چلے گئے۔

ان کے جانے کے بعد آپ نے اپنے دل میں کہا' یوں تو یہاں سے اٹھ کر کہیں نہیں جانے کا۔ ابھی آپ یہ سوچ ہی رہے تھے کہ اس برج میں حضرت خضر علیہ السلام کا نزول ہوا۔

"خدمت کر۔ اٹھ اور ابوسعید کے گھر جا' اپنا ہاتھ ان کے ہاتھ میں دے۔"

اتنی بڑی سفارش کے بعد کیا مجال تھی کہ نہ جاتے' آپ نے برج سے باہر قدم نکالا اور باب ازج کو رونق بخش دی۔ دیکھا کہ حضرت ابوسعید اپنے گھر کے سامنے ٹہل ٹہل کر آپ کا انتظار فرما رہے ہیں۔

"عبدالقادر' کیا میرا کہنا کافی نہیں تھا جو خضر علیہ السلام کے کہنے کی ضرورت پڑی؟"

"جو انہوں نے کہا وہ آپ نے کب کہا تھا؟"

"انہوں نے کیا کہہ دیا؟"

"اگر صرف روٹی کے لیے آتا تو اپنے نفس کی پیروی کرتا۔ انہوں نے تو یہ کہا کہ میں اپنا ہاتھ آپ کے ہاتھ میں دے دوں۔"

"یوں ہے تو چلو یونہی سہی' آؤ گھر کے اندر تو آؤ۔"

ایسا مرید تو مرادوں کے بعد بھی نہیں ملتا۔ حضرت ابوسعید اپنی قسمت پہ جتنا ناز کرتے کم تھا۔ گھر کے اندر پہنچتے ہی انہوں نے آپ کو نہایت احترام سے بٹھایا۔ آپ نے حضرت ابوسعید کے دست حق پرست پر بیعت کی۔ پھر حضرت ابوسعید نے کھانا منگوایا اور اپنے ہاتھ سے لقمہ توڑ کر آپ کے منہ میں رکھا۔ اس طرح برابر اپنے ہاتھ سے کھانا کھلاتے رہے۔ ہر لقمے کے ساتھ آپ کا سینہ نور معرفت سے بھرتا جاتا تھا۔

جب آپ شکم سیر ہو کر کھانا تناول فرما چکے تو چند مہمانوں کی موجودگی میں حضرت ابوسعید نے آپ کو خرقۂ ولایت پہنایا۔

"اے عبدالقادر! یہ خرقہ جناب سرور کائنات رسول مقبول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے حضرت علیؓ کو عطا فرمایا۔ انہوں نے خواجہ حسن بصریؒ کو عطا کیا اور ان سے دست بدست مجھ تک پہنچا اور اب تمہیں عطا ہوتا ہے۔"

اس خرقے کو پہنتے ہی آپ کو اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کرنے کی جلدی ہوئی۔ آپ نے پیر طریقت سے اجازت طلب کی اور برابر کے کمرے میں نوافل ادا کرنے چلے گئے۔

"اس جوان کے قدم ایک دن تمام اولیا اللہ کی گردن پر ہوں گے اور اس کے زمانے کے تمام اولیا اس کے آگے انکساری کریں گے۔" حضرت ابوسعید نے مہمانوں سے مخاطب ہو کر کہا۔

☆☆☆

حضرت عبدالقادر جیلانی کی ہمیشہ یہ آرزو ہوتی تھی کہ ہمیشہ خلوت گزیں رہیں۔ دشت و بیاباں مسکن ہو۔ نہ مخلوق انہیں دیکھے نہ وہ اس کو دیکھیں لیکن اللہ تعالیٰ کو کچھ اور ہی منظور تھا۔

آپ بیعت کے بعد کسی ویرانے کو آباد کرنے کے بارے میں سوچ ہی رہے تھے کہ 16 شوال 521ھ سہ شنبہ کے دن دوپہر کے وقت آرام کی غرض سے لیٹے ہی تھے کہ آپ کے خواب میں سرورِ کونینؐ تشریف لائے اور فرمایا۔ "اے عبدالقادر! تم لوگوں کو گمراہی سے بچانے کے لیے وعظ و نصیحت کیوں نہیں کرتے۔"

"یارسول اللہ میں ایک عجمی ہوں۔ عرب کے فصحا کے سامنے کیسے بولوں۔"

"اپنا منہ کھولو۔" حضورؐ نے فرمایا۔

آپ نے حضورؐ کے ارشاد کی تعمیل کی۔ سرور کائناتؐ نے اپنا لعاب دہن سات بار آپ کے منہ میں ڈالا اور پھر حکم دیا۔ "جاؤ' قوم کو وعظ و نصیحت کرو اور ان کو اللہ کے راستے کی طرف بلاؤ۔"

آنکھ کھلی تو خواب تازہ تھا۔ حکم مل چکا تھا۔ سرتابی کی ہمت نہیں تھی لیکن ہنوز پریشان تھے۔ اس وادی میں قدم رکھنے کا حکم ہوا تھا جس کی سیر کی ابھی تک توفیق نہیں ہوئی تھی۔ اجنبی راستے اجنبی منزلیں۔ یہ سفر کیسے طے ہوگا؟ لوگ تو مجھے عبدالقادر دیوانہ کے طور پر قبول کر چکے ہیں' وہ میرے اس نئے انداز کو پسند کریں گے یا نہیں۔ انہوں نے یہ غور اپنے عہد کا جائزہ لیا۔ سیاسی ابتری میں کچھ کمی آ گئی تھی لیکن عام لوگوں کا اخلاقی انحطاط انتہا کو پہنچ چکا تھا۔ اس موقع پر مجالس ارشاد و ہدایت کی سخت ضرورت تھی۔ اس سے بڑا جہاد اور کوئی نہیں تھا کہ اسلام کی حقانیت کو ثابت کیا جائے۔ آپ کے اندر سے آواز آئی۔ اے عبدالقادر! تو نے جو علوم حاصل کیے ہیں' ان سے اگر خلقِ خدا کو فائدہ نہ پہنچا تو پھر اس سے کیا

حاصل۔ تیرے مجاہدات صرف تیرے لیے ہیں لیکن علم تو سب کے لیے ہے۔ اسے حق داروں میں تقسیم کردے۔ لوگوں کو راہ راست پر لا۔ مکروفریب کے پردے چاک کر۔ نام نہاد واعظین کے ہونٹوں پر تالے ڈال دے۔ اسی آواز کو سنتے ہی آپ ایک عزم کے ساتھ شیخ طریقت حضرت ابوسعید کی خدمت اقدس میں حاضر ہوئے اور خواب کا تمام ماجرا کہہ سنایا۔

''دیر کس بات کی ہے۔ میرا مدرسہ حاضر ہے۔ اہلِ بغداد کو مخاطب کرو انہیں حق کی طرف بلاؤ۔''

یہ اذن ملتے ہی آپ نے ظہر کی نماز ادا کی۔ مسجد مدرسے سے ملحق ہی تھی۔ وعظ کا اعلان کردیا گیا۔ آپ مسجد سے اٹھے اور مدرسے کے منبر پر بیٹھ گئے۔ نمازیوں میں سے کچھ لوگ آپ کے گرد جمع ہوگئے۔ لوگ زیادہ نہیں تھے لیکن آپ پہلی مرتبہ اتنے لوگوں سے مخاطب ہورہے تھے۔ لہٰذا جھجک رہے تھے۔ یکایک کشف کی حالت طاری ہوئی۔ آپ نے دیکھا' حضرت علیؓ آپ کے سامنے کھڑے ہیں۔

''وعظ شروع کیوں نہیں کرتے ؟''

''ابا جان! میں گھبرا گیا ہوں۔''

''اپنا منہ کھولو۔'' حضرت علیؓ نے فرمایا۔

آپ نے تعمیل کی تو حضرت علیؓ نے اپنا لعاب دہن چھ بار آپ کے منہ میں ڈالا اور فرمایا۔ ''اب وعظ شروع کرو۔''

''یا حضرت! آپ نے سات مرتبہ اپنے لعاب دہن سے مجھے کیوں نہیں مشرف فرمایا؟''

''یہ ہادی اکرم کا پاسِ ادب ہے۔'' حضرت علیؓ نے فرمایا اور کشف کی حالت ختم ہوگئی۔

مجمع دم بخود آپ کی کیفیات ملاحظہ کررہا تھا اور مشتاق بھی تھا کہ وعظ شروع ہو۔ حضرت عبدالقادر جیلانی نے کشف کی حالت گزرنے کے بعد قریب بیٹھے ہوئے لوگوں پر ایک نظر ڈالی۔ اس نظر میں کچھ ایسی بات تھی کہ لوگوں پر آپ کی ہیبت طاری ہوگئی۔ سراپا جمال عبدالقادر جیلانی منبر پر رونق افروز تھے اور حاضرین کی آنکھیں جھکی ہوئی تھیں۔ انہوں نے اس سے پہلے سیکڑوں مرتبہ آپ کو دیکھا تھا لیکن آج ان کے چہرے سے حسن و جمال کی جو شعاعیں پھوٹ رہی تھیں' ان سے پورا مدرسہ روشن ہوگیا تھا۔ آپ نے خطبہ پڑھا اور اس کے بعد اپنے موضوع کی طرف آئے' لوگوں کو مخاطب کیا۔

''لوگو! اسلام رو رہا ہے اور فاسقوں' بدعتیوں' گمراہوں' مکر کے کپڑے پہننے والوں اور ایسی باتوں کا دعویٰ کرنے والوں کے ظلم سے جو ان میں نہیں ہیں' اپنے سر کو تھامے ہوئے فریاد مچا رہا ہے۔ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے دین کی دیواریں پے بہ پے گر رہی ہیں اور اس کی بنیاد گری جارہی ہے۔

اے باشندگان زمین' آؤ اور جو گر گیا ہے اس کو مضبوط کردیں اور جو ڈھے گیا ہے اس کو درست کردیں۔ یہ چیز ایک سے پوری نہیں ہوتی۔ اے سورج' اے چاند! اور اے دن' تم سب آؤ۔''

آپ کی آواز گونج رہی تھی۔ کثرت عبادت سے بدن نحیف تھا لیکن آواز ایسی کڑک دار کہ مدرسے کے باہر تک پہنچ رہی تھی۔ جو باتیں آپ فرما رہے تھے' بر سر عام کسی نے نہیں کہی تھیں۔ لوگ سانسیں روکے سن رہے تھے' آپ فرما رہے تھے۔

''اے اہلِ بغداد' تمہارے اندر نفاق بڑھ گیا ہے اور اخلاص کم ہوگیا ہے۔ باتیں زیادہ ہیں اور کام کچھ بھی نہیں۔ جان لو کہ عمل کے بغیر قول کسی کام کا نہیں بلکہ وہ تمہارے خلاف حجت ہے۔ قول بلا عمل ایسا خزانہ ہے جو خرچ نہیں کیا جاتا۔ وہ محض دعویٰ ہے' گواہ اور دلیل کے بغیر۔ وہ ایک ڈھانچا ہے روح کے بغیر۔ روح تو توحید و اخلاص اور کتاب و سنت پر عمل کرنے سے آتی ہے۔ تمہارے اعمال بے روح ہوچکے ہیں۔ غفلت چھوڑ دو اور آؤ خدا کی طرف پلٹو۔''

آپ کی زبان عربی نہیں تھی۔ آپ تو بلاد فارس کے رہنے والے تھے لیکن اس وقت آپ جس فصیح و بلیغ عربی میں تقریر فرما رہے تھے' ایسی تھی کہ فصحائے عرب نثار ہوں۔ سامعین حیرت سے آپ کا لب و لہجہ دیکھ رہے تھے۔ تنقید کی میزان پر پرکھ رہے تھے۔ ایسی پُراثر اور دل نشین تقریر انہوں نے پہلے نہیں سنی ہوگی۔ وعظ کے اختتام تک مجمع میں کھلبلی مچ گئی۔ ہر زبان پر احسنت و مرحبا کے الفاظ تھے۔ ایک مسیحا تھا جو مردہ جانوں میں روح پھونک رہا تھا۔

وعظ ختم ہوا اور لوگ مدرسے سے باہر آئے تو ہر زبان پر آپ کی تقریر کا چرچا تھا۔ ہر آدمی دوسرے سے ذکر کررہا تھا۔ جو نہیں گئے تھے' انہیں اپنی غیر حاضری پر افسوس ہورہا تھا۔ ہر زبان پر ایک ہی سوال تھا۔ اب دوسرا وعظ کب ہوگا؟

جمعۃ المبارک کی شام کو آپ پھر مسند ہدایت پر رونق افروز ہوئے۔ اس مرتبہ آپ کو سننے کے لیے پورا شہر امڈ آیا

تھا۔ ہر شخص آگے بیٹھنے کے لیے بے تاب تھا لیکن مجال نہیں تھی کہ کوئی آواز بلند ہوتی۔ آپ کا رعب مدرسے کی دیواروں پر پہرہ دے رہا تھا۔

آپ نے خطبہ دینا شروع کیا تو مدرسہ کسی ویرانے میں بدل گیا۔ یہ معلوم ہوتا تھا جیسے یہاں کوئی موجود نہیں۔ آپ کی آواز گونج رہی تھی جیسے ویرانوں میں ہوا درختوں سے الجھتی ہے۔

''میں اس طریقے کو قائم کرنے کی کوشش کررہا ہوں جس پر جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم' آپ کے صحابہؓ اور تابعینؒ رہے ہیں۔ اس دور میں لوگ دولت کے پجاری بن گئے ہیں۔ وہ موسیٰ علیہ السلام کی قوم کی طرح بن گئے ہیں کہ ان کے دلوں میں بچھڑے کی محبت رچ گئی تھی اور اس زمانے کا بچھڑا درہم و دینار بن گئے ہیں۔ تجھ پر افسوس ہے کہ تو اسی دنیا کے بادشاہ سے جاہ و مال کا طالب بنا ہوا ہے حالانکہ عنقریب وہ معزول ہوجائے گا یا مرجائے گا۔ اس کا مال' ملک و جاہ سب جاتا رہے گا اور ایک ایسی قبر میں جا بسے گا جو تاریکی' تنہائی اور کیڑے مکوڑوں کا گھر ہے۔ فانی بادشاہ پر مت بھروسا کرو ورنہ توقع نامراد رہے گی اور مدد منقطع ہوجائے گی۔ بھروسے کے لائق تو صرف ذات الٰہی ہے جو کائنات کی خالق ہے اور جس کو فنا نہیں۔''

اس وعظ کا ایسا اثر ہوا کہ بہتوں نے جوش میں آکر اپنے کپڑے پھاڑ ڈالے۔ بعض بے ہوش ہوگئے۔ ہر آنکھ اشکبار تھی۔ ہر طرف آہیں تھیں' سسکیاں تھیں۔ وجہ یہی تھی کہ کہنے والا بے عمل نہیں تھا۔ جن باتوں کی طرف توجہ دلا رہا تھا' خود اس میں ملوث نہیں تھا۔

اس مجلس کی ایسی شہرت ہوئی کہ اگلے وعظ میں خلیفہ کے محلات کا ناظم عزیزالدین بھی حاضر ہوا۔ نہایت بااثر امیر تھا لہٰذا تزک و احتشام کے ساتھ آیا تھا۔

آپ کی نظر جیسے ہی اس پر پڑی اور آپ کے باطن کے آئینے نے اس کے تکبر کو آپ پر ظاہر کیا' آپ نے فوراً اپنی تقریر کا موضوع بدل دیا اور اسے مخاطب کرکے فرمایا۔

''تم سب کی یہ حالت ہے کہ ایک انسان دوسرے انسان کی بندگی کرتا ہے۔ اللہ کی بندگی کون کرتا ہے؟'' اس کے بعد گرج دار آواز میں کہا۔

''کھڑا ہو۔ اپنا ہاتھ میرے ہاتھ پر رکھ دے تاکہ اس فانی گھر یعنی دنیا سے بھاگ کر رب العالمین کی طرف لپکیں اور اس کی رسی کو تھام لیں۔ عنقریب تجھ کو خدا کی طرف لوٹنا ہوگا اور وہ تیرے اعمال کا محاسبہ کرے گا۔'' پوری مجلس وعظ سناٹے میں آگئی۔ ناظم عزیزالدین سے کوئی اس طرح بھی مخاطب ہوسکتا ہے؟ وہ تو اگر کسی مجلس میں جاتے تھے تو امیر مجلس منبر سے اتر کر ان کا استقبال کرتا تھا۔ ان کے لیے اگلی نشست میں جگہ بنائی جاتی تھی۔ یہاں وہ عام لوگوں میں بیٹھے تھے۔ ان کے استقبال کے لیے منبر سے کوئی بھی نہیں اترا تھا اور پھر جس بے باکی سے آپ نے اسے مخاطب کیا تھا' یہ بالکل نئی بات تھی۔

مجلس ختم ہوئی تو ہر زبان پر یہی چرچا تھا۔ واعظین میں کھلبلی مچ گئی کہ کہیں ایسی مجالس پر پابندی ہی نہ لگ جائے لیکن اب کچھ بھی نہیں ہوا۔ ہفتے میں تین دن آپ کی مجالس اسی طرح منعقد ہوتی رہیں۔

کچھ دن نہیں گزرے تھے کہ آپ کی مجالس نے سب کے چراغ گل کردیے۔ وعظ و ہدایت کا یہ سلسلہ ابتدا میں مدرسے کی چاردیواری میں شروع کیا گیا تھا لیکن لوگ اس کثرت سے آنے لگے کہ یہ جگہ تنگ ہوگئی۔ مدرسے سے باہر شارع عام پر بھی بھیڑ لگنے لگی۔

یہ صورت حال دیکھ کر قرب و جوار کے مکانات شامل کرکے مدرسے کو وسیع کردیا گیا لیکن یہ کشادگی بھی لوگوں کے بے پناہ ہجوم کے سامنے تنگ تھی۔ اس کا حل یہی نکالا جاسکتا تھا کہ آپ کا منبر شہر سے باہر عیدگاہ کے وسیع میدان میں رکھا جانے لگا۔

اطراف و اکناف کے لوگ آپ کے مواعظ حسنہ پر ٹوٹ پڑے۔ آپ کی شہرت چند دنوں میں سارے عراق' شام' عرب اور عجم میں پھیل گئی۔ ہدایت کے قافلے عراق کا رخ کرنے لگے۔ حاضرین مجلس کی تعداد بسا اوقات ستر ہزار بلکہ اس سے بھی بڑھ جاتی تھی۔ ٹھاٹھیں مارتا ہوا ہدایت کا یہ سیلاب سب کو سیراب کررہا تھا۔ عیسائی' یہودی اور دیگر غیر مذاہب کے لوگ آپ کی مجلس میں حاضر ہوئے۔ پتھر بن کر آتے' موم بن کر پگھل جاتے۔ اپنے مذہب کو خیرباد کہتے اور دین اسلام اختیار کرتے۔ ان مسلمانوں کی تعداد کا کوئی اندازہ ہی نہیں تھا جو فسق و فجور میں مبتلا تھے اور آپ کے ہاتھ پر توبہ کرکے کامل مسلمان بن گئے۔

آپ کی اس گرم بازاری نے آپ کے بہت سے حاسد پیدا کردیے۔ علما کا ایک بڑا گروہ آپ کی مخالفت پر کمربستہ ہوگیا لیکن آپ کے عاشقوں کی بھیڑ میں کوئی پتھر آپ تک نہیں پہنچ سکتا تھا۔ کوئی آپ کے خلاف ایک لفظ

سننے کو تیار نہیں تھا۔ باوجود علم و فضل کی فراوانی کے آپ کی عاجزی و انکسار ایسا تھا کہ آپ لوگوں کے دلوں میں آباد تھے۔

بغداد علم و حکمت کے اعتبار سے تمام دنیائے اسلام کا مرکز تھا۔ بے شمار علما و واعظین مصروف عمل تھے۔ سیدنا غوث اعظم کے حسنِ کلام کے سامنے سب کی مجلسیں پھیکی پڑ گئیں۔ ان علما و فقہا نے آپ کو نیچا دکھانے کی ترکیبیں سوچنی شروع کردیں۔ آپ کے علم و فضل سے واقف ہونے کے باوجود آپ کو لاجواب کرنے کی ایک ترکیب سوچ ہی لی۔ ان سب نے باہم فیصلہ کیا کہ ہم سب ایک ایک دقیق مسئلہ سوچ کر ایسے وقت شیخ عبدالقادر جیلانی کے پاس جائیں جب آپ وعظ میں مصروف ہوں اور خلقت کا ہجوم ہو۔ اس وقت باری باری تابڑتوڑ مسائل پوچھے جائیں' مصروفیت کے باعث اگر وہ کسی مسئلے کا جواب دینے سے قاصر رہیں گے تو لوگوں کی عقیدت خود بخود ختم ہوجائے گی۔

اس ترکیب پر عمل کرتے ہوئے تقریباً ایک سو علما کامرانی کی امید سے سرشار اس وقت آپ کی مجلس میں پہنچے جب آپ کسی موضوع پر تقریر کررہے تھے۔ علمائے عراق تھے لہٰذا لوگوں نے جگہ بنائی اور یہ سب منبر کے قریب بیٹھ گئے۔ حضرت غوث اعظم چند لمحے اپنے موضوع کا حق ادا کرتے رہے اور پھر تقریر روک دی۔

ابھی کسی نے سوال نہیں کیا تھا کہ آپ باری باری ہر ایک کی طرف متوجہ ہوئے اور فرمایا۔ تمہارا یہ سوال ہے اور اس کا یہ جواب ہے۔ غرض اسی طرح آپ نے ہر ایک کے سوال کی تفصیل بتا کر اس کا ایسا شافی جواب دیا کہ سب کی زبانیں بند ہوگئیں۔ تمام علما فرطِ حیرت سے آپ کا منہ تک رہے تھے۔ سب سے زیادہ حیرت اس بات کی تھی کہ آپ نے دلوں کا حال جان لیا تھا۔ مجلس میں کہرام مچ گیا۔ بکا کا اس قدر شور ہوا جیسے زلزلہ آگیا ہو۔

اب آپ کے علم و فضل کے ساتھ ساتھ آپ کی اس کرامت کا بھی تذکرہ ہونے لگا۔ آپ نے بھی مخالفین کا زور توڑنے کے لیے کرامات سے لوگوں کو اپنا عقیدت مند بنانا شروع کردیا۔ ان کرامات کا مقصد اظہارِ نمائش نہیں تھا بلکہ اللہ کے ولی کی شان دکھانا مقصود تھا۔

ایک دن آپ وعظ فرما رہے تھے۔ سامعین ہزاروں کی تعداد میں جمع تھے۔ یکایک سیاہ بادل گھر آئے اور دیکھتے ہی دیکھتے موسلا دھار بارش شروع ہوگئی۔ لوگ بارش سے بچنے کے لیے منتشر ہونے لگے۔

آپ نے آسمان کی طرف نظر کی اور فرمایا۔ ''مولائے کریم! میں تیرے بندوں کو جمع کرتا ہوں اور تو ان کو منتشر کرتا ہے۔''

آپ کا یہ کہنا تھا کہ قدرت خداوندی سے بارش یکایک تھم گئی اور لوگ پھر جم کر بیٹھ گئے۔ دیکھنے والوں نے دیکھا' جہاں تک سامعین موجود ہیں بارش کا ایک قطرہ بھی نہیں گر رہا ہے' باقی جگہ بدستور بارش ہورہی ہے۔

لوگوں نے یہ کھلی کرامت دیکھی تو پکار اٹھے۔'' بے شک! آپ ولیِ دوراں ہیں۔ اب تو کوئی نہ کوئی کرامت روز دیکھنے کو مل رہی تھی۔ لوگ پروانوں کی طرح آپ کے گرد جمع رہنے لگے۔ اپنی مرادیں لے کر آتے اور دعا کے طالب ہوتے۔ آپ سامنے نہ بھی ہوتے تو آپ کے نام کی دہائی دی جاتی اور لوگوں کے مقاصد پورے ہوجاتے۔

ایک دن آپ وعظ میں مصروف تھے کہ آپ کا چہرۂ مبارک سرخ ہوگیا اور آپ نے اپنا ہاتھ چادر کے اندر کرلیا۔ کچھ دیر بعد جب باہر نکالا تو آستین سے پانی ٹپک رہا تھا۔ کسی نے کچھ خیال بھی نہیں کیا۔ اس بدلی ہوئی کیفیت کے بارے میں کسی کے دل میں کوئی خیال آیا بھی تو پوچھنے کی ہمت نہ ہوئی۔

اس واقعے کے تقریباً دو ماہ بعد آپ اپنے حلقۂ احباب میں بیٹھے تھے کہ کچھ سوداگر بغداد پہنچے اور بہت سے تحائف لے کر حضرت کی خدمت میں حاضر ہوئے۔

ان سوداگروں نے بتایا۔ ''ہم پُرسکون سمندر میں سفر کررہے تھے کہ یکایک تیز و تند ہوا چلنے لگی اور سمندر میں ایک ہولناک تلاطم پیدا ہوا۔ ہمارا جہاز گرداب میں پھنس کر ڈوبنے کے قریب تھا کہ بے اختیار ہماری زبان سے یا شیخ عبدالقادر جیلانی نکلا۔ ہم نے دیکھا کہ ایک ہاتھ غیب سے برآمد ہوا اور جہاز کو کھینچ کر کنارے پر لے آیا۔''

اس واقعے کی تاریخ پوچھی گئی تو وہی تھی جس تاریخ کو آپ نے بھیگی ہوئی آستین اپنی چادر سے نکالی تھی اور رعب کی وجہ سے لوگ کچھ پوچھ نہیں سکے تھے۔

یہ باتیں بظاہر عقل سے بعید معلوم ہوتی تھیں لیکن جب لوگ آپ کے معمولات پر غور کرتے تھے تو یہ باتیں ناممکن نہیں تھیں۔ مجاہدات و ریاضات کے بعد جب آپ نے احیائے دین کی جدوجہد کا آغاز فرمایا تو اس وقت بھی عبادت کے ذوق و شوق میں مطلق فرق نہ آیا۔ ہمیشہ باوضو

رہتے۔ راتیں مراقبہ، مشاہدہ اور یادالٰہی میں گزرتیں۔ نیند کوسوں دور رہتی۔ روزے کثرت سے رکھتے۔ بعض دفعہ کئی کئی دن مسلسل ایک ہی روزہ رکھتے۔ جب عالم یہ ہو تو دعا میں اثر کیوں نہ ہو۔ زبان میں تاثیر کیسے نہ ہو۔

آپ کی کرامات کا شہرہ ہوا تو بعض لوگوں نے اسے بھی مبالغے سے تعبیر کیا۔ ایک صاحب عبدالصمد بن ہمام تھے۔ وہ آپ کی کرامات کے منکر تھے۔ ایک دفع جمعے کے دن وہ آپ کے مدرسے کے قریب سے گزرے۔ پیشاب کی حاجت ہو رہی تھی لیکن نماز کا وقت قریب تھا۔ انہوں نے سوچا پہلے نماز ادا کرلوں پھر رفع حاجت کے لیے چلا جاؤں گا۔

وہ مدرسے میں داخل ہوئے اور منبر کے قریب بیٹھ گئے۔ جوں جوں نماز کا وقت قریب آتا گیا لوگوں کا ہجوم بڑھتا گیا۔ یہاں تک کہ تل دھرنے کی جگہ نہ رہی۔ ادھر ان صاحب کو اس شدت سے پیشاب کی حاجت ہوئی کہ برداشت کی طاقت نہ رہی۔ اٹھنے کی کوشش کی تو باہر جانے کے لیے راستہ نہ تھا۔ عین اس وقت کہ آپ کے کپڑے ناپاک ہونے کو تھے۔ سیدنا غوث اعظم اپنے منبر سے اتر کر آپ کے قریب آئے اور اپنی آستین مبارک سے ان کے سر پر سایہ کرلیا جیسے کوئی کسی کو چھپاتا ہے۔ عبدالصمد بن ہمام نے اپنے آپ کو ایک باغ میں پایا جہاں دور دور تک کوئی نہیں تھا۔ قریب ہی پانی بہہ رہا تھا۔ وہ وہاں رفع حاجت سے فارغ ہوئے۔ طہارت کر کے وضو کیا اور دو رکعت نماز ادا کی۔ اس وقت آپ نے اپنی آستین ان کے سر سے ہٹالی اور یہ دیکھ کر ان صاحب کی عقل چکرا گئی کہ وہ کسی باغ میں نہیں، ہجوم خلائق کے درمیان اسی جگہ بیٹھے ہیں جہاں آکر بیٹھے تھے۔ سوچنے کا وقت نہیں تھا اور جماعت کھڑی ہوگئی۔

جب نماز ہو چکی اور وہ اٹھنے لگے تو اپنا رومال جس میں گھر کے تالوں کی کنجیاں بندھی ہوئی تھیں، غائب تھا۔ بہت تلاش کیں لیکن کہیں نہ پایا۔ مایوس ہوکر گھر واپس آگئے اور گھر کے تالے توڑ کر گھر میں جانا پڑا۔

وہ کئی دن تک سوچتے رہے کہ یہ محض اتفاق ہے یا عبدالقادر کا تصرف۔ اتفاق تو ہو ہی نہیں سکتا۔ وہ بالآخر ان کی کرامت کے قائل ہوگئے لیکن کسی سے ذکر کرتے ہوئے حسد مانع تھا۔

پندرہ بیس روز بعد وہ کسی سفر پر گئے۔ راستے میں ایک مقام سے گزرے تو انہیں یوں لگا جیسے وہ اس مقام پر پہلے بھی آئے ہیں۔ یاد کیا تو یاد آیا کہ جب حضرت عبدالقادر نے ان کے سر پر اپنی آستین کا سایہ کیا تھا تو انہوں نے اپنے آپ کو اسی باغیچے میں موجود پایا تھا۔ وہ یہاں رک گئے۔ باغ کے اندر گئے تو وہ نہر بھی دیکھی جس کے کنارے بیٹھ کر انہوں نے وضو کیا تھا۔ قریب ہی وہ رومال پڑا تھا جس میں ان کی چابیاں بندھی ہوئی تھیں اور جنہیں ڈھونڈ ڈھونڈ کر تھک چکے تھے۔ انہوں نے رومال اٹھالیا۔ اب جو شہر میں آئے تو ان کی زبان پر حضرت عبدالقادر کی عظمت اور بزرگی کے سوا کچھ نہیں تھا۔

سب جانتے تھے کہ عبدالصمد بن ہمام، حضرت عبدالقادر کی کرامتوں کے قائل نہیں ہیں۔ اب جو انہیں طرف دار دیکھا تو اسے بھی آپ کی ایک کرامت ہی سمجھا کہ مخالفوں کی زبان پر بھی آپ کی تعریف آگئی۔

آپ نے ابھی تک شادی نہیں فرمائی تھی۔ آپ کے مشاغل ہی ایسے تھے کہ عائلی زندگی کا بار نہیں اٹھا سکتے تھے۔ حصول تعلیم کے بعد زندگی کے پچیس سال جنگلوں اور بیابانوں میں گزر گئے۔ مجاہدات و ریاضات میں اپنا ہوش ہی نہیں تھا۔ اس کڑے امتحان میں کامیابی کے بعد احیائے دین کی جدوجہد میں مشغول ہوگئے۔ مخالفوں کو ایک موضوع یہ بھی ہاتھ لگ گیا کہ آپ نے ابھی تک اس سنت رسول کو پورا نہیں کیا جبکہ آپ کی عمر پچاس سال سے اوپر ہوگئی ہے۔ آپ ان اعتراضات کو مسکرا مسکرا کر سنتے رہے اور انتظار کرتے رہے کہ دیکھو پردۂ غیب سے کیا ظہور میں آتا ہے۔ آپ نے اپنا ارادہ اور اختیار اللہ تعالیٰ کو سونپ دیا تھا۔ جب اللہ تعالیٰ چاہے گا میں شادی کرلوں گا۔

وہی ہوا بھی۔ ہر کام کا ایک وقت متعین ہوتا ہے۔ جب وقت آیا تو اللہ تعالیٰ نے ایک نہیں وقفے وقفے سے چار بیویاں عطا کیں اور آپ کو کثرت اولاد سے فیض یاب کیا۔ یعنی بیس لڑکے اور انتیس لڑکیاں۔

شادی کے بعد آپ میں ایک تبدیلی یہ آئی کہ آپ نہایت عمدہ پوشاک زیب تن فرمانے لگے۔ اس کا کپڑا نہایت قیمتی ہوتا۔ کپڑے کے تاجر دور دراز سے آپ کے لیے گراں بہا کپڑے اور ملبوسات لاتے تھے۔

ایک زمانہ وہ تھا کہ صوف کا معمولی جبہ زیب تن فرماتے تھے، اب جو مخالفوں نے دیکھا کہ قیمتی پوشاک بدن پر رہنے لگی ہے۔ ہر جمعے کوئی پاپوش پہنتے ہیں۔ قیمتی سے قیمتی پوشاک ایک دن سے زیادہ نہیں پہنتے تو مخالفت کا ایک اور

پہلو نکل آیا کہ عبدالقادر دنیادار ہو گئے ہیں لیکن یہ بحث بھی زیادہ دن نہ چل سکی۔ جلد ہی یہ راز کھل گیا کہ یہ بھی ایک انداز فقر ہے۔ مساکین کی امداد کا ایک بہانہ ہے۔ قیمتی پوشاک ایک دن پہننے کے بعد دوسرے دن کسی محتاج کو عطا کر دیتے۔ وہ غریب آدمی اسے فروخت کر کے اپنی ضرورت پوری کر لیتا۔ یہ لباس چونکہ آپ کی اترن ہوتا تھا اس لیے آپ کے عقیدت مند مہنگے داموں خرید لیتے تھے اور غریب آدمی کا بھلا ہو جاتا تھا۔

غریبوں اور ناداروں کا خیال آپ کو ہر حال میں رہتا تھا اور آپ ان کی مدد کے بہانے ڈھونڈا کرتے تھے چنانچہ ایک مرتبہ آپ حج بیت اللہ کے لیے تشریف لے جا رہے تھے۔ راستے میں آپ نے ایک قصبے میں قیام فرمایا۔ وہاں کے ایک شخص سے دریافت کیا کہ اس قصبے میں کون شخص سب سے زیادہ نادار اور محتاج ہے۔ لوگوں نے ایک فلاکت زدہ بوڑھے کا پتا بتایا۔ آپ سیدھے اس کے مکان پر تشریف لے گئے۔ ایک خستہ حال کٹیا تھی جس کی دیواریں گر چکی تھیں اور پردے کے لیے چاروں طرف بوسیدہ کمبل لٹک رہے تھے۔ آپ نے صاحب خانہ سے مکان میں قیام کرنے کی اجازت طلب کی۔ اس بوڑھے کے لیے یہ خوشی کا مقام تھا کہ حضرت عبدالقادر جیلانی اس کی کٹیا میں قیام پذیر ہونے کے خواہش مند ہیں۔ اس بوڑھے نے بہ خوشی اجازت دے دی۔

آپ کی آمد کی خبر پھیلی تو قصبے کے لوگ تحائف و ہدیہ لے کر آپ کی خدمت میں حاضر ہونے لگے۔ صاحب ثروت لوگوں نے سونا' چاندی' غلہ' مویشی اور کئی دوسری قیمتی چیزیں آپ کی خدمت میں پیش کیں۔ آپ نے وہ سب نذرانے قبول کر لیے۔

رات گزار کر دوسرے دن جب آپ مکہ معظمہ کے لیے روانہ ہونے لگے تو وہ تمام مال و اسباب آپ نے اس بوڑھے کو ہدیہ کر دیا۔ آپ کے روانہ ہوتے ہی وہ نادار بوڑھا مالدار ہو گیا۔

متاہلانہ زندگی اختیار کرنے کے بعد آپ نے محلہ حلبہ میں رہائش اختیار کر لی۔ مکان سے ملحق ایک مہمان خانہ تعمیر کرایا جس میں ہر وقت دسترخوان سجا رہتا۔ نادار محتاج شکم سیر ہو کر کھاتے۔ دور دراز سے جو لوگ آپ کے دیدار کے لیے حاضر ہوتے' وہ اسی مہمان خانے میں ٹھہرنے لگے۔

☆☆☆

سات سال ہو گئے تھے کہ آپ باطل کے مورچوں پر عوامی خطبات کے ذریعے حملہ آور ہو رہے تھے۔ آپ کا بے مثال تبحر علمی دیکھ کر دنیا چونک اٹھی اور تھوڑے ہی عرصے میں ان خطبات کا ڈنکا پوری دنیائے اسلام میں بجنے لگا۔ دور دراز سے لوگ آپ سے علوم شریعت و طریقت حاصل کرنے کے لیے جوق در جوق آتے اور اس بحر زخار سے سیراب ہو کر گھروں کو لوٹتے۔

اب ضرورت اس بات کی تھی کہ جو لوگ آپ کے خطبات سے راہ راست پر آ چکے تھے' انہیں رموز شریعت سمجھائے جائیں۔ اس مقصد کے لیے آپ نے اپنے مدرسے میں درس و تدریس کا آغاز کر دیا۔ نماز فجر سے فارغ ہو کر آپ مدرسہ تشریف لے جاتے اور طلبہ' خدام اور دوسرے لوگوں کو شریعت و طریقت کی تعلیم دیتے۔ ایک سبق تفسیر کا' ایک حدیث کا' ایک فقہ کا اور ایک اختلاف ائمہ اہل سنت اور ان کے دلائل کا ہوتا۔ علاوہ ازیں علوم طریقت کے متلاشیوں کو رموز شریعت سمجھائے جاتے۔ ظہر کی نماز کے بعد تجوید کی تعلیم ہوتی اور شام کو پھر صبح کی طرح درس ہوتا'

حضرت عبدالقادر جیلانی علم کا ٹھاٹھیں مارتا ہوا سمندر تھے۔ نہ صرف علوم ظاہری بلکہ علوم باطنی کے بھی منتہی تھے۔ سترہ علوم کے استاد کامل تھے۔

ایسا استاد کامل تدریس کے میدان میں اترا اور اس کے دامن تربیت سے فیض اٹھانے والے اِدھر اُدھر پھیلنے لگے تو بغداد کی درس گاہیں پھیکی پڑ گئیں۔ مذہب اہل سنت کو آپ کے درس و تدریس سے بڑا فروغ حاصل ہوا۔ بداعتقادی اور بدعات کا بازار سرد پڑ گیا۔

آپ کی شہرت کے ساتھ ساتھ آپ کی عظمت و احترام میں بھی اضافہ ہو گیا۔ آپ کی عظمت کا یہ عالم تھا کہ مشائخ کبار آپ کے مدرسے میں جھاڑو دیتے اور چھڑکاؤ کرتے تھے۔ جب آپ کی اجازت ہوتی تو زانوئے ادب تہ کر کے آپ کے سامنے بیٹھتے۔

مشہور ولی اللہ شیخ علی بن ابی نصر الہیتی گاہے گاہے اپنے ساتھیوں کے ساتھ اپنی جائے رہائش زویران سے آپ کی خدمت میں بغداد آیا کرتے تھے۔ بغداد کے قریب پہنچتے تو اپنے ساتھیوں سے فرماتے' دریائے دجلہ میں غسل فرما لو اور اپنے دلوں کو خطرات سے پاک کر لو کہ ہم سلطان الاولیا کی خدمت میں حاضر ہونے والے ہیں۔ بغداد میں داخل ہوتے اور لوگ ان کی خدمت میں آتے تو فرماتے شیخ

عبدالقادر کے دروازے کی طرف بھاگو۔ میں تو ان کا ایک ادنیٰ نیازمند ہوں۔ جب سیدنا غوث اعظم کے دروازے پر پہنچتے تو اپنا جوتا اتار دیتے اور اذن باریابی طلب کرتے، جب آپ پکارتے تو مودبانہ حاضر ہوتے۔

ہیبت وجلال کا یہ عالم تھا کہ مجالس وعظ میں سانسوں کے سوا کوئی آواز سنائی نہیں دیتی تھی۔ دوران وعظ کسی کی مجال نہیں تھی کہ اپنی جگہ سے اٹھ کر اِدھر اُدھر جائے یا کوئی بات کرے، کسی کو سرگوشی تک کی جرأت نہیں تھی۔

جب آپ کسی راستے سے گزرتے تو لوگ سراپا احترام بن کر دورویہ راستے پر کھڑے ہوجاتے۔ باتیں بند کردیتے اور نظریں جھکا لیتے۔ آپ کا خچر یا اونٹ جس پر آپ سوار ہوتے، گزر جاتا تب کہیں جا کر راہگیروں کو ہوش آتا۔

ایک روز آپ جامع مسجد میں بیٹھے ہوئے تھے کہ آپ کو چھینک آئی۔ آپ نے الحمدللہ کہا۔ جواب میں لوگوں نے یرحمک اللہ کہا تو ہزارہا لوگوں سے بھری ہوئی مسجد گونج اٹھی۔ مسجد سے دور ایک جگہ خلیفہ وقت المستنجد باللہ بھی بیٹھا تھا۔ اس نے یہ آواز سنی تو حیرت سے پوچھا، یہ کیسی آواز ہے؟

”حضرت عبدالقادر جیلانی کو چھینک آئی ہے اور لوگ اس کا جواب دے رہے ہیں۔“ لوگوں نے بتایا۔

یہ سننا تھا کہ خلیفہ پر لرزہ طاری ہوگیا۔ اللہ اکبر! یہ عظمت، یہ جلال، یہ مقبولیت، اللہ کے ولی کے سوا کس کو یہ عظمت حاصل ہوسکتی ہے۔ اس دن کے بعد سے جب بھی آپ کا کوئی نامۂ مبارک خلیفہ کے پاس پہنچتا، تو وہ خوف سے تھرا اٹھتا تھا کہ شاید آپ نے کسی بات پر سرزنش کی ہو۔ نامۂ مبارک چوم کر آنکھوں سے لگاتا اور آپ کی تحریر کے مطابق عمل کرتا۔ آپ کی بے پناہ مقبولیت کے باعث خلیفہ کی مجال نہیں تھی کہ آپ کی تحریر پر عمل نہ کرے۔

☆☆☆

وہ ایک مبارک دن تھا کہ آپ محلہ حلبہ میں اپنے مہمان خانے میں وعظ فرمارہے تھے کہ یکایک آپ پر حالت کشف طاری ہوئی۔ آپ بے اختیار پکار اٹھے۔ ”میرا یہ قدم ہر ولی اللہ کی گردن پر ہے۔“

اس مجلس میں عراق کے قریباً سب اکابر مشائخ موجود تھے۔ ان سب نے آپ کا یہ ارشاد سنتے ہی اپنی گردنیں خم کردیں۔ کامل شیخ علی بن ابونصر الہیتی بھی اس مجلس میں موجود تھے۔ وہ فوراً اٹھے اور آپ کا قدم مبارک پکڑ کر اپنی گردن پر رکھ لیا۔

کرۂ ارض پر جہاں جہاں کوئی قطب، ابدال یا ولی تھا، اس نے بھی حکم الٰہی سے آپ کی آواز سنی اور اپنی گردن جھکا دی۔ خواجہ معین الدین چشتی اجمیری کا عالم جوانی تھا اور اس وقت خراسان کے پہاڑوں میں مجاہدے میں مصروف تھے۔ انہوں نے غائبانہ یہ آواز سنی اور اپنی گردن خم کردی۔ اتنی خم کہ پیشانی زمین کو چھونے لگی۔ روایت ہے کہ دنیا کے کم وبیش تین سوتیرہ اولیائے کرام نے آپ کے اس ارشاد کے سامنے اپنی گردنیں جھکائیں۔

اصفہان کے ایک ولی اللہ شیخ صفان دریائے علم ومعرفت کے زبردست شناور تھے اور بکثرت کرامات ان سے سرزد ہوتی تھیں۔ یہ فرمان انہوں نے بھی سنا لیکن غوث الاعظم کا مرتبہ کمال پہچاننے میں ٹھوکر کھاگئے۔ انہوں نے سر جھکانے سے انکار کردیا۔ اسی وقت انہیں محسوس ہوا کہ ان

متحدہ عرب امارات میں مقیم
اردو قارئین کے لیے خوشخبری
جاسوسی ڈائجسٹ پبلیکیشنز کراچی (پاکستان)
کے چاروں رسائل
جاسوسی ڈائجسٹ، سسپنس ڈائجسٹ، ماہنامہ پاکیزہ اور ماہنامہ سرگزشت
ایک فون کال کے فاصلے پر
آپ کال کریں، مطلوبہ رسالہ آپ کو گھر بیٹھے مل جائے گا۔
اردو بک ورلڈ ایف زیڈ سی۔ بزنس سینٹر، شارجہ پبلشنگ سٹی
فری زون، الزاہیہ، شیخ محمد بن زائد آر ڈی، ای 311 شارجہ
971504805734
URDU BOOKS WORLD FZC.
BUSINESS CENTRE
SHARJAH PUBLISHING CITY
FREE ZONE, AL ZAHIA
SHEIKH MOHAMMED BIN ZAYED RD,
E311, SHARJAH, UNITED ARAB EMIRATES

کی ولایت اور دوسری قوتیں سلب ہوگئی ہیں۔ دامن خالی ہوگیا تو گھبراہٹ نے پاؤں پکڑ لیے۔ اب سارا معاملہ سمجھ میں آ گیا۔ جہاں تھے وہیں سے بغداد کی طرف دوڑ پڑے۔ کئی دنوں کے سفر کے بعد وہ ان کے آستانے پر پہنچے۔ وہاں لوگوں کا ہجوم تھا اور وعظ و نصیحت فرمائی جارہی تھی۔ شیخ صفان بھی خاموشی سے آ کر بیٹھ گیا۔ وعظ کی آواز کانوں میں آ رہی تھی۔

''جو آخرت چاہے اسے دنیا سے اور جو اللہ عزوجل کو چاہے اسے عقبیٰ سے زہد اختیار کرنا لازم ہے۔ کل جہتوں سے اندھے بن جاؤ اور ان میں سے کسی ایک سے بھی تعلق مت رکھو کیونکہ جب تک تم ان کو پیش نظر رکھو گے تو اس وقت تک اللہ جل شانہ کے فضل کا دروازہ تم پر بند رہے گا اس لیے تمام جہات کو اپنی توجہ سے بند کردو اور انہیں اپنے یقین سے' اپنی فنا سے' اپنے علم سے مٹادو.....''

جیسے ہی بیان ختم ہوا حضرت شیخ صفان بھیڑ کو چیرتے پھاڑتے حضرت عبدالقادر کے منبر تک پہنچ گئے اور آپ کے قدموں سے لپٹ گئے۔

''کون ہو اور کہاں سے آئے ہو؟'' حضرت عبدالقادر نے نہایت شفقت سے فرمایا۔

''یا حضرت! میں شیخ صفان ہوں۔ اصفہان سے حاضر ہوا ہوں۔''

''تم شیخ صفان ہو' کیا حالت بنائی ہوئی ہے؟''

آپ نے انہیں اٹھایا اور اپنے برابر بٹھالیا۔ پھر شیخ صفان نے تمام ماجرا حرف بہ حرف گوش گزار کیا اور معافی کے طلب گار ہوئے۔ آپ نے انہیں گلے سے لگالیا۔ گلے ملتے ہی حضرت شیخ صفان کے تمام سلب شدہ درجات وحالات انہیں واپس مل گئے بلکہ درجات میں کچھ اور اضافہ ہوگیا۔

آپ کا یہ فرمان کہ میرا یہ قدم ہر ولی اللہ کی گردن پر' آپ کی زبان مبارک سے نکلا ہوا محض ایک جملہ نہیں تھا بلکہ حکم الٰہی تھا جو آپ کی زبان سے جاری ہوا کیونکہ قطبیت کا تاج سلطانی آپ کے سر پر رکھا جاتا تھا۔ آپ کا مرتبہ لازماً تمام اولیا سے بلند ہونا تھا۔ اس لیے بعض اولیائے کرام نے یہ شہادت دی کہ جس وقت یہ ارشاد صادر ہوا' انہوں نے فرشتوں کی ایک جماعت ہوا میں اڑتی ہوئی دیکھی۔ وہ جماعت سیدھی مجلس میں آ کر بیٹھ گئی اور آپ کو اقلیم ولایت کی بادشاہی ملنے پر مبارک باد دی۔ اسی دن دنیا کے دسوں ابدالوں نے آپ کے سامنے سر تسلیم خم کردیے۔

اس ارشاد کے معنی ومفہوم پر عرصہ دراز تک بحث جاری رہی۔ اس بات پر تو سب متفق ہیں کہ آپ کا یہ ارشاد حکم الٰہی کے مطابق تھا لیکن اس کے مفہوم کے بارے میں اختلاف ہے۔ بعض لوگ اس قول کے تحت آپ کے زمانے کے تمام اولیا کے علاوہ آپ سے پہلے گزرے ہوئے اور بعد میں آنے والے اولیا کو بھی لاتے ہیں۔ اس کے برعکس دوسرے لوگوں کا خیال ہے کہ آپ کا یہ فرمان صرف اولیائے وقت کے ساتھ مخصوص تھا کیونکہ اولیائے متقدمین میں صحابہ کرام' تابعین اور تبع تابعین بھی شامل ہیں جن کی فضیلت اور برتری مسلم ہے اور بعد میں آنے والوں میں حضرت مہدی علیہ السلام شامل ہیں۔

بعض اصحاب نے قدم سے مراد طریقہ لیا ہے جیسا کہ عربی زبان میں کہا جاتا ہے ''فلاں شخص قدم حمید (صراط مستقیم) پر ہے چنانچہ اس طبقۂ فکر کے لوگ یہ مراد لیتے ہیں کہ آپ کا طریقہ' مرتبہ اور آپ کے کمالات ولایت اس زمانے کے تمام اولیا اللہ کے طریقوں' کمالات اور مراتب سے آگے بڑھ گئے تھے اور وہ حکم الٰہی سے سلطان الاولیا قرار دیے گئے۔

☆☆☆

آپ کا وجود اسلام کے لیے باد بہاری بنا ہوا تھا جس نے دلوں کے قبرستان میں ایک نئی جان ڈال دی تھی اور عالم اسلام میں ایمان اور روحانیت کی ایک نئی لہر پیدا کردی تھی۔ لاکھوں کی تعداد میں طالبان حق آپ کے ہاتھ پر بیعت کررہے تھے۔ پھر آپ کے یہی تربیت یافتہ افراد دنیا کے کونے کونے میں پھیل کر تبلیغ کے فرائض انجام دے رہے تھے۔ آپ جب بھی کسی خادم یا مرید کو داعئ حق مقرر فرما کر کسی خاص علاقے کی جانب روانہ کرتے تو یہ ہدایات دیتے۔

1۔ حکام اور امرا کی ملازمت نہ کرنا۔ 2۔ کسی امیر سے وظیفہ قبول نہ کرنا۔ 3۔ ہر کام میں اللہ تعالیٰ کی خوشنودی کو پیش نظر رکھنا۔ 4۔ کتاب اللہ اور سنت رسول کا دامن مضبوطی سے پکڑنا۔ 5۔ شریعت کی حدود سے کبھی تجاوز نہ کرنا۔ 6۔ سادہ زندگی کو اپنا شعار بنانا۔ 7۔ غرور و تکبر کے نزدیک نہ پھٹکنا۔ 8۔ تبلیغ حق میں کسی مصیبت یا رکاوٹ سے دل برداشتہ نہ ہونا۔ 9۔ وقت کی پابندی کرنا۔ 10۔ غیر مسلموں سے رواداری کا برتاؤ کرنا۔ 11۔ دنیاوی عزت اور نمود ونمائش سے پرہیز کرنا۔

آپ نے داعیان حق کی جو مقدس جماعت تیار کی وہ علوم ظاہری و باطنی میں درجۂ کمال کو پہنچی ہوئی تھی۔ اس جماعت کے افراد نے حضرت کے فیض صحبت سے پورا پورا فائدہ اٹھایا تھا۔ ان کی رگ رگ میں خدا اور رسول کی محبت موجزن تھی۔ انہیں محض زبانی تبلیغ حق ہی نہیں کرنی تھی بلکہ انہیں خلق محمدی کا عملی نمونہ بن کر گمراہوں کو راہ حق کی طرف بلانا تھا۔ یہ لوگ اپنے مرشد کامل کی سچی اور عملی تصویر تھے لہٰذا یہ لوگ جہاں بھی گئے۔ اگر ایک طرف اسلام کی سچی تصویر پیش کی تو دوسری جانب اپنے مرشد کامل کا بہترین تعارف بھی پیش کیا۔ جو لوگ حضرت عبدالقادر جیلانیؒ سے ملاقات نہیں کر سکے تھے' ان لوگوں کو دیکھ کر آپ کی عقیدت میں سرشار ہو گئے۔

آپ کے علم و فضل کی شہرت ایسی ہوئی کہ ہر طرف سے سائلوں کے مکتوبات آنے لگے اور فتوے پوچھے جانے لگے۔ وعظ و تدریس اور عبادات الٰہی کے بعد اتنا وقت ہی کہاں رہتا تھا لیکن آپ کسی سائل کو محروم کرنے کے روادار ہی نہیں تھے۔ آپ نے اس ذمے داری کو بھی قبول فرمایا۔ فتاویٰ کی کثرت ناقابل بیان تھی لیکن اس کے باوجود کوئی فتویٰ رات بھر بھی آپ کے پاس نہ رہتا۔ آپ کی علمی صلاحیت کا یہ عالم تھا کہ غور و فکر کی ضرورت ہی پیش نہ آتی۔ مسئلہ دریافت کرتے اور جواب لکھوا دیتے۔ کئی مرید قلم دواتیں لے کر بیٹھ جاتے اور آپ باری باری جواب لکھوا دیتے۔

علمائے عراق آپ کے فتاویٰ کی صحت اور جوابات کی سرعت پر متعجب رہتے تھے۔ مشہور محدث اور مؤرخ علامہ ابن جوزی آپ کے بہت مخالف تھے اور آپ کے ارشادات و مواعظ پر اعتراضات کرتے رہتے تھے۔ ایک دن حافظ ابوالعباس احمد نے اصرار کر کے انہیں اپنے ہمراہ سیدنا غوث الاعظم کی مجلس میں لے گئے۔ اس وقت آپ قرآن حکیم کا درس دے رہے تھے۔ اردگرد طلبہ و تلامذہ کا ہجوم تھا۔ شیخ ابوالعباس احمد اور علامہ ابن جوزی حلقہ درس سے پرے ہٹ کر بیٹھ گئے۔ اتنے میں قاری نے ایک آیت پڑھی۔ سیدنا غوث اعظم نے اس کا ترجمہ سنایا اور پھر تفسیری نکات بیان کرنے شروع کر دیے۔ پہلے نکتے پر حافظ ابوالعباس احمد نے علامہ ابن جوزی سے پوچھا۔ کیا آپ کو اس کا علم ہے؟ انہوں نے اثبات میں سر ہلا دیا۔ پھر دوسرے نکتے پر بھی سوال کیا اور علامہ ابن جوزی نے اثبات میں

آکسفورڈ یونیورسٹی
(Oxford University)

آکسفورڈ دریائے آکس کے کنارے، انگلستان کا مشہور شہر ہے۔ اس کے معنی دریائے آکس کا گھاٹ کے ہیں، اس جگہ انگلستان کا مشہور اور قدیم ترین دارالعلوم واقع ہے۔ اس کی بنیاد قدیم زمانے میں رکھی گئی تھی۔ لیکن منظم تدریس کا آغاز 1133ء سے ہوا جب پیرس کے رابرٹ پولین نے یہاں تدریس کا سلسلہ شروع کیا۔ اس نے یونیورسٹی کی صورت 1163ء میں اختیار کی۔ اس میں پینتیس کالج ہیں جن کی اقامت گاہیں بھی ہیں۔ لیکن تدریس تمام کالجوں کے مشترکہ لیکچروں کی صورت میں ہوتی ہے اور کالجوں کے ٹیوٹر اپنی اپنی اقامت گاہوں پر بھی طلبہ کی تعلیمی رہنمائی کرتے ہیں۔ آکسفورڈ یونیورسٹی کی شہرۂ آفاق بوڈلین لائبریری (1595ء) دنیا بھر کی سب سے بڑی لائبریری ہے۔ اس کی مزید توسیع 1946ء میں جدید بوڈلین لائبریری کی شکل میں ہوئی، جس میں پچاس لاکھ کتابوں کی گنجائش رکھی گئی۔ اس کا نام سر تھامس باڈلے (1545ء۔1613ء) کے نام پر رکھا گیا ہے۔

آئینہ سکندری

آئینہ اصل میں آہنہ ہے۔ چونکہ ابتدا میں اسے لوہے سے بنایا گیا تھا اس لیے اسے آہنہ کہا جانے لگا۔ مشہور ہے کہ سکندر اعظم نے درباری حکماء کو جمع کر کے کہا کہ ہم ایک ایسی چیز بنانا چاہتے ہیں جس میں ہر شے کا عکس نظر آسکے۔ حکماء نے مختلف معدنیات سے یہ چیز بنانے کی کوشش کی لیکن کامیاب نہ ہوئے۔ آخر سکندر اعظم کے مشورے سے ایک لوہار نے فولاد کو اس قدر جلا دی کہ اس میں ہر چیز کا عکس نظر آنے لگا۔ اس میں اتنی کمی رہ گئی کہ لوہے کا ٹکڑا چھوٹا ہوتا تھا تو شبیہ چھوٹی نظر آتی تھی اور لمبوترا ہوتا تو لمبی۔ گول آئینہ بنانے میں یہ سب دقتیں دور ہو گئیں اور ہر شے جوں کی توں نظر آنے لگی۔ جب آئینہ سکندر کی منشا کے مطابق تیار ہو گیا تو اس نے اس میں اپنی شبیہ دیکھی اور بہت بڑا جشن منعقد کیا۔ لیکن تاریخی اعتبار سے یہ خیال درست معلوم نہیں ہوتا کیونکہ فراعنہ مصر کے مقبروں سے کئی ہزار برس پہلے کے آئینے نکلے ہیں۔ شیشے کی دریافت کے بعد بہت عمدہ آئینے بننے لگے ہیں۔

جواب دیا حتیٰ کہ گیارہ تفسیری نکات تک علامہ ابن جوزی اثبات میں جواب دیتے رہے۔ اس کے بعد جو سیدنا غوث اعظم کا بیان اس طرح جاری تھا کہ علم کا ایک دریا ہے جو امڈتا ہی چلا آتا ہے اور کہیں رکنے کا نام ہی نہیں لیتا۔ اس کے بعد یکے بعد دیگرے آپ نے اس آیت کے چالیس تفسیری نکات و رموز بیان فرمائے۔

بارہویں سے چالیسویں نکتے تک علامہ ابن جوزی اپنے علم کی بے بسی کا اعتراف کرتے رہے اور حیرت و استعجاب کے عالم میں سر دھنتے رہے۔ آخر بے اختیار ہو کر پکار اٹھے "اب قال کو چھوڑ کر حال کی طرف رجوع کرتا ہوں۔"

پھر جوش ہیجان میں اپنا گریبان چاک کر بیٹھے اور آپ کے قریب پہنچ کر آپ کے تبحر علمی و عظمت کا اعتراف کیے بغیر چارہ نہ رہا۔

اس اعتراف نے ثابت کر دیا کہ اس وقت دنیائے اسلام میں حضرت عبدالقادر جیلانی کا ہمسر کوئی نہیں۔ حال و قال میں کوئی آپ کا جواب نہیں۔ آپ بے شک سلطان العارفین ہیں۔

شیخ ابوالحسن سعد الخیر کا بیان ہے کہ میں ایک دفعہ شیخ عبدالقادر کی مجلس میں حاضر ہوا اور سب لوگوں کے پیچھے بیٹھ گیا۔ اس وقت آپ زہد کے موضوع پر تقریر فرما رہے تھے۔ میرے دل میں خواہش پیدا ہوئی کہ آپ معرفت کا مضمون بیان کریں۔ آپ نے یکا یک زہد کا موضوع چھوڑ کر معرفت کے موضوع پر تقریر شروع کر دی۔ پھر میں نے چاہا کہ آپ شوق کے بارے میں کلام فرمائیں...... آپ نے فوراً شوق کے موضوع پر تقریر شروع کر دی۔ اب میں نے چاہا کہ فنا و بقا کے مسئلے پر وضاحت کریں۔ آپ نے فنا و بقا کا مسئلہ بیان کرنا شروع کر دیا۔ پھر میرا دل غیبت و حضور کے موضوع پر آپ کے ارشادات سننے کے لیے بے تاب ہوا۔ آپ نے اسی موضوع پر ایک سیر حاصل تقریر فرما دی۔ پھر بہ آواز بلند فرمایا۔ "ابوالحسن تمہیں یہی کافی ہے۔" میں فرط حیرت سے دم بخود رہ گیا۔

☆☆☆

پانچویں صدی ہجری کا نصف آخر دنیائے اسلام کے لیے انتشار و افتراق کی ہجری تھی۔ سیاسی انقلابات اور آپس کی خانہ جنگیوں نے مسلمانوں کو اخلاقی پستی میں اتار دیا تھا۔ ہر طرف بدعات کا شور تھا۔ فرقہ بندی عام تھی۔ غیر اسلامی معتقدات کی خوب خوب نشوونما ہو رہی تھی۔ مدارس کھلے ہوئے تھے لیکن اسباق حلق سے نیچے نہیں اتر رہے تھے۔ ولی اللہ اجمعین موجود تھے لیکن دلوں پر تالے پڑے ہوئے تھے۔ اذانیں بلند ہو رہی تھیں لیکن روح بلالی مفقود تھی۔ خانقاہیں آباد تھیں لیکن پیغام عام نہیں ہو رہے تھے۔ ہر طرف گھٹا ٹوپ اندھیرا پھیلا ہوا تھا۔

حضرت شیخ عبدالقادر جیلانی کی مسیحا نفسی نے مردہ دلوں کو حیات تازہ بخش دی۔ آپ کے مواعظ حسنہ سے کائنات کا ذرہ ذرہ جگمگا اٹھا۔ آپ نے صرف عام لوگوں کی ہی تربیت نہیں کی بلکہ آپ کے دامن فیض اثر سے علماء، فقہا اور اولیائے عظام نے بھی کسب فیض کیا۔ آپ نے ایسے افراد صالح تیار کیے جو آپ کے بعد بھی اسلام کی حیات تازہ کے لیے کام کرتے رہیں۔ ایک باغ تھا جو اجڑ رہا تھا، آپ نے اس میں نئے پھول کھلا دیے۔ اسی لیے آپ کو محی الدین کے لقب سے سرفراز کیا گیا یعنی دین کو زندہ کرنے والا۔

ایک مرتبہ سیدنا غوث اعظم سے کسی نے پوچھا، کہ آپ محی الدین کے لقب سے کیسے مشہور ہوئے۔ آپ نے جواب میں یہ واقعہ سنایا۔

"ایک دن میں بغداد سے باہر گیا ہوا تھا۔ واپس آیا تو راستے میں ایک بیمار اور خستہ حال شخص کو دیکھا جو ضعف و لاغری کے سبب چلنے سے عاجز تھا۔ جب میں اس کے پاس پہنچا تو کہنے لگا۔ "اے شیخ! مجھ پر توجہ کر اور اپنے دم مسیحا نفس سے مجھے قوت عطا کر۔" میں نے بارگاہ رب العزت میں اس کی صحت یابی کے لیے دعا مانگی اور پھر اس پر دم کیا۔ میرے دیکھتے ہی دیکھتے اس شخص کی لاغری اور نقاہت یک لخت دور ہو گئی اور وہ تندرست و توانا ہو کر اٹھ کھڑا ہوا اور مجھ سے پوچھا۔

"عبدالقادر، مجھے پہچانا؟"

"نہیں......" میں نے کہا۔

"میں دین ہوں۔ ضعف کی وجہ سے میری یہ حالت ہو گئی ہے۔ اب اللہ تعالیٰ نے تیرے ذریعے سے مجھے حیات تازہ عطا کی ہے۔ تو محی الدین ہے اور اسلام کا مصلح اعظم۔"

میں اس کو چھوڑ کر جامع مسجد کی طرف روانہ ہوا۔ راستے میں ایک شخص ننگے پاؤں بھاگتا ہوا میرے پاس سے گزرا اور بلند آواز سے پکارا۔ "سید محی الدین!"

میں حیران رہ گیا۔ پھر میں نے مسجد میں جا کر دوگانہ ادا کیا۔ جونہی میں نے سلام پھیرا۔ میرے چاروں طرف

لوگ انبوہ در انبوہ جمع ہوگئے اور محی الدین، محی الدین کے فلک شگاف نعرے لگانے لگے۔

اس سے پہلے کبھی کسی نے مجھے اس لقب سے نہیں پکارا تھا۔

آپ کو زمانے کے لوگوں کی ضعیف الاعتقادیوں کا علم تھا۔ آپ جانتے تھے کہ یہ لوگ محض نصیحت سے باز آنے والے نہیں' یہ ایسے ولی اللہ سمجھتے ہیں جو انہیں کرامات دکھا سکتا ہو لہٰذا آپ نے کثرت سے کرامات دکھا کر ان لوگوں کے دلوں میں گھر کیا۔ اس لیے کثرت کرامات آپ کی انفرادیت ہے۔ مشہور ولی اللہ شیخ علی بن ابی نصر الہیتی کا بیان ہے کہ میں نے اپنے زمانے میں کوئی شخص حضرت شیخ عبدالقادر جیلانی سے بڑھ کر صاحب کرامت نہیں دیکھا۔ جس وقت کوئی شخص آپ کی کرامت دیکھنا چاہتا' دیکھ لیتا۔

شیخ الاسلام عزالدین بن عبدالسلام کا قول ہے کہ شیخ عبدالقادر جیلانی کی کرامات جس قدر تواتر سے منقول ہیں اور کسی ولی کی نہیں۔ امام ابن تیمیہ کا قول ہے کہ حضرت شیخ عبدالقادر جیلانی کی کرامات حد تواتر کو پہنچ گئی ہیں۔

☆☆☆

561ھ میں آپ اپنی مبارک عمر کے نوّے سال پورے کر چکے تھے اور اکانویں سال میں داخل ہو چکے تھے۔ جس مقصد کے لیے اللہ تعالیٰ نے آپ کو عالم بالا سے عالم زیریں میں بھیجا تھا' آپ نے اس مقصد کو پورا کر دیا تھا۔ عالم بالا کے مکین آپ کے فراق کی گھڑیاں گن گن کر گزار رہے تھے۔ جب آپ کے مشن کی تکمیل ہوگئی تو وصال کی تیاریاں ہونے لگیں۔

عمر عزیز کی اکانویں منزل میں داخل ہوئے تو قوائے جسمانی میں اضمحلال محسوس ہوا جس نے آہستہ آہستہ شدید صورت اختیار کرلی اور آپ صاحب فراش ہوگئے۔ یہ علالت اس بات کا اشارہ تھا کہ اب محبوب حقیقی کو جدائی گوارا نہیں۔ بلاوا آیا ہی چاہتا ہے' یہاں بھی محبوب سے ملنے کی جلدی تھی۔

''بیٹھا ہوں بلاوا مرا جب تک نہیں آتا۔''

ماہ ربیع الثانی 561ھ میں علالت نے شدت اختیار کرلی اور آپ کو یقین ہوگیا کہ اب عالم جاودانی کو رخصت ہونے کا وقت قریب آگیا ہے۔

آپ نے اہل خانہ کو قریب بلایا اور انہیں خبر دی کہ بہت جلد میں تم سے دائمی مفارقت اختیار کرنے والا ہوں۔

ماہنامہ جاسوسی ڈائجسٹ

مارچ کے شمارے کی دل لبھاتی جھلک

اولین صفحات

موسم میں تبدیلی آتی ہے۔ سلگتی دھوپ کے بعد برکھا رت کی سرشاری۔ مگر سیاست و معاشرت کے وجود میں نظامِ خلق کی بہبود کے علاوہ سب موجود ہے۔ درد و کرب میں ڈوبی سیلابی کہانی کے نشیب و فراز **پروین زبیر** کے قلم سے

سربکف

ماضی کی دھندلی پرچھائیوں کے تعاقب میں دوڑتے بھاگتے کردار کی پُراسرار داستان......

طاہر جاوید مغل کے قلم سے

دبر

قدم قدم پر بڑھتی مصیبتوں کا مقابلہ کرنے والے ایک دلیر نوجوان کی کوچہ گردی **حسام بٹ** کے قلم سے سلسلے وار کہانی

سرورق کے رنگ

پہلا رنگ

کچھ حقیقتیں آسیب کی طرح چمٹ جاتی ہیں...... ایک دن کی مسافت پر مشتمل شکار اور شکاری کا خونی کھیل...... **عائشہ نصیر** کی کاوش

دوسرا رنگ

ایک خوبصورت لڑکی کے ساتھ رونما ہونے والے خوفناک واقعات کی روداد...... **محمد فاروق انجم** کی تیکھی کہانی

یہ پاکیزہ نفوس بھی راضی بہ رضا رہنے والے تھے۔ آہ و بکا کا تو سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ آپ کے صاحب زادے شیخ عبدالوہاب نے پوچھا بھی تو یہ پوچھا۔

''قبلہ گاہی مجھے ایسی وصیت فرمائیے جس پر میں آپ کے وصال کے بعد عمل کروں۔''

آپ نے فرمایا۔ ''اللہ کی عبادت کو اپنا شعار بنا' کسی اور سے نہ ڈر اور نہ اُمید رکھ۔ تمام حاجتیں بزرگ و برتر اللہ کے سپرد کر اور اسی سے مانگ۔ سوائے اللہ تعالیٰ کے کسی اور پر بھروسا نہ کر اور نہ اعتماد کر کہ پاک ہے وہ ذات۔ توحید کو لازم پکڑ۔ تمام چیزوں کا مجموعہ توحید ہے۔''

رحلت سے پہلے ایک دن اور ایک رات آپ کی زبان مبارک پر یہ کلمات جاری رہے۔

''وعلیکم السلام ورحمتہ اللہ وبرکاتہٗ اللہ تعالیٰ مجھے بھی بخشے اور تمہیں بھی اور میری توبہ قبول فرمائے اور تمہاری بھی۔ بسم اللہ' تشریف لاؤ اور رخصت نہ کیے جاؤ۔''

آپ کے ایک صاحب زادے نے طبیعت کا حال پوچھا' فرمایا۔ ''مجھ سے کوئی کچھ نہ پوچھے۔ میں وہی ہوں کہ علم خدائے عزوجل میں کروٹیں بدل رہا ہوں۔''

صاحب زادہ شیخ عبدالجبار نے دریافت کیا۔ ''حضور کو کہیں درد تو محسوس نہیں ہوتا؟''

فرمایا۔ ''دل مسرور و مطمئن ہے اس کے سوا سب اعضا ستارہے ہیں۔''

وصال سے کچھ دیر پہلے آپ نے تازہ پانی سے غسل کیا اور نماز عشا ادا کی۔ دیر تک بارگاہ الٰہی میں سجدہ ریز رہے اور سب مسلمانوں کے لیے بار بار یہ دعا مانگی۔

''اے اللہ! محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی امت کو بخش دے۔ اے اللہ! محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی امت پر رحم فرما۔ اے اللہ! محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی امت سے درگزر فرما۔''

اس کے بعد آپ بستر پر لیٹ گئے۔ تمام صاحب زادے آپ کے اردگرد جمع تھے۔ آپ نے ان سب کو اپنے پاس سے ہٹ جانے کا حکم دیا۔

''میرے اردگرد سے پرے ہٹ جاؤ کہ میں بہ ظاہر تمہارے ساتھ ہوں مگر بہ باطن کسی اور کے ساتھ ہوں۔ میرے اور تمہارے بلکہ ساری خلق خدا کے درمیان اتنی دوری ہے جتنی زمین اور آسمان میں لہٰذا مجھے کسی پر قیاس نہ کرو اور نہ کسی کو مجھ پر۔''

کچھ دیر توقف کے بعد پھر فرمایا۔ ''میرے پاس تمہارے علاوہ اور لوگ آئے ہیں۔ جگہ چھوڑ دو اور ان کا ادب کرو۔ یہاں بڑا ازدحام ہے۔ ان پر مکان تنگ مت کرو۔''

یہ کہتے کہتے آپ پر بے ہوشی طاری ہوگئی اور یہ الفاظ آپ کی زبان پر جاری رہے۔

''میں مدد لیتا ہوں اس خدا سے جس کے سوا اور کوئی معبود نہیں۔ جو زندہ ہے نہ کبھی مرے گا اور نہ اسے مرنے کا خوف ہے۔ پاک ہے وہ رب جو طاقت میں سب پر غالب ہے اور اس نے اپنے بندوں پر موت کو غالب کیا۔ نہیں کوئی معبود سوائے اللہ کے اور محمد اللہ کے رسول ہیں۔''

اس کے ساتھ ہی آپ کی آواز پست ہوگئی اور آپ کی روح قفس عنصری سے پرواز کرگئی۔

وفات کی خبر نے جونہی گھر کی دہلیز پار کی ہر طرف کہرام مچ گیا۔ آہ و زاری کے سوا شہر میں کوئی آواز سنائی نہ دیتی تھی۔ جہاں تک خبر پھیلی' لوگ والہانہ آفتاب علم و معرفت کی آخری زیارت کے لیے آستانہ مبارک کی طرف دوڑ پڑے اور دیکھتے ہی دیکھتے ہزارہا مخلوق کا اجتماع ہوگیا۔

جنازہ اٹھا تو ہر زبان پر تھا' سرزمین بغداد نے اس شان کا جنازہ پہلے کبھی نہ دیکھا تھا۔ وہ ہجوم خلائق تھا کہ بادشاہوں کو نصیب نہ ہوا ہوگا۔

عقیدت مندوں نے باچشم گریاں آپ کے جسم خاکی کو آپ کی آخری آرام گاہ کے حوالے کیا اور آپ کی یادوں کا مرقد ہر دل میں ہمیشہ کے لیے تعمیر کیا۔ باب ازج' بغداد میں آپ کا مزار مبارک آج بھی مرجع خلائق ہے۔

سلطان عصر شاہ زماں قطب اولیا
کامد وفات روز قیامت علامتے
تاریخ سال وقت وفاتش چو خواستم
گفتا سروش غیب وفاتش قیامتے

☆☆☆

561ھ

زبان اولیا پر ہے ترانہ غوث اعظم کا
بہشت معرفت ہے آستانہ غوث اعظم کا

ماخذات

دائرۃ المعارف۔ تذکرہ سیدنا غوث اعظمؓ ..... از طالب ہاشمی

مجبور شہنشاہ

زویا صفوان

مغلوں نے شہنشاہیت کی تاریخ رقم کی۔ شجاعت کا پرچم بلند رکھا۔ انہی مغل حکمرانوں میں کچھ نام ایسے بھی ہیں جو بے بس و بے کس رہے۔ تخت و تاج کے وارث ہوتے ہوئے بھی ان کی زندگی محرومیوں سے بھری رہی۔

تاریخ کے دریچے سے حیران کن انکشافات

ہند میں طوائف الملوکی عروج پر تھی۔ مرکز کی کمزوری کے باعث لاتعداد حکومتیں قائم ہوچکی تھیں۔ حیدرآباد میں نظام دکن بادشاہ بنے ہوئے تھے۔ گائیکواڑ اور کاٹھیاواڑ، میں 'بھونسلا' کا راج تھا۔ مالوہ میں 'سندھیا' اور 'ہلکر' کی حکمرانی تھی۔ راجپوتوں کی ریاستیں مرہٹوں سے نبرد آزما ہونے کے لیے پرتول رہی تھیں۔ بنگال ایسٹ انڈیا کمپنی کے قبضہ میں تھا۔ روہیل کھنڈ اور الہ آباد' اودھ' کے وزیر کی دسترس میں تھے اور پنجاب پر سکھوں کی اجارہ داری قائم ہوچکی تھی۔

ان حالات میں مرکز کا یہ عالم تھا کہ اتفاق نابود تھا۔

اقتدار کی حرص نے ہر ایک کے لہو میں سرطان کی طرح پنجے گاڑ رکھے تھے۔ مرکز اس قدر کھوکھلا اور کمزور ہو چکا تھا کہ عالمگیر ثانی لال قلعہ میں نظر بندی کی زندگی بسر کرنے پر مجبور تھا۔

☆☆☆

شاہ عالم ثانی کی پیدائش والد کی نظر بندی کے دوران ہی ہوئی تھی۔ شاہ عالم کا اصل نام 'مرزا عبداللہ عرف عالی گہر' (علی گوہر) تھا۔ اسے بچپن میں 'لال میاں' اور 'مرزا بلاقی' بھی کہا جاتا تھا۔ اسیری کے باوجود اس کی تعلیم شاہی دستور کے مطابق ہی ہوئی۔ وہ فارسی' اردو اور ہندی کے علاوہ ترکی زبان سے بھی آشنا تھا۔

شاہ عالم نے عہد شباب میں قدم رکھا تو اقتدار کا ہما والد پر مہربان ہو گیا۔ عالمگیر ثانی بادشاہ اور مرزا عبداللہ ولی عہد قرار پائے۔ اس وقت بادشاہ کی حیثیت قلعہ کے امراء کے ہاتھوں کٹھ پتلی کی سی تھی۔ وہ جسے چاہتے حکومت سے معزول یا قتل کر دیتے اور جسے چاہے بادشاہ بنا دیتے تھے۔

شاہ عالم اس گھٹن' بے بسی اور بے یقینی سے نجات حاصل کرنا چاہتا تھا۔ عالمگیر ثانی نے بھی بیٹے کی محبت میں مجبور ہو کر ایک جاگیر دے کر قلعہ سے دور بھیج دیا۔ اب صورت حال متوازن ڈگر پر لوٹ جانی چاہیے تھی لیکن عماد الملک کو اپنے لیے شدید خطرہ محسوس ہونے لگا۔ اس نے عالمگیر کو مجبور کیا کہ وہ بیٹے کو دہلی واپس بلائے۔

شاہ عالم نے خطرہ بھانپ لیا اور محاصرہ کے باوجود 'اودھ' فرار ہونے میں کامیاب ہو گیا۔ اودھ کے نواب 'شجاع الدولہ' نے گرمجوشی سے اس کا استقبال کیا۔ کچھ عرصہ لکھنؤ میں قیام کے بعد الٰہ آباد کے حاکم 'محمد قلی خان' نے اسے اپنی ریاست میں مدعو کر لیا۔ وہ ایک طویل عرصہ سے بنگال پر حکومت کا خواہش مند تھا۔ اس نے شاہ عالم کو 'بہار' اور 'بنگال' پر لشکر کشی کے لیے قائل کر لیا۔ شجاع الدولہ نے بھی اس تجویز کی تائید کی لیکن اس مہم میں کامیابی مقسوم نہ تھی۔

محمد قلی خان دلبرداشتہ ہو کر الٰہ آباد واپس چلا گیا تاہم شاہ عالم کے حوصلے ابھی توانا تھے۔ اس نے اکتوبر 1759 میں دوبارہ بہار کا رخ کر لیا۔ لشکر کشی کی تیاریاں جوبن پر تھیں۔ اسی اثناء میں عالمگیر ثانی کو قتل کر دیا گیا۔

☆☆☆

شاہ عالم کو اپنے والد کے قتل کی خبر ایک ماہ بعد بہار کے گاؤں 'کھتولی' میں ملی تھی۔ اس نے وہیں اپنی بادشاہت کا اعلان کیا اور تاج پوشی کی رسومات میں مصروف ہو گیا۔ شفقت پدری سے محرومی کی خلش کم ہو کے ہی نہیں دے رہی تھی۔ وہ اکثر شام سے پہلے جھروکے میں بیٹھ کر سرمئی آسمان کی وسعتیں کھوجنے لگتا۔ اپنے گھونسلوں کی جانب پرواز کرتے پرندے اور مغرب کی سمت غروب ہوتا سورج وجود میں ایک بے کلی برپا کر دیتا تھا۔ اس صورت حال میں الفاظ و تخیل خاموشی سے دست بستہ اس کے پاس چلے آتے۔ وہ افسردہ نگاہوں سے انہیں دیکھتے ہوئے قلم تھام لیتا۔

اس روز بھی یہی ہوا۔ شاہ عالم نے اپنے خیالات صفحہ قرطاس پر منتقل کرنے کا آغاز کر دیا۔

عاجز ہوں ترے ہاتھ سے کیا کام کروں میں
کر چاک گریباں تجھے بدنام کروں میں
ہے دور جہاں میں مجھے سب شکوہ تجھی سے
کیوں کچھ گلہ گردش ایام کروں میں
آ دے جو تصرف میں مرے مے کدہ ساقی
اک دم میں خموں کے خمیں انعام کروں میں
حیراں ہوں ترے ہجر میں کس طرح سے پیارے
شب و روز کو اور صبح کے تئیں شام کروں میں
مجھ کو شہ عالم کیا اس رب نے نہ کیونکر
اللہ کا شکرانہ انعام کروں میں

تخلیق کا یہ مرحلہ مکمل ہوتے ہی ہندوستان کے اس فرماں روا کو ایک بار پھر امور سلطنت کے پیچ و خم نے اپنی گرفت میں لے لیا۔

☆☆☆

شاہ عالم انگریزوں کے بڑھتے ہوئے اقتدار سے سخت ناخوش تھا۔ وہ ان کی موجودگی اور انداز گفتگو پر بھی ایک واضح اضطراب محسوس کیا کرتا۔ ستم ظریفی یہ تھی کہ وہ اپنے قلبی معاملات کسی کے گوش گزار کرنے سے بھی گریزاں ہی رہتا۔ اسے شب و روز امور مملکت میں 'دیمک' کی طرح سرایت کرنے والے انگریز اور ان کے مقامی معاونین کے اختیارات کم کرنے کی مؤثر راہ تلاش تھی۔

شاہ عالم عہد شباب سے ہی بنگال فتح کرنے کا خواہش مند تھا۔ اس نے عالمگیر ثانی کی حیات میں ہی اس خطہ کو ایسٹ انڈیا کمپنی کے چنگل سے آزاد کروانے کا عزم کر رکھا تھا۔ اسے نواب میر جعفر کی جانب سے شدید تحفظات لاحق تھے۔ میر جعفر انگریزوں کا زبردست حامی تھا۔

(میر جعفر' نواب سراج الدولہ' کی فوج کا سپہ سالار تھا۔ اس نے 1757 کی جنگ پلاسی کے دوران نواب سراج الدولہ کے ساتھ غداری کر کے 'غدار' کے لقب سے شہرت پائی۔ اسی خدمت کے صلہ میں انگریزوں نے 1757 میں اسے بنگال کا برائے نام نواب مقرر کردیا۔ میر جعفر ایک کٹھ پتلی حکمران تھا۔ اصل اختیارات 'لارڈ رابرٹ کلائیو' کے ہاتھ میں تھے۔ انگریزوں کو لوٹ مار کی کھلی آزادی تھی۔ انہوں نے عوام کو جی بھر کر لوٹا۔ بنگالیوں کے ململ کے کاروبار تباہ ہوگئے)

شاہ عالم نے سید ہدایت علی خاں' مرزا رضا علی خاں اور محمد قلی خان کو ہمراہ لے کر اس پر چڑھائی کردی۔ شاہ عالم کا لشکر 'شاہ آباد' پہنچا تو میر جعفر کا ہم نوا 'راجا رام نارائن' سخت بوکھلاہٹ کا شکار ہوگیا۔ اس نے میر محمد جعفر خاں اور انگریزوں کو یکے بعد دیگرے کئی خطوط ارسال کیے۔ ان سبھی خطوط کا متن کم و بیش یکساں تھا۔

''حالات ہمارے موافق نہیں ہیں۔ شاہ عالم کے بارے میں اچھی خبریں نہیں مل رہیں۔ محل سے یہی اطلاعات مل رہی ہیں کہ اس نے جنگ کا فیصلہ کرلیا ہے۔ سید ہدایت علی خاں' مرزا رضا علی خاں اور محمد قلی خان بھی اس کے اتحادی ہیں۔ مجھے اپنی فوج میں اضافہ درکار ہے۔''

''شاہ عالم کی پیش قدمی جاری ہے۔ مجھے آپ کی مدد چاہیے۔ میرا موجودہ لشکر اس کے مقابلہ کے لیے ناکافی ہے۔''

''حضور! میں آپ کی طرف سے مثبت جواب کا منتظر ہوں۔ میری مدد کے لیے فوج نہ بھیجی گئی تو شاہ عالم کے لشکر کا مقابلہ ناممکن ہے۔''

رام نارائن کی یہ التجائیں بے سود ثابت ہوئیں۔ اسے میر جعفر کی طرف سے کوئی مدد حاصل ہوئی نہ ہی انگریزوں نے داد رسی کی نتیجتاً اسے شاہ عالم کی اطاعت قبول کرتے ہوئے یہ صوبے اس کے حوالے کرنے پڑے۔

(انگریزوں نے میر جعفر کو معزول کر کے اس کے داماد 'میر قاسم' کو نواب بنادیا تھا)

☆☆☆

ایک دیرینہ خواب کی تکمیل اور فتح کی سرشاری نے شاہ عالم کے مزاج میں فرحت پیدا کردی تھی۔ وہ اپنے اگلے پڑاؤ اور منصوبوں کے متعلق پُر اعتماد انداز میں سوچنے لگا تھا۔ اس فرحت اور سرشاری نے تخیل اور ذخیرہ الفاظ کو بھی بھرپور انداز میں مہمیز کردیا۔ تخیل کے طائر کی بلند پروازی نے اسے قرب و جوار سے کچھ لمحوں کے لیے مکمل طور پر بیگانہ کردیا۔ قلم کی نوک تیزی سے صفحات پر پھسل رہی تھی۔

دیکھو تو کس ادا سے رخ پر ڈالی ہیں زلفیں
یوں مار ڈستی ہیں دل دلبر کی کالی زلفیں
چاہے ہیں جس نہ تس کو باندھیں گرہ میں اپنی
دل لینے کو بلائیں یہ پیچ والی زلفیں
مثل سلاسل اس میں عقدے ہزار ہا ہیں
ٹک پیچ و تاب سے میں دیکھیں نہ خالی زلفیں
مار سیہ جدا کب رہتا ہے گنج زر سے
ہوتی نہیں ہیں اس کے رخ سے نرالی زلفیں
تھی رات جو لیا یک دن دیکھنے لگے سب
جب آفتاب اس نے رخ سے اٹھالی زلفیں

الفاظ کے اس تال میل اور رقص کو دیکھتے ہوئے شاہ عالم کی سرشاری دوچند ہوگئی۔ کچھ ہی دیر میں شام کے سرمئی سائے نیلگوں فلک پر چھانے لگے تو مزاج یک دم ہی ایک بے عنوان سے تغیر کی لپیٹ میں آگیا۔ اسے افسردگی' خلفشار اور ملال نے گھیر لیا تھا۔ شاہ عالم کو سخت جھنجلاہٹ محسوس ہونے لگی۔ ان کیفیات کے زیر اثر اسے قرب و جوار کے علاوہ اپنی ذات سے بھی شدید بیگانگی محسوس ہوتی تھی۔ تلخ اور بے معنی سوچوں کی یلغار اسے مزید مضطرب کرنے لگتی۔

''وقت کا سفر پیچھے کیوں نہیں مڑسکتا؟ میں اس دور میں واپس جانا چاہوں گا جب انگریزوں کو یہاں تجارت کرنے کی اجازت دی گئی تھی۔ اس لمحہ میں تیغ کر ان مکار صفت افراد کے چہروں پر موجود نقاب ہٹادوں گا۔ ان کے اصل چہرے کی رونمائی کر کے ہندوستان کو ایک دیمک سے بچایا جاسکتا تھا۔''

''کون جانتا تھا کہ بظاہر بے ضرر دکھائی دینے والے یہ انگریز ہندوستان میں اس قدر تیزی سے اپنا اثر و رسوخ قائم کرلیں گے؟''

''غلطیاں اور کوتاہیاں تو عوام و خواص سے بھی ہوئی ہیں۔ ہاں یقیناً ہوئی ہیں۔ ہم ان کے پھیلائے گئے جال میں اس قدر آسانی سے کیسے پھنس گئے؟''

''ایک غلطی تو یہ بھی ہوئی ہے کہ ہم اپنے آباؤ اجداد کی میراث پر کاربند نہ رہ سکے۔ تیموری خاندان کے وہ جیالے نڈر اور پیدائشی جنگ جو جانے کیسے عیش و عشرت کے دلدادہ ہوگئے ہیں؟ انہوں نے ایک ارفع منزل کا سفر کرتے

ہوئے پستی کا رخ کیونکر کرلیا؟ وہ ایک معمولی سا نکتہ کیسے فراموش کر بیٹھے کہ تنزلی اور نشیب کا سفر طے کرنے کے لیے قدموں کی ایک ہلکی سی لغزش ہی مہلک ثابت ہوتی ہے۔''

''کیا یہ سفر کبھی اختتام پذیر ہوگا؟ کیا تیموری خاندان اپنی میراث حاصل کرکے ایک بار پھر اوج حاصل کر سکے گا؟''

''میں یہ منزل طے کروں گا۔ میں ہندوستان کو اس شکنجہ سے آزاد کروالوں گا۔ ایک پڑاؤ تو عبور ہوگیا ہے۔ اگلی منازل بھی یقیناً ایسے ہی طے ہوجائیں گی۔''

ان سوچوں سے الجھتے ہوئے اپنی کامیابی کی سرشاری اب بے کیف محسوس ہونے لگی تھی۔ ذہن کے کسی اتھاہ گوشے سے اضطراب کی لہریں موجزن ہوتے ہوئے دھیرے دھیرے اس تمام تر مثبت توانائی کو نگلنے لگی۔

''اگلی منازل اس قدر بھی آسان نہیں ہوں گی۔''

ایک تلخ اور پُرخار سوچ نے مزاج کی یاسیت میں مزید اضافہ کردیا۔

☆☆☆

شاہ عالم کا یہ خدشہ بالکل درست ثابت ہوا۔ اس کے سفر کا اگلا ہی پڑاؤ غیر متوقع ثابت ہوا۔ وہ اپنے لشکر کے ہمراہ قصبہ دادونگر کے قریب پہنچا تو مرزا محمد علی موسوی اور مرزا اسحاق کشمیری کو تین سو آدمیوں کے ہمراہ رام نارائن کے پاس روانہ کردیا۔

''رام نارائن! تمہیں بادشاہ سلامت نے طلب کیا ہے۔'' مرزا محمد نے کہا۔

''میں خود کو اس قابل ہی نہیں سمجھتا۔'' اس کا چہرہ متغیر ہونے لگا۔

''تو کیا شاہی فرمان کی حکم عدولی کروگے؟'' مرزا اسحاق نے دریافت کیا۔

ان الفاظ میں پوشیدہ تنبیہ نے اسے جھرجھرا دیا۔

''میری اتنی مجال کہاں؟'' وہ اپنے ہونٹ کچلنے لگا۔ ''جہاں پناہ کا سامنا کرنے کی ہمت ہی نہیں ہے۔''

مرزا محمد علی کے لیے اس کی کیفیات قابلِ فہم تھیں۔ اس نے قدرے دوستانہ انداز میں کہا۔

''تمہارے پاس اپنی وفاداری ثابت کرنے کا ایک بہترین موقع ہے۔''

''جہاں پناہ مجھے کوئی سزا تو نہیں دیں گے؟'' وہ معصومیت سے مستفسر ہوا۔

دونوں افراد نے اسے تسلی تشفی دیتے ہوئے شاہ عالم کی غیر مشروط اطاعت کے لیے راضی کرلیا۔ رام نارائن ان کے ہمراہ 'قصبہ پھلواری' میں شاہ عالم کے پاس پہنچا اور مخصوص انداز میں ہاتھ جوڑتے ہوئے کہنے لگا۔

''میں جہاں پناہ کو وچن دیتا ہوں کہ میری تلوار آپ کے سامنے اٹھنے والے ہر باغی کا سر قلم کردے گی۔''

''میر جعفر کے متعلق تمہارا کیا خیال ہے؟'' شاہ عالم نے گمبھیر انداز میں اسے مخاطب کیا۔

''نواب صاحب بھٹک گئے تھے۔ وہ انگریزوں کی سرگرمیوں سے ناخوش ہیں۔'' اس نے شستگی سے جواب دیا۔

شاہ عالم کے ہونٹوں پر طنزیہ مسکراہٹ رینگ گئی۔ وہ اس بیانیہ کے تضاد سے بخوبی واقف تھا۔ میر جعفر نے ہندوستانی فرماں روا کی عزت و احترام کے باوجود انگریزوں کی مدح سرائی کے ساتھ سہولت کاری میں بھی کوئی کسر اٹھا نہ رکھی تھی۔

رام نارائن کی مکار کہنہ سال نگاہیں شاہ عالم کے چہرے پر مرکوز تھیں۔ وہ اس کی کیفیات کسی کھلی کتاب کی مانند پڑھ سکتا تھا۔ اس نے صورتِ حال کی نزاکت کے پیشِ نظر شاہ عالم کو اپنی غیر مشروط وفاداری کا بھرپور یقین دلایا اور اس کی اعانت کے لیے مزید رسد حاصل کرنے کی غرض سے رخصت ہوگیا۔

☆☆☆

رام نارائن سے ملاقات اور حالات میں متوقع بہتری کا تصور خوش آیند تھا۔ زمینی حقائق سے آگاہی کے باوجود شاہ عالم کے دل میں کئی خوش گمانیوں نے بسیرا کرلیا۔ مزاج میں لطافت اور ترنگ از خود ہی در آئی۔ تخیل نے اپنی انگلی تھمائی اور الفاظ کی تال میل منظم صورت اختیار کرنے لگی۔

کل کا وعدہ نہ کرو دل میرا بے کل نہ کرو
کل پڑے گی نہ مجھے مجھ سے یہ کل کل نہ کرو
کہیں جلا دے نہ اسے شعلہ آہ عشق
پلکوں کی ٹٹی کے تئیں آنکھوں کی اوجھل نہ کرو
کرچکی تیغ نگاہ کام تو پل ہی میں تمام
تیر پلکوں کا مقابل مرے پل پل نہ کرو
اس کو ہر شب ہے زوال اس کو نہیں ہے کچھ نقص
بدر کو چہرے سے اس کے متمثل نہ کرو

دکھ نہ پاوے کہیں وہ نازنیں گردن پیارے
تکیہ زنہار سر بالش مخمل نہ کرو

☆☆☆

شاہ عالم کی تمام تر امیدیں زمین بوس ہوگئی تھیں۔ قسمت کی ستم ظریفی ہی تھی کہ رام نارائن کو قلعہ لوٹتے ہی انگریزی فوج کی آمد کا عندیہ موصول ہوگیا۔ رام نارائن نے فی الفور اپنی کینچلی بدل لی۔ اب مصلحت پسندی کی پروا تھی نہ ہی بادشاہ کے کسی بھی عتاب کا خوف۔ انگریزی فوج کی آمد نے اسے بالکل ہی بے خوف کردیا تھا۔ یہی وجہ تھی کہ شاہ عالم کی شہر میں داخل ہونے کی خبر کو بالکل درخور اعتناء نہ سمجھا اور اسے یہ پیغام بھیج دیا۔

''آپ شہر میں داخل ہوں گے تو اس سے شہر والوں کو تکلیف ہوگی۔ اپنی راہیں الگ کرلیجیے۔''

شاہ عالم اس پیغام پر سخت برافروختہ ہوا۔ اس نے رام نارائن کو ماضی قریب کا معاہدہ یاد کرواتے ہوئے جوابی پیغام ارسال کیا۔

''جہاں پناہ سے کیے گئے وعدوں کی رو سے تم ہماری مدد کے پابند ہو۔ ہندوستان کے فرماں روا سے یہ عہد شکنی بہت عبرت ناک ثابت ہوگی۔''

رام نارائن کے ہونٹوں پر طنزیہ مسکراہٹ رینگ گئی۔ اس نے گویا ناک سے مکھی اڑاتے ہوئے شاہ عالم کو آگاہ کیا۔

''میں آپ کا نوکر ہوں نہ ہی تابعدار۔ جو کچھ میں نے آپ کے ساتھ سلوک کیا تھا وہ مہمان کی حیثیت سے کیا تھا۔''

بادشاہ کے لیے یہ الفاظ واندازنا قابل برداشت تھے۔ محمد قلی خاں نے اپنی فوج کو قلعہ سر کرنے کا حکم دے دیا۔ اس لڑائی کا مرکز 'پورب' کی سمت تھی۔ دونوں افواج میں گھمسان کا رن پڑنے کے باوجود جنگ بے نتیجہ ثابت ہوئی۔ اسی دوران شاہ عالم کو انگریزی فوج کی آمد کی اطلاع موصول ہوگئی۔ مشیروں اور وزیروں کی جانب سے متفقہ رائے یکساں تھی۔

''جہاں پناہ! اس وقت محاصرہ ترک کردینا ہی بہتر ہے۔ ہمیں شجاع الدولہ سے امداد طلب کرنی چاہیے۔ ان کا تعاون ہمارے لیے بہت سودمند ثابت ہوگا۔''

شاہ عالم نے سوچ بچار کے بعد اس مشورے کی تائید کرتے ہوئے بنارس روانگی کا فیصلہ کرلیا۔

دیس پردیس

دلوں میں امنگ، آنکھوں میں سہانے خواب سجائے پردیس میں قسمت آزمانے والوں کی داستان، **ناہید سلطانہ اختر** کے قلم سے

ظالم مظلوم

ماضی کا آئینہ، بااختیار اور بے اختیار انسانوں کے سبق آموز اور عبرت آمیز واقعات **زویا صفوان** کے قلم کی روانی

رمزشناس

خوف میں لپٹی پوشیدہ رازوں کی کڑیاں ملانے والے ایک رمزشناس کی دلچسپ داستان...... **نازیہ کامران کاشف** کی اچھوتی تحریر

جنگ باز

معاشرتی ناسوروں اور درندوں کی خوں ریز سازشوں اور زخم زخم ہونے والے ایک جنگ باز کی دلدوز داستان **ڈاکٹر عبدالرب بھٹی** کے قلم کی جادوگری

اس کے علاوہ

صائمہ دانش، عبرق بخاری، عائشہ نسیر، جاوید بسام، لبنیٰ خان، ڈاکٹر طیب سنگھانوی و دیگر کی خوب صورت تحریریں

☆☆☆

شاہ عالم کی واپسی کے بعد میر جعفر کا بیٹا 'میرن' عظیم آباد (پٹنہ) پر قابض ہو گیا۔ عنانِ اقتدار سنبھالتے ہی غرور و تکبر اس طرح غالب آئے کہ عوام پر ظلم و ستم کی انتہا کر دی۔ میرن کی ان چیرہ دستیوں نے رعایا کے صبر کا پیمانہ بہت جلد لبریز کر دیا۔

ان مظالم کے شکار 'دلیر خاں' اور 'کامگار' نے تمام تر مصلحتیں بالائے طاق رکھتے ہوئے شاہ عالم سے الحاق کا فیصلہ کر لیا۔ وہ دونوں 'بند ھیل کھنڈ' سے پانچ ہزار کی فوج کے ہمراہ شاہ عالم کے پاس پہنچ گئے۔ کامگار خاں نے سامانِ جنگ کی ذمہ داری قبول کرتے ہوئے زمین داروں سے روپیا وغیرہ جمع کرنے کا بیڑا اٹھا لیا۔

ان دونوں کی منصوبہ بندی بہت سادہ اور منطقی تھی۔ وہ میرن کی آمد سے قبل رام نارائن سے نبرد آزما ہونا چاہتے تھے تاکہ عظیم آباد کے قلعہ پر قبضہ ممکن ہو سکے۔ شاہ عالم کو یہ تجویز بے حد پسند آئی۔ اس نے فی الفور فوج کو کوچ کرنے کا حکم دے دیا۔

رام نارائن کا لشکر 'دیو باندی' کے کنارے پڑا ہوا تھا۔ کامگار خاں اور دلیر خاں نے اس کی سپاہ کے برابر اپنی فوج کا پڑاؤ ڈال دیا اور اگلے کچھ روز تک نہایت صبر و سکون سے صورتِ حال کا جائزہ لیتے رہے۔

جنگ کا آغاز ہوتے ہی سب سے پہلے دلیر خاں اور اصالت خاں نے اپنے تین سو ساتھیوں کے ہمراہ حملہ کیا۔ وہ بے جگری سے رام نارائن کی فوج میں گھسے اور بندوقوں، چھریوں کی مدد سے تابڑ توڑ حملے کرنے لگے۔

ان دونوں بھائیوں کی جانبازی کے نتیجہ میں میدانِ جنگ کچھ ہی دیر میں دشمنوں کی لاشوں سے پٹ گیا۔ دلیر خاں اور اصالت خاں نے لاتعداد دشمنوں کو موت کے گھاٹ اتار کر جان کی بازی ہار دی۔

کامگار خاں کی عقابی نگاہیں اس تمام تر صورتِ حال سے لحہ بہ لحہ آگاہ ہو رہی تھیں۔ اس نے ہراول دستے کی ہلاکت کے بعد اپنی فوج کے ہمراہ خود میدان میں اترنے کا فیصلہ کر لیا۔ رام نارائن کی ہمت اب جواب دے چکی تھی۔ دلیر خاں کی فوج نے اس کے سارے کس بل نکال دیے تھے۔ اس نے کامگار کی سپاہ سے مقابلہ کی بجائے پسپائی کا حتمی ارادہ کر لیا۔

کامگار خاں اس پسپائی کے عقب میں پوشیدہ مصلحت سے ناواقف تھا۔ اسے علم نہیں تھا کہ رام نارائن نے دورانِ جنگ 'کپتان کاکری' کو یہ پیغام بھیجا ہے کہ اس فوج میں سے نصف اس کی مدد کے لیے روانہ کر دی جائے۔

کاکری نے اس کا مطالبہ پورا کر دیا تاہم یہ سپاہ بھی جنگ میں تھکاوٹ سے دوچار تھی۔ ان میں مقابلہ کی تکمل تاب ہی نہیں تھی۔ کامگار خاں نے یہ صورتِ حال بھانپتے ہی موقع کو غنیمت جانا اور اپنا گھوڑا رام نارائن کے ہاتھی کے پاس لے جا کر کھڑا کر دیا۔ رام نارائن نے اس افتاد پر بوکھلاہٹ کی بجائے حاضر دماغی کا مظاہرہ کیا اور کامگار خاں کی جانب سے برسائے جانے والے تیروں سے زخمی حالت میں دانستہ طور پر ایک حوض میں لیٹ کر دم سادھ لیا۔

رام نارائن کی یہ چال کامیاب رہی۔ کامگار نے اسے مردہ سمجھتے ہوئے نظر انداز کر دیا۔ شاہ عالم کی جانب سے اس فتح کے بعد فوج کا تعاقب کرنے کی بجائے انہیں کھیت پر ڈالنے کا حکم دے دیا۔ شاہ عالم کا یہ فیصلہ ہلاکت خیز ثابت ہوا۔ اس کی مڈبھیڑ انگریزی فوج سے ہوتے ہی شکست فاش ہوئی۔

شاہ عالم اس شکست سے بددل نہیں ہوا۔ اس نے مرشد آباد میں انگریزی فوج کے انخلاء کے بعد ایک نئی حکمت عملی طے کر لی۔ وہ پہاڑوں کے راستوں سے فوج کو مرشد آباد کے درمیانی راستوں سے گزارتے ہوئے دارالسلطنت پر قبضہ کرنا چاہتا تھا۔ اس کی یہ منصوبہ بندی بھی مکمل طور پر ناکام ہو گئی۔ پہلی جھڑپ میں ناکامی کے دو ماہ بعد ہی اپریل 1780 میں انگریزوں نے اسے ایک بار پھر خاک چاٹنے پر مجبور کر دیا۔

☆☆☆

تیموری خاندان کا وہ فرماں روا شام کے سرمئی آنچل سے ڈھکے آسمان کو دیکھ رہا تھا۔ اس کی بظاہر سپاٹ نگاہوں کے عقب میں شدید انتشار برپا تھا۔ انگریزوں سے پے در پے شکست اور رام نارائن کا دھوکا اندرونی خلفشار کم ہونے ہی نہیں دے رہا تھا۔

اس ذہنی کیفیت میں وہ قرب و جوار اور اپنی ذات سے بیگانگی محسوس کرنے لگتا۔ خاندانی جاہ و جلال اور ماضی کی عظمتِ رفتہ دل میں پوشیدہ خلش و ملال از سرِ نو اجاگر کر دیتی۔ ان کیفیات کے ساتھ ایک انوکھی خواہش کی کونپل سر اٹھانے لگتی۔ وہ ماضی میں اپنے آباؤ اجداد کے رعب و دبدبہ اور کامیابیوں کا لطف محسوس کرنا چاہتا تھا جو ایک قطعی ناممکن

امر تھا۔ ان الجھنوں اور احساس نارسائی سے نبرد آزما ہوتے اسے شدت سے راہ فرار کی تلاش تھی۔ اس نے کاغذ اور قلم تھام کر وقتی خود فراموشی کا فیصلہ کرلیا۔

پاتا نہیں ہوں اور کسی کام سے لذت
جو کچھ کہ میں پاتا ہوں ترے نام سے لذت
کیفیتیں اس دیدہ میگوں سے جو پائیں
پائی نہ کبھی بادے سے اور جام سے لذت
ظاہر ہے تری نرگس مخمور سے مستی
ٹپکے ہے ترے لعل مے آشام سے لذت
پاتا ہوں مزا بے کلی اور درد کا ایسا
پاوے ہے کوئی جیسے کہ آرام سے لذت
رکھتا ہے ہوس بو سے کی تیرے شہ عالم
پاوے گا بہت تیرے اس انعام سے لذت

تخلیق کے اس کرب نے وقتی طور پر خود فراموشی عطا کردی تاہم زمینی حقائق کی عفریت ہنوز منہ پھاڑے اس کی منتظر تھی۔

☆☆☆

شاہ عالم اب عظیم آباد کی جانب عازم سفر تھا۔ اس مسافت کے دوران اس کی ملاقات ایک فرانسیسی 'موشیرلا' سے ہوئی۔ شومئی قسمت موشیرلا پانچ سو فرانسیسیوں کا کمان دار تھا۔ شاہ عالم نے اس کی مدد سے عظیم آباد کے قلعہ کا محاصرہ کرلیا۔

موشیرلا اور زین العابدین نے دانائی و بہادری کے ایسے جوہر دکھائے کہ اہل حصار کو اپنی شکست اور قلعہ سے دست برداری واضح دکھائی دینے لگی۔ اس موقع پر تقدیر نے ایک بار پھر بے وفائی کی۔ انگریز سپاہ کا میجر فوکسن دو سو انگریز سپاہی اور ہندوستانی فوج کے ہمراہ محض تیرہ دن میں تین سو میل مسافت طے کر کے 'حاجی پور' سے 'دریاپور' ہوتا ہوا شہر میں داخل ہوگیا۔

میجر فاکسن کے اس ناگہانی حملہ نے جنگ کا پانسہ ہی پلٹ دیا۔ غالب فوج انجام کار مغلوب ٹھہری اور شاہ عالم ایک جیتی ہوئی بازی ہارنے کے بعد جنوب میں 'گیا' کی سمت پسپائی پر مجبور ہوگیا۔

اس ہزیمت کے بعد شاہ عالم نے حسب عادت 'گیا' کے علاقہ سے امیدیں وابستہ کرلیں۔ اس کا گمان تھا کہ مقامی لوگ اسی کا ساتھ دیں گے لیکن یہ بھی ایک خام خیالی ہی ثابت ہوئی۔ اس علاقہ میں 'خادم حسین' کے سوا کسی نے

جھیل کیسے بنتی ہے

جھیلوں کے لیے عموماً دو چیزوں کی ضرورت ہوتی ہے ایک پانی اور دوسری وہ جگہ جہاں وہ اکٹھا ہو یا اسے اکٹھا کیا جائے۔ دنیا میں جھیلیں کسی اور طریقے کی نسبت زیادہ تر گلیشیرز کے باعث وجود میں آئیں۔ اس طرح کی جھیلوں کو "Glacial Lakes" کہتے ہیں۔ اسی طرح اونچے پہاڑوں کی اترائیوں (وادیوں) میں واقع جھیلیں "Alpine Lakes" کہلاتی ہیں۔ یورپ میں ایسی جھیلوں کو "Trans" کہتے ہیں جب کہ مٹی اور برف کے تودوں کے گرنے کی وجہ سے بننے والی جھیلیں "Barrier Lakes" کہلاتی ہیں۔ جھیلیں آہستہ آہستہ بہاؤ کے حامل دریاؤں اور سمندروں کے قریب نچلی سطح کے علاقوں میں بھی عموماً پائی جاتی ہیں۔ ایسی جھیلوں کو "Oxbows" کہتے ہیں۔ اس کے علاوہ قدرتی طور پر پڑنے والے بڑے شگافوں پر مشتمل جھیلیں "Tectonic Lakes" کہلاتی ہیں۔ اسی طرح بعض جھیلیں ایسے علاقوں میں بنتی ہیں جہاں چونے کا پتھر گھل کر خلاء اور گڑھا بناتا ہے اس طرح کی جھیلوں کو "Karast Lakes" کہتے ہیں۔ زیر زمین پانی بھی چونے کے پتھر کو گلا کر زیر زمین جھیلیں بناتا ہے علاوہ ازیں جھیلیں آتش فشاں کے پھٹنے سے بھی بنتی ہیں اور کئی ایک جھیلیں مصنوعی طور پر بھی بنائی جاتی ہیں۔

مرسلہ: راحت علی۔ کراچی

بھی اسے درخورِ اعتناء نہ سمجھا۔
شاہ عالم نے خادم حسین کی مدد پا کر پٹنہ پر حملہ کر دیا۔ اسے ناکامیوں کا تسلسل ختم کرنے کی قوی اُمید تھی لیکن تقدیر کو ہنوز رسوائی و پسپائی ہی منظور تھی۔ اس کے مقابل' کپتان نوکسن' نے 'راجا شتاب رائے' کو اپنا ہم نوا بنا کر اسے شمال کی طرف پسپا ہونے پر مجبور کر دیا۔ انگریز اور بنگال فوج نے اسی پر اکتفانہ کیا بلکہ تعاقب جاری رکھتے ہوئے شمالی علاقہ جات سے بھی بے دخل کر دیا۔

☆☆☆

شاہ عالم کے نہاں زخم قلب و روح میں اذیت برپا کیے ہوئے تھے۔ اسے اپنی ذات' حیثیت اور شخصی وقار سے شدید اجنبیت محسوس ہو رہی تھی۔
''تیموری خاندان کا خون اس قدر ارزاں ہو گیا ہے کہ اسے اتنی آسانی سے شکست دی جا سکتی ہے؟'' اس کے ذہن میں ایک زہریلی سوچ نے سر ابھارا۔
''جلال الدین اکبر کے جانشین اس قدر رسوا کیوں ہو رہے ہیں؟ ہماری حکمت عملی اور جدوجہد میں آخر کہاں کمی رہ جاتی ہے؟'' وہ جھنجلانے لگا۔
شاہ عالم کی اس ذہنی کیفیت کا سبب موشیر لا کی موت بھی تھی۔ وہ اپنے عہد کی پاسداری کرتے ہوئے جواں مردی سے موت کا شکار ہوا تھا۔ ایک باصلاحیت اور وفادار ساتھی کی موت کا تاسف ہی کم نہ تھا کہ اگلے روز انگریز افسران کی آمد اور پیش کش نے شاہی وقار کو سخت ٹھیس پہنچائی۔
''ہم بادشاہ کے لیے چوبیس لاکھ روپے سالانہ خراج مقرر کرنا چاہتے ہیں۔''
انگریزی افسر کے یہ الفاظ سماعت میں گونجتے ہی وہ بے کل ہو گیا۔ ان فسران کو واضح انکار کر دینے کے باوجود دل سے خلش کم ہونے کا نام نہ لے رہی تھی۔ شاہ عالم کا ذہنی خلفشار بڑھنے لگا۔ وہ ایک بار پھر اپنی دیرینہ خواہش سے مغلوب ہونے لگا تھا۔ سازشوں اور کسی بھی بیرونی مداخلت سے پاک ہندو' ایک طاقتور' بااختیار اور بارعب فرماں روا' مضبوط مرکز اور صوبوں کی کلی فرماں برداری۔ بس اتنی سی ہی تو تمنا تھی۔ اس کے بعد زندگی میں خوشبوؤں' پھولوں' تتلیوں اور آرزوؤں کی تکمیل کا سنگم پا لینے کا خواب بھی شرمندۂ تعبیر ہو جاتا تو کیا مضائقہ تھا۔
ان خوابوں کے رومان نے شاہ عالم کا قلم مہمیز کر دیا۔

میرے گلے سے آن کے پیارا جو پر لگے
یہ ابر یہ بہار مجھے خوب تر لگے
مت اس ادا و ناز سے گلشن میں کر گزر
ڈرتا ہوں میں مبادا کسی کی نظر لگے
ہو چار چشم کون کرے ایسے یار سے
آنکھوں کے دیکھتے ہی پیا کی خطر لگے
ہر لیل و ہر نہار تری ذات پاک ہے
کہتا ہے آفتاب دعائے سحر لگے

☆☆☆

شاہ عالم کے ضبط کا پیمانہ لبریز ہو چکا تھا۔ اسے اپنی بے بسی پر شدید تاؤ بھی محسوس ہوتا لیکن کہیں کوئی درماں نہ تھا۔ اسی دوران وزیر خاص کی آمد اور اس کی جانب سے ایک انکشاف نے اسے تاریکی میں ایک جگنو تھما دیا۔
''جہاں پناہ! میر قاسم کی جانب سے ایک پیغام موصول ہوا ہے۔'' وزیر نے بتایا۔
''میر قاسم......میر جعفر......میرن......تف ہے ان سب پر۔'' اس نے نخوت سے کہا۔
''حضور! وہ مداوا کرنا چاہتے ہیں۔''
''کیسا مداوا؟'' شاہ عالم چونک گیا۔
''انہوں نے اپنے پیغام میں عندیہ دیا ہے کہ وہ ابتداً انگریزوں کے ہم نوا تھے لیکن اب ان کی زیادتیوں سے تنگ آ گئے ہیں۔'' وزیر نے مزید انکشاف کیا۔
شاہ عالم کی پیشانی پر شکن ہو گئی۔ اسے میر قاسم کی ذہانت' خودداری اور شخصی اوصاف میں کوئی شبہ نہیں تھا تاہم انگریزوں کی ہم نوائی نے مزاج میں کدورت پیدا کر دی تھی۔
''اس وقت بنگال کے کیا حالات ہیں؟'' اس نے دریافت کیا۔
''انگریز تاجروں کی وجہ سے مقامی تجارت خسارہ کا شکار ہے۔ میر قاسم نے محاصل میں برابری کا اعلان کیا ہے لیکن انگریز اس تبدیلی کو قبول کرنے کے لیے تیار نہیں۔ انہوں نے اپنے پیغام میں بھی یہی عندیہ دیا ہے کہ وہ فوج کو جدید طرز پر منظم کر رہے ہیں۔ توپ خانے بھی تشکیل پا چکے ہیں۔ نواب اودھ شجاع الدولہ نے اس مہم میں اعانت کی تائید کر دی ہے۔ انگریزوں سے ایک جنگ ناگزیر ہو گئی ہے۔''

شاہ عالم کی آنکھوں میں ایک چمک بیدار ہو گئی۔ اسے اقرار کرنے میں بالکل بھی تامل نہ تھا۔

☆☆☆

میر قاسم، شجاع الدولہ اور شاہ عالم کی چالیس ہزار سے زائد سپاہ بہار کے ضلع بکسر میں پڑاؤ زن تھی۔ یہ علاقہ دریائے گنگا کے کنارے واقع تھا۔ ان کے مقابل سات ہزار سپاہیوں پر مشتمل انگریز فوج تھی۔ اس سپاہ کی قیادت میجر ہیکٹر منرو کر رہا تھا۔ انگریز فوج میں محض ساڑھے آٹھ سو یورپی شامل تھے۔ دیگر سپاہی مقامی افراد ہی تھے۔

اگلی صبح دونوں افواج آمنے سامنے ہوئیں تو میجر منرو کی عقابی نگاہوں نے جلد ہی مقابل کی کمزوریاں تاڑ لیں۔ شاہ عالم کے اتحادیوں میں ہم آہنگی مفقود تھی۔ میر قاسم کی توپیں کمزور اور غیر اہم مقامات پر موجود تھیں۔ شجاع الدولہ کی فوج بھی نظم و ضبط سے عاری تھی۔ ان کے حملوں میں اعتماد اور نظم کا فقدان تھا۔ میجر منرو کے حکم پر انگریزوں کے توپچیوں نے مرکز سے گولہ باری کا آغاز کر دیا۔ اس نے فوج کو باقاعدہ ترتیب سے کھڑا رکھا اور توپوں کو حرکت پذیر حصوں میں بانٹ دیا۔ نتیجتاً میدان بدلتے ہوئے بھی گولہ باری میں کوئی تعطل پیدا نہ ہوسکا۔

دوپہر تک صورتِ حال یہ تھی کہ ہندوستانی اتحاد کے سپاہی پسپا ہونے لگے۔ شجاع الدولہ میدان چھوڑ کر بھاگ گیا اور شاہ عالم نے شکست تسلیم کر لی۔ میر قاسم نے بھی موقع دیکھتے ہی فرار میں عافیت سمجھی۔ ہندوستانی اتحاد کی تینوں طاقتیں تاش کے پتوں کی طرح بکھر گئی تھیں۔ بنگال، بہار اور اڑیسہ انگریزوں کے تسلط میں آگئے۔

☆☆☆

انگریزوں نے اپنی فتح کو قانونی حیثیت دینے کے لیے تین معاہدے تشکیل دیے۔ وہ اپنے مخالف کے تمام ترکس بل نکال دینا چاہتے تھے۔ اس ضمن میں شاہ عالم کو بنگال، بہار اور اڑیسہ کی 'دیوانی' کا حق دلایا تاہم عملاً یہ اختیار ایسٹ انڈیا کمپنی کے پاس تھا۔ اس سے کمپنی کو ہندوستان میں محاصل کے حصول کا قانونی حق مل گیا۔

شجاع الدولہ کو بھاری تاوان جنگ ادا کرنا پڑا۔ انگریزوں نے اسے اپنے وسیع تر مفادات کے پیش نظر اسے اودھ کا تخت دوبارہ عطا فرما دیا۔ میر قاسم البتہ نیپال میں روپوش ہو چکا تھا۔

اس جنگ میں شکست کے بعد ہندوستان کے سیاسی اور معاشی اثرات نہایت دگرگوں ہو گئے تھے۔ بنگال، اڑیسہ اور بہار پر انگریزوں کا عملاً قبضہ ہوتے ہی مغل بادشاہ ایک برائے نام حکمران بن کر رہ گیا۔ کمپنی پہلی بار حکومت چلانے اور ٹیکس جمع کرنے والی طاقت بن گئی۔ اسے دیوانی نظام کے ذریعہ سالانہ کروڑوں روپے حاصل ہونے لگے۔ اس دولت سے انگریزوں نے اپنی فوجی طاقت میں بے پناہ اضافہ کیا۔

معاہدہ الٰہ آباد پر دستخط کرتے ہوئے شاہ عالم کی ذہنی کیفیت نہایت پراگندہ تھی۔ حکومت، طاقت اور دبدبہ کے دیرینہ خواب چکنا چور ہو چکے تھے۔ اس لمحہ اسے ایسا محسوس

دنیا کے کسی بھی گوشے میں اور ملک بھر میں گھر بیٹھے حاصل کریں

جاسوسی، ڈائجسٹ، سسپنس ڈائجسٹ
ماہنامہ پاکیزہ، ماہنامہ سرگزشت

ایک رسالے کے لیے 12 ماہ کا زرِ سالانہ بشمول رجسٹرڈ ڈاک خرچ
پاکستان کے کسی بھی شہر یا گاؤں کے لیے 3000 روپے

بیرون ممالک کے لیے زرِ سالانہ 50,000 روپے

بیرون ملک سے قارئین صرف ویسٹرن یونین یا منی گرام کے ذریعے رقم ارسال کریں

رابطہ:
مرزا ثمر عباس
0301-2454188

جاسوسی ڈائجسٹ پبلی کیشنز
63-C فیز II ایکسٹینشن ڈیفنس ہاؤسنگ اتھارٹی
مین کورنگی روڈ۔ کراچی

ہو رہا تھا کہ اگر جنگ پلاسی میں شکست نے انگریزوں کو اس خطہ زمین پر قبضہ کا دروازہ دکھایا تھا تو بکسر کی ہزیمت نے پورے ہندوستان کی عنان ہی انہیں تھمادی تھی۔

شاہ عالم نے لرزیدہ ہاتھوں سے اس معاہدہ پر دستخط کیے اور شکستہ بھنچی ہوئی آواز میں محض یہی کہہ پایا۔

''ہندوستان کی حکومت اب تلوار سے نہیں' قلم سے انگریزوں کے ہاتھ چلی گئی ہے۔''

☆☆☆

شاہ عالم کی زندگی اب ایک نئے تغیر کی زد میں تھی۔ ہندوستانی فرماں روا کو الہ آباد اور کوڑہ جہان آباد جاگیر میں دیتے ہوئے حفاظت پر انگریز فوج مامور کردی گئی۔ شاہ عالم کو اس قید نما زندگی سے سخت گھٹن محسوس ہوتی تھی۔ دہلی کی بہاریں' عظمت رفتہ کا تصور اور دل میں نہاں خلش و ملال کسی بھی طور چین نہ لینے دیتے۔ انجام کار رقص و سرود کی محفلوں اور شاعری میں مزید روانی آ گئی۔ مغنیائیں جو اس پر بجلیاں گراتیں۔ ان کی ناز برداریاں کرتے ہوئے قلم کی جولانی رک کے نہ دیتی۔

وہ گلبدن جو آ کے ہم آغوش ہو کہیں
چوں غنچہ پیرہن میں نہ پھولے سمایئے
ہے مدتوں سے منتظر جلوہ آفتاب
مکھڑے سے تک نقاب کو جلدی اٹھایئے
چھیڑنے کا تو مزا یہ ہے کہو اور سنو!
بات میں تم تو خفا ہوگئے لو اور سنو
اے صنم جس سے جہاں میں آشنائی کیجیے
کیا ہے لازم پھر اس سے بیوفائی کیجیے
اس قدر افسردہ دل کیوں مدتوں سے آفتاب
دیکھ کر ہوتا ہے تجھ کو تنگ دل گلزار کا

☆☆☆

دہلی میں منتقلی کی خواہش اب ایک کرب ناک حسرت کی حیثیت اختیار کرچکی تھی۔ شاہ عالم کی آنکھوں میں گویا ایک ہی خواب بسا تھا۔ وہ ہندوستانی فرماں روا کی حیثیت سے ویسا ہی دبدبہ' اقتدار اور اختیارات محسوس کرنا چاہتا تھا جو اس کے آباؤ اجداد کی میراث تھی۔

شاہ عالم کی اس خواہش کی تکمیل کے لیے تقدیر نے بالآخر ایک در وا کردیا۔ مرہٹوں نے اس کی حفاظت کا وعدہ کرتے ہوئے دہلی بلالیا۔ شاہ عالم کی خوشی کا کوئی ٹھکانا نہیں تھا۔ اس بے بہا مسرت اور جوش و جذبہ میں اسے یہ بھی احساس نہ ہوسکا کہ مرہٹے اسے اپنے اشاروں پر نچانے لگے ہیں۔ شاہ عالم نے 'تکاجی ہلکر' اور 'مہاجی سندھیا' کے ہی ایماء اور تحریک پر 'روہیل کھنڈ' پر حملہ کردیا۔ مرہٹوں نے اس علاقہ میں خوب لوٹ مار کی اور شاہ عالم کو مقررہ خراج دینے سے انکار کردیا۔

شاہ عالم کے لیے ہزیمت کا یہ نیا زخم بہت کاری تھا۔ اس کے ستارے مکمل طور پر گردش میں تھے۔ ایک جانب مرہٹوں کی خودسری سنبھالے نہ سنبھل رہی تھی تو دوسری سمت انگریز اس کی دہلی آمد اور مرہٹوں سے الحاق پر چیں بہ جبیں تھے۔ نتیجتاً الہ آباد معاہدہ ضبط کرکے پچاس لاکھ روپے کے عوض شجاع الدولہ کو فروخت کردیا گیا۔ لارڈ کلائیو نے تین صوبوں کی دیوانی کے عوض 'چھبیس لاکھ روپے دینے کا وعدہ نہایت سہولت سے چکنا چور کردیا۔

شاہ عالم کی زندگی ایک بھیانک تلاطم کی زد میں تھی۔ وقت نے اپنی زنبیل میں موجود معمولی ترین غلطی کا بھی بھرپور تاوان وصول کرنے کی ٹھان رکھی تھی۔ ماضی قریب میں روہیلہ کے حاکم ضابطہ خاں کی اولاد کو دہلی لایا گیا تھا۔ ان میں غلام قادر روہیلہ بھی شامل تھا۔ دہلی آمد کے بعد غلام قادر نے شاہ عالم کے ہاتھوں نہایت زک اٹھائی تھی۔ بادشاہ نے اسے مردانہ اوصاف سے محروم کرتے ہوئے زنانہ کپڑے پہننے پر مجبور کردیا تھا۔ اس کے دل میں پنپتا بغض اور کینہ آتش فشاں کی حیثیت اختیار کرنے لگا تھا۔ غلام قادر نے جوڑتوڑ کرتے ہوئے امیر الامراء کا عہدہ حاصل کرلیا تھا اور اب اسے کسی مناسب موقع کی تلاش تھی۔

☆☆☆

حالات وواقعات کے ان تغیرات اور اپنی جانب بڑھتے خطرات سے بے نیاز شاہ عالم اپنی سابقہ روش پر ہی کاربند تھا۔ رقص و سرود کی محفلوں میں شب بیتنے کا اندازہ بھی نہ ہو پاتا تھا۔ مغنیاؤں' رقاصاؤں کی خوب چاندی ہو چلی تھی۔ وہ شاہ عالم کی شاعری پر سر دھنتے ہوئے اپنی آواز اور رقص کا ایسا جلوہ بکھیرتیں کہ وہ سدھ بدھ سے ہی بے گانہ ہو جاتا تھا۔

سید انشاء کی دہلی آمد اور دربار سے وابستگی سونے پر سہاگا ثابت ہوئی۔ بادشاہ کو ان کے بغیر قرار ہی نہ آتا۔ شاہ عالم کی شاعری بھی ہر گزرتے دن کے ساتھ نکھرتی جا رہی تھی۔

صبح تو جام سے گزرتی ہے

شب دل آرام سے گزرتی ہے
عاقبت کی خبر خدا جانے
اب تو آرام سے گزرتی ہے

☆☆☆

بات کیجیے غیر سے اور ہم سے منہ کو موڑیے
تک خدا سے ڈریے ان دمغوں کو اپنے چھوڑیے
منہ نہ موڑے گا یہ عاصی گر یہی منظور ہے
لیجیے سنگ جفا اور شیشہ دل توڑیے

☆☆☆

چوں شمع تا سحر شب فرقت میں آفتاب
بے اختیار مج کو رلاتی ہے یہ چاندنی

شاعری، موسیقی اور شراب وشباب وقتی طور پر ہر خلش مندمل کر دیتی تھی۔

☆☆☆

دہلی پر مرہٹوں کا اقتدار اور خودسر روش نے غلام قادر کے ضبط کا بند پاش پاش کر دیا۔ اس نے 1787 مرہٹوں کی سرکوبی کے لیے دیگر امراء سے الحاق کر لیا۔ اب اسے ایک مناسب موقع کی تلاش تھی جس سے فائدہ اٹھا کر شاہ عالم سے تمام تر حسابات چکتا کر دیے جائیں۔

شومئی قسمت یہ موقع جنگ سے پہلے ہی میسر آ گیا۔ اس نے بادشاہ کو ہوش وحواس سے بیگانہ دیکھ کر قید کیا اور دونوں آنکھیں نکال لیں۔ شاہ عالم کی تڑپ، اذیت اور کرب ناک صدائیں اسے دلی سکون پہنچا رہی تھیں۔

اس کے بعد غلام قادر مرہٹوں سے نبرد آزما ہوا لیکن کامیابی نہ مل سکی۔ مرہٹوں نے اسے گرفتار کر کے بصارت سے محروم کرنے کے علاوہ ناک، کان، ہاتھ اور پاؤں بھی کاٹ دیے۔ وہ اسے اسی حالت میں شاہ عالم کے پاس بھیجنا چاہتے تھے لیکن اسے لے جانے والوں نے راستہ میں ہی ایک درخت میں سر نیچے اور دھڑ اوپر کر کے لٹکا دیا۔ زخموں سے چور غلام قادر اسی حالت میں عدم سدھار گیا۔

☆☆☆

شاہ عالم کی بصارت سے محرومی کے باوجود مرہٹوں نے اسے بادشاہت کی مسند پر براجمان رکھا۔ وہ اس کی آڑ لیے اپنے ذاتی مفادات کی خوب تسکین کر رہے تھے۔ انگریز اس روش کو کب تک برداشت کر پاتے؟ انہوں نے 1803 میں سندھیا اور 1804 میں جسونت سنگھ سے جنگ کے بعد دہلی پر مکمل قبضہ کر لیا۔ شاہ عالم سے ایک معاہدہ طے کیا گیا۔

☆ فوجداری، مذہبی اور دیوانی مقدمات میں عدالت شرع محمدیؐ کے مطابق ہی فیصلہ کرے گی۔

☆ عدالت فوجداری کا حکم جو قید میعاد کثیر یا سزائے موت پر مشتمل ہوگا، بادشاہ کی مرضی ومنظوری کے بغیر عمل میں نہیں لایا جائے گا۔

☆ بادشاہ کو بلاناغہ تمام دعوؤں اور مقدمے کے فیصلوں کی اطلاع دی جائے گی۔

☆ بادشاہ کو ایک لاکھ روپے کے قریب خراج ادا کیا جائے گا۔ اس کے علاوہ دس ہزار روپے سالانہ مرمت قلعہ و مکانات کے لیے ملیں گے۔

☆ اندرون شہر اراضی مفتوحہ شاہی بادشاہ کی ملکیت ہوگی۔ اس کا انتظام ریذیڈنٹ کے ذمہ ہوگا۔

☆ حساب وکتاب سے بادشاہ کو مطلع کیا جاتا رہے گا۔

☆ فوج اور پولیس کے اخراجات کمپنی برداشت کرے گی۔

اس معاہدہ کے بعد دہلی میں ایک ہی بات زبان زدعام تھی۔

''سلطنت شاہ عالم از دہلی تا پالم''

(پالم دہلی کا ہی ایک باہری علاقہ ہے)

☆☆☆

بصری معذوری، بے بس اقتدار اور ریاست میں برپا شورشوں کے باوجود شاہ عالم کی روش میں کوئی تغیر نہیں آیا تھا۔ موسیقی وشاعری ہنوز آب وتاب سے جاری تھی۔

گو سدھ نہیں اس شوخ ستم گر نے سنبھالی
تس پر بھی کوئی بات ادا سے نہیں خالی
کچھ ہوش نہیں مجھ میں رہا جب سے پلائی
اس نرگس مخمور کی ساقی نے پیالی
شبنم کے عرق میں ہوا خجلت سیتی گل تر
دیکھی جو لب لعل کی اس شوخ کے لالی
وے غیر ہی ہیں جن کی ہر اک بات ہو سنتے
ہم نے تو جو کچھ عرض کی سو سنتے ہی ٹالی

شاہ عالم کے عہد میں سلطنت روبہ زوال تھی لیکن اردو زبان سنور رہی تھی۔ عالمگیر کے دور حکمرانی میں ولی نے اس نظم کا چراغ روشن کیا تھا۔ محمد شاہ کے عہد میں آسمان پر ستارہ بن کے چمکا اور شاہ عالم نے آفتاب بن کر اسے اوج

پر پہنچا دیا۔

بصارت سے محرومی نے اسے نثر میں 'عجائب القصص' اور نظم میں 'نادرات شاہی' املا کروانے کا موقع دیا۔ عجائب القصص شمالی ہند میں اردو نثر کے اوّلین نمونوں میں سے ایک ہے۔ اس کی لسانی انفرادیت بے مثل شمار ہوتی ہے۔ کئی تذکرہ نویسوں نے شاہ عالم کے اردو دیوان کا ذکر بھی کیا ہے جو کہیں نہیں مل پایا۔ اردو، ہندی اور فارسی شاعری کے نمونے اس کی کتاب نادرات شاہی میں موجود ہیں جو اردو کے ساتھ دیوناگری رسم الخط میں ہے۔

☆☆☆

شاہ عالم کی ان مصروفیات بے بہا پر مطمئن انگریز حکمران ایک نئی الجھن کا شکار ہو گئے تھے۔ معاملہ کچھ یوں تھا کہ اس زمانے میں بادشاہ کی حیثیت سے قطع نظر عوامی مقبولیت جوں کی توں ہی برقرار تھی۔ اس وجہ سے کمپنی بھی بادشاہ کا احترام کرنے پر مجبور تھی۔ ایسٹ انڈیا کمپنی کی جانب سے کی گئی تقرریوں کی منظوری بھی بادشاہ سے ہی لینی پڑتی تھی۔ ان تقرریوں میں گورنر جنرل اور اعلیٰ عدلیہ کے مصنفین کو بھی کوئی استثنیٰ حاصل نہ تھا۔

شاہ عالم سے معاہدہ طے کرتے ہوئے انگریزوں کو قطعاً یہ خیال نہ تھا کہ وہ مغلیہ سلطنت کے وجود کو مٹانے کے لیے کوئی قدم اٹھائے اور اپنی ایک خود مختار حکومت تشکیل دے۔ وہ مغل بادشاہ کی آڑ میں ہی اپنے مقاصد پورا کرنا چاہتے تھے۔

کچھ ہی عرصہ بعد 13 جولائی 1804 کو گورنر جنرل لارڈ ولوی نے ایسٹ انڈیا کمپنی کے نام ایک خط میں اس امر کا واضح الفاظ میں اقرار کیا۔

''فرانسیسیوں کو ہندوستان کے شمال مغربی اضلاع میں قوت وغلبہ حاصل ہو گیا تھا۔ ہم نے شہنشاہ شاہ عالم کو فرانس کے اثر سے نجات دلا دی ہے۔ فرانسیسی حکومت اس زبردست آلہ کار سے محروم ہو گئی ہے جس کی آڑ میں برطانوی حکومت کے خلاف فرانس کو ہندوستان پر قبضہ کرنا مقصود تھا۔ اب ہم بادشاہ اور اس کے خاندان کے لیے امن وراحت کے ذمّہ دار ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ہندوستانی ریاستیں ہم پر اعتماد کرنے لگی ہیں کیونکہ ہم نے بادشاہ کو مرہٹوں اور فرانسیسیوں کی قید سے رہائی دلوائی ہے۔ ہمیں عوام کی نظروں میں بادشاہ کا حامی نظر آتے رہنے کی ضرورت ہے۔''

☆☆☆

انگریز افسران کے یہ جذبات دیرپا ثابت نہیں ہوئے۔ کچھ ہی عرصہ بعد ایسٹ انڈیا کمپنی کو عوام وخواص میں بادشاہ کی مقبولیت کھٹکنے لگی۔ ان کے تحفظات وخدشات ایک ہی نکتہ پر مرکوز تھے جسے بعدازاں اعلیٰ انتظامیہ کے گوش گزار اگیا۔

''یہ آبائی سلطنت اگر اسی طرح چلتی رہے گی تو بادشاہت کا سلسلہ ختم نہ ہو سکے گا۔ بادشاہ دہلی کے لال قلعہ میں آباد رہا تو اس کے مصاحب یونہی اس کے در پر حاضری دیتے رہیں گے۔ عوام کی جانثاری اور وفاداری بھی یونہی برقرار رہی تو ایک دن ایسا آئے گا کہ اس تباہ حال سلطنت کو شاہ عالم کے جانشینوں میں سے ہی کوئی شخص بحال کرلے گا۔''

اس تجویز کے بعد شاہی خاندان کو منگیر، منتقلی کی پیش کش کی گئی۔ شاہ عالم کے علاوہ اس کے خاندان کا ہر ایک فرد، مصاحبین اور دہلی کے مقامی افراد نے بھی سختی سے مخالفت کی۔ شاہ عالم کی بے بسی ایک وحشیانہ ردِّعمل میں ڈھل گئی۔ اس نے تلوار کے قبضہ پر ہاتھ رکھ کر کہا۔

''ایسا کبھی نہیں ہو سکتا۔ مجھ میں ابھی زندہ رہنے کی قوت موجود ہے۔ اور زندہ آدمی کو کوئی شخص اپنی پسند کردہ قبر میں دفن نہیں کر سکتا۔''

☆☆☆

اس ردِّعمل کے بعد لارڈ ولہوزی کو اپنا ارادہ ترک کرنا پڑا لیکن اس سے شاہی خاندان کے افراد میں انگریزوں کی نیت سے ایک عام بدگمانی پیدا ہو گئی۔ اس کشمکش اور کسمپرسی کی زندگی میں شاہ عالم زندگی کی خواہش سے محروم ہونے لگا۔ اسے ایک خلش کا جواب مل کے ہی نہ دیتا کہ وہ بدقسمت زیادہ ہے یا مظلوم؟ اس نے پیدائش کے بعد زندگی کے تھپیڑے ہی سہے تھے۔

مغلیہ خاندان کا یہ بے بس حکمران بالآخر نومبر 1805 میں زندگی کی قید سے آزاد ہو گیا۔ اس کی تدفین موتی مسجد قطب صاحب میں ہوئی۔ اس کے مرقد پر کندہ ہے۔

''دے آفتاب روئے زمیں بود پیش ازل
شد آفتاب زیر زمیں آہ وآہماں''

ماخذات:

1857 کے مجاہد شعراء...... امداد صابری

شاپ نمبر 144

واجد رضا اصفہانی

گل پلازا جل گیا۔ بہت سے ارمان، بہت سی خوشیاں بھی راکھ ہو گئیں۔ وہاں جمع لوگوں سے سنی باتوں کو ایک لڑی میں پرو کر یہ چھوٹی سی تصوراتی تحریر قلم بند کی گئی ہے۔

سانحات کے شہر میں رونما ایک سانحہ

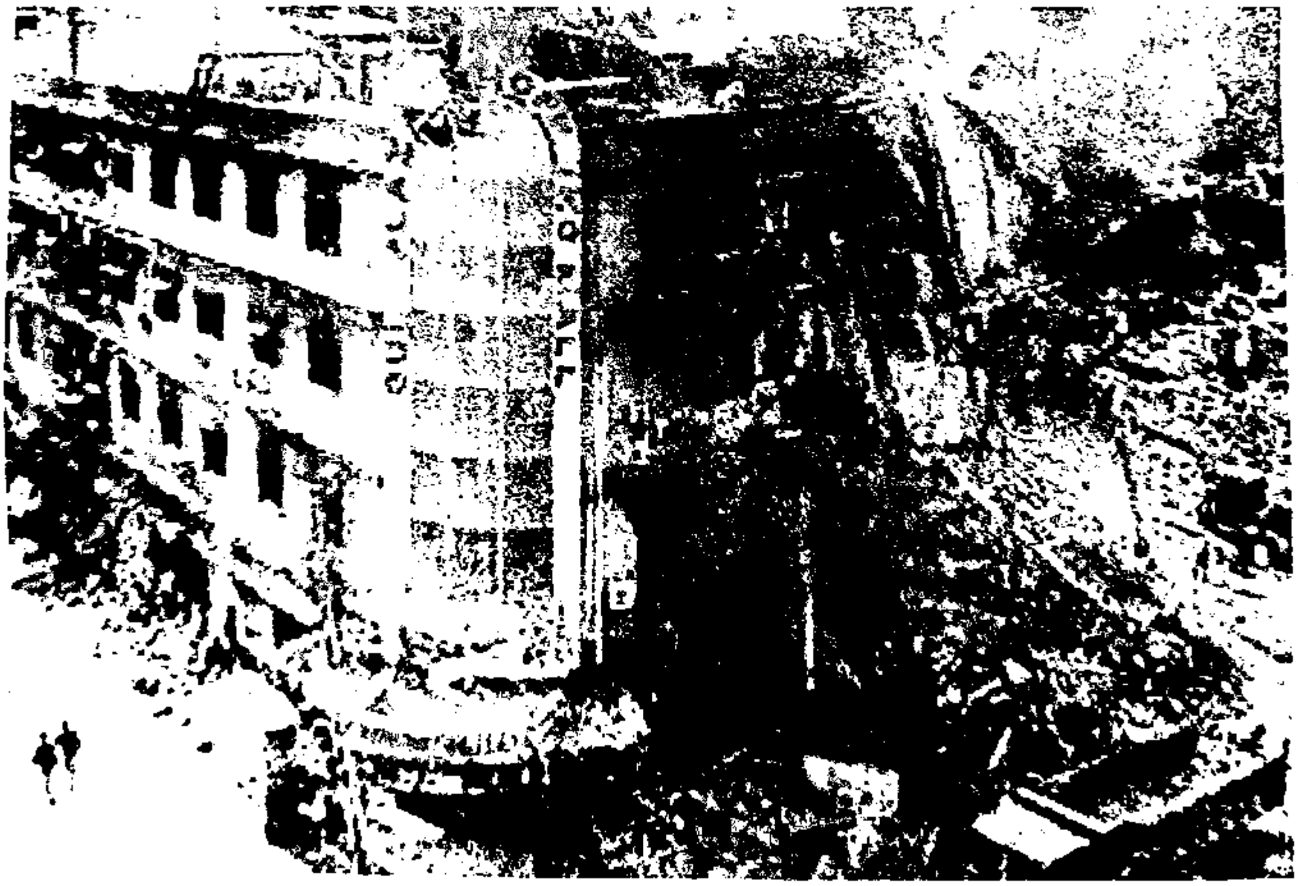

آگ نے اس دن کوئی اعلان نہیں کیا تھا۔

نہ کوئی الارم چیخا، نہ سائرن نے راستہ بنایا، نہ کسی نے اوپر سے آواز دی کہ "باہر نکل آؤ۔"

بس ایک لمحہ تھا۔

جب کراچی کے معروف تجارتی مرکز گل پلازا کی روشنیاں ایک ساتھ جھپکیں، جیسے کسی نے پورے عمارت کی آنکھوں پر ہاتھ رکھ دیا ہو۔ پھر اندھیرا آیا اور اندھیرے کے ساتھ خوف۔

گل پلازا کے میزنائن فلور پر خوف کا راج تھا اسی میں ایک بدنصیب دکان تھی شاپ نمبر 144 جس کا شٹر آدھا جھکا ہوا تھا۔

نہ پوری طرح بند، نہ کھلا۔

بالکل ویسے ہی جیسے اندر کھڑے لوگوں کے دل جو فیصلہ نہیں کر پا رہے تھے کہ بچنے کی امید رکھیں یا انجام قبول کرلیں۔

اندر اندھیرا ایسا تھا جو آنکھوں میں نہیں، سیدھا سینے میں اتر رہا تھا۔

موبائل فون کی ٹارچیں جل رہی تھیں، چھوٹی چھوٹی روشنیوں کے دائرے، جو ایک دوسرے سے ٹکراتے، دیواروں پر کانپتے سائے بناتے۔ یہ روشنی نہیں تھی۔ یہ ضد تھی۔ اندھیرے کے خلاف ایک خاموش بغاوت۔

میزنائن فلور کی طرف سے دھواں چاروں طرف پھیل رہا تھا۔ پہلے ہلکا، پھر گاڑھا، پھر ایسا کہ سانس لیتے ہوئے حلق جلنے لگا۔ ہوا میں جلتے پلاسٹک کی بو تھی، لکڑی کے جلنے کی کڑواہٹ، اور ایک ایسی بو جس کا کوئی نام نہیں ہوتا بس دل پہچان لیتا ہے کہ یہ خوف ہے۔ کراکری کے شیلف اپنی جگہ سلامت کھڑے تھے۔ چمکتی پلیٹیں، قطار میں رکھے کپ، ڈنر سیٹس کے ڈبے سب ایسے لگ رہے تھے جیسے کسی نے وقت کو روک دیا ہو۔

لیکن ان کے درمیان، تقریباً دو درجن زندگیاں سمٹ کر کھڑی تھیں۔ کوئی کسی کے بازو سے لپٹا ہوا، کوئی کسی کے سائے میں، کوئی زمین پر بیٹھا، کوئی دیوار سے ٹیک لگائے۔ سانسیں ایک دوسرے سے الجھ رہی تھیں۔ دکان کے مالک، حاجی صاحب، شٹر کو نیچے دھکیل رہے تھے۔ ان کے ہاتھ کانپ رہے تھے۔ یہ پسینا گرمی کا نہیں تھا، یہ وہ نمی تھی جو صرف خوف پیدا کرتا ہے۔

”بس...... بند رکھو۔“ ان کی آواز لرز گئی۔

یہ حکم نہیں تھا۔ یہ التجا تھی۔ یہ دعا تھی۔

”باہر آگ ہے۔“ انہوں نے تھوک نگل کر کہا۔ ”اندر شاید...... شاید بچ جائیں ہم......“

یہ جملہ دوسروں کے لیے نہیں تھا۔ یہ خود اپنے دل کو سنبھالنے کی کوشش تھی۔ نوجوان سیلز مین جس کی مسکراہٹ اس دکان کی پہچان تھی، جو ہر گاہک کو بھائی صاحب یا باجی کہہ کر بلاتا تھا۔ اب موبائل فون کو اوپر نیچے کر رہا تھا۔ اس کی انگلیاں تیزی سے اسکرین پر پھسلیں۔ چہرہ سفید ہو چکا تھا۔

”حاجی صاحب...... نیٹ ورک نہیں آ رہا۔“ اس نے دوبارہ کوشش کی۔ پھر جیسے اسے یاد آیا کہ اُمید ابھی پوری طرح مری نہیں۔ ”میڈیا والے ہوں گے نیچے۔“ اس کی آواز میں ایک مصنوعی جوش بھر آیا۔

”خبر پھیلے گی...... فائر بریگیڈ آئے گی۔ وہ آگ بجھا دیں گے۔“ کسی نے جواب نہیں دیا۔

لیکن سب نے اس کی بات کو پکڑ لیا، جیسے ڈوبتے ہوئے کو تنکے کا سہارا ہوتا ہے۔ ایک کونے میں تین خواتین زمین پر سمٹی بیٹھی تھیں۔

ساٹھ سالہ ماں نے اپنی بیٹی اور بھانجی کو بازوؤں میں اس طرح جکڑ رکھا تھا جیسے بازو نہیں دیواریں ہوں۔

”ہم نے تو بس چائے کے کپ لینے تھے۔“ ان کی آواز ٹوٹ گئی۔ الفاظ رندھ گئے۔

”اے اللہ......!“

”بس گھر واپس بھیج دے۔“

بیٹی خاموش تھی۔

آنکھوں سے آنسو بہہ نہیں رہے تھے، وہ آستین میں جذب ہو رہے تھے۔ بھانجی کے ہونٹ ہل رہے تھے۔ کبھی دعا، کبھی سسکی، کبھی شاید دونوں ایک ساتھ۔ قریب ہی ایک باپ کھڑا تھا۔ ایک ہاتھ بیٹے کے کندھے پر رکھا ہوا۔ ”ڈرنا نہیں بیٹا......“ اس نے کہا۔ ”میں ہوں نا۔“ لیکن اس کی آواز خود اس پر یقین نہیں کر پا رہی تھی۔

بچہ دس یا گیارہ برس کا ہوگا۔ وہ دکان کے ایک کونے کو گھور رہا تھا۔ ایسے جیسے وہاں کوئی دروازہ ہو جو صرف بچوں کو نظر آتا ہے۔

”بابا......“ اس نے آہستہ سے کہا۔

باپ جھک گیا۔ ”ہاں؟“

”آج نانو کے گھر جانا تھا۔“ بچے کی آواز کانپ گئی۔ ”وہ انتظار کر رہی ہوں گی مٹر چاول بنائے ہیں میری پسند کے۔“

لفظ بکھر گئے۔ وہ آگے کچھ نہ کہہ سکا۔ اچانک وہ اٹھا اور کونے میں جا بیٹھا، جیسے وہاں چھپ کر آگ کو دھوکا دے رہا ہو۔

ایک طرف ایک جوان بہن اپنے چھوٹے بھائی کو سینے سے لگائے بیٹھی تھی۔ ”امی نے کہا تھا...... زیادہ دیر نہ کرنا۔“ اس نے سرگوشی کی۔

”کیا پتا ان کو ہماری خبر ہو یا نہ ہو ورنہ وہ دعا ضرور کرتیں۔“

بھائی نے سر اٹھایا۔ آنکھوں میں آنسو نہیں تھے، ضد تھی۔

”آپ کو کچھ نہیں ہونے دوں گا آپا۔“

بہن نے مسکرانے کی کوشش کی۔ مسکراہٹ آدھی ہی بنی، اور آنسو مکمل بہہ گئے۔

دکان کے درمیان ایک پانچ افراد کی فیملی بیٹھی تھی۔ ماں، باپ اور ان کے تین بچے۔ ماں نے فرش پر رکھے ڈنر سیٹ کے ڈبے پر ہاتھ پھیرا۔ ایسے جیسے وہ ڈبا نہیں، اپنی بیٹی کی پیشانی ہو۔ ”بس یہ آخری خریداری تھی۔“ ان کی آواز دھیمی تھی۔ ”عید

کے بعد شادی ہے میری بچی کا گھر بسنے والا تھا۔"
آگے کا خیال آتے ہی آواز لرز گئی۔

باپ نے اوپر دیکھا۔ جیسے چھت کے پار آسمان نظر آرہا ہو۔ "اے میرے مالک۔" اس نے کانپتی ہوئی آواز میں کہا۔ "ہمیں سلامت نکال دے۔" اسی لمحے پڑوس کی دکان کا سیلز مین دھڑ دھڑاتا ہوا اندر آیا۔

کپڑے کالک سے اٹے تھے۔ سانس اکھڑی ہوئی۔

"ہماری دکان جل گئی۔" اس نے اردگرد دیکھا۔ آنکھوں میں وحشت تھی۔ "یہ...... یہ جگہ محفوظ ہے نا؟"

کسی نے کچھ نہیں کہا۔ سب نے بس سر ہلا دیا۔ اس لمحے جھوٹ بھی امّید کی صورت اختیار کر گیا تھا۔

دروازے کے پاس سیکیورٹی گارڈ کھڑا تھا۔ وردی پر کالک جم رہی تھی۔ آنکھوں میں خالی پن تھا۔ "فورسز آتی ہی ہوں گی۔" اس نے کہا۔

"میں نے دیکھا ہے سیلاب ہو یا زلزلہ ہر آفت میں پہنچتی ہیں۔" وہ خود کو مضبوط دکھانا چاہ رہا تھا۔ لیکن اس کے الفاظ پہلے ہی جل چکے تھے۔

"ریسکیو والے بچا لیں گے۔" کوئی چیخا۔

"کیمرے آن ہوں گے...... حکومت مجبور ہو جائے گی۔" کسی نے سیاست کا سہارا لیا۔ "میں نے ووٹ دیا ہے وہ مرنے نہیں دیں گے۔"

وقت پگھل رہا تھا۔ دھواں گاڑھا ہو رہا تھا۔ سانس آگ کی طرح اندر جاتی اور راکھ بن کر باہر آتی اور شاپ نمبر 144 خاموشی سے سب کچھ دیکھ رہی تھی۔

دکان کے بیچ بیٹھی وہ پانچ افراد کی فیملی اب دھوئیں میں بھی ایک دوسرے کو پہچان رہی تھی۔

ماں نے اپنی بڑی بیٹی کا ہاتھ تھاما ہوا تھا۔ وہی ہاتھ جس پر ابھی چند دن پہلے مہندی کا رنگ آزمایا گیا تھا۔

"اماں......" بیٹی نے آہستہ کہا۔ "اگر میں نے وہ سبز جوڑا ہی پہن لیا ہوتا نا جو خالہ نے پسند کیا تھا۔"

ماں کی آنکھوں سے آنسو بہہ نکلے۔ "چپ کر پاگل لڑکی۔ تو جو پہنے گی، اچھی ہی لگے گی۔"

چھوٹی بہن نے چونک کر کہا۔ "امی! آپ نے زیوروں کی لسٹ ابو کو دی تھی نا؟ وہ سونے کی چوڑیاں۔"

ماں نے اثبات میں سر ہلایا۔ "ہاں...... وہی جو تیری نانی نے دی تھیں۔"

"کہتی تھیں، بیٹی کی شادی میں کام آئیں گی۔" باپ نے گلا صاف کیا۔ وہ اب تک خاموش تھا۔

"میں نے ہال بھی بک کرا لیا تھا۔" اس نے دھیمی آواز میں کہا۔ "چار سو آدمیوں کا کہہ رہے تھے مہنگا ہے۔ مگر میں نے کہا۔ بیٹی کی خوشی سے بڑھ کر نہیں ہے۔"

بیٹی نے آنکھیں بند کر لیں۔ اس کے ذہن میں اسٹیج آیا، پھول، روشنی، اور ابا کا وہ ہاتھ جو رخصتی پر کانپتا ہے۔

"ابا......" اس نے لرزتی آواز میں کہا۔ "آپ نے وعدہ کیا تھا نا کہ مجھے خود اسٹیج تک لے جائیں گے۔"

باپ کا سر جھک گیا۔

دھواں آنکھوں میں گیا، یا آنسو پتا نہیں۔

"میں لے جاتا بیٹا۔ ضرور لے جاتا۔"

چھوٹا بھائی ماں کے قریب سرک آیا۔ "آپ رونے لگیں تو ہم سب ناراض ہو جائیں گے۔" اس نے معصومیت سے کہا۔ ماں ہنسنے کی کوشش میں رو پڑی۔

"یہ بچہ بھی نا۔" گرمی بڑھ رہی تھی۔ مگر ان باتوں میں شادی کی خوشبو تھی جو آگ سے زیادہ ضدی ہوتی ہے۔

دکان میں وہی باپ اور بیٹا اب فرش پر بیٹھ چکے تھے۔

باپ نے پلاسٹک کی تھیلی کو مضبوطی سے پکڑا ہوا تھا۔ "یہ دیکھو......" اس نے بیٹے کو دکھایا۔ "تمہاری نانو کے لیے کینو بھی لیے ہیں، میٹھے ہیں اور وہ مصالحہ جو وہ خاص مانگتی ہیں۔"

بچہ دھیرے سے مسکرایا۔ "نانو کہتی ہیں مصالحے کے ساتھ کینو کھانے کا مزہ ہی الگ ہوتا ہے۔"

باپ نے اثبات میں سر ہلایا۔

بچہ پھر بولا۔ "بابا...... نانو کو تو پتا ہے کہ ہم لوگ یہاں آئے ہوئے ہیں۔ وہ اب کیا کریں گی؟"

باپ نے فوراً کہا۔ "وہ تو جا نماز پر بیٹھی ہوں گی کہہ رہی ہوں گی۔ اے خدا! میرے نواسے کو سلامت رکھ۔"

بچے نے آنکھیں بند کرتے ہوئے کہا۔ "وہ میرے بالوں میں ہاتھ پھیرتی ہیں اور کہتی ہیں میرا شیر آ گیا۔"

باپ نے بیٹے کو سینے سے لگا لیا۔ "تمہاری نانو" ان کی آواز ٹوٹ گئی۔ "تمہیں دیکھے بغیر سو نہیں سکتیں۔" انھوں نے آہستہ سے کہا۔ "اگر ہم دیر سے پہنچے تو دروازہ کھلا ہی رکھیں گی۔"

دھواں اب نیچے جھکنے لگا تھا۔ سانس لینا مشکل ہو رہا تھا۔

بچہ کھانسا۔ "بابا۔ اگر ہم آج نہ پہنچے تو؟"

باپ نے آنکھیں بند کر لیں۔

"پھر تمہاری نانو خود آ جائیں گی ہمیں لینے۔" یہ کہتے

ہوئے انھوں نے بیٹے کی پیشانی چوم لی۔

اب شاپ نمبر 144 میں آوازیں تیز ہوگئی تھیں۔

''یااللہ!''

''اے پروردگار!''

کسی نے زور سے کہا۔''دروازہ کھول دو۔''

حاجی صاحب نے لرزتی آواز میں کہا۔''باہر آگ ہے۔''

سیکیورٹی گارڈ نے وردی کے بٹن کھول دیے۔''میرا فرض بس یہاں تک تھا۔''

سیلز مین چیخ پڑا۔''ہم مر نہیں سکتے۔ میری ابھی بات ہوئی ہے میری ماں انتظار کر رہی ہے۔''

ایک عورت نے دعا کے لیے ہاتھ اٹھا دیے۔''اگر بچانا نہیں تو آسانی دے دے مالک۔''

گرمی ناقابلِ برداشت ہو گئی۔ دیواریں تپ رہی تھیں۔ سانس جل رہی تھی۔ آگ اب اندر آچکی تھی۔ اُمید اب صرف دعا کی صورت رہ گئی تھی۔ کسی معجزے کی منتظر، آخر وہ لمحہ بھی آگیا جب الفاظ جل گئے۔

باپ نے بیٹے کو مضبوطی سے پکڑ لیا۔''آنکھیں بند کر لو اور مجھے معاف کر دو بیٹا۔''

ماں نے بیٹی کا سر سینے سے لگا لیا۔''میری شہزادی۔''

برتن گرنے لگے۔ شیشے ٹوٹنے۔ لیکن چیخیں نہیں تھیں۔ صرف سرگوشیاں۔ کہیں کلمے کی آواز۔ کہیں پکار۔

''امی۔''

''بابا۔''

''نانو۔''

''اللہ۔''

مجھے معاف کر دیں اور پھر شاپ نمبر 144 خاموش ہو گئی۔

گل پلازا میں آگ جلتے جلتے بجھا دی گئی۔ لیکن کچھ کہانیاں راکھ میں بھی زندہ رہتی ہیں۔ جہاں یقین زندہ رہا مگر زندگی وہیں رک گئی۔

خاموشی کے بعد ایک عجیب سی بازگشت رہ گئی تھی۔ ایسی خاموشی جو شور سے زیادہ بھاری ہوتی ہے۔ آگ اب دشمن نہیں رہی تھی وہ اپنا کام مکمل کر چکی تھی۔

فائر بریگیڈ کے عملے کی کوششیں بے سود ثابت ہوئیں۔ پانی کی تیز دھاریں جلے ہوئے خوابوں پر پڑیں، اور بھاپ بن کر آسمان میں گم ہو گئیں۔

ریسکیو اہلکار شاپ نمبر 144 کے سامنے رکے۔ جلے ہوئے شٹر کو کاٹتے ہوئے لوہے کی چیخ سنائی دی جیسے وہ بھی گواہی دے رہا ہو کہ اندر کیا گزری تھی۔

جب دروازہ کھلا تو دھوئیں نے باہر کی ہوا سے ٹکرا کر ایک لمحے کو پیچھے ہٹنے کی کوشش کی، جیسے راز چھپانا چاہتا ہو۔ لیکن راز چھپتے نہیں۔ اندر زندگیاں ایک دوسرے سے لپٹی ہوئی تھیں۔ کوئی بھاگا نہیں تھا۔ کوئی چیخا نہیں تھا۔ ہر ایک نے کسی اپنے کو تھاما ہوا تھا۔

باپ اور بیٹا اب بھی ایک دوسرے کے گرد بندھے تھے۔

بچے کا چہرہ باپ کے سینے میں چھپا ہوا، جیسے نانو کی گود مل گئی ہو۔ وہ پانچ افراد کی فیملی ایک دائرے میں تھی۔ ماں کا ہاتھ بٹی کے سر پر، بیٹی کا سر ماں کے دل پر، باپ کی پشت دیوار سے لگی ہوئی، اور چھوٹے بہن بھائی اس دائرے کے اندر تھے۔

جیسے انھیں بچانے کے لیے درمیان میں بٹھایا ہو، زیور بھی جل چکے تھے۔ مہندی لگے ہاتھ بھی نہ رہے۔ سب کچھ بدل گیا تھا۔ باہر لوگ جمع ہو گئے تھے۔ کسی کی زبان پر نام تھا، کسی کی آنکھوں میں تصویر۔

کسی نے کہا۔''میرا بھائی تھا۔''

''میری ماں اندر تھی۔'' کسی نے آواز لگائی۔

کچھ مرد زمین پر بیٹھ گئے۔ کچھ دیواروں سے ٹیک لگا کر رو دیے۔ اور کچھ خاموش کھڑے رہے کیونکہ بعض صدمے آواز چھین لیتے ہیں۔

اگلے دن اخبارات نے سرخی لگائی۔''گل پلازا میں آتش زدگی۔ کئی افراد جاں بحق۔''

لیکن سرخی میں وہ وعدے نہیں تھے۔ جو ایک باپ نے کیے تھے۔ وہ شادی کا جوڑا نہیں تھا۔ جو کبھی پہنا نہ جا سکا۔ وہ نانو کا دروازہ نہیں تھا جو رات بھر کھلا رہا۔ شاپ نمبر 144 ایک سوال بن چکی تھی۔ جس کا جواب ہر شہر، ہر عمارت، اور ہر بند دروازہ اب بھی دینے سے قاصر ہے۔

وقت آگے بڑھ گیا۔ شہر کے لوگ پھر خریداری میں مصروف ہو گئے۔ عید جو سر پر ہے۔ لیکن کچھ مائیں اب بھی چائے کے کپ دیکھ کر کانپ جاتی ہیں۔ کچھ بچے اب بھی آگ سے پہلے ماں کا ہاتھ مضبوطی سے پکڑ لیتے ہیں۔

کیونکہ آگ صرف جسم نہیں جلاتی وہ یادوں میں ہمیشہ کے لیے رہ جاتی ہے۔

++

فریبِ ناتمام

دانیال حسن چغتائی

شطرنج کی بساط پر ہر مہرہ آزاد ہوتا ہے ... چال چلنے کا محتاج کہلاتا ہے لیکن زندگی کی بساط پر بچھے مہرے خود ہی چال چلنا شروع کر دیتے ہیں۔ جانی، فریز، میری اور روٗبہ چاروں کھلاڑی بھی تھے اور بساط کے مہرے بھی۔

ایک ناتمام فریب کی دلچسپ داستان

شام کے سائے گہرے ہو رہے تھے۔ ڈیفوڈل ہوٹل کے نیم تاریک اور گرد آلود کیبن میں جانی بے چینی سے اپنی انگلیوں کو میز پر بجا رہا تھا۔ اس کے چہرے پر تھکن کے آثار نمایاں تھے۔ کچھ دیر بعد کیبن کا پردہ سرکا اور فریز اندر داخل ہوا۔ فریز کا حلیہ بگڑا ہوا تھا، بال بکھرے ہوئے، قمیص کے بٹن کھلے ہوئے اور پیشانی پر پسینے کی بوندیں چمک رہی تھیں۔

''کیا وہ مر گئی؟'' جانی نے سرگوشی کے انداز میں

پوچھا۔ اس کی نظریں فریز کے لرزتے ہوئے ہاتھوں پر جمی تھیں۔

فریز نے کرسی پر ڈھیر ہوتے ہوئے اپنا چہرہ دونوں ہاتھوں میں چھپا لیا۔ اس کے بدن میں تھرتھراہٹ تھی جو خاموشی میں بھی محسوس کی جا سکتی تھی۔ ویٹر کے آنے پر جانی نے دو کڑک چائے کا اشارہ کیا اور دوبارہ فریز کی طرف متوجہ ہوا۔

"میں بہت خوفزدہ ہوں جانی! میرا پورا جسم کانپ رہا ہے۔ مجھے سمجھ نہیں آ رہا کہ یہ سب پلک جھپکتے میں کیسے ہو گیا۔"

فریز کی آواز میں لرزش تھی۔ "میں اور میری...... ہم ہمیشہ کی طرح بحث کر رہے تھے۔ وہ مجھ سے بےزار ہو چکی تھی، اسے شہر کی چکاچوند اور مہنگے خوابوں کی طلب تھی۔ جب اس نے طلاق کا مطالبہ کیا تو میرا پارہ چڑھ گیا۔ میں اسے روکنے کے لیے آگے بڑھا، شاید میں نے اسے دھکا دیا یا وہ خود پیچھے ہٹی، مجھے ٹھیک سے یاد نہیں۔ بس اتنا پتا ہے کہ وہ پیچھے رکھی ہوئی اس بھاری لکڑی کی میز سے ٹکرائی اور اس کا سر کونے پر لگا۔ اس کی چیخ نکلی اور پھر...... خاموشی۔ وہ فرش پر بےحس و حرکت پڑی تھی۔ میں نے اس کی نبض دیکھی، اس کا سانس رک چکا تھا۔ جانی! میں نے اسے جان بوجھ کر نہیں مارا، وہ بس حادثہ تھا!"

جانی نے چائے کا گرم گھونٹ بھرا اور سردمہری سے بولا۔ "حادثہ یا قتل، قانون کی نظر میں یہ سب ایک ہی ہے۔ تم جانتے ہو ہمارے ملک میں پولیس کا نظام کیسا ہے؟ اگر تم پکڑے گئے تو تمہاری باقی زندگی جیل کی ان سلاخوں کے پیچھے گزرے گی جہاں سورج کی روشنی بھی نہیں پہنچتی۔ تمہارا کیریئر، تمہاری عزت، سب خاک میں مل جائے گا۔"

فریز نے ہراساں نظروں سے جانی کو دیکھا۔ "تو میں کیا کروں؟ میں نے لاش کو بیڈروم میں چھپا دیا ہے، لیکن میں اسے وہاں زیادہ دیر نہیں رکھ سکتا۔ بدبو سے پڑوسیوں کو شک ہو جائے گا۔"

جانی نے فریز کے کندھے پر ہاتھ رکھا۔ "دیکھو فریز، میں تمہارا بچپن کا دوست ہوں۔ میں تمہیں اس دلدل میں اکیلا نہیں چھوڑ سکتا۔ میں لاش کو ٹھکانے لگانے میں تمہاری مدد کروں گا۔ میرے پاس شہر سے دور پرانا گودام ہے، وہاں کسی کو پتا نہیں چلے گا۔ لیکن...... دوستی کے اس امتحان میں تمہیں بھی میرا ایک کام کرنا ہو گا۔"

فریز نے فوراً کہا۔ "تم جو کہو گے میں کروں گا جانی، بس مجھے اس مصیبت سے نکالو۔"

جانی کی آنکھوں میں شیطانی رنگ ابھرا۔ "میری بیوی زو...... وہ اب میرے لیے بوجھ بن چکی ہے۔ وہ جائیداد میں آدھے حصے کی دعویدار ہے اور مجھے بلیک میل کر رہی ہے۔ اگر وہ طلاق لیتی ہے تو میں سڑک پر آ جاؤں گا۔ میں چاہتا ہوں کہ تم اسے راستے سے ہٹا دو، تم اسے قتل کر دو، میں تمہارا جرم چھپا دوں گا۔ یوں ہم دونوں آزاد ہو جائیں گے۔"

فریز کا رنگ فق ہو گیا۔ "کیا؟ میں...... میں کسی کا قتل کیسے کر سکتا ہوں؟ میں تو میری کی موت سے بھی مرنے والا ہو رہا ہوں۔"

جانی نے سختی سے اس کا ہاتھ دبایا۔ "تم پہلے ہی قاتل ہو فریز! میری کی لاش تمہارے بیڈروم میں پڑی ہے۔ اگر میں پولیس کو فون کر دوں تو تم ابھی ہتھکڑیوں میں ہو گے۔ فیصلہ تمہارا ہے، یا تو میرے ساتھ مل کر نئی زندگی کی شروعات کرو یا پھر عمر قید کے لیے تیار ہو جاؤ۔"

فریز کے پاس کوئی راستہ نہیں تھا۔ اس نے بادل ناخواستہ ہامی بھر لی۔

☆☆☆

دو دن بعد، اسی ہوٹل اور تاریک کیبن میں جانی بےصبری سے انتظار کر رہا تھا۔ جب فریز آیا تو اس کی آنکھیں سرخ ہو رہی تھیں۔

"ہو گیا؟" جانی نے پوچھا۔

فریز نے اثبات میں سر ہلایا۔ "ہاں، سب ختم ہو گیا۔ میں تمہارے گھر میں پچھلے دروازے سے داخل ہوا۔ تمہاری بیوی کچن میں تھی، اسے سنبھلنے کا موقع بھی نہیں ملا۔ میں نے اسے ڈکیتی کا رنگ دیا ہے تاکہ پولیس ملزم کو تلاش کرتی رہے۔" اس نے لمبی آہ بھری۔ "جانی، میں نے تمہارا قرض اتار دیا، اب میں سکون سے نہیں سو سکوں گا۔"

جانی نے فاتحانہ مسکراہٹ کے ساتھ کہا۔ "فریز، جذبات کو ایک طرف رکھو۔ اب ہم دونوں محفوظ ہیں۔ میری کی لاش میں نے ٹھکانے لگا دی ہے اور زو اب تمہارے راستے کا کانٹا نہیں رہی۔"

لیکن.... اتنی سادہ نہیں تھی جتنی جانی سمجھ رہا تھا۔ جانی جب اپنے خفیہ ٹھکانے یعنی شہر سے دور پُرتعیش کاٹیج پر پہنچا تو وہاں میری، فریز کی بیوی صوفے پر بیٹھی بوتل سے اپنا پسندیدہ مشروب گلاس میں ڈال کر پی رہی تھی۔ وہ زندہ تھی اور بہت خوش نظر آرہی تھی۔

''تمہاری اداکاری لاجواب تھی میری!'' جانی نے اسے گلے لگاتے ہوئے کہا۔ ''فریز کو سچ مچ یقین ہوگیا کہ تم مرگئی ہو۔ اس بے وقوف نے خوف کے مارے میری بیوی زو کو قتل کر دیا اور اب وہ ہمیشہ کے لیے میرے بس میں ہے۔''

میری ہنسی۔ ''مجھے تو اپنی ہنسی روکنا مشکل ہو رہی تھی جب میں فرش پر پڑی اس کے رونے کی آوازیں سن رہی تھی۔ بے چارہ فریز! اسے کیا معلوم کہ ہم نے یہ سارا ناٹک اسے قاتل بنانے کے لیے کیا تھا۔ اب جب زو مر چکی ہے تو تم اس کی جایداد کے اکیلے مالک ہو، اور ہم دونوں اس رقم پر عیش کریں گے۔''

جانی نے اطمینان کی سانس لی۔ اسے لگا کہ اس نے زندگی کی سب سے بڑی جنگ جیت لی ہے۔ ''اب میں گھر جاؤں گا، زو کی لاش دیکھ کر رونا دھونا کروں گا اور پولیس کو ڈکیتی کی رپورٹ درج کراؤں گا۔''

جانی جب اپنے عالی شان بنگلے میں داخل ہوا، تو وہاں کا منظر دیکھ کر اس کے ہاتھوں کے طوطے اڑ گئے۔ لیونگ روم کی لائٹیں روشن تھیں اور اس کی بیوی زو، جسے فریز کے بقول قتل ہو جانا چاہیے تھا، بالکل تندرست حالت میں صوفے پر بیٹھی اسے گھور رہی تھی۔

☆☆☆

''تم...... تم زندہ ہو؟'' جانی کی آواز بمشکل نکل پائی۔ اس کا دماغ گھومنے لگا۔ ''فریز نے تو کہا تھا کہ اس نے تمہیں مار دیا ہے۔''

زو نے سرد مہری سے مسکراتے ہوئے چائے کا سپ لیا۔ ''فریز مر چکا ہے جانی! اور اسے میں نے مارا ہے۔''

جانی کے پیروں تلے سے زمین نکل گئی۔ ''تم نے اسے کیوں مارا؟''

زو کھڑی ہوئی اور جانی کے قریب آکر بولی۔ ''تم کیا سمجھتے تھے کہ میں بیوقوف عورت ہوں؟ میں تمہارے اور اس میری کے چکر کے بارے میں مہینوں سے جانتی تھی۔ فریز جب یہاں مجھے مارنے آیا تو میں نے اسے

1857ء کے بعد ہندوستان کے شاعروں میں جدید افکار ونظریات پروان چڑھے، جدید افکار ونظریات میں ماضی کی محرومیوں کا غم تھا اس کے ساتھ ساتھ حال کی نفسیاتی الجھنوں کا ایک سیلاب بھی تھا، مسلمانوں کا اقتدار ختم ہو چکا تھا، انگریزوں کی حکومت کا جال ہندوستان میں پھیل چکا تھا۔ زندگی کے جملہ شعبوں میں ایک نئی تبدیلی آرہی تھی۔ تجارت، صنعت و حرفت میں نئے انداز شامل ہو چکے تھے۔ پریس اور اخبارات، جدید نظام تعلیم کا ارتقا ہو رہا تھا، ان ترقیوں میں مذہب اور مسلمانوں کی قدیم تہذیب کا سرمایہ بھی خطرے سے دوچار تھا۔ مذہب اور ثقافت کے مٹنے کا خوف، شاندار ماضی کا تحفظ کس طرح کیا جائے، یہ ایسے مسائل تھے جو شاعروں اور ادیبوں کو سوچنے سمجھنے، غور وفکر کرنے پر مجبور کر رہے تھے، لیکن جلد ہی شاعروں نے جدید فکر حاصل کی اور اپنے نظریات کو ادب اور زندگی کے مستحکم رشتوں سے وابستہ کرلیا۔ روشن خیال ادیبوں اور شاعروں نے قومی تعمیر اور ذہنی تشکیل کے لیے اردو شاعری کی ایک نئی شاہراہ تلاش کرلی۔ جدید افکار ونظریات، مذہبی و ادبی مسائل کے نتیجے میں 1857ء کے بعد شعوری تحریک شروع ہوگئی اس تحریک کے ایک اہم رکن سرسید بھی تھے۔

مرسلہ: الطاف بٹ، میرپور آزاد کشمیر

آبی شیشہ
(Water Glass)

اس کا کیمیائی نام سوڈیم سلیکیٹ ہے جو سوڈیم، سلیکان اور آکسیجن کا مرکب ہے۔ آبی شیشہ یا واٹر گلاس پانی میں حل ہوجاتا ہے اور گاڑھا محلول بناتا ہے، جو بڑا کارآمد ہوتا ہے۔ آبی شیشے کا استعمال چھاپے خانوں میں کیا جاتا ہے۔ آگ سے اثر قبول نہ کرنے والا کپڑا تیار کرنے والی صنعت میں، صابن سازی کے کارخانوں میں اور انڈوں کو محفوظ کرنے کے عمل میں آبی شیشہ استعمال ہوتا ہے۔ علاوہ ازیں فرنیچر کے پالش کے لیے بھی استعمال کیا جاتا ہے۔

سب کچھ بتا دیا۔ میں نے اسے تمہارے اور میری کے خفیہ پیغامات دکھائے اور اسے احساس دلایا کہ تم دونوں نے مل کر اسے دھوکا دیا ہے۔ جب اسے حقیقت معلوم ہوئی، تو وہ پاگل ہو گیا اور مجھ پر حملہ آور ہونے لگا۔ میں نے دفاع میں اس پر گولی چلا دی۔"

جانی نے تھوک نگلتے ہوئے کہا۔ "مگر...... مگر پولیس؟"

"پولیس آ رہی ہے جانی! لیکن وہ تمہیں پکڑنے آ رہی ہے۔ میں نے ثبوت اکٹھے کر لیے ہیں کہ تم نے فریز کو اپنی بیوی کے قتل پر اکسایا اور اس کے ساتھ مل کر میری کی فرضی موت کا ڈراما رچا کر اسے بلیک میل کیا۔ فریز کا قتل تو دفاعی تھا لیکن تمہاری سازش تمہیں پھانسی تک لے جائے گی۔"

☆☆☆

جانی ہراساں ہو کر میری کے پاس بھاگا۔ اسے لگا کہ اب میری ہی اس کا ساتھ دے سکتی ہے، اس کے علاوہ کوئی اسے نہیں بچا سکتا۔

"میری! سب برباد ہو گیا۔ فریز مر گیا اور زو نے پولیس کو فون کر دیا ہے۔ ہمیں ابھی یہاں سے نکلنا ہوگا۔"

میری نے حیرت اور غصے سے اسے دیکھا۔ "فریز مر گیا؟ اسے کس نے مارا؟"

جانی کی شک کی عادت دوبارہ جاگ اٹھی۔ اس نے سوچا کہ کہیں میری بھی زو کے ساتھ تو نہیں ملی ہوئی؟

"تمہارا رویہ اتنا بدلا ہوا کیوں ہے میری؟ کیا تم بھی اس سب میں شامل ہو؟"

اس نے اپنے کوٹ کی جیب سے پستول نکال لی۔ "میں کسی پر بھروسا نہیں کر سکتا۔ اگر میں ڈوب رہا ہوں تو تمہیں بھی ساتھ لے کر جاؤں گا۔"

میری پیچھے ہٹی۔ "جانی! تم پاگل ہو گئے ہو، میں تمہاری شریکِ جرم ہوں۔"

"نہیں! تم صرف اپنے مفاد کی ساتھی ہو۔ پولیس کو یہاں تمہاری لاش ملے گی اور وہ یہی سمجھیں گے کہ فریز نے پہلے میری کو مارا، پھر زو کو مارنے کی کوشش کی اور آخر میں تم نے خودکشی کر لی۔"

جانی نے نشانہ باندھا لیکن اس سے پہلے کہ وہ ٹریگر دباتا، باہر سے پولیس کی گاڑیوں کے سائرن سنائی دیے۔

کچھ دیر بعد، جانی ہتھکڑیوں میں جکڑا ہوا پولیس اسٹیشن کے لاک اپ کے سامنے کھڑا تھا۔ اس کے سامنے زو اور فریز کھڑے تھے۔

"فریز؟" جانی کی آنکھیں حیرت سے پھٹی کی پھٹی رہ گئیں۔ "تم...... تم تو مر چکے تھے؟"

فریز نے قہقہہ لگایا۔ "یہی تو تمہاری غلطی تھی جانی، تم نے سب کو مہرہ سمجھا لیکن یہ بھول گئے کہ مہرے بھی چال چل سکتے ہیں۔ جب تم نے میری کی موت کا یقین کر کے مجھے زو کے قتل پر اکسایا، تبھی مجھے شک ہو گیا تھا۔ میں میری کی فطرت سے واقف تھا، وہ اتنی آسانی سے مرنے والی نہیں تھی۔ جب میں واپس گھر گیا، تو وہاں میز پر میری کی تازہ لپ اسٹک کے نشانات والا گلاس ملا جبکہ تمہارے مطابق تم نے لاش ٹھکانے لگا دی تھی۔"

زو نے فریز کا ہاتھ تھامتے ہوئے کہا۔ "پھر فریز میرے پاس آیا۔ ہم نے مل کر تمہارا منصوبہ تمہارے ہی خلاف استعمال کیا۔ میں نے میری کو بھی اس کھیل میں شامل کر لیا کیونکہ اسے تم سے زیادہ پیسوں سے پیار تھا۔ ہم نے یہ سارا ڈراما رچایا تاکہ تم خود اپنے جرم کا اعتراف کرو اور میری کے قتل کی کوشش میں رنگے ہاتھوں پکڑے جاؤ۔"

جانی نے بے چارگی سے میری کی طرف دیکھا جو اب زو کے ساتھ کھڑی مسکرا رہی تھی۔

میری نے کہا۔ "جانی! تم نے بیس سال زو کے ساتھ گزارے لیکن اسے پہچان نہ سکے اور میں نے چند ماہ تمہارے ساتھ گزارے اور تمہیں جان گئی۔ تم ایک خود غرض انسان ہو اور خود غرضی کا انجام یہی ہوتا ہے۔"

فریز نے آخری ضرب لگائی۔ "جانی! میری کی لائف انشورنس اور تمہاری جائیداد کا بڑا حصہ اب زو کا ہے اور ہم دونوں نے فیصلہ کیا ہے کہ ہم مل کر اس دولت کو سنبھالیں گے۔ تمہارے اس احسان کا شکریہ کہ تم نے ہمیں ایک دوسرے سے ملوایا اور ہمیں نئی زندگی شروع کرنے کا موقع دیا۔"

جانی سلاخوں کے پیچھے اکیلا رہ گیا جہاں اب تنہائی اور پچھتاوا اس کے ساتھی تھے۔ اس نے دوسروں کے لیے گڑھا کھودا تھا لیکن وہ خود اس کی گہرائیوں میں جا گرا تھا۔

دھوکے کی بنیاد پر رکھی گئی عمارت کبھی پائیدار نہیں ہوتی اور دوسروں کے لیے بچھایا گیا جال اکثر شکاری کو ہی اپنا شکار بنا لیتا ہے۔

++

دوسرا حصہ

باکمال اداکارہ

علی سفیان آفاقی

پاکستان کی اس اداکارہ نے دولت شہرت کے ساتھ وہ مقام بھی حاصل کرلیا تھا جو کسی اور اداکارہ کے حصے میں نہیں آیا۔ اس کی زندگی ہمیشہ مدوجزر میں رہی۔ غیر متوقع اتار چڑھائو کا وہ شکار رہی۔ اپنے حالات کے آئینے میں وہ اگر ایک مرحلے پر ہمدردی کی مستحق نظر آتی ہے تو دوسرے ہی لمحے اس کا کردار ظالم حسینہ کا سا ہوجاتاہے۔

صف اوّل کی اداکارہ کے عروج وزوال کی داستان

بابرہ نے 1951ء میں لاہور کی ہیرامنڈی میں جنم لیا تھا۔اس حساب سے اس کی عمر اس وقت چوہتر سال ہے مگر کیا وہ دیکھنے میں بھی چوہتر سال کی عورت نظر آتی ہے؟ ہرگز نہیں یہ تسلیم کہ اس کا جسم ہمیشہ ہمیشہ سے ایک مکمل عورت کا جسم ہے مگر اس کا چہرہ آج بھی ایک دوشیزہ کا چہرہ نظر آتا ہے۔ بابرہ کے والد کا نام محمد شریف تھا۔شریف صاحب کی ہیرامنڈی میں دکان تھی اور وہ گھی فروخت کیا کرتے تھے۔ بابرہ کو شریف کا نام باپ کی رعایت سے ملا ہے۔

محمد شریف تین لڑکیوں اور ایک لڑکے کا باپ بنا۔ ہیرا منڈی میں بیٹیاں کسی نعمت سے کم نہیں تصور کی جاتیں اور

شریف تو ایک چھوڑ تین بیٹیوں کا باپ تھا۔ بابرہ کی سب سے بڑی بہن فردوس ہے۔ منجھلی بہن فاخرہ کے بارے میں آپ کو بتایا جا چکا ہے۔ بابرہ بہن بھائیوں میں سب سے چھوٹی ہے۔ اس کا بڑا بھائی طلعت ایک تعلیم یافتہ نوجوان ہے۔ اس نے اپنی بہن کے ہمراہ اسٹوڈیو میں چوکیداری نہیں کی۔ وہ مزاجاً ایک معقول شخص ہے اور اس کی ہمیشہ یہی کوشش رہی ہے کہ بہنوں کے تعلقات اور سرمائے سے تھوڑا بہت فائدہ تو اٹھائے مگر بذات خود بھی روزگار سے لگ جائے یہی وجہ ہے کہ طلعت نے مختلف اوقات میں مختلف کاروبار کیے۔ یہ بھی ایک قابلِ ذکر بات ہے کہ وہ ہیروئنوں اور ایکٹریسوں کے بھائیوں کی مانند اپنی بہنوں کی کمائی پر تکیہ کر کے نہیں بیٹھا۔ چند سال قبل طلعت کی شادی ہو چکی ہے اور وہ کئی بچوں کا باپ ہے۔ بابرہ کی سب سے بڑی بہن فردوس نے لاہور میں بالاخانہ شروع کیا تھا۔ وہ ایک خوش شکل اور خوش ادا عورت ہے۔ حسن اخلاق ایسی چیز ہے جو محمد شریف کے بچوں میں کوٹ کوٹ کر بھرا ہوا ہے۔ ان کی ترقی اور مقبولیت میں ان بہنوں کی خوش اخلاقی اور ملنساری کا بھی نمایاں ہاتھ رہا ہے۔ فردوس کی ملاقات لاہور میں ایک میمن سیٹھ سے ہو گئی جو فردوس کا کلمہ پڑھنے لگا۔ کراچی کے اس میمن سیٹھ نے دل کے ہاتھوں مجبور ہو کر فردوس کو گھر میں بسا لیا اور اس طرح یہ خاندان لاہور سے کراچی منتقل ہو گیا۔ محمد شریف نے گھی کی دکان بند کر دی۔ اس کی بیٹی نے جس ماحول اور جس حلقے میں قدم رکھا تھا وہاں اسے گھی فروشی کی ضرورت نہیں تھی۔

بابرہ کے خاندان نے غالباً 1964ء میں لاہور سے بوریا بستر باندھ کر کراچی کی راہ لی تھی۔ اس وقت بابرہ کی عمر تیرہ سال تھی۔ کراچی کے ماحول میں بابرہ اور اس کی بہنوں نے تہذیب اور تمدن سے آشنائی حاصل کی۔ کراچی ان چاروں بہن بھائیوں کے عادات و اطوار پر بھی اثر انداز ہوا۔ ان کی اردو کو صیقل کرنے میں بھی کراچی کے شب و روز نے نمایاں کردار ادا کیا۔ فردوس، فاخرہ اور بابرہ شریف نے اردو کا لب و لہجہ کراچی کے دوران قیام میں سیکھا۔ بابرہ نے باقاعدہ تعلیم حاصل نہیں کی مگر اس کا لب و لہجہ اور مکالموں کی ادائیگی دیکھ کر یہ گمان گزرتا ہے جیسے وہ کسی کالج کی تعلیم یافتہ ہے۔ اس خوبی نے بعد میں بابرہ کو کامیاب اداکارہ بننے میں بہت مدد دی اور پنجابی تو اس کی مادری زبان ہے ہی۔

فردوس کو خدا نے موقع دیا تو وہ اپنی بہنوں کو اور ماں باپ کو بھی اپنے ہمراہ کراچی لے گئی۔ سچ تو یہ ہے کہ بابرہ کے خاندان کو بنا سنوار کر موجودہ پوزیشن تک پہنچانے میں مقدر کے بعد سب سے بڑا ہاتھ فردوس کا ہے۔ اس نے اپنے ماں باپ کو ذہنی اور مالی آسودگی فراہم کی اور اس کے ساتھ ہی فاخرہ اور بابرہ کو بھی تربیت دینی شروع کر دی۔ چھوٹے بھائی طلعت کا رجحان تعلیم کی جانب تھا اس لیے اسے اسکول میں داخل کرا دیا گیا۔ فاخرہ اور بابرہ تعلیم کے زیور سے محروم تھیں اس لیے فردوس نے انہیں ماڈل بنا دیا۔ کراچی میں ماڈلنگ کا دستور بہت پرانا ہے۔ فاخرہ اور بابرہ نے بھی ماڈلنگ کا سہارا لیا اور اس راستے فلم اور ٹیلی ویژن اسکرین تک رسائی حاصل کرنے کی کوشش کی۔ فاخرہ نے شباب کیرانوی کی فلم ''انسان اور آدمی'' کے تجربے کے بعد ایکٹریس بننے کا خیال چھوڑ دیا تھا مگر بابرہ کے بارے میں دونوں بہنوں کی توقعات بہت بلند تھیں اور بابرہ ان توقعات پر نہ صرف پوری اتری بلکہ ان کی امیدوں سے بڑھ کر نکلی۔ فردوس نے اپنے گھرانے کو معزز اور ممتاز بنانے کی جس مہم کا آغاز کیا تھا بابرہ نے اسے کامیابی اور خوش اسلوبی سے منزل تک پہنچا دیا۔ فردوس آج بھی کراچی میں خوش حالی اور فارغ البالی کی زندگی بسر کر رہی ہے۔ اپنی خوش اطواری، خوش اخلاقی اور میل ملاپ کی خوبیوں کے باعث اس کا سوشل سرکل کافی وسیع ہے بعد میں بابرہ اور فاخرہ نے اس دائرے کو اور زیادہ وسیع کر دیا۔

بابرہ نے پبلسٹی فلموں کے لیے ماڈلنگ شروع کی اور کامیابی نے اس کے قدم چومے۔ صابن کی پبلسٹی فلم کی مقبولیت کے بعد وہ پہلے ٹی وی ڈراموں میں نمودار ہوئی اور پھر جب اس نے فلمی دنیا کا رخ کیا تو دیکھتے ہی دیکھتے ترقی کی منزلیں طے کرتی ہوئی صف اوّل کی ہیروئن بن گئی۔ بابرہ کی فلمی کامیابیوں کی تفصیل بیان کرنا ضروری نہیں ہے کیونکہ سبھی ان سے واقف ہیں۔ اس راہ میں بہت سے کٹھن مقامات بھی آئے مگر وہ کامیابی سے ان سے گزرتی چلی گئی یہاں تک کہ موجودہ مقام تک پہنچ گئی۔

بابرہ کے بارے میں مزید تفصیل بتانے سے پہلے کچھ فاخرہ کے بارے میں بیان کر دینا بھی بے موقع اور غیر مناسب نہیں ہوگا۔ فاخرہ ایک کشیدہ قامت سانولی سلونی اور دلکش شخصیت کی مالک ہے مگر اپنی طوطے جیسی کھڑی ناک کے باعث کیمرے کے لیے اس کا چہرہ مناسب نہیں ہے۔ اس کے علاوہ اس کا چہرہ تاثرات سے بھی عاری ہے ورنہ جہاں تک بول چال اور مکالموں کی ادائیگی کا تعلق ہے وہ

اس معاملے میں اپنی دونوں بہنوں پر فوقیت رکھتی ہے مگر اس کی یہ صلاحیتیں کیمرے کے سامنے اجاگر نہیں ہو پاتیں۔ حقیقی زندگی میں وہ ایک مجلسی اور پُرکشش شخصیت سمجھی جاتی ہے۔ رنگین مزاجی اور رومان پرستی کے معاملے میں وہ اپنی دونوں بہنوں سے کہیں آگے ہے۔ صنف مخالف کے دل کو موہ لینا، نازو انداز اور باتوں سے انہیں مطیع و فرماں بردار بنالینا فاخرہ کو ورثے میں ملا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اسے کبھی دوستوں اور چاہنے والوں کی کمی نہیں رہی۔ اس کی زندگی میں کئی مرد آئے مگر مستقل رفاقت کے لیے اس نے جس شخص کو پسند کیا آخر کار اس سے شادی کر لی اور آج اس کے بچوں کی ماں ہے۔ فاخرہ کا شوہر ایک اچھے خاندان کا چشم و چراغ ہے۔ گھر والوں کی مرضی کے خلاف اس نے فاخرہ کو اپنا لیا اور پھر اسی کا ہو کر رہ گیا۔ یہاں تک کہ اپنا گھر بار چھوڑ کر فاخرہ کے ہمراہ بابرہ شریف کی کوٹھی کے ایک حصے میں اینکسی بنا کر رہنے لگا۔ فاخرہ کا شوہر چند سال قبل لندن میں اسمگلنگ کے الزام میں گرفتار ہو کر جیل خانے بھی پہنچ گیا۔ حسب معمول اس کے متعلقین کا یہی بیان تھا کہ وہ بے گناہ ہے اور سادہ لوحی میں پکڑا گیا مگر اصلیت خدا جانتا ہے یا لندن پولیس۔

فاخرہ نے بابرہ شریف کے ہیروئین بنے کا یہ فائدہ اٹھایا کہ فلمی اور اعلیٰ سوسائٹی کے لوگوں میں تعلقات پیدا کر لیے اور بوتیک شروع کر دیا۔ آغاز میں وہ بابرہ شریف کی فلموں کے لیے اس کے فلمی ملبوسات مہنگے داموں تیار کر کے منافع کماتی رہی اور بعد میں ان تجربات کی روشنی میں اس نے ملبوسات اور فیشن سے متعلق چیزوں کی دکان قائم کر کے اس میدان میں باقاعدہ قدم رکھ دیا۔ فاخرہ کی عمر بابرہ سے چار پانچ سال زیادہ ہے مگر وہ آج بھی ایک سرو قد، تروتازہ اور جوان عورت نظر آتی ہے۔ شاید یہ خوبی ان بہنوں کو قدرت کی جانب سے عطا کی گئی ہے۔ بابرہ شریف کے فلمی کیریئر کو کامیاب بنانے میں فردوس نے ابتدائی ایام میں جدوجہد کی تھی مگر اس کامیابی کا زیادہ تر سہرا فاخرہ شریف کے سر باندھنا چاہیے جس نے اپنی تربیت اور رفاقت سے بابرہ کو موجودہ سانچے میں ڈھالنے کے سلسلے میں نمایاں کردار ادا کیا ہے۔ بابرہ کے فلمی سفر میں فاخرہ اس کے ہم رکاب رہی ہے اور قدم قدم پر اس کے لیے سہارا بنتی رہی ہے۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ بابرہ کو قدرت نے بے شمار نعمتوں سے نوازا ہے۔ اس پر اللہ کی مہربانیاں بے حساب ہیں۔ شکل و صورت، قد و قامت، ڈیل ڈول، حسن و رعنائی، ذہنی اور جسمانی صلاحیتیں، کامیابی، کامرانی، شہرت، دولت، مقبولیت یہاں تک کہ عزت و احترام تک کون سی دنیاوی نعمت ہے جو بابرہ شریف کے حصے میں نہیں آتی ہے بلکہ دوسروں کے مقابلے میں وہ کہیں زیادہ نوازی گئی ہے مگر انسان کبھی بھی اپنی تمام خواہشیں اور آرزوئیں پوری کرنے میں کامیاب نہیں ہوتا۔ ہر بشر کی زندگی میں خامیاں، کوتاہیاں اور محرومیاں ہوتی ہیں۔ یہی قدرت کا دستور اور اصول ہے۔ بابرہ بھی نظام قدرت کی اس اصول سے مبرا نہیں ہے۔ سراپا رعنائی اور سیکس کا مجسمہ ہونے کے باوجود بابرہ ازدواجی اور گھریلو سکون اور خوشیوں سے اتنی ہی دور ہے جتنی وہ دولت اور شہرت سے نزدیک ہے۔ لوگ کہتے ہیں کہ یہ محرومیاں کسی فقیر کی بددعا کا نتیجہ ہیں۔ ایک صحافی نے یہ انکشاف فرمایا کہ بابرہ شریف نے یہ نحوست اپنی فلمی استاد شمیم آرا کے طفیل سمیٹی ہے۔ جس طرح شمیم آرا کو ازدواجی خوشی اور گھریلو سکون حاصل نہیں ہو سکا اسی طرح بابرہ ان نعمتوں سے بہرہ مند نہیں ہو سکی۔ شمیم آرا کو اس کے خاندان والوں نے چین کا سانس نہیں لینے دیا اور ہر قدم پر اس کی راہ میں رکاوٹیں پیدا کرتے رہے مگر بابرہ کے ساتھ معاملہ بالکل برعکس رہا۔ بابرہ بچپن ہی سے گھر والوں کی لاڈلی اور چہیتی رہی۔ اسے ہر قسم کی آزادی اور من مانی کرنے کے لیے کھلی چھٹی حاصل رہی۔ اس کی خواہشوں اور خوشیوں کی راہ میں کبھی کوئی گھر والا رکاوٹ نہیں بنا۔ اسے ہر قسم کی آزادی میسر تھی اور آج بھی وہ ذہنی اور جسمانی طور پر بالکل آزاد ہے۔ گھر والوں کی جانب سے اس پر نہ پہلے کبھی پابندی عائد کی گئی اور نہ ہی آج وہ کسی بندش کا شکار ہے بلکہ حیرت کی بات تو یہ ہے کہ بابرہ کے خاندان والوں نے اس پر وہ پابندیاں بھی عائد نہیں کیں جو نگہداشت اور نگرانی کے بہانے اداکاراؤں کے گھر والے لازماً عائد کرتے ہیں۔ بابرہ کی کمائی پر صرف اسی کا اختیار ہے۔ وہ اپنی مرضی سے جو بھی چاہے خرچ کرے یا لٹائے۔ وہ اپنے خون پسینے سے کمائی ہوئی دولت میں گھر والوں کو شریک کرنے کی پابند نہیں ہے حالانکہ اس کی ہر چیز ان کے لیے حاضر ہے۔ اسے کبھی کسی قسم کی شرائط کی زنجیروں میں نہیں جکڑا گیا۔ انتہا تو یہ ہے کہ بابرہ نہ صرف اپنے کاروباری معاملات بذات خود ہی نمٹاتی رہی بلکہ اس نے مستقل طور پر ہیروئن کے ہمراہ سائے کی طرح رہنے والے پہریداروں کی روایت بھی توڑ دی۔ فلمی

صنعت کے لوگ یہ دیکھ کر انگشت بدنداں رہ جاتے جب بابرہ رات اور دن میں کسی بھی وقت اپنی کار میں تنہا سوار ہو کر ڈرائیونگ کرتی ہوئی شوٹنگ کے لیے اسٹوڈیو پہنچ جاتی۔ بعد میں یہ اس کے معمول میں داخل ہو گیا۔ لاہور سے باہر اور بیرونِ ملک فلم بندی کے دوران میں فاخرہ اس کی ہم سفر رہی مگر کئی مرتبہ بابرہ کسی نگراں یا خادمہ کے بغیر ہی بیرونِ ملک شوٹنگ کے لیے جاتی رہی ہے۔ پاکستان ہی کیا بھارت کی فلمی دنیا میں بھی یہ ایک انوکھی اور ان ہونی بات ہے۔ بابرہ نے خود مختاری، خود اعتمادی اور خود کفالت کی جو مثال فلمی دنیا میں قائم کی وہ اپنی نوعیت کے اعتبار سے واحد اور منفرد ہے مگر ٹھہریئے بابرہ شریف صرف اس اعتبار ہی سے نہیں اور بھی کئی لحاظ سے ایک مختلف اور منفرد ہستی ہے۔ وہ فلم سازوں کے ساتھ اپنے معاملات بذاتِ خود طے کرتی۔ شوٹنگ کے لیے وہ اپنی مرضی سے وقت دیتی۔ معاوضہ وہ اپنی پسند اور مصلحت کے مطابق وصول کرتی۔ دن اور رات کے کسی بھی وقت میں وہ جہاں بھی چاہے کار ڈرائیو کرتی ہوئی پہنچ جاتی۔ یہاں تک کہ دل کے معاملات میں بھی وہ مکمل طور پر آزاد اور خود مختار تھی۔ اپنے جسم و جاں اور ذہن پر بابرہ کی مطلق العنان حکمرانی رہی اس بارے میں کوئی اسے مشورہ تک نہیں دے سکتا اور اگر دیتا بھی تو بابرہ اس پر عمل کرنے کی تکلیف گوارا نہیں کرتی۔ وہ خود کو عقلِ کل سمجھتی یہی وجہ ہے کہ دھوکے کھاتی اور دکھ اٹھاتی رہی۔

بابرہ نے رسمی طور پر باقاعدہ صرف ایک شادی کی ہے اور شادی کے لیے اس کا انتخاب اس قدر بے ساختہ اور حیرت انگیز تھا کہ فلمی دنیا والے ہی نہیں خود اس کے گھر والے بھی ششدر رہ گئے۔ اردو کا ایک محاورہ ہے کہ سیانا کوا جب بھی گرتا ہے گندگی اور غلاظت پر ہی گرتا ہے۔ بابرہ پر بھی یہ کہاوت پوری طرح صادق آئی۔ اس نے جس تیزی سے عروج اور کامیابیاں حاصل کیں وہ بذاتِ خود ایک ریکارڈ ہے۔ 1974ء میں فلموں میں نمودار ہونے والی لڑکی اگلے دو سالوں میں پاکستان کی چوٹی کی ہیروئن بن گئی۔ اس کی ہم عصر ہیروئنوں کو یہ خوش فہمی تھی کہ شاید چھوٹا قد اس کی کامیابی کی راہ میں رکاوٹ بن جائے گا مگر بابرہ ان تمام رکاوٹوں کو ہٹا کر بلند چوٹی پر پہنچ گئی۔ اپنی فن کاری کے ساتھ ساتھ سوجھ بوجھ اور معاملہ فہمی کی بنا پر بھی اس نے بہت سی پرانی ہیروئنوں کو پیچھے چھوڑ دیا۔ یہاں تک کہ بہت سی مقبول اور کامیاب ہیروئنیں بھی اس پر رشک کرنے لگیں بلکہ یہ کہنا زیادہ درست ہوگا کہ اس سے حسد کرنے لگیں۔ جو کامیابی شہرت اور مقبولیت اسے ملی تھی وہ حد درجہ حیران کن تھی۔ بہت سی ہیروئنیں سالہا سال تک پاپڑ بیلنے کے باوجود وہ مقام حاصل کرنے میں کامیاب نہیں ہو سکی تھیں جو مختصر عرصے میں فلمی صنعت اور فلم بینوں میں بابرہ نے حاصل کر لیا تھا مگر دل کے معاملات میں بابرہ بہت اناڑی ثابت ہوئی۔

بابرہ سوسائٹی کے جس طبقے سے تعلق رکھتی ہے اس کے بارے میں عام طور پر یہی خیال کیا جاتا ہے کہ یہ عورتیں صدقِ دل سے کسی مرد سے بے لوث محبت کرنے کی صلاحیت سے محروم ہوتی ہیں۔ اگرچہ اس کے برعکس بھی کچھ مثالیں موجود ہیں مگر تجربہ شاہد ہے کہ خلوص اور بے ریا محبت سے فلم ایکٹریسوں کا دامن خالی ہی رہا ہے اور اگر کہیں ان کا تعلق اس بازار سے ہو تو پھر یہ کریلا اور نیم چڑھا والی بات ہے۔

بابرہ نے کراچی کی روشنیوں میں ہوش سنبھالا تھا جہاں زندگی زیادہ تیز رفتار ہے اور سوشل سرگرمیوں کے اعتبار سے یہ پاکستان کا سب سے فیشن ایبل اور آزاد خیال شہر ہے پھر جس ماحول میں کوئی روک ٹوک نہ ہو وہاں بابرہ جیسی خوش اندام اور خوش گفتار لڑکی کو مداحوں اور پرستاروں کی کیا کمی ہو سکتی تھی۔ فلم ایکٹریس تو وہ بہت بعد میں بنی۔ اس سے پہلے ہی وہ صنفِ مخالف کی توجہ اور محبوبیت کا مرکز بن چکی تھی۔ جوانی کے آنگن میں قدم رکھتے ہی اس پر پسند کرنے والوں کی نگاہیں مرکوز ہونے لگیں۔ مردوں کی نظر کی پہچان عورتوں کو فطری طور پر ہو جاتی ہے اور اگر عورت بھی بابرہ جیسی ہوشیار، زمانہ ساز اور نظر شناس ہو تو پھر یہ مسئلہ اور بھی آسان ہو جاتا ہے۔ بابرہ نے ابتدائی عمر ہی میں لوگوں کی توجہ حاصل کرنی شروع کر دی تھی۔ دوستی اور بے تکلفی کے پردے میں جب کوئی اسے گلے سے لگاتا تو وہ بھانپ جاتی تھی کہ اس شخص کی نیت کیا ہے بلکہ اسے تو بچپن ہی میں تربیت اور آگہی حاصل ہو گئی تھی۔ مشرق کے گھٹے ہوئے پابند معاشرے میں عورت اور مرد دو مختلف قسم کی جنس ہیں جو عمر کے کسی حصے میں بھی ایک دوسرے کے نزدیک نہیں ہو پاتے۔ یہی وجہ ہے کہ نوجوان اور پختہ عمر لوگ جب موقع پا کر نوعمر بچیوں کو بزرگی کے پردے میں گود میں بٹھاتے اور پیار کرتے ہیں تو ان کی سانسوں کی آمد و رفت سے ان کے دلی جذبات کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔ شریف اور سادہ گھرانوں کی لڑکیاں ان ارادوں اور جذبات کو سمجھنے میں کچھ

ویرلگاتی ہیں مگر بابرہ کا تعلق جس گھرانے اور جس ماحول سے تھا وہاں ان باتوں کی تربیت اور آگہی خود بخود ہو جاتی ہے۔ فردوس کو اس بات کا کریڈٹ جاتا ہے کہ جب اسے زندگی نے موقع دیا تو وہ اپنی چھوٹی بہنوں کو ہیرا منڈی اور بازار حسن کے چوباروں سے بہت دور لے گئی۔ بابرہ شریف کو کبھی بالا خانے پر بیٹھنے اور تماش بینوں کے دل لبھانے کا اتفاق نہیں ہوا مگر وہ اس ماحول کے تمام قاعدے قرینوں اور رموز و اسرار سے پوری طرح واقف تھی۔ شاید گھر کا ماحول اور روزمرہ کے معمولات ان لڑکیوں کو تجربات سے آشنا کر دیتے ہیں یا پھر یہ انداز فکر قدرتی طور پر انہیں مل جاتا ہے۔ طوائف کسی پیشے سے تعلق رکھنے والی عورت کا نام نہیں ہوتا، درحقیقت یہ ایک ذہنیت کا نام ہے، ایک خاص سوچ اور مخصوص انداز فکر کو طوائف کا نام دیا جاسکتا ہے اس کے لیے ضروری نہیں ہے کہ اس کی تربیت کسی بازار میں یا کوٹھے پر کی جائے۔ آپ نے دیکھا ہوگا کہ ہیرا منڈی سے میلوں دور پرورش پانے والی ان گھرانوں کی لڑکیاں بھی اپنے رنگ ڈھنگ نہیں چھوڑتیں یہاں تک کہ وہ لڑکیاں جنہوں نے کبھی حقیقی زندگی میں کبھی کوٹھا نہیں دیکھا ہوتا اور جو اس رنگا رنگ ماحول سے بہت دور یورپ اور امریکا میں پرورش اور تعلیم حاصل کرتی ہیں ان کے انداز، عادات و اطوار اور ذہنیت پر بھی طوائفیت کی چھاپ انتہائی دیرپا اور مضبوط ہوتی ہے۔ سلمیٰ آغا ان کی ایک مثال ہے۔ طوائف بننے کے لیے کسی خاص جگہ یا علاقے کی پابندی نہیں ہے۔ وہ تو اپنی طوائفیت کے جراثیم اپنے ہمراہ لیے پھرتی ہے۔ شاید یہی وہ اندرونی بیماری ہے جو اکثر طوائفوں کو کبھی نارمل عورت نہیں بننے دیتی۔ وہ اپنے احساس اور ادراک کے پھندے سے کبھی رہائی حاصل نہیں کرسکتیں۔ اس طرز زندگی کو اپنانے کے فائدے بھی ہیں مگر چند نقصان بھی ہیں، سب سے بڑا نقصان تو یہی ہے کہ وہ کوشش کے باوجود اس زہر کو اپنے وجود سے کھرچ کر باہر نہیں پھینک سکتیں اور عمر بھر اپنے سوچنے کے انداز سے نجات حاصل کرنے میں ناکام رہتی ہیں۔

بابرہ کے ساتھ بھی یہی المیہ پیش آیا۔ مشکل یہ ہوئی کہ وہ عمر سے پہلے جوان، بالغ اور باشعور ہوگئی تھی۔ اس پر اوائل عمر ہی میں وہ تمام راز منکشف ہوگئے تھے جن کو جاننے کے لیے ایک عمر دراز کی ضرورت ہوتی ہے۔ وہ پختہ خیال اور تجربہ کار ہو چکی تھی حالانکہ اسے کوئی عملی تجربہ حاصل نہیں ہوا تھا۔ عقل و شعور کی دولت خداداد تھی۔ اس میں اضافہ کرنے کے لیے خاندانی میراث موجود تھی۔ نتیجہ یہ نکلا کہ وہ ہر شخص کو پرکھنے اور ہر چیز کا تجزیہ کرنے کی عادت میں مبتلا ہوگئی۔ اس عادت نے آنے والے دنوں میں اسے بہت تکالیف پہنچائیں۔ بہت مشکلات پیدا کیں مگر وہ اپنی عادت اور فطرت کے ہاتھوں مجبور تھی۔ کراچی میں عنفوان شباب سے قبل ہی چند معمولی لغزشوں نے اس کے شعور اور فہم کو مزید اجاگر اور صیقل کر دیا تھا۔ پھر بہت جلد ہی اسے شو بزنس کے ماحول میں جانے کا موقع مل گیا۔ پہلے ماڈلنگ کے طور پر اس نے ٹی وی کیمرے کا مزہ چکھا اور اس کے بعد ٹی وی اسٹوڈیو کا لطف اٹھا لیا۔ اس سے پہلے وہ اپنی بہنوں کے تجربات کا گہری نگاہوں سے مشاہدہ کرتی رہی تھی۔ بہت سے لوگ خود اپنے آپ پر بیتنے والے تجربات سے بھی کچھ حاصل نہیں کرتے جبکہ بعض حساس اور ذہین لوگ دوسروں کو دیکھ کر گھر بیٹھے تجربہ حاصل کر لیتے ہیں۔ بابرہ کا شمار بھی آخرالذکر قسم کے لوگوں میں ہوتا ہے۔ اس نے اپنے آس پاس کے لوگوں اور حالات و واقعات کو اتنی شدت سے محسوس کیا جیسے کہ وہ ان کا ایک حصہ رہی ہو۔

لاہور آنے سے پہلے جو شخص بھی پیار محبت کے بہانے اس کے نزدیک آیا بابرہ نے بظاہر تو اس کی پذیرائی کی مگر اس کا تجزیہ کرنے کے بعد اسے نمبر بھی دیتی رہی۔ افسوس کہ ان میں سے کوئی ایک بھی اس کے معیار کے مطابق پاسنگ... مارکس حاصل نہیں کرسکا مگر اسے کوئی جلدی نہیں تھی۔ اس کے سامنے پوری زندگی بانہیں پھیلائے کھڑی تھی۔ اسے ابھی بے شمار سفر کرنے تھے اور راہ میں بے شمار سایہ دار درخت اور ان گنت ہم سفروں سے اس کا واسطہ پڑنے والا تھا۔ اس لیے بابرہ نے ان چھوٹی موٹی آنکھ مچولیوں کو زیادہ اہمیت نہیں دی۔ بابرہ کو شعور کی آنکھ کھولتے ہی یہ احساس ہوگیا تھا کہ قدرت نے اسے غیر معمولی صلاحیتوں سے نوازا ہے۔ یہاں تک کہ اس کے گھر والے بھی بابرہ کی عقلمندی، ہوشیاری اور سمجھ بوجھ سے متاثر تھے۔ وہ گھر میں سب سے چھوٹی تھی۔ قد و قامت میں بھی اور عمر میں بھی مگر اس کی رائے کو بہت اہمیت دی جاتی تھی۔ تجربہ شاہد تھا کہ اس کی رائے ہمیشہ مناسب اور درست ہوا کرتی تھی۔ گھر والوں کی تعریف اور ملاقاتیوں کی ستائش نے بابرہ کو خود اعتمادی کے ساتھ ساتھ برتری کے احساس سے بھی آشنا کر دیا۔ اس کی ہٹ دھرمی کی عادت وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ پختہ ہوتی گئی۔ وہ

دوسروں کی پسند پر اپنی پسند کو اور دنیا والوں کی رائے پر اپنی ذاتی رائے کو فوقیت دینے کی عادی ہو گئی۔ یہ احساس اس کے دل میں جاگزیں ہو چکا تھا کہ وہ دوسروں سے زیادہ ہوشیار، چالاک، زمانہ ساز اور عقلمند ہے اسے انسانی رشتوں اور انسانی فطرت کی پہچان دوسروں سے کہیں زیادہ ہے پھر تربیت اور ماحول نے اسے یقین دلا دیا تھا کہ دنیا کے تمام مرد محض جذبات سے کام لیتے ہیں۔ وہ جذبہ وفا اور خلوص سے عاری ہوتے ہیں۔ زیادہ سے زیادہ مردوں کو بے وقوف بنانا اور انہیں اپنے اشاروں پر نچانا ہی عورت ذات کا فرض ہے۔ مردوں کو محض عورت کے جسم کی طلب اور آرزو ہوتی ہے۔ وہ کسی حالت میں بھی قابل اعتبار نہیں ہوتے۔ اس لیے ہر عورت خصوصاً حسین عورت کا فرض ہے کہ مردوں کے جذبہ پذیرائی حسن سے فائدہ اٹھائے اور انہیں بندہ بے دام بنا لے۔

مگر حضرت ''عشق'' کے انداز نرالے ہوتے ہیں۔ عشق کا دیوتا کیوپڈ جب تیر کمان سے لیس ہو کر انسانی دلوں کا شکار کھیلنے کی غرض سے نکلتا ہے تو پھر کسی کو نہیں بخشتا خواہ وہ شہزادی ہو، ایکٹریس ہو یا کوئی اور ہو۔ بابرہ عشق کے مفہوم سے بخوبی واقف تھی مگر اس حد تک کہ عشق کو وہ بے وقوفی اور محبت کرنے والوں کو انتہائی احمق خیال کرتی تھی۔ اس نے جس ماحول میں ہوش سنبھالا تھا وہاں عشق اور محبت کا بھلا کیا کام ہو سکتا ہے؟ البتہ عشق جتانے والوں سے یہ لوگ کام لینا خوب جانتے ہیں۔ بابرہ کی شامت اعمال دیکھیے کہ ایسے محبت ہوئی بھی تو ایک ایسے شخص سے جو اپنی غیر مستقل مزاجی، رنگینی اور بے وفائیوں کے لیے سارے پاکستان میں مشہور تھا۔ یہ اداکار شاہد تھا، شاہد کے کارناموں سے پاکستان کا بچہ بچہ واقف تھا۔ جس نے اس کی فلمیں نہیں دیکھی تھیں انہوں نے بھی اس کے بارے میں اخبارات میں رنگ برنگی خبریں پڑھی تھیں اور فلمی صنعت میں تو شاہد ڈان کی حیثیت سے مشہور بلکہ بدنام تھا۔ مگر وہ اس اصول کا قائل تھا کہ ''بدنام اگر ہوں گے تو کیا نام نہ ہوگا؟''

اور اس بات میں ذرا بھی شک نہیں ہے کہ شاہد کی بدنامی نے اسے بہت فائدہ پہنچایا تھا۔ خصوصاً خواتین کے حلقوں میں اس کا نام آتے ہی حاضرین محفل کے دلوں میں پھلجھڑیاں سی چلنے لگتی تھیں اور ان کے دلوں کی دھڑکنیں تیز ہو جایا کرتی تھیں۔ ہیروئنیں اپنی خاص محفلوں میں اس کی داستانیں سنتی اور سناتی تھیں اور شاہد کے نام کے ساتھ جس کسی کا نام منسوب ہوا کرتا تھا اسے بظاہر برا کہنے کے ساتھ ساتھ اپنے دلوں کی گہرائیوں میں اس پر رشک کرتیں اور خود بھی شاہد کے قرب کے خواب دیکھا کرتی تھیں۔

شاہد کو فلم والے عورتوں کا شکاری کہا کرتے تھے۔ یہ خوب صورت خوش ادا خوش لباس نوجوان اپنی شوخی کے ساتھ ساتھ اخلاق و آداب کے لیے بھی مشہور تھا اور ہر ایک کو اپنے حسن اخلاق اور حفظ مراتب کے مظاہرے سے مرعوب کر دیا کرتا تھا۔ بظاہر انتہائی مہذب مؤدب اور شائستہ نظر آنے والا یہ ہیرو صنف نازک کے دلوں سے کھلونوں کی طرح کھیل کر انہیں توڑ کر پھینک دیا کرتا تھا۔ اس کے در پر ایسے ٹوٹے ہوئے دلوں اور شکستہ کھلونوں کا ڈھیر لگا ہوا تھا۔ کہتے ہیں کہ چنگیز و ہلاکو انسانی سروں کے مینار بنوا کر خوش ہوا کرتے تھے مگر شاہد خوب صورت عورتوں کی آرزوؤں کے پھولوں کو مسل کر اور ان کے دلوں کو کچل کر خوش ہوا کرتا تھا۔ اس نے بھی مایوس نامراد عورتوں کے دلوں کے مینار تعمیر کرائے تھے اور خود سب سے بلندی پر چڑھا بیٹھا تھا۔ وہ ہر دم کسی نئے شکار کی تاک میں رہتا تھا۔ ایسا بھی نہیں ہے کہ اسے اپنے شکار کے لیے گھات لگا کر بیٹھنا پڑتا تھا یا وہ اسے گھیر کر نشانہ بنانے کے لیے اونچی چٹان پر منتظر بیٹھا ہوتا تھا۔ اس کے پیکر میں ایسی خوشبو، اس کی آنکھوں میں ایسی کشش اور اس کی باتوں میں ایسی دلکشی تھی کہ شکار خود بخود کھنچتا ہوا اس کے پاس چلا آتا تھا۔ اس نے عشق کے سلسلے میں ابتدا کرنے میں کبھی پہلا قدم آگے نہیں بڑھایا تھا۔ اس کہانی کا آغاز ہمیشہ مخالف سمت سے ہوا کرتا تھا۔ شاہد اپنی شریفانہ طبیعت اور با اخلاق سرشت کے پیش نظر دامن بچانے کی بہت کوشش کرتا تھا مگر آخر کار خود بھی اسی جال میں گرفتار ہو جاتا تھا جو وہ دوسروں کے لیے بچھایا کرتا تھا۔ شاہد کی فتوحات کی تعداد خاصی نمایاں تھی۔ آئے دن کسی نہ کسی اداکارہ کے ساتھ اس کا کوئی نا کوئی اسکینڈل منظر عام پر آتا رہتا تھا۔ طشت از بام ہونے والے اسکینڈلز کے علاوہ اور بھی بہت سی کہانیاں تھیں جن سے زمانہ واقف نہیں تھا۔ وہ شادی شدہ ہی نہیں ضرورت سے زیادہ شادی شدہ تھا۔ اس نے ایک گھریلو شادی کی تھی پھر گھر سے باہر شادیوں اور رومانوں کا سلسلہ شروع ہوا تو قطار لگ گئی۔ آئے دن اس کی رسمی یا غیر رسمی شادیوں کی خبریں گرم ہوتی رہتی تھیں جن میں سے بیشتر سچی ہوا کرتی تھیں۔ شاہد نے کبھی ان کی تصدیق یا تردید کرنے کی شعوری کوشش نہیں کی تھی۔ وہ تو بس شوخ

نگاہوں سے مسکراتا رہتا تھا اور دریافت کرنے والا اس کی سحر انگیز شخصیت کے جادو میں کھو جاتا تھا۔

شاہد سے پہلے بابرہ کی زندگی میں کچھ اور لوگ بھی داخل ہوئے تھے۔ منور ظریف اس کا پہلا فلمی جوڑا تھا اور پہلا شکار بھی۔ بابرہ نے اپنی معصوم باتوں اور دلنواز مسکراہٹ سے منور ظریف کے سینے میں محبت کی آگ بھڑکا دی تھی۔ منور اس پیار کی آگ میں جلنے لگا تو بابرہ کسی اور جانب نکل چکی تھی منور ظریف تو اس کا پہلا پڑاؤ تھا۔ اسے ایک مقبول اور با اثر سہارے کی ضرورت تھی۔ منور کی صورت میں اسے وہ سہارا مل گیا تھا مگر بھول اور دوسری فلموں کی نمائش کے بعد بابرہ کے فلمی کردار کی نوعیت بدل گئی۔ وہ مزاحیہ اداکارہ اور مزاحیہ اداکار کی محبوبہ نہیں رہی بلکہ ایک باقاعدہ ہیروئن بن گئی تھی۔ رومانی ہیرو اس کے ساتھ کام کر رہے تھے۔ اس کی شہرت چاروں جانب پھیلنے لگی تھی پھر اسے کیا پڑی تھی کہ منور ظریف جیسے مزاحیہ اداکار کو اپنے دل اور نگاہوں میں جگہ دے۔ اس نے نظریں پھیریں تو منور ظریف کے دن اور تقدیر بھی بدل گئی۔ اس نے مایوسی اور بے اختیاری کے عالم میں پہلے تو اپنا غم غلط کرنے کے لیے انگور کی بیٹی کا سہارا لیا مگر جب بے قراری حد سے بڑھی تو خود کو بے اعتدالیوں اور خود فراموشی کے سمندر میں غرق کر دیا۔ یہاں تک کہ دل کا مریض ہو گیا۔ دل کا عارضہ منور ظریف کے لیے ایک بالکل نئی بیماری تھی۔ یہ تحفہ اسے بابرہ کے پیار نے دیا تھا مگر بابرہ اس کی جانب سے آنکھیں پھیر چکی تھی۔ بابرہ کا مرتبہ اور حیثیت بہت بلند ہو چکا تھا۔ منور جیسے اداکاروں کو منہ لگانا وہ اپنی شان کے خلاف سمجھتی تھی۔ یہ بے اعتنائی اور بے مہری اس کے زخموں پر نمک چھڑک گئی۔ خود کو بھلانے کے لیے اس نے دن رات کام اور مے نوشی شروع کر دی۔ دونوں ہی چیزیں اس کی صحت کے لیے انتہائی مضر تھیں مگر۔

مے سے غرض نشاط ہے کس روسیاہ کو
اک گونہ بے خودی مجھے دن رات چاہیے

والا معاملہ تھا۔ جب بیماری زیادہ بڑھ گئی تو وہ دوستوں اور ہمدردوں کے اصرار پر طبی معائنے کے لیے امریکا بھی گیا۔ امریکی ڈاکٹروں نے اپنے مزاج اور دستور کے مطابق اسے سب کچھ صاف بتا دیا۔ انہوں نے اسے واشگاف لفظوں میں باخبر کیا کہ وہ دل کے ایک ایسے مرض میں مبتلا ہے جس سے چھٹکارا حاصل کرنا ممکن نہیں ہے۔ انہوں نے کہا کہ وہ چند ماہ سے زائد زندہ نہیں رہے گا۔ اس کے باوجود منور ظریف کی بے تابی اور خواہشوں میں کمی نہ ہو سکی۔ یہاں تک کہ ڈاکٹروں کی پیش گوئی کے مطابق سچ مچ چند ماہ میں اللہ کو پیارا ہو گیا۔ بابرہ نے بظاہر منور کی جواں مرگی پر کسی قسم کا اظہار غم یا ماتم نہیں کیا۔ وہ بدستور اپنے کاموں اور دلچسپیوں میں مصروف رہی اپنی نا آسودہ خواہشات کو پورا کرنے میں لگی رہی۔ کسی نے منور ظریف کے بارے میں اس کی زبان سے تعزیت اور ہمدردی کے رسمی جملوں کے سوا کوئی اور بات نہیں سنی۔

منور ظریف اپنی آرزو کی آگ میں خود ہی جل کر راکھ ہو گیا تو بابرہ نے اپنے دوسرے ساتھی اداکاروں کی طرف توجہ دی۔ غلام محی الدین اس کا پہلا کامیاب ہیرو تھا۔ ''میرا نام ہے محبت'' نے بے پناہ مقبولیت اور کامیابی حاصل کی تھی مگر بابرہ شریف کو غلام محی الدین سے کوئی دلچسپی نہیں تھی۔ وہ اس سے متاثر بھی نہیں تھی۔ دراصل دوسری فن کاروں کی مانند وہ اپنی مرضی اور پسند کے بغیر کسی کو اپنا مستقل ہمنوا بنانے کے لیے تیار نہیں تھی۔ غلام محی الدین صورت شکل اور شخصیت کے اعتبار سے بھی بابرہ کے معیار پر پورا نہیں اترتا تھا۔ یہی وجہ ہے کہ وہ فلم کے ریلیز ہوتے ہی غلام محی الدین سے دور ہوتی چلی گئی۔ وحید مراد کو وہ اپنے ایج گروپ سے باہر تصور کرتی تھی۔ شاہد البتہ اس کے معیار پر پورا اترتا تھا۔ چنانچہ اس نے شاہد پر زیادہ توجہ دینی شروع کر دی۔ دونوں کو ملاقات کے مواقع کم ہی میسر آتے تھے مگر پھر بھی چوری چھپے یہ رومانی سلسلہ شروع ہو گیا اور کافی عرصے تک جاری رہا۔

پرانے لوگوں کی کہاوت ہے کہ عشق اور مشک چھپائے نہیں چھپتا۔ چنانچہ شاہد اور بابرہ شریف کی باہمی لگاوٹ اور وابستگی کا راز بھی پوشیدہ نہیں رہ سکا۔ حالانکہ اسٹوڈیو کی چار دیواری اور فلموں کے سیٹ پر وہ دونوں ایک دوسرے سے قریب قریب بے تعلق ہی رہا کرتے تھے۔ رسمی انداز میں گفتگو کرتے تھے اور عموماً چھوٹی چھوٹی باتوں کو انا کا سوال بنا کر جھگڑے کیا کرتے تھے۔ مثلاً اگر بابرہ سیٹ پر دیر سے آئے تو شاہد ناراضی کا اظہار کرتا اور کبھی کبھی سیٹ چھوڑ کر بھی چلا جاتا۔ یہی رویہ بابرہ کا بھی تھا۔ شاہد ان دنوں بہت مصروف ہیرو تھا اور سیٹ پر دیر سے پہنچنا اس کا معمول تھا۔ بابرہ اس پر بہت برہمی کا اظہار کیا کرتی تھی۔ ان دونوں کے باہمی جھگڑوں کی وجہ سے فلم ساز، ہدایت کار اور دوسرے اداکار عاجز رہا کرتے تھے مگر کوئی نہیں جانتا تھا کہ یہ محض دکھاوا ہے اور وہ دونوں نجی زندگی میں ایک دوسرے سے

بہت نزدیک ہو چکے ہیں۔ شاہد اور بابرہ کی قربت پر بابرہ کے گھر والوں کو کوئی اعتراض نہیں تھا۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ اول تو گھر والے بابرہ کے ذاتی معاملات میں دخل ہی نہیں دیا کرتے تھے۔ دوسرے یہ کہ شاہد ایک مقبول ہیرو تھا اور ان دونوں کی دوستی کاروباری اعتبار سے بابرہ کے حق میں مفید ثابت ہو سکتی تھی۔

شاہد نے چوری چھپے بابرہ کے گھر آمدورفت شروع کی تو کسی نے بھی اعتراض نہیں کیا۔ یہاں تک کہ جب شاہد ڈرائنگ روم سے گزر کر بابرہ کی خواب گاہ تک پہنچ گیا تب بھی گھر والوں کو اس میں کوئی قابلِ اعتراض بات نظر نہیں آئی مگر جب انہیں احساس ہوا کہ بابرہ سچ مچ شاہد کو پسند کرنے لگی ہے اور اسے شریکِ حیات بنانے کے بارے میں سوچ رہی ہے تو انہیں پریشانی ہونے لگی۔ دوستی اور میل ملاقات اداکاروں کے لواحقین کو عموماً بری نہیں لگتی مگر جب بات سچ مچ کے پیار محبت اور شادی کے وعدوں تک پہنچ جائے تو پھر وہ ہوشیار ہو جاتے ہیں اور راستے میں ہر قسم کی رکاوٹیں ڈالنے پر تل جاتے ہیں۔ شاہد کے معاملے میں بھی ایسا ہی ہوا مگر قدرے مختلف انداز میں۔ گھر والوں کو بابرہ پر روک ٹوک کرنے کی عادت نہیں تھی۔ وہ اپنی من مانی کرنے کی خوگر تھی مگر ان کی بہنوں نے بہت بے تکلفی اور خلوص سے اسے سمجھایا اور شاہد سے دور رہنے کا مشورہ دیا۔ ان کا کہنا تھا کہ شاہد پہلے ہی سے شادی شدہ ہے۔ اس کے علاوہ اس کے ہرجائی پن کی داستانیں آئے دن اخبارات میں شائع ہوتی رہتی ہیں۔ ہر روز اس کا نام کسی نئی عورت کے ساتھ پیوست کر دیا جاتا ہے۔ شاہد کے بارے میں یہ تاثر بھی تھا کہ وہ مے نوش نہیں بلکہ بلانوش ہے اور اس قدر مدہوش ہو جاتا ہے کہ پھر اسے کسی چیز کا ہوش نہیں رہتا۔ یہی وجہ ہے کہ شاہد آئے دن اپنی فلموں کے سیٹ سے غیر حاضر رہتا تھا اور کسی جگہ بھی اس کا پتا نشان نہیں مل سکتا تھا۔ وجہ یہ تھی کہ وہ رات کو جہاں بھی بیٹھ جاتا تھا بس وہیں پڑ کر سو جاتا تھا اور اس طرح شوٹنگ پر پہنچنے سے قاصر رہا کرتا تھا۔ شاہد کو نفسیاتی مریض بھی کہا جاتا تھا۔ فاخرہ اور فردوس نے بابرہ کو یہ بھی سمجھانے کی کوشش کی کہ شاہد انتہائی ناقابلِ اعتبار، غیر ذمے دار، لاابالی آدمی ہے۔ ایسے شخص کے ساتھ تھوڑا وقت تو گزارا جا سکتا ہے پوری زندگی نہیں گزاری جا سکتی۔

بابرہ کا نکتۂ نگاہ بالکل مختلف تھا۔ اس کا کہنا تھا کہ شاہد بچپن ہی سے محبت اور ماں کے پیار سے محروم رہا ہے اس لیے محرومی اور بے التفاتی کا شکار ہو کر نفسیاتی اور ذہنی مریض ہو گیا ہے۔ بابرہ کا دعویٰ تھا کہ وہ شاہد کو سدھار سکتی ہے کیونکہ وہ بہت اچھا انسان ہے۔ بابرہ کو اپنی ذات پر بہت زیادہ بھروسا تھا اس کی خوداعتمادی آج تک بار آور ہی ثابت ہوئی تھی۔ اسے انسانوں کی پہچان کا زعم تھا اور وہ اپنے آپ کو انسانوں کی پرکھ اور ان کو سمجھنے اور راہِ راست پر لانے کی صلاحیتوں سے بہرہ ور تصور کرتی تھی۔ بہنوں اور بھائی نے بہتیرا زور لگایا، سمجھایا بجھایا، دھمکیاں دیں، ڈرایا دھمکایا مگر بابرہ کے سر سے عشق اور شاہد کی اصلاح کا بھوت نہ اتر سکا۔ اسے شاہد پر ترس آتا تھا۔ شاہد کی ذات سے ہمدردی تھی۔ وہ اسے ایک اچھا انسان بنانے کی خواہش مند تھی۔ اسی لیے یہ جوا کھیل رہی تھی۔ بابرہ کی ہمدردی رفتہ رفتہ محبت اور پھر عشق میں تبدیل ہو گئی۔

شاہد کو جن لوگوں نے بھی دیکھا ہے وہ اس کے حسنِ اخلاق شائستگی اور ادب آداب سے متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکے۔ وہ عورتوں سے بات کرنے کا ڈھنگ جانتا ہے۔ انہیں لبھانے اور رجھانے کے طریقوں سے بخوبی واقف ہے یہی وجہ ہے کہ سب کچھ جانتے بوجھتے ہوئے بھی خوب صورت عورتیں اس کے جال میں گرفتار ہو جایا کرتی تھیں۔ پاکستان کے کسی بھی ہیرو میں اتنا اخلاق، مروت اور رکھ رکھاؤ نہیں تھا جتنا کہ شاہد میں تھا۔ شاہد ایک خوش لباس، خوش اطوار اور خوب رو انسان تھا۔ قدرت نے اسے صنفِ مخالف کو اپنی طرف راغب کرنے کی صلاحیتیں بھی عطا کی تھیں اور پھر وہ انہیں دیوانہ بنانے اور رجھانے کا فن بھی جانتا تھا۔ یہ ممکن ہی نہیں تھا کہ وہ کسی لڑکی پر توجہ دے اور اسے اپنانے میں کامیاب نہ ہو۔ فلمی اداکارائیں اور طوائفیں تک اپنے گھاگ پن اور تجربے کاری اور ہوشیاری کے باوجود اس کے دام میں پھنس جایا کرتی تھیں۔ بابرہ جیسی زمانہ ساز اور سمجھدار لڑکی کو اپنے پیار کے حصار میں اسیر کر لینا ایک بہت بڑا کارنامہ تھا یہی وجہ ہے کہ بابرہ کی دیوانگی اس کی بہنوں کے لیے ناقابلِ فہم اور ناقابلِ یقین تھی۔ بابرہ جس مٹی کی بنی ہوئی تھی اس کے خمیر میں ایسی حماقت کی کوئی گنجائش نہ تھی۔ اس کی بہنیں اسے یہی بات سمجھانے کی کوشش کرتی رہیں مگر توبہ کیجیے عشق کے مارے سب سے پہلے سوچنے سمجھنے کی صلاحیت کھو بیٹھتے ہیں۔ عشق میں سب سے پہلے جو چیز قتل ہوتی ہے وہ سمجھداری اور سوجھ بوجھ ہوتی ہے۔ بابرہ کے ساتھ بھی یہی حادثہ پیش آیا تھا۔

شروع شروع میں تو پردہ پڑا رہا مگر رفتہ رفتہ یہ راز فلمی دنیا والوں پر بھی افشا ہو گیا۔ کسی کو اس خبر پر یقین نہیں تھا۔ کوئی یہ ماننے کو تیار نہیں تھا کہ بابرہ جیسی زیرک چالاک اور ہوشیار لڑکی شاہد جیسے شخص سے پیار اور پھر شادی کرنے کے بارے میں سوچے گی مگر بابرہ نے کم از کم اپنے گھر والوں کو صاف صاف بتا دیا تھا کہ وہ ہر قیمت پر شاہد سے شادی کرے گی۔ خواہ دنیا اِدھر سے اُدھر ہو جائے۔ یہ فیصلہ ہوش اڑانے والا ضرور تھا مگر اس کے گھر والوں کو اپنی تربیت اور بابرہ کی ذہانت اور عقلمندی پر پورا بھروسا تھا۔ وہ سمجھتے تھے کہ یہ جذبہ وقتی ہے چند روز کے بعد جب بخار اتر جائے گا تو دونوں اپنی اپنی راہ لیں گے مگر یہ ان کا خیال خام تھا۔ قربت کے لمحات نے ان دونوں پر ایک دوسرے کی لطافتیں منکشف کر دی تھیں اور وہ زیادہ قریب ہو گئے تھے۔ بعض تسلیم کرتے ہیں کہ شاہد کی شخصیت اور وجود میں ایک حیوانی کشش پائی جاتی تھی۔ وہ ایک ایسا مقناطیس تھا جس کی کشش سے ہر لڑکی اس کی جانب کھنچی چلی جاتی تھی۔ شریف زادیوں کے بارے میں تو وثوق کے ساتھ کہنا مشکل ہے مگر اس میں کوئی شک نہیں کہ پختہ کار عورتوں کے لیے اس میں ایک مخصوص قسم کی کشش تھی۔ وہ اس کی داستانیں سن سن کر اس کے نزدیک ہونے کے بہانے ڈھونڈا کرتی تھیں اور جب ایک بار اس کے بازوؤں کے حصار میں پہنچتی تھیں تو پھر موم کی طرح پگھل کر رہ جاتی تھیں۔ وہ ایک ایسا فاتح تھا جو محض اپنی ساکھ کے بل بوتے پر دشمن کو زیر کرنے کی صلاحیتوں سے مالا مال تھا۔ چنانچہ بابرہ کے گھر والوں کا یہ اندازہ بھی غلط ثابت ہوا۔ وہ اپنے تجربے میں ناکام ہو گئے۔ جبر اور زبردستی سے وہ کام نہیں لے سکتے تھے۔ بابرہ جیسی خودمختار لڑکی پر کسی کا زور نہیں چل سکتا تھا۔ اس کے بعد ان کے لیے صرف ایک ہی صورت باقی رہ جاتی تھی وہ یہ کہ اس ضدی لڑکی کے سر سے عشق کا بخار اتر جانے کا انتظار کریں۔ انہیں یقین تھا کہ شاہد اپنی افتادِ طبع کے ہاتھوں مجبور ہو کر ایسی حرکتیں ضرور کرے گا کہ بابرہ اس سے بدظن اور بیزار ہو جائے گی۔

یہ تو گھر والوں کی خواہشات تھیں مگر بابرہ اور شاہد نے سنجیدگی سے شادی کا منصوبہ بنا لیا تھا۔ انہوں نے اس منصوبے کی تفصیلات ہر ایک سے پوشیدہ رکھیں۔ شاہد تو اپنے رازوں کو اپنے دل کے اندر محفوظ رکھنے کا ماہر تھا ہی مگر بابرہ نے بھی اس راز کی دل و جان سے حفاظت کی، یہاں تک کہ اس کی بہنیں جو ہر معاملے میں ایک دوسرے کی شریک راز اور قابل اعتبار سہیلیاں بھی تھیں بابرہ نے انہیں بھی اس کی ہوا نہیں لگنے دی۔ جان محمد جمن کی فلم "دیکھا جائے گا" کی شوٹنگ میں حصہ لینے کی غرض سے بابرہ کراچی روانہ ہوئی تو شاہد بھی فلم کی شوٹنگ کے لیے کراچی پہنچ گیا مگر وہ دونوں شوٹنگ سے زیادہ شادی میں دلچسپی لے رہے تھے۔ کراچی میں بابرہ اور شاہد کا چند قریبی اور ہم راز جاننے والوں کی موجودگی میں نکاح ہو گیا اور اسی روز وہ لندن روانہ ہو گئے۔

لاہور میں فلم ساز ان دونوں کے انتظار میں بیٹھے رہے مگر ان دونوں کی کوئی خبر نہیں تھی اور نہ ہی کسی کو یہ علم تھا کہ وہ دونوں کہاں ہیں۔ فلمی صنعت میں افواہیں تو بہت گرم ہو رہی تھیں مگر یہ کسی کو یقین نہیں تھا کہ بابرہ اور شاہد کی باقاعدہ شادی ہو چکی ہے اور وہ دونوں ہنی مون منانے کے لیے لندن چلے گئے ہیں۔

لندن میں شاہد اور بابرہ کو چھپ کر رہنے کی بظاہر کوئی ضرورت نہیں تھی مگر اس کے باوجود انہوں نے کسی ہوٹل میں قیام کرنا مناسب نہیں سمجھا۔ مشرقی لندن میں ایک واقف کار کے چھوٹے سے گھر میں انہوں نے پناہ لی جہاں پاکستانی مداح کی بیگم پاکستانی پکوان پکا کر ان کی خاطر مدارات کرتی رہی۔ بعد میں انہوں نے اپنے جاننے والوں کو بتایا کہ وہ دونوں گھر کے ایک بالائی بیڈروم میں مقیم تھے اور ابتدائی چند روز تو انہوں نے کمرے سے باہر قدم تک نہیں رکھا۔ میزبان انہیں ناشتا اور کھانا خواب گاہ میں ہی پہنچا دیا کرتے تھا اور وہ دونوں باقی دنیا سے بے خبر ایک دوسرے میں کھوئے ہوئے تھے۔ چند روز کے بعد جذبات کا طوفان تھما تو انہوں نے کمرے سے اور پھر مکان سے باہر نکل کر دیکھا۔ لندن ان دونوں ہی کے لیے نیا اور غیر مانوس نہیں تھا مگر اس بار لطف ہی کچھ اور تھا۔ ایک دوسرے کی رفاقت میں وہ زندگی کی رنگینیوں سے جی بھر کر لطف اندوز ہو رہے تھے۔ رات گئے معروف اور غیر معروف سڑکوں پر گھومنا، تھیٹر اور سینما کی سیر اور سب سے بڑھ کر ایک دوسرے کی رفاقت کا مزہ۔ شاہد نے بابرہ کی ناز برداری میں کوئی کسر اٹھا نہیں رکھی۔ بابرہ کے منہ سے نکلی ہوئی ہر بات اس کے لیے حکم کا درجہ رکھتی تھی اور بابرہ کی ناراضگی وہ ایک لمحہ کے لیے بھی برداشت نہیں کرسکتا تھا۔ وہ دونوں ایسے مقامات پر جانے سے پرہیز کرتے تھے جہاں ملاقاتیوں، شناساؤں یا مداحوں سے ملاقات کا ڈر ہوتا۔ وہ اپنے وقت اور اپنی مصروفیات میں کسی تیسرے شخص کو شریک کرنے کے روادار نہیں تھے۔ یہی وجہ ہے کہ انہوں نے

لندن میں اپنے کسی دوست، رشتے دار یا پرستار کو اپنی آمد کی اطلاع نہیں دی تھی۔ وہ ٹیکسیوں میں گھومتے، پیدل گشت کرتے یا پھر غیر آباد اور غیر معروف مقامات کی خاک چھانتے۔ باقی ماندہ دنیا کے لیے وہ ناپید ہو چکے تھے۔ ان کا کسی سے تعلق نہ تھا نہ کسی کا ان سے رابطہ۔ وہ مکمل طور پر انڈر گراؤنڈ جا چکے تھے۔ حکومتوں کو سنگین جرائم میں مطلوب مجرم بھی اتنی رازداری اور احتیاط کے ساتھ لوگوں کی نظروں سے محفوظ رہنے کی کوشش نہیں کرتے جو یہ دونوں کر رہے تھے۔

فلم ساز، دوست احباب اور رشتے دار گویا ان کے نزدیک دنیا میں موجود ہی نہیں تھے۔ انہوں نے اپنی دنیا ہی الگ بنالی تھی۔ ان کا زیادہ وقت تنہائی میں ایک دوسرے کی محبت میں گزرتا تھا۔ ادھر پاکستان میں فلم سازوں کی پریشانی بڑھتی جا رہی تھی۔ افواہیں انہوں نے بھی بہت سنی تھیں مگر حقیقت حال سے وہ یکسر ناواقف تھے۔ کئی فلموں کے سیٹ لگے ہوئے تھے۔ کئی فلموں کے سیٹ ٹوٹ چکے تھے۔ فلم سازوں کی یہ منصوبہ بندی دھری کی دھری رہ گئی تھی۔ ان کا یہ ہنی مون دوسروں کو بہت مہنگا پڑا تھا۔

پھر ایک دن جس طرح اچانک وہ دونوں غائب ہوئے اسی طرح ایک دم نمودار بھی ہو گئے۔ لاہور کے فلمی حلقوں میں یہ خبر گھوم گئی کہ بابرہ اور شاہد ہنی مون منانے کی غرض سے لندن چلے گئے تھے واپس آ گئے ہیں۔ فلم سازوں، دوستوں، شناساؤں اور ملاقاتیوں کا تانتا بندھ گیا۔ دوسرے دن بابرہ اور شاہد الگ الگ نگار خانوں میں شوٹنگ کر رہے تھے۔ شاہد کے پاس تو ہر سوال کے جواب میں ایک شرمیلی سی مسکراہٹ تھی مگر بابرہ کے پاس ہزاروں داستانیں تھیں۔ بے ضرر سے واقعات اور شاہد کی وارفتگی کے حالات تو اس نے سبھی کو سنا دیئے مگر پس پردہ تفصیلات محض اپنی قریبی سہیلیوں کے لیے وقف رکھیں۔ وہ اداکارائیں جو شاہد کی رفاقت کا مزہ چکھ چکی تھیں اور وہ جو اس سے ملن کی آس میں بیٹھی تھیں ان سبھی نے بابرہ کو گھیر لیا۔ بابرہ یہ داستانیں مزے لے لے کر سناتی رہی اور سننے والوں کو بھی مزہ آتا رہا۔

ان دونوں کی شادی کا راز فاش ہو چکا تھا۔ اس لیے اب وہ دونوں کھلم کھلا میاں بیوی کے طور پر ملتے تھے۔ بابرہ نے شاہد سے شادی کے لیے دستور کے مطابق وہی شرائط رکھی تھیں جو اداکارائیں عام طور پر پیش کیا کرتی ہیں۔ مثلاً بابرہ فلموں میں بدستور کام کرتی رہے گی، بابرہ کی کمائی سے شاہد کا کوئی تعلق نہ ہوگا۔ وہ نہ صرف بابرہ کا خرچا اٹھائے گا بلکہ جیب خرچ کے طور پر ایک معقول رقم بھی ہر ماہ دیا کرے گا۔ اس کے علاوہ شاہد اپنی بیوی کو ایک شاندار گھر بھی لے کر دے گا۔ معاہدے کی سب سے اہم شرط یہ تھی کہ شاہد اپنی بیوی کو طلاق دے دے گا۔ چنانچہ زمرد جو شاہد کے انتظار میں گلبرگ میں اس کی کوٹھی میں اپنی نوعمر بیٹی کے ساتھ شاہد کی منتظر تھی اسے ایک روز خود شاہد یا اس کے محبت نامے کی بجائے طلاق نامہ موصول ہو گیا تو وہ ہکا بکا رہ گئی۔ شاہد کی آوارہ گردی اور رنگین مصروفیات کی داستانیں زمرد سے پوشیدہ نہیں تھیں مگر وہ یہ سمجھ کر چپ تھی کہ ایک دن تھک کر شاہد واپس اس کے پاس آ جائے گا مگر یہ اس کی خوش فہمی کے سوا کچھ اور نہ تھا۔ شاہد کا متلون مزاج اس سے اکتا چکا تھا۔ وہ اس سے علیحدہ ہونے کے لیے مناسب وقت اور موقع تلاش کر رہا تھا اور یہ موقع اور اخلاقی قوت اسے بابرہ شریف نے فراہم کر دی تھی۔ زمرد بہت عرصہ قبل شاہد کی توجہ اور مہربانی سے محروم ہو چکی تھی۔ شادی کے ابتدائی چند مہینوں کے بعد شاہد کی وارفتگی میں حسب معمول کمی پیدا ہو چکی تھی اور وہ جو بڑے چاؤ سے زمرد کو اپنی بیوی بنا کر اپنے بنگلے میں لایا تھا رفتہ رفتہ اس سے دور ہونے لگا تھا۔ ایک خوب صورت اور پیاری بیٹی کی پیدائش بھی شاہد کو زمرد کے ساتھ وابستہ رکھنے میں ناکام رہی تھی۔ ایک سال کے بعد شاہد کی آوارگیاں اور غیر حاضریاں بڑھنے لگیں اور زمرد جو ایک خالص گھریلو بیوی بن کر باقی ماندہ زندگی گزارنے کا خواب دیکھ رہی تھی اس خواب کی تعبیر سے محروم ہی رہی۔ کتنی عجیب بات ہے کہ شاہد کی ایک گھریلو بیوی کے ہوتے ہوئے زمرد نے اس سے شادی پر رضامندی ظاہر کر دی تھی۔ زمرد کے حق میں یہ بات جاتی ہے کہ اس نے کم از کم شاہد سے یہ مطالبہ نہیں کیا تھا کہ وہ اپنی پہلی بیوی کو طلاق ضرور دے گا مگر بابرہ نے اپنی ذات اور برادری کی ایک عورت کی سوکن بننے پر اکتفا نہیں کیا تھا بلکہ شادی کی شرط کے طور پر یہ بات منوائی تھی کہ شاہد زمرد کو طلاق دے دے گا۔ شاہد کو اس شرط کو تسلیم کرنے میں کوئی تامل نہیں تھا۔ وہ تو شاید اس عمل کے لیے کسی بہانے کی تلاش میں تھا۔ اس نے نہ تو اپنی بیوی کا خیال کیا اور نہ ہی معصوم بچی اس کی راہ میں حائل ہوئی۔ زمرد کو گھر بیٹھے بٹھائے طلاق نامہ موصول ہوا تو وہ ساکت و جامد رہ گئی۔ اس کی تمام آرزوؤں اور امیدوں کی ڈوری منقطع ہو چکی تھی۔ صبر کے سوا اس کے پاس کوئی اور چارہ نہیں تھا البتہ گلبرگ میں وہ کوٹھی ضرور اس کے قبضے میں تھی جہاں شادی کے بعد وہ شاہد کی

بیوی بن کر آئی تھی۔ زمرد کے ساتھ یہ کوئی نئی اور ان ہونی بات نہیں ہوئی تھی ابتدائے آفرینش ہی سے مرد صنف نازک کے ساتھ یہی سلوک کرتے چلے آرہے ہیں اور ستم ظریفی یہ ہے کہ اس کی محرک بھی کوئی عورت ہی ہوا کرتی ہے۔

لاہور پہنچ کر چند روز تو مبارک بادیں وصول کرنے میں صرف ہوئے اس کے بعد حالات رفتہ رفتہ معمول پر آنے لگے۔ وہ فلم ساز جوان دونوں کی اس غیر ذمے دارانہ حرکت پر آگ بگولہ ہو رہے تھے انہیں سامنے پاکر موم کی طرح پگھل گئے۔ ناراضی کا اظہار کرنے کے بجائے وہ انہیں مبارکبادیں اور دعوتیں دینے میں مصروف ہو گئے۔ یہ بھی کوئی نئی بات نہیں تھی کیونکہ فلم سازوں کی ابن الوقتی اور موقع پرستی بھی ہماری فلمی صنعت میں ضرب المثل بن چکی ہے اور ان کی اسی روش نے فلمی ستاروں کو یہ حوصلہ دیا ہے کہ وہ ان کے ساتھ جو چاہے سلوک روا رکھیں۔ اچانک شوٹنگ سے غائب ہو کر شادی کر لینا اور پھر ہنی مون منانے کے لیے ملک سے باہر چلے جانا ایک پرانی روایت ہو چکی ہے پھر ہیروئن کا کسی پیشگی اطلاع کے بغیر ماں بن جانے کی تیاری کرنا اور درجنوں فلموں کا ملتوی ہو جانا بھی کوئی نئی ریت نہیں ہے۔ بابرہ اور شاہد کے ساتھ بھی یہی معاملہ پیش آیا۔ وہ اپنی کامرانیوں اور ذاتی خوشیوں کی برسات میں شرابور تھے۔ انہیں دوسروں کے جذباتی اور کاروباری صدموں سے کوئی دلچسپی نہیں تھی۔ بابرہ نے ہنی مون کی جو رومان انگیز اور رنگین داستانیں اپنی ہم جلیسوں کو سنائی تھیں وہ رفتہ رفتہ عام ہونے لگی تھیں اور اس کے ساتھ ساتھ ہی فلمی دنیا کی ہیروئنوں میں شاہد کی مارکیٹ اونچی ہوتی جا رہی تھی۔ بابرہ کو یہ احساس ہی نہیں تھا کہ وہ نادانستگی میں شاہد کی پبلسٹی کرنے میں مصروف ہے۔ یہ بھی نہیں ہے کہ اس کے بغیر شاہد بابرہ سے منہ نہ موڑتا مگر اس میں کوئی شک نہیں کہ اس عمل میں کچھ تاخیر ضرور ہو سکتی تھی مگر بابرہ نے شاہد کی رومانی زندگی کا جو نقشہ پیش کیا تھا اسے سن کر بہت سی فلمی خواتین کے جذبات میں ہلچل پیدا ہو گئی تھی اور وہ بھی اس بہتے دریا میں ہاتھ دھو لینے کی سعادت سے محروم نہیں رہنا چاہتی تھیں۔ شاہد پر ان کے التفات اور مہربانیوں میں اضافہ ہو چکا تھا اور بابرہ سے دور ہونے کے لیے شاہد کو اب پہلے کے مقابلے میں زیادہ مواقع اور بہانے حاصل ہو چکے تھے۔ شاہد کی زندگی کا یہ پہلو ہمیشہ بہت رنگین اور سنگین قرار دیا گیا تھا مگر جب بابرہ جیسی پختہ کار خوب صورت سلجھی ہوئی اداکارہ نے ان تمام داستانوں کی تصدیق

ایک نکتہ

ایک نکتہ کی کم مائیگی پر نہ جائیں۔ یہ بظاہر بے ضرر نظر آنے والا نکتہ بڑے بڑے کارنامے انجام دے سکتا ہے۔ یہ ایک نکتہ۔

☆ ''زحمت'' کو اللہ کی ''رحمت'' میں تبدیل کر سکتا ہے۔

☆ ''خرام'' کو ''حرام'' قرار دے سکتا ہے۔

☆ ''حلوے'' کے ''جلوے'' دکھا سکتا ہے۔

☆ ''رقوم'' کو ''زقوم'' کی طرح خاردار بنا سکتا ہے۔

☆ ''رنگ'' کی خوش حالی کو ''زنگ'' لگا سکتا ہے۔

☆ ''رفیق'' کو ''رقیق'' القلب بنا سکتا ہے۔

☆ ''زمر'' کے ''رمز'' آشکارا کر سکتا ہے۔

☆ ''سفر'' کرنے والے کو ''سقر'' پہنچا سکتا ہے۔

☆ ''طاہر'' کو ''ظاہر'' کر سکتا ہے۔

☆ ''غدر'' کے لیے ''عذر'' تراش سکتا ہے۔

☆ ''غرض'' کو ''عرض'' کر سکتا ہے۔

☆ ''خلق'' کی ''حلق'' میں اٹک سکتا ہے۔

☆ ''فرح'' کو ''فرخ'' کی زوج بنا سکتا ہے۔

☆ انسان کو ''فریب'' کے ''قریب'' لا سکتا ہے۔

☆ ''فصد'' کا ''قصد'' دلا سکتا ہے۔

☆ ''قضا'' کی ''فضا'' پیدا کر سکتا ہے۔

☆ ''قرق'' کا ''فرق'' سمجھا سکتا ہے۔

☆ ''کنیز'' کو ''کنیر'' (زہریلا) بنا سکتا ہے۔

☆ ''فند'' (دھوکا) کو ''قند'' میں تبدیل کر سکتا ہے۔

☆ ''فرار'' ہو کر ''قرار'' پا سکتا ہے۔

☆ ''غلت'' (بھول) کو ''علت'' سے بچا سکتا ہے۔

☆ ''عسل'' میں ''غسل'' دے سکتا ہے۔

☆ ''غم'' کے ''عم'' میں نڈھال کر سکتا ہے۔

☆ ''غزال'' کو ''عزال'' میں پھینک سکتا ہے۔

☆ ''خلال'' کو ''حلال'' قرار دے سکتا ہے۔

☆ ''حر'' کو ''حر'' کی آزادی دلا سکتا ہے۔

☆ ''علجان'' کی میزبان کو ''غلجان'' میں ڈال سکتا ہے۔

اس ایک نکتہ کو حقیر مت گردانیے۔ یہ بہت کچھ کر سکتا ہے۔

مرسلہ: حسن رزاقی۔ کراچی

کردی تو شاہد کی قدر و قیمت میں ایک دم اضافہ ہوگیا۔ بابرہ نے جذبات انگیز واقعات کا جو پٹارہ کھولا تھا اس میں سے برآمد ہونے والے ناگ نے آخر کار اس کی ازدواجی زندگی کو ڈس لیا۔

شادی کے ابتدائی ایام تو سبھی کے لیے خمار انگیز اور جذبات خیز ہوتے ہیں پھر شاہد اور بابرہ تو ایک دوسرے کے لیے ترسے ہوئے تھے اور بہت اللہ آمین کے بعد ایک دوسرے کی رفاقت سے فیض یاب ہوئے تھے۔ قریبی دوستوں اور مشیروں نے ہمدردی اور نصیحت کے جتنے بھی فقرے کہے وہ ان پر اثر نہ کر سکے۔ بابرہ کے گھر والوں نے بھی اس حادثے کو مشیت ایزدی سمجھ کر قبول کرلیا تھا۔ آہستہ آہستہ وہ اس شادی کے منفعت بخش پہلو کو بھی دیکھنے لگے تھے۔ بابرہ جس ماحول سے تعلق رکھتی تھی اس میں شادیاں، وقتی رفاقتیں اور صنف مخالف سے دوستیاں زیادہ اہمیت نہیں رکھتی تھیں۔ البتہ ان تعلقات اور رشتوں کا مالی اور کاروباری پہلو بہت اہم تھا۔ طلاق اور علیحدگی سے انہیں زیادہ فرق نہیں پڑتا۔ دیکھنے اور سمجھنے کی بات یہ ہے کہ اس شادی یا طلاق سے فائدہ ہوگا یا نقصان؟ اور اکثر حالات میں یہ خواتین سکے کے اس رخ سے تعلق رکھتی ہیں جس کا چہرہ ہمیشہ اوپر کی جانب ہوتا ہے۔ رومانی اور جذبات انگیز لمحات سے وقت نکال کر بابرہ نے یہ بھی ملحوظ رکھا تھا کہ شادی کا مالی پہلو یکسر فراموش نہ ہوجائے۔ سب سے پہلے تو انہیں ایک گھر کی ضرورت تھی۔ بابرہ کا خوبصورت اور آراستہ گھر انہیں عارضی طور پر تو پناہ فراہم کرسکتا تھا مگر یہاں زیادہ عرصہ قیام کرنا مناسب نہیں تھا۔ یہ نہ تو شاہد کی غیرت کو گوارا تھا اور نہ ہی بابرہ کی مصلحت کے لیے مناسب تھا۔ چنانچہ گلبرگ ہی میں ایک کرائے کا بنگلا تلاش کرلیا گیا۔ اسے فرنیچر اور ضروری ساز و سامان سے آراستہ کرنا کوئی دشوار کام نہ تھا۔ شاہد ایک معروف ہیرو تھا اور معقول معاوضہ حاصل کر رہا تھا۔ اس گھر کو سجانے کے بعد بابرہ کے گھر والوں نے شاہد کو معاہدے کی وہ شق یاد دلانی شروع کردی جس کے تحت اسے بابرہ کو ایک گھر بھی بنا کر دینا تھا۔ اول تو مرد ذات ہی کا کوئی بھروسا نہیں ہے۔ گھڑی میں تولہ، گھڑی میں ماشہ، اور پھر شاہد ایک خاص قسم کا مرد تھا جس کی بے اعتباری کی کہانیاں عام ہیں۔ پھر یہ کیسے ممکن تھا کہ معاہدے کے اس پہلو کو نظر انداز کردیا جاتا۔

پیار محبت اور اخلاص اپنی جگہ، مگر اپنے حقوق کا تحفظ بھی تو آخر کوئی چیز ہوتی ہے۔ شاہد نے بہت جلد بابرہ کے نام سے گارڈن ٹاؤن کے فیشن ایبل علاقے میں دو کنال کا ایک پلاٹ خرید لیا اور اس پر مکان تعمیر کرنے کے لیے نقشے بنوانے شروع کردیے۔ مگر یا تو نقشہ نویس نے دیر کردی یا پھر شاہد نے اپنے جذبات کے الاؤ کو سرد کرنے میں کچھ زیادہ ہی عجلت برتی۔ ابھی اس مکان کے لیے کوئی معقول نقشہ پسند نہیں کیا گیا تھا کہ بابرہ اور شاہد کی شادی کا نقشہ بدلنا شروع ہوگیا۔ جذبات کی طوفان خیز آندھی تھمنے لگی تو شاہد نے پر پرزے نکالنے شروع کردیے۔ دوستوں کی محفلیں اور ناؤنوش کی مجلسیں آراستہ ہونے لگیں۔ وہ شخص جو بظاہر بالکل تبدیل ہوچکا تھا اور سرِ شام گھر لوٹ آتا تھا۔ اب گھر سے راتوں کو غائب رہنے لگا۔ بابرہ نے اپنے گھر کو بسانے کے لیے بڑے چاؤ کیے تھے۔ حقیقت یہ ہے کہ بابرہ کے اندر ایک خالص عورت اور ماں چھپی بیٹھی ہے۔ یہ عورت اپنے آپ کو گاہے بگاہے بے نقاب کرتی رہتی ہے۔ بابرہ ان معدودے چند ایکٹریسوں میں شمار کی جاسکتی ہے جو صحیح معنوں میں گھریلو زندگی کی خواہاں ہیں۔ اس کی تمنا رہی ہے کہ وہ ایک بیوی کے طور پر زندگی بسر کرے اور اس کے گھر میں بچوں کی رونق رہے۔ بابرہ کو اس وقت بھی چھوٹے بچوں سے والہانہ پیار تھا۔ جہاں بھی کوئی بچہ نظر آتا اسے دبوچ کر بیٹھ جاتی اور گود میں اٹھائے پھرتی۔ بچے اس کی کمزوری تھے۔ پہلے وہ جاننے والوں کے بچوں سے کھیلتی اور دل بہلاتی رہی۔ جب اس کی بہنوں کے بچے گھر میں آئے تو بابرہ نے فارغ اوقات میں ان بچوں سے اپنا دل بہلانا شروع کردیا۔ وہ بچوں کے لیے ترستی رہی مگر بدقسمتی سے اس کی آغوش ہمکتے ہوئے بچے کے وجود سے محروم رہی۔ اس کے دامن میں ممتا کے پھول نہیں کھلے۔ اس کا گلشن ایسی تمام کلیوں کے چٹکنے کی آوازوں کو ترستا رہا ہے۔ بابرہ نے شاہد سے بہت سوچ سمجھ کر شادی کی تھی۔ شاہد کی زندگی اس کے سامنے کھلی کتاب کی مانند تھی۔ پھر گھر والوں اور سہیلیوں نے بھی سمجھانے کی بہت کوشش کی مگر بابرہ کی ضدی اور ہٹ دھرم طبیعت یہ تسلیم کرنے کو تیار نہ تھی کہ اگر شاہد کو سچی محبت، خلوص اور ماحول فراہم کیا جائے تو وہ ایک قابل فخر انسان بن جائے گا۔ شاہد کے بارے میں اس نے جو داستانیں سنی تھیں ان سب میں یہ بات مشترک تھی کہ وہ بچپن ہی سے توجہ اور محبت سے محروم رہا تھا۔ اسے ماں کا پیار اور توجہ نصیب نہیں ہوئی تھی۔ خود شاہد بھی نجی محفلوں میں اپنی محرومیوں کو بہت تفصیل سے بیان کرنے کا عادی تھا۔ خصوصاً عورتوں کے

دلوں میں اپنی محبت کی جوت جگانے کے لیے وہ اپنی زندگی کا یہ تکلیف دہ اور تلخ پہلو آشکارا کرنے سے باز نہیں رہتا تھا۔ وہ اس قدر دردانگیز انداز میں اپنی کہانی سناتا تھا کہ ہر عورت کا فطری جذبہ اس پر اپنا سب کچھ نچھاور کرنے پر آمادہ ہو جاتا تھا دیگر بہت سے لوگوں کا خیال ہے کہ یہ محض اس کی ایک چال تھی۔ یہ درست ہے کہ شاہد بچپن ہی میں ماں کی گود سے محروم ہو گیا تھا مگر اسے محبت کرنے والے مشفق چچا کا سایہ نصیب تھا جنہوں نے اسے اپنی اولاد سے بڑھ کر پیار دیا تھا۔ پھر اس کی بہنیں ہمیشہ اس پر واری صدقے ہونے کو تیار تھیں۔ تمام خامیوں اور کوتاہیوں کے باوجود انہوں نے شاہد کو ہمیشہ بے انتہا محبت سے نوازا۔ یہ سلسلہ آج بھی جاری ہے۔ شاہد بچپن ہی سے اپنی صورت شکل اور بھولپن کے باعث ہر ایک کی آنکھ کا تارا بنا رہا ہے۔ اس لیے اس کی یہ داستان الم جذبات کو اکسانے والی ایک دردناک کہانی سے زیادہ اہمیت نہیں رکھتی۔ مگر عورتیں اپنے فطری مادرانہ جذبات سے مجبور ہوتی ہیں اور پھر جب جذبات میں آگ لگانے والا شاہد جیسا خوبرو اور پُرکشش نوجوان ہو تو پھر جھوٹ اور سچ پر کون دھیان دیتا ہے؟

بابرہ بھی شاہد کی اسی چال کا شکار ہوئی تھی۔ اس نے فلموں میں دیکھا تھا اور ناولوں میں پڑھا تھا کہ جو بچے ابتدائی عمر میں ماں باپ کی محبت، توجہ اور خلوص سے محروم رہتے ہیں وہ نارمل انسان نہیں رہتے بلکہ مختلف ذہنی امراض میں مبتلا ہو جاتے ہیں۔ پھر اس نے یہ بھی دیکھا سنا اور پڑھا تھا کہ اگر مناسب توجہ اور محبت فراہم کی جائے تو ایسے بظاہر جنگلی اور بے پروا لوگ خلوص اور محبت کے پیکر میں ڈھل جاتے ہیں۔ بابرہ نے رضیہ بٹ کا مشہور ناول ''وحشی'' بھی پڑھا تھا جس کا ہیرو اسی قسم کے حالات کا نشانہ بن کر ایک اکھڑ اور بدتمیز نوجوان کی شکل اختیار کر گیا تھا مگر پھر ایک حساس اور ہمدرد لڑکی نے اپنے بے پناہ پیار کی بدولت اس کی زندگی میں انقلاب برپا کر دیا تھا۔ اس قسم کی اور بھی بہت سی کہانیاں بابرہ کے علم میں تھیں۔ جب اس نے شاہد کی کہانی سنی تو فوری طور پر خود کو وحشی کی ہیروئین کے روپ میں محسوس کرنا شروع کر دیا۔ وہ عالم تصور میں ایک مصلح اور انقلابی شخصیت کے سانچے میں ڈھل گئی۔ یہاں تک کہ ساری دنیا کے سمجھانے اور باز رکھنے کے باوجود اس نے اپنی زندگی کی بساط پر یہ داؤ کھیلنے کا فیصلہ کر لیا۔ مزے کی بات یہ ہے کہ بابرہ کو اس فیصلے سے باز رکھنے کا مشورہ دینے والوں میں ایک

☆ دنیا میں تقریباً آدھی جھیلیں انسانی سرگرمیوں کے باعث تنزلی کا شکار ہیں۔

☆ چین کی 100 جھیلیں بری طرح آلودہ ہو چکی ہیں ان جھیلوں کا 70 فیصد پانی میونسپل اور صنعتی اخراج پر مشتمل ہے۔

☆ کمبوڈیا کی جھیل Tonle sap بری طرح مٹی سے بھرتی جا رہی ہے جس کی بنیادی وجہ اس جھیل کے واٹرشیڈ کے علاقوں میں درختوں کی بے تحاشا کٹائی ہے۔

☆ نکارا گوآ کی Lake Managoa حیاتیاتی تنوع سے عاری ہو چکی ہے کیوں کہ 1925ء سے بغیر کسی کشید کے گندہ پانی اور میونسپل ویسٹ اس جھیل میں ڈالا جا رہا ہے۔

☆ شمالی تیونیسیہ Northern Tunisia کی جھیل Lch Keul کو پانی مہیا کرنے والے دریاؤں کے رخ موڑنے کے حوالے سے اس جھیل کو خطرات کا اندیشہ ہے۔

....☆....☆....

☆ مصر کی Lake Manzala مچھلیوں سے محروم ہو چکی ہے جس کی بنیادی وجہ پورٹ سعید کی توسیع کے نتیجے میں 1970ء کے عشرے میں زہریلے صنعتی مادے کا جھیل میں پھینکا جانا تھا۔

☆ جھیل وکٹوریہ کا 30 میٹر سے زائد گہرائی کا پانی آکسیجن سے محروم ہو چکا ہے کیوں کہ ہر سال جھیل میں 2 ملین لیٹر گندا پانی تنزانیا کی جانب سے پھینکا جا رہا ہے۔

☆ سائبیریا کی جھیل Baikal میں آلودہ فیکٹریاں ملین کیوبک میٹر مادہ پھینک چکی ہیں جس سے 1990ء کے عشرے کے وسط تک جھیل کی تہہ کے 20 مربع کلومیٹر علاقے میں آلودگی کے باعث آکسیجن کی مقدار کم ہو چکی ہے۔

☆ مغربی افریقا کے ممالک چاڈ، نائیجریا اور کیمرون کی سرحدوں پر واقع جھیل چاڈ ان تینوں ممالک کے تازہ پانی کے آبپاشی کے منصوبوں کا ماخذ ہے لیکن گزشتہ 30 سالوں میں جھیل کے سائز میں حیرت انگیز کمی واقع ہوئی ہے۔ 1963ء سے اب تک جھیل اپنے اصل سائز کے مقابلے میں صرف 20 فیصد رہ گئی ہے جس کی وجہ آب و ہوا میں تبدیلی اور زراعت کے لیے پانی کی زیادہ مانگ ہے۔

مرسلہ: راحت علی کراچی

نام شمیم آرا کا بھی تھا۔ شمیم آرا کو بابرہ کی فلمی زندگی کا "ناخدا" کہا جاسکتا ہے۔ "بھول" میں اسے پہلا چانس شمیم آرا ہی نے مہیا کیا تھا اور بعد میں شمیم آرا کی فلموں ہی سے بابرہ کی شہرت اور مقبولیت میں اضافہ ہوا۔ وہ ذاتی طور پر بھی شمیم آرا کی سوجھ بوجھ اور دانش کی قائل تھی۔ اسے اعتراف تھا کہ شمیم آرا اپنی ذاتی زندگی کے بارے میں درست فیصلے کرنے سے قاصر رہی ہے مگر اس کے باوجود وہ ہمیشہ اس کی رائے کو بہت اہمیت دیتی رہی تھی۔ شمیم آرا نے اسے شاہد کے بارے میں جو کچھ بتایا وہ اس کے ذاتی مشاہدے اور تجربے پر مبنی تھا۔ شاہد کی بیوی زمرد شمیم آرا کی بہترین ہمراز سہیلی رہی تھی۔ شمیم آرا کو اس کی شادی کے بعد کے لمحہ بہ لمحہ رونما ہونے والے واقعات وحالات کا بھی علم تھا۔ وہ بخوبی جانتی تھی کہ شادی کے چند ماہ بعد شاہد کے طرز عمل میں کیا تبدیلی پیدا ہوئی تھی اور زمرد کس ذہنی اور نفسیاتی عذاب میں مبتلا تھی۔ اس نے بابرہ کو بہت وضاحت کے ساتھ یہ سب کچھ بتانے اور سمجھانے کی کوشش کی مگر اس کے سر پر تو عشق کا بھوت سوار تھا جو کسی عمل اور وظیفے سے اترنے کا نام نہیں لیتا تھا۔ جب بابرہ کو ثابت قدم اور مستقل مزاج پایا تو شمیم آرا نے بھی ایک باشعور اور سمجھ دار عورت کی طرح یہ سوچ کر صبر کرلیا کہ ہر شخص زندگی میں اپنے تجربات بذات خود کرنا چاہتا ہے۔ وہ دوسروں کے تجربات اور ٹھوکروں سے کوئی سبق حاصل نہیں کرتا بلکہ اپنے حصے کی ٹھوکریں خود ہی کھانا پسند کرتا ہے۔ اگر بزرگوں کے تجربات سے سبق حاصل کرنے کی فطرت ہوتی تو آج حضرت انسان کے حالات بالکل مختلف ہوتے۔ دوسروں کی غلطیوں سے کبھی کسی نے کچھ نہیں سیکھا اور ان کو دہرانے میں کبھی نہیں ہچکچائے۔

بابرہ کو لاہور واپس پہنچ کر چند ماہ بعد ہی شاہد کا اصلی روپ نظر آنے لگا۔ شاہد نے کبھی کسی عورت کے ساتھ سختی یا بدتمیزی کا سلوک نہیں کیا۔ اس کی جانب سے بداخلاقی یا درشتی کا مظاہرہ بھی نہیں ہوا۔ اس کا سب سے بڑا اور تکلیف دہ ہتھیار نظر انداز کرنا اور بے وفائی تھی۔ اس کا ہرجائی پن ہی اس کے خلاف سب سے بڑی شہادت تھی۔ اس کے لیے یہ ممکن ہی نہیں تھا کہ کسی ایک عورت کے ساتھ باقاعدہ اور پُرسکون گھریلو زندگی بسر کرے۔ وہ انتہا سے زیادہ تلون مزاج اور بے پروا ہونے کے ساتھ ساتھ خود فراموشی کے عارضے میں بھی مبتلا رہا تھا۔ رات کی محفل میں بیٹھنے کے بعد یہ ممکن ہی نہیں تھا کہ وہ اعتدال میں رہے۔ اس وقت وہ دنیا کی ہر چیز کو فراموش کر بیٹھتا تھا اور صحیح معنوں میں دنیا و مافیہا سے بے خبر ہو جاتا تھا۔ چند روز کے پرہیز کے بعد اس کا یہ مرض دوبارہ عود کر آیا تھا۔ گھر سے غائب رہنے کے وقفوں میں اضافہ ہو چکا تھا۔ یہاں تک کہ جب وہ رات رات بھر گھر غائب رہنے لگا تو بابرہ صحیح معنوں میں فکر مند ہو گئی۔ شاہد کی شخصیت کا ایک اثر انگیز پہلو یہ بھی تھا کہ وہ نہایت خلوص اور معصومیت کے ساتھ اپنی غلطی کا اعتراف کرنے کے بعد معافی بھی طلب کر لیتا اور سراپا عجز و خلوص بن کر الفاظ اور حرکات کی مدد سے تمام شکاریوں کا ازالہ کر دیتا تھا۔ یہ اس کا ایسا حربہ ہے جس کے آگے ہر کوئی ہتھیار پھینک دینے پر مجبور ہوتا رہا۔ بابرہ کے ساتھ بھی یہی کہانی دہرائی جا رہی تھی۔ وہ لمبے وقفوں کے بعد گھر سے غیر حاضر رہنے کے بعد جب واپس آتا تو اپنی کوتاہی کی تلافی کر دیتا۔ اس قدر پیار نچھاور کرتا، سراپا اخلاص و نیاز بن کر ایسی تصویر پیش کرتا کہ بابرہ پگھل کر موم ہو جاتی مگر جب یہ واقعات معمول میں داخل ہونے لگے تو بابرہ واقعی فکر مند ہو گئی۔ گلبرگ کے بنگلے میں وہ تن تنہا کب تک وقت گزارتی اور پھر ستم یہ کہ شاہد کی غیر حاضریوں میں اضافہ ہونے لگا تھا۔ پھر ایک وقت ایسا بھی آیا جب وہ شاہد کو تلاش کرنے کے لیے مختلف نگار خانوں اور فلم سازوں کے گھروں میں فون کرتی رہتی مگر شاہد کا کوئی پتا نشان نہیں ملتا۔ بابرہ بذات خود ایک من موجی اور خود پسند شخصیت کی مالک تھی۔ اس کو کسی کی ناز برداری کرنے کی عادت کبھی نہیں رہی۔ وہ تو ناز اٹھوانے کی خوگر رہی تھی مگر شاہد کے معاملے میں اس نے تنک مزاجی کا مظاہرہ کرنے سے پہلے حد سے زیادہ صبر و برداشت کا مظاہرہ کیا۔ ایک نازک مزاج لڑکی کے لیے شاہد کی بے اعتنائی، بے پروائی اور بے نیازی کا یہ مظاہرہ ناقابل برداشت تھا۔ یہاں تک کہ ایک دن اس کے صبر کا پیمانہ لبریز ہو گیا۔ اس نے اپنا سوٹ کیس سنبھالا اور کار میں بیٹھ کر اپنے گھر چلی گئی۔ اس اکیلے گھر میں برہا کی راتیں اور انتظار کے دن گزارنا اس کے لیے ممکن نہیں رہا تھا۔

بابرہ اور شاہد کے عشق نے
کیا گل کھلایا؟
فلم انڈسٹری پر کیا اثر پڑا
آئندہ ماہ آخری حصہ میں ملاحظہ کریں

++

شکاری کا شکار

اے آر راجپوت

شکار کرنا ایک جوکھم بھرا شوق ہے۔ کبھی کبھی شکاری بھی شکار ہو جاتا ہے لیکن وہ شکاری شکار کرنے نہیں، انتقام لینے اس بھیانک جنگل میں پہنچا تھا' اپنے باپ کی موت کا انتقام۔

ایک بالکل الگ انداز کی شکار کہانی

بھوک کے مارے میری حالت انتہائی غیر ہوئی جارہی تھی۔ میں نے بے صبری سے آگ پر رکھے ہوئے برتن کا ڈھکنا اٹھایا۔ سوندھی سوندھی خوشبو نتھنوں میں گھس گئی۔

میں اپنے انکل اور ان کے ایک ریڈ انڈین ملازم کے ساتھ شکار کے لیے آیا ہوا تھا۔ ہم صبح سے لے کر شام تک گھوڑے کی پشت پر ہرنوں کا پیچھا کرتے رہے تھے اور جسم کا انگ انگ دکھ رہا تھا۔ اس پر یہ پشیمانی مستزاد کہ ایک بھی ہرن ہاتھ نہ آیا تھا۔

خیمے کے سامنے گرے ہوئے درخت کے تنے سے

ٹیک لگا کر میں نے ٹانگیں پھیلا دیں۔ تبھی دریا کی جانب سے انکل جم آتے دکھائی دیے۔

ان کے ایک ہاتھ میں پانی کی بالٹی تھی اور دوسرے میں تین موٹی موٹی شکر قندیاں۔ ان پر سرخ مٹی کی تہہ جمی ہوئی تھی۔ پانی کی بالٹی انہوں نے ایک طرف رکھی اور تینوں شکر قندیاں آگ میں دبا دیں۔ پھر میری طرف دیکھ کر مسکرائے اور بولے۔

''جانتے ہو کوپر......! بھنی ہوئی شکر قندی بڑی لذیذ ہوتی ہے۔''

شاید وہ میری تھکاوٹ کا احساس کرتے ہوئے مجھے خوش کرنا چاہتے تھے۔ میں نیم دلی سے مسکرانے لگا اور اسی انداز میں اپنے سر کو اثباتی جنبش دیتے ہوئے بولا۔ ''ہاں، انکل! آپ درست کہتے ہیں، سرما کی یخ بستہ راتوں میں بھنی ہوئی شکر قندی بڑا مزہ دیتی ہے۔''

انکل جم نے کنکھیوں سے مجھے دیکھا۔ ''ہم...... معلوم ہوتا ہے تم نے پہلے بھی چکھی ہے۔'' کہتے ہوئے اس نے شکر قندی آگ سے اتاری اور پلیٹ میں ڈال کر سامنے رکھ دیا۔

میں نے شکر ادا کرتے ہوئے جلدی جلدی زہر مار کرنے لگا۔ خنک ہوا کا ایک جھونکا آیا اور مجھے تخیلات کی دنیا میں اڑا لے گیا۔

☆☆☆

ہم ہر سال اس موسم میں شکار کھیلا کرتے تھے۔ انکل جم ہماری شکار پارٹی کے لیڈر ہوتے۔ گزشتہ سال ہم نے جنگلی سؤروں سے دو دو ہاتھ کیے تھے۔ یہ انتہائی خوف ناک مہم تھی۔

اس میں ہمارا تیسرا ساتھی جوپیل، انکل جم کا ریڈ انڈین ملازم، ایک مشتعل جنگلی سور کے حملے سے بال بال بچا تھا۔

ہوا یوں کہ ہم وسطی امریکا کے ایک دریا میں سفر کر رہے تھے۔ صبح کا وقت تھا، ہماری لانچ دریا کی موجوں سے اٹکھیلیاں کرتی ہوئی رواں دواں تھی۔ میں جنگلے سے ٹیک لگائے گرما گرم کافی سے لطف اندوز ہو رہا تھا کہ میرے کانوں میں سنکھ کی آواز آئی، جو وقفوں سے بلند ہو رہی تھی۔

میں نے انکل جم اور جوپیل کو اس طرف متوجہ کیا۔ انہوں نے آواز پر کان لگا دیے۔ پھر جوپیل بولا۔

''کوئی ریڈ انڈین ہم سے بات کرنا چاہتا ہے اور وہ اپنی کشتی میں ہمارے پیچھے آ رہا ہے۔''

انکل جم نے ڈرائیور کو ہدایت کی کہ لانچ کی رفتار کم کر دے۔ تھوڑی ہی دیر گزری تھی کہ ریڈ انڈین کی مخصوص طرز کی کشتی اپنی طرف بڑھتی ہوئی نظر آئی۔

دو نوجوان ریڈ انڈین لمبے چپوؤں سے کشتی کھے رہے تھے اور ایک ادھیڑ عمر کا شخص ہاتھ میں سنکھ پکڑے کشتی میں کھڑا تھا۔ جوپیل نے انہیں شناخت کر لیا اور بتایا کہ یہ لوگ مسکیٹو قبیلے سے تعلق رکھتے ہیں۔

دھیرے دھیرے کشتی، لانچ کے بالکل قریب پہنچ گئی۔ لٹکی ہوئی رسی کی مدد سے ادھیڑ عمر کا آدمی ہماری لانچ پر آ گیا اور جو سے مقامی زبان میں باتیں کرنے لگا۔

جو نے بتایا کہ یہ مسکیٹو قبیلے کا سردار جورابیلا ہے۔ اس کے ساتھ اس کے دو بیٹے لاکا اور پیک ہیں۔ یہ ہمیں اپنے علاقے میں جنگلی سؤروں کے شکار کی دعوت دینے آئے ہیں۔

جنگلی سؤروں کا شکار بڑا مشکل، دلچسپ اور جوش انگیز ہوتا ہے۔ انکل نے فوراً دعوت قبول کر لی۔ ہم نے لانچ سے بندھی ہوئی ڈونگی کھولی، بندوقیں وغیرہ لیں اور ان لوگوں کے ساتھ ہو لیے۔

کچھ دور تک بڑے دریا میں سفر کرنے کے بعد ہم اس کی ایک معاون ندی کے دہانے میں داخل ہو گئے۔ پھر تقریباً چار سو گز مزید آگے جا کر ہم نے کشتیاں کنارے سے لگا دیں۔ خشکی پر اترے اور وسیع و عریض جنگل میں داخل ہو گئے۔

ریڈ انڈین تیر کمان، لمبے نیزوں اور چوڑے پھل والے چھروں سے مسلح تھے۔ آدھ گھنٹے کے سفر کے بعد جورابیلا اور اس کے بیٹے کچھ محتاط سے ہو گئے۔ انہوں نے ہمیں بھی خاموش رہنے کا اشارہ کیا۔

''ہم جنگلی سوروں کے قریب پہنچ چکے ہیں۔'' جوپیل نے میرے کان میں آہستہ سے کہا۔ ''میں ان کی بو سونگھ رہا ہوں۔''

لاکا گربایا چند قدم آگے بڑھا اور جھک کر جھاڑیوں کی اوٹ سے دیکھنے لگا۔ پھر اطمینان کا اظہار کرتے ہوئے سر کو جنبش دی۔

''لاکا نے سوروں کا سراغ لگا لیا ہے۔'' جوپیل نے سرگوشی کے انداز میں کہا۔

ہم جورابیلا کی ہدایت پر نصف دائرے کی شکل میں آگے بڑھے۔ ریڈ انڈین پرندوں کی آوازوں سے ملتی جلتی سیٹیاں بجا کر ایک دوسرے کو ہدایات دے رہے تھے۔ میں زندگی میں پہلی بار اس انوکھے تجربے سے دوچار ہو رہا تھا۔ میرا دل بڑی تیزی سے دھڑکنے لگا۔ یوں لگتا تھا جیسے میری ریڑھ کی ہڈی میں چنگاریاں سلگ رہی ہیں۔

اچانک لاکا نے نعرہ بلند کیا اور نیزہ سامنے جھاڑی میں دے مارا۔ ایک بہت بڑا جنگلی سور تیزی سے لاکا پر حملہ آور ہوا۔ لاکا نے فوراً اچھل کر ایک درخت کی شاخ پکڑ کر لٹک گیا۔ سور کا وار خالی گیا وہ نیچے سے گزر گیا۔ اس ناکامی سے اس کے اشتعال اور غضب میں مزید اضافہ ہوگیا۔

”فائر کرو......“ جوبیل نے چیخ کر کہا۔ ”ورنہ ہماری بھی خیر نہیں۔“ میں نے کانپتے ہوئے ہاتھوں سے گولی چلادی، لیکن نشانہ خطا گیا۔ فوراً ہی جورابیلا نے کمان سے تیر پھینکا جو سیدھا سور کے شانے میں پیوست ہوگیا۔ وہ دوڑتے دوڑتے گر پڑا، لیکن پھر اٹھا اور دگنی شدت سے دوبارہ ہم پر حملہ آور ہوا۔

اب کے انکل جم نے انتہائی پھرتی دکھائی، انہوں نے سور کے سر کا نشانہ لیا اور گولی چلادی۔ سور کے پرخچے اڑ گئے اور وہ زمین پر گر پڑا۔

ہم آگے بڑھ گئے۔ ایک کھلے میدان میں سوروں کا گلہ ہراساں سا کھڑا تھا۔ شاید کچھ دیر پہلے اپنے دانتوں سے زمین میں دبی ہوئی جڑیں کھود کھود کر کھا رہے تھے۔ انکل نے مجھے فائر کرنے کا موقع دیا۔ میں نے ایک جھاڑی کی اوٹ میں بیٹھ کر گولی چلادی۔ ایک سور وہیں ڈھیر ہوگیا۔

فائر کی آواز سے جنگل گونج اٹھا۔ ایک سور حلق سے بھیانک آوازیں نکالتا ہوا میری طرف بڑھا جورابیلا نے اس پر تیر چلایا۔ سور نے اپنا رخ موڑا۔ اب وہ پیک کی طرف لپک رہا تھا۔ جب وہ اس کے قریب پہنچا تو پیک اچھل کر ایک طرف ہوگیا۔

اس کی پھرتی پر ہم بھی اش اش کر اٹھے۔ دراصل خطرے کے وقت حاضر دماغی اور مستعدی ریڈ انڈین باشندوں ہی کا خاصہ ہے۔ میں نے اس کا مظاہرہ کہیں اور نہیں دیکھا۔ حالانکہ میں پورے افریقا اور یورپ میں شکار کھیل چکا ہوں۔

اسما قادری کے سحر انگیز قلم سے

نیا شاہکار

جانباز

امارت کے نشے میں چور...... کمزوروں پر ظلم اور اپنے زیردست لوگوں کی عزتوں کو پامال کرنے والے ظالموں کی خودسری و دیدہ دلیری......

ظلم کے خلاف سینہ سپر نوجوان کی داستان

اسے اپنی محبت کو حاصل کرنے کا جنون بھی تھا اور مجرموں سے ٹکرانے کا حوصلہ بھی۔

تہلکہ خیز واقعات کا سلسلہ......

سسپنس کے صفحات پر جلد آرہا ہے

پیک نے اپنا لمبا نیزہ سور کے شانے کے پیچھے بھونک دیا۔ اس کی جرأت قابلِ داد تھی کہ وہ اس خوف ناک جانور کے ساتھ دوڑتے ہوئے نیزے پر دباؤ ڈال کر اسے اور زیادہ گہرا بھونکنے کی کوشش کر رہا تھا۔

بالآخر سور تکلیف کی شدت سے زمین پر گر پڑا۔ پیک نے کمر سے چوڑے پھل والا چھرا جسے ''بچی'' کہتے ہیں، کھولا اور سور پر پے در پے وار شروع کر دیے۔ سور چیخ مارتے ہوئے تڑپ تڑپ کر دم توڑ گیا۔

ہم دم بخود کھڑے انسان اور جنگل کے خوف ناک جانور کی اس جنگ کو دیکھ رہے تھے۔ پیک نے جوشِ مسرت سے نعرہ بلند کیا اور لاش کے گرد رقص کرنے لگا۔

جورا ہیلا نے اعلان کیا کہ فائرنگ کی آواز سے باقی سور محتاط ہو گئے ہیں، اب مزید شکار نہیں ملے گا۔ لہٰذا واپس چلنا چاہیے۔ پیک اور لاکا نے ہلاک کیے ہوئے سوروں کو ایک جگہ اکٹھا کیا، ان کی ٹانگیں جنگلی بیلوں سے باندھیں اور ایک موٹی ٹہنی سے لٹکا کر کاندھوں پر اٹھا لیا۔ جورا ہیلا نے چچا جم سے پوچھا۔

''کیا آپ بھی کچھ حصہ لینا پسند فرمائیں گے؟''

انکل جم مسکرایا اور اس کے شوق کو دیکھ کر کہا۔ ''نہیں، ہم اور شکار کر لیں گے، یہ سب آپ لے جائیں۔''

جورا ہیلا بے حد خوش ہوا اور اپنے ہاتھ نچا کر شکریہ ادا کرنے لگا۔ ریڈ انڈین کسی کے ممنونِ احسان ہوتے ہیں تو اسی طرح شکریہ ادا کرتے ہیں۔

ہمیں شکار کے لیے یہ جگہ پسند آئی کہ اگلے دن بھی یہیں کا پروگرام بنا لیا۔ یوں ہم ڈونگی میں بیٹھ کر ندی میں آ گئے۔ انکل اور جو پیل چپو چلا رہے تھے اور میں رائفل تھامے کشتی میں بیٹھا تھا۔

معاً ہی جو نے کنارے پر ایک سور دیکھ لیا۔ اس نے اچھل کر کہا۔

''اب میری باری ہے، اسے میں شکار کروں گا۔''

پھر میرے ہاتھ سے رائفل لی، نشانہ باندھا اور گولی چلا دی۔ سور لڑکھڑا کر گر پڑا۔ جو نے نعرہ اور چپو ہاتھ ہی میں لیے ہوئے وہ ڈونگی سے کود کر ندی پار کی، جوں ہی وہ سور کے قریب پہنچا، اس نے ایک بھیانک چیخ ماری اور اٹھ کھڑا ہوا اور پھر جو پر ٹوٹ پڑا۔

جو نے گھبرا کر سور کے سر پہ چپو دے مارا۔ چپو کے ٹکڑے ہو گئے اور جو لڑھک کر ایک طرف گر پڑا۔ تاہم وہ فوراً سنبھلا، پھرتی سے اٹھا اور چوڑے پھل والا چھرا نکال لیا۔ سور کا حملہ اتنا شدید تھا کہ اسے وار کرنے کی مہلت ہی نہ ملی۔ میں نے اضطرار کی حالت میں ڈونگی میں پڑی ہوئی رائفل اٹھا لی۔ انکل جم چیخے۔

''کوپر......! ٹریگر مت دبانا، جو بھی گولی کا شکار ہو جائے گا۔''

یہ کہہ کر انہوں نے اپنی رائفل لی، ڈونگی سے کودے اور جو کی طرف دوڑے۔ میں بھی ان کے پیچھے ہو لیا۔ جو سور سے گتھم گتھا ہو چکا تھا۔ کبھی کبھار اس کے چھرے والا ہاتھ اٹھتا اور سور کے جسم پر کاری وار لگا دیتا، لیکن وہ خود بھی اس کے تند و تیز حملوں سے لہولہان ہو چکا تھا۔

انکل جم نے جرأت سے کام لیا اور سور کو زور سے رائفل کا بٹ دے مارا۔ سور نے وحشت ناک آنکھوں سے انکل جم کو دیکھا۔ ان کی رائفل نے شعلہ اگلا۔ اگلے ہی لمحے سور کا بھیجا اڑ گیا۔ وہ آخری بار کانپا، دھڑام سے گرا اور دم توڑ گیا۔

ہم نے جو کو سہارا دے کر اٹھایا۔ اس کی چھاتی پر کئی زخم آئے تھے اور سر سے بھی خون کی ایک تیز دھار ابل کر چہرے کو رنگین کر رہی تھی۔ ہم نے اسے اٹھایا اور ڈونگی میں لے آئے۔ زخم صاف کیے اور خون روکنے کے لیے پٹی باندھی۔ جو پیل کے اوسان بحال ہوئے تو مسکرا کر بولا۔

''جنگ کا مزہ ہی آ گیا، لیکن میں یہ نہیں سمجھ سکا کہ گولی کھانے کے بعد وہ دوبارہ کیسے اٹھ کھڑا ہوا؟''

''اس میں حیرانی کی کوئی بات نہیں۔'' انکل جم نے جواب میں کہا۔ ''تمہاری گولی اس کی کھال کو چھوتی ہوئی گزر گئی، اس سے سور کچھ دیر کے لیے سن ہو کر رہ گیا۔ جب تم قریب پہنچے تو اس نے پاگل ہو کر تم پر ہلہ بول دیا، شکر ہے تمہاری جان بچ گئی۔''

جو کی حالت پھر خطرناک ہو گئی اور بے ہوش ہو گیا۔ ہم ڈونگی میں تیزی سے روانہ ہو گئے اور شہر لے جا کر جو کی مرہم پٹی کروائی، زخم مندمل ہونے میں متعدد ہفتے لگ گئے۔

☆☆☆

میں پہلے بتا چکا ہوں کہ انکل جم ہر سال موسم سرما میں شکار کھیلا کرتے تھے۔ اب کے انہیں اپنے بچھڑے چراگاہوں سے جمع کر کے محفوظ باڑوں میں پہنچاتے پہنچاتے دیر ہو گئی۔ چنانچہ جب شکار پر روانہ ہوئے تو میری موسم سرما کی چھٹیاں ختم ہو رہی تھیں۔ پھر بھی میں

ضد کر کے انکل کے ہمراہ شکار پر جانے کے لیے تیار ہوگیا۔

پاپا نے ہدایت کی کہ اسکول کھلنے سے پہلے واپس شہر پہنچ جاؤں۔ میں نے وعدہ کرلیا۔

کھانا کھانے کے بعد انکل نے کافی تیار کی اور ہم اطمینان سے چسکیاں لینے لگے۔ جوپیل گزشتہ تین روز سے غائب تھا۔ میں نے انکل سے اس کے متعلق پوچھا تو وہ بولے۔

''کوپز......! میرے بیٹے! کیپی کریک، جو کا آبائی علاقہ ہے۔ اس کا قبیلہ مدتوں اس علاقے میں قیام پذیر ہے۔ جب کبھی ہم ان جنگلوں میں شکار کے لیے آتے ہیں تو اسے بے بہا مسرت ہوتی ہے اور وہ ان جنگلوں میں گھومتے گھامتے، بہت دور نکل جاتا ہے، بہرکیف......اگر وہ آج بھی واپس نہ آیا تو میں کل اسے ضرور تلاش کرنے جاؤں گا۔''

کافی سے فارغ ہوکر ہم اٹھ کھڑے ہوئے۔ آسمان پر آہستہ آہستہ اندھیرے قابض ہوتے جارہے تھے۔ دور مغرب میں ''چوکیدار چٹان'' تاریکی کے دبیر پردے میں لپٹتی جارہی تھی۔ انکل جم نے خاموشی توڑتے ہوئے کہا۔

''مجھے یقین ہے جوپیل کسی حادثے کا شکار نہیں ہوا ہوگا۔ تاہم اب اسے جنگلوں میں یوں نہیں گھومنا چاہیے۔ وہ خاصا بوڑھا ہوچلا ہے۔''

جوپیل ایک عجیب وغریب شخص تھا۔ وہ چھ سال پہلے انکل کے پاس آیا تھا۔ انکل جم نے اس کی شخصیت سے متاثر ہوکر اسے ملازم رکھ لیا۔ جنگلوں کے بارے میں جو کی معلومات بہت وسیع تھیں۔ انکل کی طرح وہ بھی شکار کا زبردست شوقین تھا۔

ہم خیمے میں داخل ہوئے ہی تھے کہ انکل جم ٹھٹک گئے اور کچھ سننے کی کوشش کرنے لگے۔ میں نے بھی کان لگادیئے۔ جھاڑیوں میں کسی کے چلنے کی آواز آرہی تھی۔ مڑ کر باہر دیکھا تو جوپیل جھاڑیوں کی اوٹ سے نکل آیا تھا۔ اس کے کاندھے پر ایک مردہ ہرن تھا جو لمبے لمبے سانس لے رہا تھا۔ اس کا کندھا اور چہرہ ہرن کے خون سے لتھڑا ہوا تھا۔

''واہ، جو! تم نے کمال کردیا۔'' میں نے مسرت سے بے خود ہوتے ہوئے کہا۔ ''گزشتہ دو روز سے باسی گوشت کھا کر تنگ آچکا تھا۔ آج تازہ گوشت مزے سے

مشینی ذہانت

انسانی بقا کے لیے خطرہ

مشہور زمانہ مفلوج برطانوی سائنسداں پروفیسر اسٹیفن ہاکنگ نے خبردار کیا ہے کہ انسان کی تخلیق کردہ مشینی ذہانت Artificial Intelligence کا مطلب انسانیت کا خاتمہ ہوسکتا ہے۔ ایک خصوصی انٹرویو میں نظریاتی طبیعیات (Theoretical Physics) کے ماہر کا کہنا تھا کہ اس قسم کی ٹیکنالوجی انتہائی تیزی کے ساتھ ترقی کرکے نوع انسانی پر غلبہ پا سکتی ہے۔ اسٹیفن ہاکنگ کے بقول یہ ایک ایسی صورت حال ہوگی جس کی منظرکشی 'ٹرمینیٹر' سیریز کی فلموں میں کی جاچکی ہے۔ ان کا کہنا تھا کہ اس وقت ہمارے پاس ابتدائی شکلوں میں جو مصنوعی ذہانت موجود ہے وہ پہلے ہی بہت کارآمد ثابت ہوچکی ہے مگر میں سمجھتا ہوں کہ مکمل مشینی ذہانت کی تیاری کے ساتھ ہی انسانی نسل کے خاتمے کا سلسلہ شروع ہوجائے گا۔ پروفیسر ہاکنگ نے کہا کہ ایک بار انسانوں نے مکمل مصنوعی ذہانت بنالی تو پھر یہ خودبخود اپنی صلاحیتوں میں اضافہ کرے گی اور ہر لمحہ بڑھتی رفتار کے ساتھ خود کو ری ڈیزائن کرے گی۔ اسٹیفن ہاکنگ، جنہیں دنیا کا سب سے زیادہ ذہین زندہ سائنسداں مانا جاتا ہے کا کہنا تھا کہ انسان جو کہ سست حیاتیاتی ارتقاء کی وجہ سے محدود صلاحیتوں کا حامل ہے۔ مصنوعی ذہانت کا مقابلہ نہیں کرپائے گا اور اس سے شکست کھا جائے گا۔ 72 سالہ پروفیسر ہاکنگ، موٹر نیورون ڈیزیز نامی بیماری سے مکمل طور پر مفلوج ہونے کے باعث ایک خصوصی وہیل چیئر پر زندگی گزار رہے ہیں۔ وہ بولنے کی صلاحیت سے بھی محروم ہوچکے ہیں اور ایک آلے کی مدد سے گفتگو کرتے ہیں۔ اگرچہ اسٹیفن ہاکنگ مصنوعی ذہانت کے مخالف ہیں۔ تاہم وہ جدید مواصلاتی ٹیکنالوجی سے فائدہ اٹھانے کے زبردست حامی ہیں اور ان کا کہنا ہے کہ وہ دنیا کے ان چند لوگوں میں سے ایک ہیں جو ابتدائی زمانے میں انٹرنیٹ کے ذریعے ایک دوسرے کے ساتھ منسلک ہوئے تھے۔ ان کا کہنا ہے کہ انٹرنیٹ فوائد کے ساتھ ساتھ خطرات بھی لے کر آیا ہے۔

مرسلہ: ہانی رضوی۔ لاہور

کھاؤں گا۔'' میں اور انکل جم ہرن کا جائزہ لینے لگے۔ ایک نظر دیکھنے ہی سے پتا چل گیا کہ معاملہ گڑبڑ ہے۔ ہرن کی گردن ٹوٹ کر پیچھے کو مڑی ہوئی تھی۔ اس کی چھاتی اور گلے پر گہرے زخم تھے۔

''جو، قصہ کیا ہے؟'' انکل جم نے پوچھا۔

''ہرن کو کسی شیر نے شکار کیا ہے۔'' جو نے جواب میں بتایا۔ میں تعجب سے دیکھنے لگا۔ اس کی آنکھوں میں ایک عجیب وحشیانہ چمک تھی۔ رائفل اس کے بائیں کندھے سے لٹکی ہوئی تھی اور چوڑے پھل کا ''میچٹی'' چھرا اس کی کمر سے لٹک رہا تھا۔

''کیچی کے جنگلوں میں گزشتہ کئی برس سے کوئی شیر موجود نہیں ہے۔ کم از کم اس کی خبر کسی کو نہیں۔'' انکل نے بھی حیرت سے کہا۔

''مجھے تو تمہاری بات کا یقین نہیں آتا۔''

جو پیل خاموش رہا۔ وہ آگ کے قریب بیٹھ کر ہاتھ سینکنے لگا۔ چند لمحوں بعد بولا۔ ''کافی عرصہ پہلے جب میرا قبیلہ اس علاقے میں رہتا تھا، ایک شیر آ گیا تھا۔ اس وقت یہاں ہرنوں کی بہتات تھی۔ قبیلے ان کے شکار پر گزر اوقات کرتے تھے، لیکن شیر کے آنے سے ہرنوں میں کمی واقع ہوگئی۔''

''پیارے جو! یہ کافی عرصے پہلے کی بات ہوگی۔'' انکل جم نے لمبی ہمکاری خارج کرتے ہوئے کہا۔ ''آج کل ان جنگلوں میں شیر کہاں؟ جس شیر کا تم شکار اٹھا لائے ہو، یہ میکسیکو سے آیا ہوگا۔''

جو کوئی جواب دینے کے بجائے ہرن کی کھال اتارنے لگا۔ انکل جم مطمئن نہیں ہو سکے تھے۔ چنانچہ دوبارہ سوال داغ دیا۔ ''ہرن کہاں سے اٹھایا تھا؟''

''بڑی چٹان کے قریب سے۔'' جو نے کہا۔ میں سمجھ گیا کہ اس کا اشارہ ''چوکیدار چٹان'' کی طرف تھا جو پہاڑی سے قدرے آگے کو نکلی ہوئی تھی۔

''میں صبح سویرے چار کتے لے آؤں گا۔'' انکل جم نے کہا۔ ''پھر ہم تمہارے اس شیر کا تعاقب کریں گے۔''

''نہیں جم، کتوں کی ضرورت نہیں۔'' جو تیزی سے بولا۔ ''میں تنہا اس کا شکار کروں گا۔ جیسا کہ کبھی میرے باپ نے کیا تھا۔''

انکل جم یہ سن کر بڑے متعجب ہوئے۔ شمال کی طرف سے آنے والی سرد ہوا میں اب تیزی آ چکی تھی۔ ہمارے جسم سن ہو رہے تھے۔ آگ بھی ہمیں گرم رکھنے میں ناکام ثابت ہو رہی تھی۔

''جو! تم کتوں کی مدد کے بغیر شیر کا تعاقب نہیں کر سکتے۔'' انکل نے اسے سمجھانے کی کوشش چاہی۔ ''کتے بیس میل کے علاقے میں شیر کا سراغ لگا لیں گے۔ تم اس سے اتنی مشقت نہ ہو سکے گی۔ تمہاری جوانی کی گرمی ختم ہو چکی ہے۔ اب تم بڑھاپے کی کمزوریوں سے دوچار ہو چکے ہو۔''

''ٹھیک کہتے ہو جم!'' جو پیل ٹھنڈی سانس بھرتے ہوئے بولا۔ ''لیکن یہ شیر بھی اسی موسم سرما کا شکار ہو چکا ہوگا۔''

''کیا مطلب؟'' انکل نے پوچھا۔ ساتھ ہی انہوں نے جیب سے سگریٹوں کا پیکٹ نکال کر ایک سگریٹ خود لیا اور دوسرا جو کی طرف اچھال دیا۔ جو نے ایک چنگاری سے سگریٹ سلگایا اور لمبا کش لے کر بولا۔

''جب یہ شیر پہلی بار یہاں آیا تھا تو میں کوپر کی طرح لڑکپن کی منزل سے گزر رہا تھا۔ ایک بار شیر سے میرے باپ کی مڈبھیڑ ہوگئی۔ انہوں نے اس پر تیر چلایا، لیکن بدقسمتی سے کمان ٹوٹ گئی۔ بڑی چٹان کے نیچے دونوں میں شدید جنگ ہوئی۔ میرا باپ ہلاک ہوگیا۔ شیر بھی زخمی ہوا، مگر بچ گیا۔ اس نے دوبارہ ہرنوں کا شکار شروع کر دیا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ لوگ خوراک کی قلت کا شکار ہو گئے اور پورا قبیلہ یہاں سے نقل مکانی کرنے پر مجبور ہوگیا۔ بہت سے لوگ موسم کی سختیوں اور بھوک کا لقمہ بن گئے۔ اب اس علاقے میں میرے قبیلے کا کوئی آدمی نہیں رہتا۔''

اچانک دور شیر کی زبردست دہاڑ سے جنگل گونج اٹھا۔ میرے تو رونگٹے کھڑے ہو گئے۔ انکل بھی کافی پریشان ہو گئے۔ ان کے ہاتھ میں کافی کا پیالہ لرز رہا تھا۔ تاہم انہوں نے مجھے تسلی دی۔

''کوپر......! پرسکون رہو، درندہ ہم سے کافی دور ہے۔''

جو کے لبوں پر اسرار بھری مسکراہٹ عود کر آئی تھی۔ اس نے رائفل پکڑی اور کہنے لگا۔ ''خدا حافظ دوستو! میں شیر سے دو دو ہاتھ کرنے جا رہا ہوں۔''

''جو، احمق مت بنو۔ تم رات کے اندھیرے میں اس کا سراغ نہیں لگا سکتے۔ آرام سے بیٹھو، صبح دیکھا جائے گا۔'' لیکن جو پیل کیمپ کے باہر پھیلی ہوئی تاریکیوں میں

گم ہو چکا تھا۔ انکل جم اس کے پیچھے بھاگے، مگر چند قدم چل کر واپس آئے اور کہنے لگے۔

"میں اسے تلاش کرنے جا رہا ہوں۔ تم پریشان مت ہونا۔"

"میں بھی آپ کے ہمراہ چلوں گا۔"

"نہیں، تمہیں پرسوں اسکول جانا ہے۔" انکل جم غرائے۔ "اس اندھیری رات میں تمہیں ساتھ رکھ کر میں کوئی خطرہ مول نہیں لینا چاہتا۔"

لیکن میرے چہرے کو بغور دیکھ کر انہوں نے جانے کا ارادہ ترک کر دیا۔ پھر اپنے دل کو تسلی دینے کے لیے کہنے لگے۔ "میکسیکو سے آئے ہوئے شیر عموماً بزدل ہوتے ہیں۔ جو چیل اسے آسانی سے گولی کا نشانہ بنا لے گا۔"

ہم نے ہرن کا گوشت آگ پر بھون کر کھایا۔ پھر بستروں میں دبک گئے۔ دن چڑھا تو کافی کے دو دو گھونٹ پینے کے بعد گھوڑوں پر سوار ہو کر جو کی تلاش میں نکل کھڑے ہوئے۔

انکل جم نم دار زمین پر جو کے قدموں کے نشان بڑی آسانی سے دیکھتے ہوئے آگے بڑھ رہے تھے۔ کافی دور جا کر ان کے ساتھ شیر کے پنجوں کے نشان بھی دکھائی دینے لگے۔ انکل نے غور سے دیکھتے ہوئے کہا۔ "درندہ زخمی ہو چکا ہے اور اپنی پچھلی بائیں ٹانگ گھسیٹ کر چلتا رہا ہے۔"

آگے چل کر ہم نے شیر کا پہلا شکار دیکھا۔ یہ ایک مردہ ہرن تھا۔ جس کا پیٹ پھٹا ہوا تھا۔ انکل اسے اچھی طرح دیکھنے کے بعد ہنس دیئے۔ بولے۔ "جو نے بڑی کامیابی سے شیر کا تعاقب کیا ہے، اس نے شیر کو اپنا شکار کھانے بھی نہیں دیا۔"

ہمارے گھوڑے پھر دوڑنے لگے۔ ہم کیچی کے جنگل میں کافی دور تک آ چکے تھے۔ ایک جگہ شیر کا دوسرا شکار نظر پڑ آیا۔ یہ بھی ایک ہرن تھا جس کی گردن شیر نے مخصوص انداز میں توڑ ڈالی تھی، لیکن اس کا پیٹ پھٹا ہوا نہیں تھا۔ انکل گھوڑے سے نیچے اترے اور ہرن پر ہاتھ رکھ کر بولے۔ "یہ ابھی گرم ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے ہم درندے کے قریب پہنچ چکے ہیں۔ زندہ باد، جو، تم نے شیر کو یہ شکار بھی نہ کھانے دیا۔"

اب ہم بڑی احتیاط سے آگے بڑھنے لگے۔ شاید

☆ پکانے کے دوران میں سبزیوں کے اہم معدنی غذائی اجزاء ضائع ہو جاتے ہیں۔ اس لیے کچی سبزیوں کی سلاد اور فرنس کو اپنی غذا میں ہمیشہ شامل رکھیں۔ سبزیوں میں شامل وٹامن سی، فولک ایسڈ اور معدنیات ہمارے جسمانی نظام کے لیے بہت ضروری ہیں۔ ان اجزاء کی کمی سے ہم مٹاپے اور قوت مدافعت کی کمی کا شکار ہو سکتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ کچی سبزیوں کا استعمال آپ کو صحت مند اور فٹ رکھ سکتا ہے۔

....☆....☆....

☆ نمک ہمارے جسمانی نظام کے لیے ضروری ہے لیکن بہت کم، اس کی زیادہ مقدار دل کے مسائل، ہائپرٹینشن، آرتھرائٹس، اوسٹیوپوروسس اور مٹاپے جیسی بیماریوں کا باعث بنتی ہے۔ عام طور سے دن بھر میں ہمارے جسم کو نمک کی 1500 ملی گرام مقدار کی ضرورت ہوتی ہے لیکن ہم عموماً اس سے دس گنا زیادہ مقدار استعمال کر لیتے ہیں۔ اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ چونکہ ہم نمک کی زیادہ مقدار کھانے کے عادی ہو چکے ہیں لہٰذا کم نمک والے کھانے کیسے کھائیں؟ تو اس کا حل یہ ہے کہ ذائقہ بڑھانے کے لیے کھانے میں لیموں کا رس شامل کر دیں اور کھانے کو پالک، گاجر یا ٹماٹر کے جوس میں پکائیں۔ مزید یہ کہ کھانے میں نمک کی مقدار بتدریج کم کرتی جائیں، کچھ ہی عرصے میں آپ اس کی عادی ہو جائیں گی۔

....☆....☆....

اچھی نیند ہماری صحت کے لیے ضروری ہے۔ نیند کے دوران میں ایک خودکار نظام کے ذریعے ہمارے جسم کے اندر صفائی کا عمل شروع ہو جاتا ہے۔ جتنا کچرا ہم پورے دن میں اپنے اندر جمع کرتے ہیں اسے ہمارا جسم نیند کے دوران میں ہی ٹھکانے لگاتا ہے۔ ناکافی نیند کے سبب آپ نے محسوس کیا ہوگا کہ آپ میں چڑچڑاہٹ بڑھ جاتی ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ نیند کی کمی کے باعث ہمارے ہارمونز کا توازن بگڑ جاتا ہے اور میٹابولزم کا عمل سست پڑ جاتا ہے۔ نتیجہ یہ کہ پھر ہمارا وزن بڑھنے لگتا ہے۔ لہٰذا بھرپور نیند کو اپنا معمول بنائیں لیکن اس کا یہ مطلب نہیں کہ آپ اتنی دیر سے اٹھیں کہ سارے کام آپ کے منتظر رہ جائیں۔ تازہ ترین ریسرچ سے معلوم ہوا کہ نو گھنٹے سے زیادہ سونے سے ہر رات ذیابیطس کا خطرہ پچاس فیصد تک بڑھ جاتا ہے۔ سو آپ جلدی سونے اور جلدی اٹھنے والے اصول پر عمل کریں اور اسمارٹ نظر آئیں۔

مرسلہ: آسیٰ اسماعیل۔ کراچی

گھوڑوں کو شیر کی بُو آنے لگی تھی۔ انہوں نے آگے بڑھنے سے انکار کردیا۔ ہم نے چابک پہ چابک رسید کیے، لیکن ان پر کوئی اثر نہ ہوا۔ مجبوراً ہم گھوڑوں سے اتر پڑے اور لگام پکڑ کر آگے بڑھنے لگے۔

یہ طریقہ کامیاب رہا۔ چند گز آگے شاہ بلوط کے درخت کے نیچے شیر مرا پڑا تھا۔ چوڑے پھل کا ''کھپی'' دستے تک اس کے سینے میں گھسا ہوا تھا۔ شیر خاصہ بوڑھا تھا۔

''جو، کہاں ہے؟'' میں نے اِدھر اُدھر دیکھتے ہوئے انکل سے پوچھا۔

انکل جم نے شاید میرا سوال نہ سنا تھا۔ وہ بڑے انہماک سے شیر کا جائزہ لے رہے تھے۔

''یہ دیکھو......'' انکل نے شیر کی پچھلی ٹانگ کی طرف اشارہ کیا۔ ''گولی لگنے سے اس کی ٹانگ ٹوٹ چکی ہے، میرے خیال میں جو نے درندے سے دو بدو جنگ بھی کی ہے۔ ممکن ہے وہ زخمی ہوگیا ہو۔ تم شیر کو گھوڑے پر لاد کر خیمے کی طرف واپس جاؤ اور میں جو کو تلاش کرتا ہوں۔''

میں شیر کو گھوڑے پر لاد کر کیمپ کی جانب روانہ ہوا۔ انکل جم آگے بڑھ گئے۔ گھوڑا درندے کی بو اور لاش سے قدم قدم پر بدک رہا تھا۔ میں بڑی مشکل سے لگام کھینچ کھینچ کر آگے بڑھتا رہا۔

کیمپ میں پہنچا تو سورج غروب ہو رہا تھا۔ انکل جم مجھ سے پہلے وہاں موجود تھے اور خیمے کے سامنے بڑی خاموشی سے سر جھکائے بیٹھے تھے۔ مجھے دیکھ کر وہ آہستگی سے بولے۔ ''جو پیل، مر چکا ہے۔''

اس افسوس ناک خبر کو سن کر میری آنکھیں پرنم ہوگئیں۔ خیمے کے اندر جو کی لاش رکھی ہوئی تھی۔ اس کا دایاں ہاتھ گلے کے زخم پر تھا اور بائیں ہاتھ میں اس نے ابھی تک ونچسٹر رائفل مضبوطی سے تھام رکھی تھی۔ میں آنسو پونچھتا ہوا باہر نکلا۔ ہمارے شکار کا ساتھی ہم سے ہمیشہ کے لیے بچھڑ چکا تھا۔

انکل جم نے سوگوار لہجے میں بتایا۔ ''تمہارے جانے کے بعد میں نے جو کو شدید زخمی حالت میں تلاش کرلیا۔ میں نے اسے کیمپ میں لانے کی کوشش چاہی، مگر وہ بولا۔ ''میرا آخری وقت قریب آچکا ہے۔ مجھے کیمپ لے جانے کی زحمت نہ کرو۔'' پھر اس نے شیر کو ہلاک کرنے کی داستان اس طرح سنائی۔

''میں ساری رات اسے ڈھونڈتا رہا، بالآخر صبح سویرے جالیا، وہ ایک ہرن کو مار چکا تھا اور اسے کھانے ہی کو تھا کہ میں پہنچ گیا۔ میں نے گولی چلائی جس سے اس کی پچھلی ٹانگ ٹوٹ کر زخمی ہوگئی، اور وہ جھاڑیوں میں غائب ہوگیا۔ نہ جانے وہ اس وقت مجھ پر حملہ کرنے سے کیوں کترایا؟ خیر میں خون کے قطروں کی مدد سے اس کا تعاقب کرتا رہا۔ گاہے گاہے اس کی غراہٹ بھی سنائی دیتی رہی، جس سے پتا چلتا تھا کہ وہ بھوکا ہے، چنانچہ اس نے بھوک مٹانے کے لیے ایک اور ہرن پر حملہ کیا اور اس کی گردن توڑ ڈالی، لیکن میں پھر اس کے سر پر پہنچ چکا تھا۔

میں نے یہ ہرن بھی اسے کھانے کی مہلت نہ دی۔ شیر جھلا کر دہاڑا، لیکن پھر آگے بڑھ گیا اور راستے میں شاہ بلوط کی اوٹ میں چھپ کر میرا انتظار کرنے لگا۔ جب میں اس کی زد میں آیا تو وہ ایک ہولناک گرج کے ساتھ مجھ پر ٹوٹ پڑا۔ میرے ہاتھ سے رائفل گر گئی۔ میں نے چھرا نکال کر پورے زور سے اس کے سینے میں گھونپ دیا، لیکن اس اثنا میں وہ پنجوں سے میری گردن زخمی کر چکا تھا اور ایک ٹانگ پر دانت گڑا کر زخمی کر چکا تھا۔ میرے چھرے کا وار بھی کارگر ثابت ہوا۔ خون کا فوارا سا ابل پڑا اور تھوڑی ہی دیر بعد اس نے دَم توڑ دیا۔ میں خود زخموں سے نڈھال ہو رہا تھا۔ تھوڑی دیر بعد تم پہنچ گئے۔ لیکن اب میں چند منٹ کا مہمان ہوں۔'' وہ آنکھیں بند کرکے خاموش ہوگیا۔ پھر اس کا سانس اکھڑنے لگا۔ آخری ہچکی لینے سے پہلے اس نے ایک بار آنکھیں کھول کر میری طرف دیکھا، ان میں یاس کی بجائے طمانیت کا تاثر نمایاں تھا، شاید وہ کہہ رہا تھا۔

''میں نے اپنے باپ کی موت کا انتقام لے لیا ہے۔'' اگرچہ اس کی اپنی جان بھی چلی گئی ہے لیکن موذی درندہ بھی موت کے گھاٹ اتر چکا ہے۔

یہ دردناک کہانی سن کر میں سکتے میں آگیا۔ انکل نے کہا۔ ''کوپر......! بزدلی کیوں دکھاتے ہو، جو پیل کی شجاعت کو ہمیشہ سامنے رکھو، آؤ اس کی دلیری کو خراج تحسین پیش کرنے کے لیے اس شیر کو اس کے قدموں میں رکھ دیں۔''

ہم نے مردہ شیر کو گھوڑے سے اتارا اور اسے جو پیل کے قدموں میں ڈال دیا، میری آنکھیں ایک بار پھر نمناک ہوچکی تھیں۔

++

دفینہ

سید احتشام

چچا نے اپنی دولت، زندگی بھر کی کمائی کہیں زمین میں دفن کر رکھی تھی۔ اس کے دو یتیم بھتیجے چچا کی موت کا انتظار کررہے تھے مگر جب چچا مرا تو ایک بھائی نے دوسرے کو راستے سے ہٹا کر دفینہ نکالا پھر جب بکس کھلے تو اس میں سے کیا نکلا؟

ایک عجیب انجام کی دلچسپ روداد

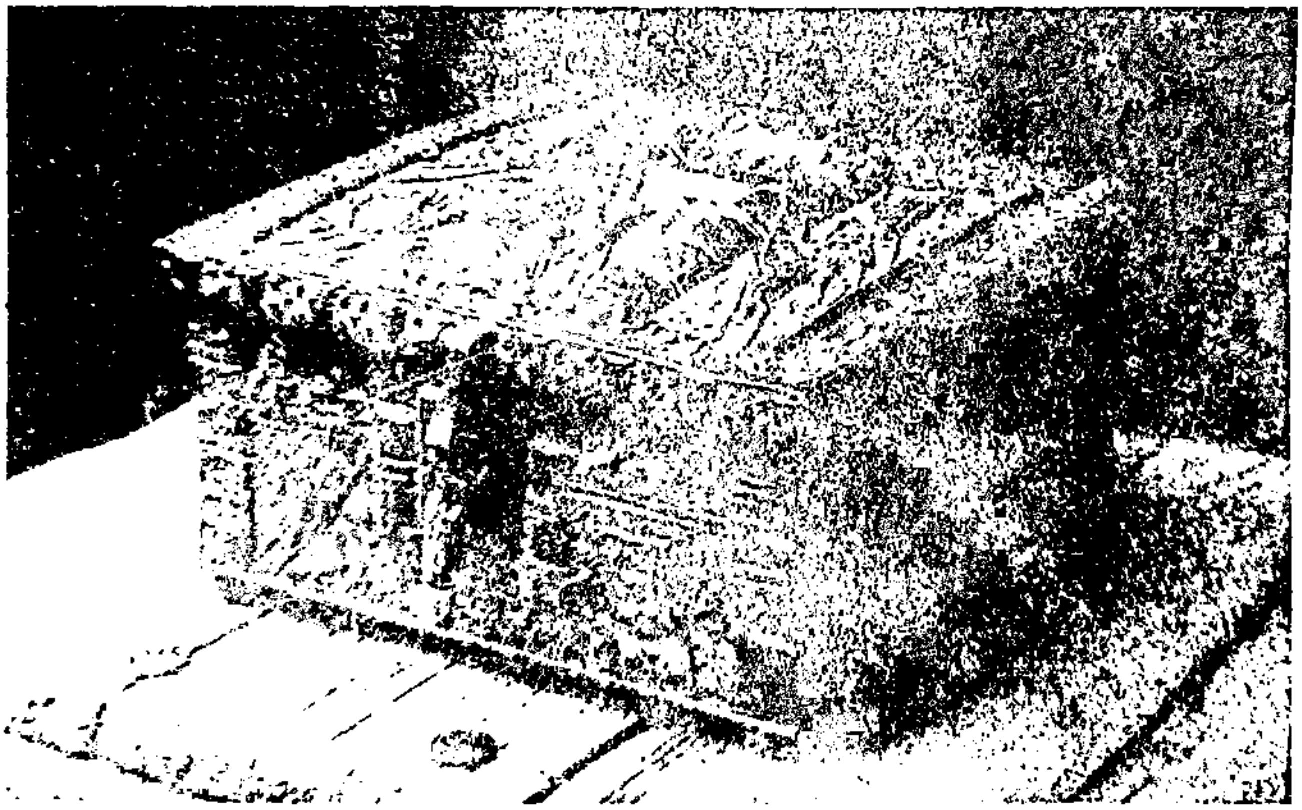

فلپائن میں سمار کے مشرقی ساحل پر پنگا تگ نام کا ایک چھوٹا سا گاؤں آباد ہے۔ اگر کسی ٹیلی فوٹو عدسے سے دیکھا جائے تو یہ ساؤتھ سی کے جزیروں کے درمیان پر چھپا ہوا، ایک سادہ اور دلکش پکچر پوسٹ کارڈ کی مانند نظر آتا ہے لیکن جب آپ دوبارہ وسیع زاویے کے عدسے سے دیکھیں تو اندازہ ہوگا کہ وہ جگہ کس قدر ناقابلِ رسائی ہے۔ گاؤں کے پیچھے تقریباً ایک میل تک جنگل پھیلا ہوا ہے اور پھر اچانک ہی پہاڑ بالکل سیدھے سر اٹھائے ہوئے نظر آتے ہیں۔

دوسری عالمی جنگ تک پنگا تگ اس قدر ناقابلِ

رسائی تھا کہ اس کے باہر کے باسیوں میں چند ہی لوگ اس کے وجود سے واقف تھے یا اسے کوئی اہمیت دیتے تھے۔ اس کی خوبصورت بندرگاہ اتنی بڑی یا گہری نہیں تھی کہ یہاں کسی بھی جسامت کا جہاز لنگر انداز ہوسکتا۔ لیکن یہ "بنکاس" کے لیے بہت موزوں تھا۔ یہ ایک مخصوص طرز کی کشتی تھی جو گاؤں کے لوگ مچھلی پکڑنے کے لیے استعمال کرتے تھے۔

دوسری جنگِ عظیم تک ماہی گیری ہی اس گاؤں کا واحد ذریعہ معاش تھا۔ قابض جاپانی نیوی نے اسے بالکل نظرانداز کر رکھا تھا۔ وہ کبھی کبھار ہنگامی صورت کے تحت پنگا تنگ سے کئی میل دور جنوب میں واقع شہر گویاں میں مختصر سی امدادی فوج فر ... اتارتے تھے کیونکہ وہاں بہت بڑی قدرتی بندرگاہ تھی جو کبھی ترقی کر سکتی تھی لیکن پنگا تنگ ویسے کا ویسا ہی رہا۔ وہاں کچھ نہ بدلا تاوقت یہ کہ امریکن نیوی، سی بریز، نے جاپانیوں کی جگہ نہ لے لی۔

سی بریز، امریکن نیوی نے گویاں میں گودی کی تعمیر کا کام شروع کردیا اور پھر وہاں ٹنوں کے حساب سے اسلحہ اور رسد کی کھیپ اترنے لگی۔ شروع شروع میں سامان خشک گودی میں اسٹور کیا جاتا رہا لیکن جلد ہی یہ محسوس کیا جانے لگا کہ سامان کی ضرورت نیوی کو تو کم مقامی لوگوں کو زیادہ تھی چنانچہ سیکورٹی کے نکتۂ نظر سے گویاں سے ملحق ویران جزیرے میں اسٹیل کے درجنوں ہٹ بنائے گئے۔ گویاں اور اس جزیرے کے درمیان صرف ایک حفاظتی پل ہی انہیں ایک دوسرے سے ملاتا تھا لیکن یہ احتیاطی تدابیر بھی ناکافی ثابت ہوئیں۔ چور بڑے ماہر تھے اور ان کی آمد و رفت کا ذریعہ آبی راستہ تھا۔

جلد ہی گویاں، دوسری سرگرمیوں کا مرکز بن گیا۔ ایک تو یہ کہ یہ فلپائن کے اس حصے میں نیول سپلائی کا ڈپو تھا۔ دوسرے یہ کہ یہاں سے چرایا جانے والا مال منیلا کی بلیک مارکیٹ میں فروخت ہونے لگا اور یہ اسمگلنگ کا ایک اہم ذریعہ بن گیا۔ سگریٹ، خشک دودھ، تمباکو، کوکا اور دیگر بے شمار اشیا وہاں کے محافظوں کی اجازت سے اسمگل ہوکر اسی سائز یا جسامت کے واٹر پروف پیکٹوں میں دوبارہ پیک کی جاتیں تاکہ کسی بنکاس میں سما سکتیں اور پھر منیلا روانہ کردی جاتیں۔ ان میں بیشتر چیزیں اپنے وزن کی وجہ سے سونے سے زیادہ قیمتی تصور کی جاتی تھیں۔ اگر کوئی دلیر مقامی بنکاس میں یہ سامان لاد کر امریکی کشتی پولیس اور مقامی قزاقوں سے بچتا بچاتا منیلا پہنچ جاتا تو وہ اس سے حاصل ہونے والے منافع سے کم سے کم چھ ماہ تک اپنی فیملی کو آرام سے کھلا سکتا تھا۔

☆☆☆

ان لوگوں کے لیے پنگا تنگ، آرام کرنے کا پہلا اسٹاپ تھا۔ اگرچہ دنیا غالباً اس مقام کے وجود سے لاعلم ہی رہی ہوگی لیکن گویاں کا ہر بلیک مارکیٹر اس مقام سے اور اس کے کھیا جوس پاروما سے اچھی طرح واقف تھا۔ کالی کھانسی کا پرانا مریض، یہ بلاکش، سادہ لوح بوڑھا، اپنی عمر اور تعلقات کی بنا پر گاؤں کا کھیا نامزد کیا گیا تھا مگر صحیح معنوں میں اس کے دو بھتیجے بارہ سالہ پیڈرو اور چودہ سالہ مارکوس ہی بیشتر کام سرانجام دیتے تھے۔ پیڈرو، لنگڑا تھا اور اسی وجہ سے لنگڑا پیڈرو کے نام سے مشہور تھا۔ یہ دونوں لڑکے ناجائز مال سپلائی کرنے والوں کو دن میں جب امریکی پیٹرول کشتیاں گشت کرتی رہتی تھیں، پناہ فراہم کرتے تھے اور رات میں ان کے تبکاس میں دو دن کا پانی اور خوراک لاد دیا کرتے تھے جو ان اسمگلروں کے اگلے اسٹاپ تک کے لیے کافی ہوتا تھا۔

اس خدمت کے عوض وہ ان کے مال میں سے اپنا حصہ لے لیتے تھے۔ چونکہ پنگا تنگ میں رہنے والوں کا تعلق ایک ہی خاندان سے تھا، لہٰذا سب کو اس مال میں سے حصہ ملتا تھا لیکن سب لوگ جانتے تھے کہ سب سے بڑا حصہ ان کے کھیا جوس پاروما کو چلا جاتا تھا۔ وہ سادہ لوح تھا یا نہیں لیکن وہ گاؤں کا بزرگ تھا اور اس کی حیثیت کا تقاضا بھی یہی تھا۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ بیشتر کام اس کے دونوں بھتیجے کیا کرتے تھے لیکن انہیں اتنا ہی حصہ ملتا تھا جتنا دوسروں کو ملتا تھا۔ یہ بات بڑی حیرت انگیز لگتی تھی کہ وہ دونوں لڑکے اتنے کم حصے کے عوض اتنی محنت کرتے تھے لیکن نوجوان مارکوس جانتا تھا کہ اس کا چچا جوس، ہمیشہ زندہ نہیں رہے گا اور ایک دن وہ اس کی دولت کے مالک بن جائیں گے۔ بوڑھا جوس پاروما چین اسموکر تھا اور ہر وقت کھانستا رہتا تھا۔ مارکوس جانتا تھا کہ وہ زیادہ عرصہ زندہ نہیں رہے گا۔

لنگڑا پیڈرو بھی اپنی جگہ بے بس تھا۔ وہ بڑی امید سے جوس کو کھانستے ہوئے، سنتا تھا۔ اگرچہ اس کا بڑا بھائی مارکوس، اس کے اور چچا کے ترکے کے درمیان دیوار بن کر حائل تھا مگر وہ جانتا تھا کہ وہ اتنا چالاک ہے کہ جب وقت آئے گا تو وہ مارکوس سے نجات حاصل کرنے کا کوئی نہ کوئی راستہ ڈھونڈ نکالے گا۔ پیڈرو، ہاتھ کی بنی ہوئی بیساکھی کے سہارے چلتا تھا۔ وہ کسی بھی کام میں مارکوس سے مقابلہ نہیں

کرسکتا تھا۔ اسے لڑکپن ہی میں اس امر کا احساس ہوگیا تھا، لہٰذا وہ مارکوس سے نفرت کرنے لگا تھا۔ اس کے جواب میں مارکوس کو بھی اپنے معذور بھائی سے نفرت ہوگئی تھی۔ وہ صرف اسی اُمید پر تُل کر کام کیا کرتا تھا کہ ایک دن انہیں ایک دوسرے کا محتاج نہ ہونا پڑے۔ اگر انہیں معلوم ہوتا کہ وہ دونوں ایک ہی خواب دیکھتے ہیں تو انہیں کتنی حیرت ہوتی۔

☆☆☆

بالآخر امریکیوں نے گوئیاں سے پنگانگ تک ایک سڑک بنادی۔ یہ پہاڑ کے پہلو کو کاٹ کر بنائی گئی تھی جو دھول سے اٹی ہوئی ایک کچی سڑک تھی۔ کہیں کہیں یہ سیکڑوں فٹ بلند ہوجاتی اور پھر کسی سانپ کی مانند بل کھاتی ہوئی، نشیب میں پنگانگ کے ساحل پر ختم ہوجاتی۔

موسلا دھار بارش ہوتی تو اس کے کئی حصے بہہ کر سمندر میں گرجاتے تھے لہٰذا جیپ کا سفر بھی خطرناک ہوجاتا تھا۔ بلیک مارکیٹر اب بھی سمندری راستے کو ترجیح دیتے تھے۔ لہٰذا پنگانگ کی وہ حیثیت سڑک بننے کے باوجود اپنی جگہ برقرار رہی اور اس کا کاروبار بھی متاثر نہیں ہوا۔ اس کچی سڑک کی واحد ٹریفک وہ جیپ تھی جو گوئیاں میں متیم نیول آفیسر چلاتا تھا۔ اس کا کام سمندری راستے سے ہونے والے اس ناجائز دھندے کا قلع قمع کرنا تھا اور یہ بہت ہی مشکل کام تھا۔

پھر دوسری جنگ عظیم ختم ہوگئی۔ اس کے ساتھ ہی پنگانگ کی وہ کاروباری حیثیت بھی ختم ہوگئی اور اس گاؤں کے باسی اپنے ماہی گیری کے پرانے پیشے کی طرف لوٹ آئے۔

☆☆☆

گاؤں کا ہر فرد جانتا تھا کہ جوس پاروما نے جنگ کے دوران بڑا مال کمایا تھا لیکن کوئی نہیں جانتا تھا کہ اس نے اپنی دولت کہاں چھپائی تھی۔ جوس شاذ و نادر ہی گوئیاں جاتا تھا اور اس کا طرزِ زندگی بالکل نہیں بدلا تھا چنانچہ مارکوس اور پیڈور سمیت بیشتر گاؤں والوں کا خیال تھا بلکہ انہیں یقین تھا کہ جوس نے اپنا سارا مال گاؤں کے عقب میں واقع جنگل میں کہیں دفن کر رکھا تھا لیکن اس پُر پیچ جنگل میں وہی شخص اس خزانے کو ڈھونڈ سکتا تھا جس نے اسے چھپایا تھا۔

مارکوس اور پیڈور، دونوں ہی اس حقیقت پر اندر ہی اندر کھولتے رہتے تھے کہ ان کا چچا جوس انہیں کبھی نہیں بتائے گا کہ اس نے سارا مال کہاں چھپایا تھا۔ جوس، اتنا بوڑھا ہوچکا تھا کہ اس خزانے پر عیش نہیں کرسکتا تھا۔ ان لڑکوں کو

انصار ناصری (1912ء۔1997ء)

برصغیر کے ممتاز براڈ کاسٹر اور ریڈیو پاکستان کے سابق ڈپٹی ڈائریکٹر جنرل، تعلیم سے فراغت کے بعد 1939ء میں آل انڈیا ریڈیو کے شعبہ ڈراما اور موسیقی میں ملازمت اختیار کی۔ 1947ء میں پاکستان چلے آئے اور ریڈیو پاکستان سے وابستگی اختیار کرلی اور ڈپٹی ڈائریکٹر جنرل کے عہدے سے سبکدوش ہوئے۔ انہیں 3 جون 1947ء کو آل انڈیا ریڈیو سے نشر ہونے والی قائداعظم محمد علی جناح کی تقریر کا اردو ترجمہ کرنے کا اعزاز حاصل تھا جس میں قیام پاکستان کا اعلان کیا گیا تھا اس کے علاوہ انہوں نے کئی کتابوں کے ترجمے بھی کیے۔

مرسلہ: ذیشان احمد۔ سکھر

ڈاکٹر مختار احمد انصاری

(1880ء۔1936ء)

برصغیر کی تحریک آزادی کے علمبردار اور نامور محب وطن، ضلع غازی پور (یوپی) کے ایک گاؤں یوسف پور میں پیدا ہوئے۔ والد بہت بڑے زمیندار تھے۔ ڈاکٹر انصاری نے بنارس سے ایف اے اور ریاستی کالج حیدرآباد دکن سے بی اے کیا۔ پھر لندن سے ایم کے سی اور ایم۔ آر۔ سی۔ پی کی ڈگریاں حاصل کیں اور وہیں ایک بڑے اسپتال میں ہاؤس سرجن مقرر ہوگئے۔ 1911ء میں انگلستان سے واپس آکر چاندنی چوک دہلی میں اپنا دواخانہ قائم کیا۔ 1913ء میں برصغیر کا جو طبی وفد ترکی گیا تھا۔ ڈاکٹر انصاری اس کے قائد تھے۔ 1918ء میں ہوم رول لیگ کے نائب صدر بنے اور جب ہوم رول لیگ والنٹیئر کور بنی تو اس کے کمانڈر انچیف مقرر ہوئے۔ 1919ء میں انگریزی حکومت کے خلاف جو تحریک چلی، اس میں پیش پیش تھے۔ ان دنوں دہلی میں جو زبردست ہڑتالیں ہوئیں ان کی کامیابی کا سہرا بھی ان ہی کے سر ہے۔ انہوں نے اپنی ہر ذاتی چیز تحریک آزادی پر قربان کردی۔

مرسلہ: ذیشان احمد۔ سکھر

ایسا لگتا تھا کہ بڈھا ساری دولت قبر میں لے جائے گا۔ گاؤں کے بیشتر لوگ شہر کا رخ کر رہے تھے۔ مارکوس نے بھی سوچا کہ بہتر ہوگا کہ وہ بھی منیلا جا کر روزی کمائے اور بڈھے کے مرنے کا انتظار کرے۔ اسے معلوم تھا کہ وہ پیڈور پر بھروسا نہیں کرسکتا تھا۔ چنانچہ اس نے اپنے ایک کزن کو ہدایت کی کہ اگر جوس مرجائے یا اگر کوئی اس کے خزانے کا پتا چلالے تو اسے خط کے ذریعہ ضرور اطلاع دے دے۔ اور وہ اپنا بوریا بستر لپیٹ کر منیلا روانہ ہوگیا۔

☆☆☆

پیڈور، اپنے بھائی کو الوداع کہتے ہوئے، دل ہی دل میں مسکرایا۔ اس کی جسمانی معذوری بڑے شہروں میں جا کر روزی کمانے میں آڑے آتی تھی۔ لہٰذا وہ گاؤں میں رہ کر ماہی گیری کرسکتا تھا۔ جوس کے گھر کے پچھواڑے آس پاس خاموشی سے اپنی تلاش بھی جاری رکھ سکتا تھا۔ اگر وہ دفینہ اسے مل جائے تو وہ بڑا آدمی بن جائے لیکن اس نے سوچ رکھا تھا کہ دفینہ ملنے پر اس سے پہلے کہ کسی کو اس کا علم ہو، وہ چپ چاپ گاؤں سے نکل جائے گا اور پھر کبھی لوٹ کر نہیں آئے گا۔

لیکن ان دونوں بھائیوں نے اپنی اپنی جگہ جو منصوبہ بنا رکھا تھا، ویسا ہوا نہیں۔ پیڈور نے خوب ماہی گیری کی اور اس نے تھوڑی بہت کھدائی بھی کی لیکن اس نے جو بھی منافع کمایا، ماہی گیری سے کمایا۔

ادھر مارکوس کو شہر میں ایک ریستوران میں ویٹر کی نوکری مل گئی۔ اور یوں پانچ سال بیت گئے۔ ایک دن اسے اپنے گاؤں سے اپنے کزن کا ایک خط ملا۔ کوئی اچھی خبر نہیں تھی۔ اس کے کزن نے لکھا تھا۔ ''پیارے مارکوس، انکل جوس نے ابھی تک نہیں بتایا ہے کہ اس کا دفینہ کہاں ہے۔ کل اس پر فالج کا حملہ ہوا ہے۔ وہ اب بھی زندہ ہے لیکن نہ تو حرکت کرسکتا ہے اور نہ ہی کچھ بول سکتا ہے۔ مارکوس، بہتر ہے کہ تم جلدی پنگا تنگ لوٹ آؤ۔ اگر انکل جوس کی قوت گویائی لوٹ آئی تو ممکن ہے وہ تمہیں بتادے کہ اس نے مال کہاں چھپا رکھا ہے۔''

وہ خط ایک ہفتہ میں اس تک پہنچا تھا جو بڑی حیرت کی بات تھی۔ مارکوس نے منیلا سے نکلویان کے لیے کشتی پکڑنے میں بالکل دیر نہیں کی۔ پھر وہ نکلویان سے فیری کے ذریعے گویاں پہنچا۔ وہاں گودی کے ایک مزدور سے کرائے پر ایک جیپ حاصل کی اور جب وہ اپنے جھونپڑے میں پہنچا تو پیڈور، پہلے سے وہاں موجود تھا۔ مارکوس نے چٹائی پر پڑے نحیف و نزار، چچا کو دیکھا جو دھندلائی ہوئی نظروں سے چھت کو گھور رہا تھا۔ وہ فوراً سمجھ گیا کہ اس کا وقت قریب آگیا ہے۔

''ہمیں فوراً انہیں گویّاں لے جانا پڑے گا۔'' وہ بولا۔ ''وہاں ایک ڈاکٹر ہے۔ ہوسکتا ہے، وہ انکل کو بولنے کے قابل بنا سکے۔ میرا مطلب ہے، بولنے اور چلنے پھرنے کے قابل......!''

پیڈور، اپنے بھائی کی اس بات پر مسکرایا۔ مارکوس کو معذرت خواہانہ انداز اپنانے کی ضرورت نہیں تھی۔ آخر اس ترکے میں مارکوس کا بھی تو حصہ تھا لیکن اس سے پہلے کہ مارکوس ترکے پر ہاتھ صاف کرتا، اس کے لیے یہ جاننا اشد ضروری تھا کہ ترکہ کہاں پوشیدہ ہے۔

''تم جیپ ڈرائیو کرنا۔ میں پچھلی سیٹ پر انکل جوس کو تھام کر بیٹھا رہوں گا۔'' پیڈور نے کہا۔

''نہیں، پیڈور تم ڈرائیو کروگے۔ میں پچھلی سیٹ پر ان کے پاس بیٹھوں گا۔'' مارکوس بولا۔

☆☆☆

آسمان پر سیاہ بادل تیزی سے چھا رہے تھے اور پھر بارش کے موٹے موٹے قطرے اس امر کا پیغام دینے لگے کہ موسلا دھار بارش ہونے والی تھی۔ اور ابھی ان کی جیپ نے نصف میل کا فاصلہ طے کیا ہوگا کہ موسلا دھار بارش شروع ہوگئی۔ اس وقت جیپ کوہستانی کچی سڑک پر سیکڑوں فٹ کی بلندی پر تھی۔ مزید نصف میل طے کرنے کے بعد جیپ کا انجن کھانسا اور رک گیا۔

''لعنت ہو۔'' پیڈور، جھلا کر بولا۔ پیٹرول ختم ہوگیا۔ تمہیں روانہ ہونے سے پہلے ہی چیک کرلینا چاہیے تھا کہ اس میں کتنا پیٹرول ہے۔''

''اتنا برہم ہونے کی ضرورت نہیں۔'' مارکوس نے جواب دیا۔ ''پیٹرول ٹینک ٹوٹا ہوا ہے۔ تمہیں واپس انکل کے گھر جانا پڑے گا۔ وہاں پیٹرول کا ایک کین پڑا ہوا ہے۔''

''کیا تم پاگل ہو؟'' پیڈور بھنا کر بولا۔ ''میں اتنی سخت بارش میں پیٹرول کا کین اٹھا کر اتنی دور چل سکتا ہوں کیا؟''

مارکوس، ناگواری میں بڑبڑانے لگا۔ لنگڑے پیڈور کا کہنا درست تھا۔ اس کے مقابلے میں مارکوس بہت تیزی سے یہ مسافت طے کرسکتا تھا لیکن اسے انکل جوس کو پیڈور

کے پاس چھوڑ کر جانا کمل رہا تھا۔ انکل جوس کی قوت گویائی کسی بھی وقت لوٹ سکتی تھی۔ مارکوس نے باول نخواستہ برساتی پہنی، پیروں سے جوتے اتارے اور ننگے پاؤں روانہ ہوگیا۔

تقریباً دو گھنٹے کے بعد وہ پٹرول کے کین سمیت پنگا تنگ سے لوٹا۔ بارش میں بھیگتی ہوئی جیپ اسے دور ہی سے نظر آگئی تھی۔ کوئی گڑبڑ بھی کیونکہ پیڈور جیپ میں نہیں تھا۔ وہ ایک طرف کھڑا بارش میں بھیگ رہا تھا۔

''انکل جوس، چل بسے۔'' وہ بولا۔

مارکوس نے پٹرول کا کین چھوڑ دیا اور لپک کر پیڈور کو گلے سے پکڑلیا۔ ''کیا انہوں نے کچھ کہا تھا؟ کچھ کہا تھا؟''

''نن..... نہیں..... کک..... کچھ نہیں۔''

پیڈور کے گریبان پر مارکوس کی گرفت مضبوط ہوگئی۔ پیڈور کی آنکھوں سے دہشت جھانکنے لگی۔ بے پناہ دہشت..... وہ جھوٹ بول رہا تھا اور مارکوس یہ بات اچھی طرح جانتا تھا۔ وہ پیڈور کو دھکیلتا ہوا، سڑک کے کنارے لے گیا اور اس بات کو بالکل نظر انداز کردیا کہ سیکڑوں فٹ نیچے تاریک سمندر ٹھاٹھیں مار رہا تھا۔ ''بتاؤ، اس نے کیا کہا تھا؟ بتاؤ.....!'' وہ دہاڑا۔

''ک کچھ نہیں..... کچھ بھی نہیں..... کچھ بھی.....!''

اسی وقت پیڈور کے پیروں کے نیچے کی گیلی زمین کا ٹکڑا کھسک گیا اور سمندر میں جا گرا۔ اس کے ساتھ ہی پیڈور بھی اپنا توازن کھو بیٹھا اور اس نے مارکوس کو بھی اپنے ساتھ کھینچ لیا۔ مارکوس، منہ کے بل گرا اور سڑک کے کنارے ہی رہ گیا۔ اس کا ہاتھ پیڈور کے گریبان سے پھسل کر اس کے بازو پر آ گیا تھا۔ یہ صرف اس کا غصہ تھا جس نے اسے اتنی طاقت عطا کردی تھی کہ وہ پیڈور کا ہاتھ تھامے ہوئے تھا۔ پیڈور کے پیروں کے نیچے کوئی زمین نہیں تھی اور وہ فضا میں معلق بری طرح اپنے پیر چلا رہا تھا۔

''بتاؤ، دفینہ کہاں ہے؟ بتاؤ، اس نے اسے کہاں چھپایا ہے؟'' مارکوس، حلق پھاڑ کر چیخا۔

''مجھے بچالو..... میں بتادوں گا..... مجھے بچالو.....'' پیڈور بری طرح گھگھیایا۔

''پہلے بتاؤ کہ اس نے کہاں چھپایا ہے؟''

پیڈور کی آنکھیں فرط دہشت سے پھٹی پھٹی سی تھیں۔ ''سپلائر کے جھونپڑے کے فرش کے نیچے..... مجھے بچالو.....!''

کمرے میں کپڑے سکھانا مضر ہے

وہ خواتین جو واشنگ مشین میں کپڑے دھونے کے بعد انہیں خشک کرنے کے لیے کسی کھلی جگہ یا دھوپ میں سکھانے کی بجائے کمرے کے اندر ہی الگنی یا ڈوری پر لٹکا دیتی ہیں وہ اپنی اور اپنے گھر والوں کی صحت کو خطرے میں ڈال رہی ہیں۔ طبی ماہرین نے خبردار کیا ہے کہ الگنی یا کپڑے خشک کرنے والے دھاتی فریموں پر گیلے کپڑے لٹکانے سے یا گرم ہوا پھینکنے والے ریڈی ایٹرز کی مدد سے کپڑے سکھانے سے گھر کے اندر ہوا میں نمی کی سطح 30 فیصد تک بڑھ سکتی ہے اور اس سے ایک ایسا ماحول بن جاتا ہے جو نم سطح پر جنمے والی پھپھوند کے لیے بہت سازگار تصور کیا جاتا ہے۔ ماہرین کو خاص طور پر Aspergillos Fumigatus Spores پر تشویش ہے۔ یہ وہ پھپھوند یا فطر ہے جو پھیپھڑے کو انفیکشن میں مبتلا کرسکتی ہے۔ مانچسٹر کے نیشنل ایسپرگلوسیس سینٹر میں پروفیسر ڈیوڈ ڈیننگ اور ان کی ٹیم نے بڑی تعداد میں ایسے مریضوں کا علاج کیا ہے جو ایسپرگلس نامی پھپھوند کو سانس کے راستے جسم میں داخل کرنے کے بعد بیمار پڑ گئے تھے۔ پروفیسر ڈیننگ کا کہنا ہے کہ واشنگ مشین میں ایک بار دھوئے جانے والے کپڑوں میں تقریباً دو لیٹر پانی موجود ہوتا ہے جو کمرے میں کپڑے پھیلانے کے دوران خارج ہوتا رہتا ہے۔ ہم میں سے بہت سے لوگوں کا جسمانی مدافعتی نظام اس فنگس کا مقابلہ کرنے کی صلاحیت رکھتا ہے جو اس مرطوب ماحول میں بہت اچھی طرح پرورش پاتے ہیں۔ اس لیے یہ پھپھوند ان کو بہت زیادہ نقصان نہیں پہنچاتے لیکن جو لوگ دمہ کے مریض ہوتے ہیں وہ جب اس پھپھوند کو سانس کے ذریعے جسم میں اتارتے ہیں تو انہیں کھانسی کا جسمانی مدافعتی نظام کمزور ہوتا ہے یا اس نظام کو نقصان پہنچ چکا ہوتا ہے جیسا کہ کیموتھراپی کرانے والے کینسر کے مریضوں اور ایڈز کا شکار ہونے والے افراد میں دیکھا جاتا ہے یا جو لوگ Autoimmune امراض میں مبتلا ہوتے ہیں ان میں یہ فنگس Pulmonary Aspergillosis کا سبب بنتا ہے۔ یہ وہ طبی صورت حال ہے جس میں پھیپھڑوں اور سائی نس (Sinuses) کو ناقابل تلافی نقصان پہنچتا ہے اور بعض اوقات مہلک ثابت ہوتا ہے۔

مرسلہ: نوشین عارف۔ کراچی

مارکوس نے اس کا ہاتھ چھوڑ دیا اور اس سے پہلے کہ پیڈور کا جسم چٹانوں سے اور اس نے بھی نیچے بپھرے ہوئے سمندر کی لہروں سے ٹکراتا، وہ مڑ گیا۔ لیکن پیڈور کا انتہائی دہشت زدہ چہرہ اس کے ذہن کے پردے پر انمٹ نقوش چھوڑ گیا۔

☆☆☆

وہ یقین سے نہیں کہہ سکتا تھا کہ اس نے پیڈور کا ہاتھ جان بوجھ کر چھوڑا تھا یا تھکن کے باعث چھوٹ گیا تھا۔ لیکن اب اس سے کیا فرق پڑتا تھا۔ اسے قصوروار نہیں ٹھہرایا جاسکتا تھا۔ وہ کچی پہاڑی سڑک اس سے پہلے بھی کئی لوگوں کی جان لے چکی تھی۔ وہ جو کہانی چاہتا گڑھ کر سنا دیتا اور گاؤں میں اس کے رشتے دار ہنسی خوشی اس کی بات پر یقین کر لیتے۔

اس نے جیپ میں پیٹرول ڈالا اور جیپ موڑ کر واپس پنگا تنگ روانہ ہوگیا۔ اب بارش تھم گئی تھی اور مطلع بھی صاف ہو رہا تھا۔ اس نے جیپ اپنے انکل جوس کے جھونپڑے کے آگے روکی تو دن کی روشنی تھوڑی بہت تھی۔ وہ جب پیٹرول کا کین لینے آیا تھا تو اس نے جھونپڑے کے ایک تاریک کونے میں ایک بیلچہ پڑا ہوا دیکھا تھا۔ وہ جھونپڑا جس کی نشاندہی پیڈور نے کی تھی، جنگل میں تھوڑی ہی دوری پر تھا۔ یہ وہی جھونپڑا تھا جہاں وہ لوگ مال سپلائی کرنے والوں کو دن میں ٹھہراتے تھے۔ وہ سیکڑوں بار اس میں جھاڑو لگا چکا تھا۔ اب وہ جھونپڑا بظاہر بالکل خالی تھا۔ حتیٰ کہ اس کے فرش پر بچھی ہوئی چٹائیاں بھی ہٹا دی گئی تھیں۔ صرف کچا فرش ہی نظر آتا تھا۔ اس وقت ہر طرف سیلن کی بو تھی۔

☆☆☆

مارکوس نے بیلچے کی مدد سے اس جھونپڑے کے وسط میں پہنچ کر مٹی ہٹائی۔ مٹی نم اور بالکل نرم تھی۔ تقریباً تین انچ نیچے اس کا بیلچہ کسی چیز سے ٹکرایا۔ کوئی پتھر؟ اس نے بیلچے کو ذرا زور سے دائیں بائیں ہلایا اور سڑی گلی لکڑی کی سطح اجاگر ہوئی۔ مارکوس کی تھکن ایک دم سے کافور ہوگئی۔ وہ تیزی سے بیلچے چلانے اور مٹی کو باہر پھینکنے لگا۔ تھوڑی ہی دیر میں مزید لکڑی اجاگر ہوگئی۔ وہ نیوی کا مخصوص چوبی لاکر تھا۔ مارکوس مزید مٹی ہٹانے لگا۔ دوسرا لاکر...... وہ پاگلوں کی طرح بیلچہ چلانے لگا۔

ذرا ہی دیر میں جھونپڑے کا سارا فرش ادھڑ چکا تھا اور ایک دیوار سے دوسری دیوار تک چوبی لاکرز ہی لاکرز تھے۔ سارے لاکرز مقفل تھے لیکن اس کی لکڑیاں گل چکی تھیں۔ مارکوس نے بیلچے کی مدد سے ایک لاکر کا ڈھکن کھولنا چاہا لیکن ڈھکن کھلا نہیں بلکہ کئی ٹکڑوں میں چرمرا کر گر پڑا اور اس کے اندر رکھے ہوئے پیکٹس نمایاں ہوگئے۔

ان پیکٹس نے برسہا برس تک کیڑے مکوڑوں، پانی اور گرمی سے بچنے کی جدوجہد کی تھی مگر آخر ان عوامل نے اپنا کام کر دکھایا تھا۔ ایک دیوار سے دوسری دیوار تک پھیلے ہوئے کارٹن کے کارٹن جو کبھی سفید ہوا کرتے تھے، اب بھورے ہوگئے تھے۔ ان پر "لکی اسٹرائک" تحریر تھا۔ ان میں رکھا ہوا مال کب کا سڑ گل چکا تھا اور فضا میں ناگوار بو پھیل رہی تھی۔

مارکوس، اپنی جگہ شل ہوگیا۔ اسے یوں لگا گویا وقت کی نبض تھم گئی ہو اور لمحے ساکت ہوگئے ہوں۔ پھر یکایک اس پر تھکن غالب آگئی۔ بے پناہ تھکن۔ وہ کراہ کر ان بھورے کارٹنوں پر بیٹھ گیا۔ پھر اس کے ہونٹ مسکراہٹ کے انداز میں پھیل گئے۔ "بے چارہ پاگل انکل جوس۔" وہ زیرلب بڑبڑایا۔ "اس نے سوچا ہوگا کہ جنگ کے دوران تمباکو کے یہ کارٹن دنیا کی سب سے بڑی دولت ہوں گے۔"

مارکوس کا ہاتھ غیر شعوری طور پر اپنی پتلون کی جیب میں چلا گیا، جس میں اس کا مقامی برانڈ کا سگریٹ کا پیکٹ تھا۔ اس نے ایک سگریٹ منتخب کر کے سلگائی اور تاسف سے دھیرے دھیرے اپنا سر ہلانے لگا۔ اس نے ساری عمر جدوجہد کی تھی اور اب وہ سوچ رہا تھا کہ اگر وہ واپس منیلا گیا تو کیا اسے دوبارہ ویٹر کی ملازمت مل جائے گی۔ آج کا دن اس پر بڑا سخت تھا۔ ایک ایسا دن جسے وہ یاد رکھنا نہیں چاہتا تھا۔

"بے چارا...... پیڈور۔" اس نے سوچا۔ اس کی مسکراہٹ کافور ہوگئی۔ "ممکن ہے، مجھے کسی شپ پر ویٹر کی جاب مل جائے۔ ہاں! ایک شپ ہی مجھے یہاں سے بہت دور لے جاسکتا ہے۔"

لیکن دھیرے دھیرے اسے یہ احساس ہونے لگا کہ کوئی بھی شپ اسے زیادہ دور نہیں لے جاسکتا تھا۔ اتنی دور...... جہاں اس سڑے ہوئے تمباکو کی ناگوار بو نہ ہو اور جہاں پیڈور کی یاد نہ ہو۔ اس کا وہ دہشت زدہ چہرہ...... اور اس سے تیزی سے دور ہوتا، سمندر کی طرف بڑھتا ہوا، اس کا جسم...... وہ اسے کیسے بھول سکتا تھا؟

++

یادِ ماضی

انوار احمد

زندگی کا سفر مختصر سہی لیکن راہ پُرخار ہوتی ہے۔ انسان اسے سنوارنے کے لیے تن من ہرسرِپیکار رہتا ہے۔ اس نے دشوار زندگی کو کیسے راحت بھری بنایا زندگی نے کیسے نئے آہنگ سے روشناس کرایا۔ بے مثل انشا پرداز، صاحبِ طرز ادیب کی خود بیتی۔

ایک ہمہ صفت و ہمہ جہت مردِ باکمال کا احوال

میرا تعلق ایک متوسط گھرانے سے ہے۔ والد مرحوم لکھنؤ سے ہجرت کرکے پاکستان آئے۔ انہوں نے نئے وطن میں زندگی صفر سے شروع کی اور سخت محنت سے اپنا مقام بنایا۔ والد مرحوم نے ہمارے لیے کوئی اثاثے تو نہیں چھوڑے لیکن ہمیں تعلیم، شعور اور آگہی کے علاوہ اپنی روایات کی پاسداری ضرور سکھائی۔

والدہ مرحومہ کا تعلق قصبہ پرتاب گڑھ کے ایک زمیندار گھرانے سے تھا، وہ نازونعم میں پلی بڑھیں لیکن والد کے ساتھ ہر مشکل گھڑی میں شامل رہیں اور کبھی کوئی شکوہ شکایت نہیں کی۔

میرے گھر میں تہذیب، روایات اور علم و ادب کے ساتھ روشن خیالی اور ایک دوسرے کی بات سننے کا بھی رواج تھا۔ گھر میں والد، چچا اور بھائیوں کے درمیان تاریخ، مذہب اور روایات پر کھل کر بحث ہوتی لیکن کبھی کوئی بدمزگی دیکھنے میں نہیں آئی۔ اختلاف رائے ضرور ہوتا لیکن تہذیب کے دائرے میں۔

میں اپنے بھائیوں میں سب سے چھوٹا تھا، مجھ سے چھوٹی تین بہنیں اور تین بڑے بھائی تھے۔

جاوید بھائی مجھ سے بڑے تھے، ان سے میرا قلبی تعلق تھا۔ وہ بھائی کم اور دوست زیادہ تھے۔ انہی نے مجھے اردو کتابیں پڑھنے کی ترغیب دی۔ اللہ انہیں غریق رحمت فرمائے۔

بچپن ہی سے میں کچھ آئیڈیلسٹ تھا۔ مجھے فائٹر پائلٹ بننے کا جنون تھا۔ انٹرمیڈیٹ کا امتحان پاس کرنے کے بعد ایک دن اخبار میں جی ڈی پائلٹ کا اشتہار دیکھا تو میں نے فارم بھر کر بھیج دیا۔ کچھ دنوں بعد ائیر فورس سلیکشن سینٹر کراچی سے ٹیسٹ اور انٹرویو کی تاریخ آ گئی۔ آج جہاں شاہین کمپلیکس ہے اس جگہ کبھی ائیر فورس سلیکشن سینٹر ہوا کرتا تھا۔ ابتدائی ٹیسٹ اور انٹرویو کے بعد آئی ایس ایس بی کوہاٹ سے کال آ گئی اور وہاں سے بھی کامیاب لوٹا۔ میری خوشی کی انتہا نہ تھی لیکن اکیڈمی جوائن کرنے سے پہلے فائنل میڈیکل میں مجھے فلائنگ کے لیے غیر موزوں قرار دے دیا گیا جو میرے لیے ایک ناقابلِ برداشت صدمہ تھا۔ بہرحال مجھے آرمی یا نیوی جوائن کرنے کا آپشن دیا گیا تھا جو میں بوجوہ نہیں کر سکا۔ میں تو فائٹر پائلٹ بننا چاہ رہا تھا۔ میرا خواب بکھر کر رہ گیا اور میں ٹوٹ سا گیا۔ شدید مایوسی کا عالم تھا لیکن آگے تو بڑھنا تھا۔ کسی طرح خود کو سنبھالا اور گریجویشن کر لی۔

دل میں بے شمار خواہشیں اور آنکھوں میں بہت سے خواب تھے جن کی تکمیل کے لیے بہت کچھ کرنے کا جنون تھا۔ کئی ملازمتیں کیں لیکن کوئی مستقبل نظر نہیں آتا تو چھوڑ دیتا اور بس یہی دھن سوار تھی کچھ بہت اچھا کرنا ہے۔ کچھ اچھا کرنا تبھی ممکن ہے جب اللہ تعالیٰ چاہے۔ ہم جب چھوٹے، بہت چھوٹے تھے تبھی سے اللہ کے آگے سوال دراز کرنے کی عادت تھی۔ اس لیے اسی سے کامیابی کی دعائیں مانگتا رہا۔ دست دعا بلند رہا کہ یہ عادت بچپن سے تھی۔ کیونکہ ہم سب کی نگہداشت ہی کچھ ایسی تھی کہ اللہ کے سوا کسی سے نہ مانگو۔

لڑکپن سے یہی دیکھا کہ گھر میں سب نماز کی پابندی کرتے، روزہ رکھتے رمضان میں افطاری کا بہت اہتمام ہوتا۔ مجھے اچھی طرح یاد ہے صراحی کا ٹھنڈا پانی جس میں کیوڑے کی مہک ہوتی اور تخم بالنگا کا شربت روح تک اتر جاتا۔ والدہ مرحومہ چاروں مغز سے بنی کوئی چیز بناتیں جو شاید دیسی گھی سے تیار ہوتا تھا۔ پکوڑے جنہیں ہمارے یہاں پھلکیاں کہا جاتا، پودینے کی چٹنی کے ساتھ کیا لطف دیتی کہ آج بھی ذائقہ نہیں بھولتا۔ گلگلے بھی بنتے جو اب قصہ پارینہ بن چکے اور دیکھنے کو ترس گئے ہیں۔ سحری میں روغنی ٹکیاں اور بالائی یا کبھی کھجلا پھینی یا گھر کی بنی سویاں ہوتیں۔

ذرا بڑے ہوئے تو ابا سحری کے بعد کی مسجد نماز فجر کے لیے لے جاتے۔ نماز کے بعد دوڑ لگواتے اور وہ اپنے چند دوستوں کے ساتھ پیچھے پیچھے چلتے اور ہم پاپوش نگر کے قبرستان تک ہو آتے۔

والد مرحوم کٹر جماعتی تھے اور صوم و صلاۃ کے سخت پابند، وہ چاہتے تھے کہ گھر کا ماحول بھی دینی ہو اور اولاد بھی انہی کی طرح ہو۔ ہم سب کو نماز کی پابندی کراتے۔ رمضان کے علاوہ بھی فجر کی نماز کے لیے سب کو علی الصباح اٹھاتے، کوئی سستی کرتا تو پانی منہ پر ڈال دیتے۔ میں چھوٹا تھا اور بقول سب کے لاڈلا بھی لہٰذا میں اس تجربے سے بچا رہا۔ شاید یہی وجہ تھی کہ والد جیسا مذہبی نہ بن سکا۔ بچپن ہی میں نماز روزے کو غچہ دینا سیکھ لیا جو بڑی مشکل سے چھوٹا۔

ذرا بڑے ہوئے تو ابا مجھے اور مجھ سے بڑے مرحوم جاوید بھائی (عمر میں تو وہ مجھ سے تین سال بڑے تھے لیکن کسی غلطی سے کاغذات اور میٹرک کے سرٹیفکیٹ میں مجھ سے چھوٹے درج کیے گئے اور آج تک یہی چل رہا ہے) کو تراویح کے لیے ساتھ لے جاتے۔ میں اور بھائی، ابا کے ساتھ مسجد میں داخل ہوتے۔ ابا اگلی صفوں میں چلے جاتے اور ہم دونوں بھائی پیچھے سے کھسک لیتے اور روڈ پر کرکٹ کھیلتے یا دوستوں اور کزنز سے گپیں مارتے اور شرارتیں کرتے لیکن نظر مسجد پر ہی ہوتی جیسے ہی تراویح ختم ہوتی ہم بھی ابا کے ساتھ گھر آ جاتے۔ ختم قرآن کی رات بالکل آخری رکعت میں ہم سب دوست مسجد جاتے اور مٹھائی کے کئی حصے وصول کرتے۔

نوجوانی کی حدود میں داخل ہوئے تو ہمارے کرتوت میں مزید ”نکھار“ آنے لگا۔ نماز روزے سے بس واجبی سا تعلق رہ گیا۔ جب ابا گھر پر ہوتے تو ان کے خوف سے ٹکریں مار لیتے۔ رمضان میں سحری بھی کرتے لیکن

رو [illegible] رہت ہوتے تھے۔ باہر ہم کئی دوست مل کر پارٹی کرتے تھے۔ ان دنوں ریسٹورنٹ بند نہیں ہوتے تھے صرف باہر پردہ لگا دیا جاتا تھا، اندر خوب ''رونق'' ہوتی تھی۔ ناظم آباد میں اب جہاں باورچیوں کا بازار ہے وہیں' کوارٹروں میں ڈھابے نما ہوٹل ہوتے تھے۔ وہاں گرم گرم نان اور ''بھونا گوشت'' یا قورمہ کھاتے۔ شاید ایک روپے میں ایک پلیٹ سالن اور دو روٹی مل جاتی۔ وہ ذائقہ اب بھی یاد ہے۔

پھر وہ پردے والے ڈھابے اور ریسٹورنٹ بھی بند کر دیے گئے تو ہم نے سوامی نارائن مندر کے احاطے میں ایک ڈھابا تلاش کر لیا جہاں لذیذ ویجیٹیرین کھانے ملتے تھے۔ اس طرح ہمارے روزے کا بھرم قائم رہتا۔ ویسے ان دنوں بھی کبھی کبھی جمعہ کے دن ہمت کر کے روزہ رکھ لیتے اور شام ہوتے ہوتے حالت غیر ہو جاتی۔

جب برسرروزگار ہوئے تو وہ کفار کی کمپنی تھی۔ وہاں روزے آتے ہی نہیں تھے۔ ہم بڑے اہتمام سے سحری میں اٹھتے۔ سحری کرتے اور کچھ دیر کے لیے سو جاتے اور پھر آفس چلے جاتے۔ ہم اچھے خاصے بڑے افسر تھے۔ آفس پہنچتے ہی ہمارا نائب بوائے سیاہ تلخ کافی سامنے لا کر رکھ دیتا اور ہم سگریٹ سلگا کر دونوں کے مزے لیتے۔ لنچ بھی آفس کی طرف سے ہوتا۔ شام میں گھر پہنچتے تو بیگم نے افطاری کا اہتمام کیا ہوتا۔ بچے تو چھوٹے تھے، بیگم اور اماں کا روزہ ہوتا۔ ہم بھی روزہ داروں جیسا منہ بنا کر لذیذ افطاری کرتے۔ بیگم اکثر دفتر سے واپسی پر پوچھتیں روزہ ہے اور ہم بڑی ڈھٹائی سے جواب دیتے، ہاں ہاں روزہ ہے اور وہ ہمیں انتہائی مشکوک نظروں سے دیکھتیں اور ہم نظر بچا لیتے۔

اب آپ پوچھیں گے کہ اب تو ہم خود مختار ہو گئے تو یہ دکھاوا کیوں اس کی وجہ صرف یہی تھی کہ کم از کم گھر میں رمضان کا ماحول تو رہے، کہیں والدہ اور بیگم کی دل شکنی نہ ہو اور یہ بھی کہ افطار کے وقت بچے اس کی اہمیت سے واقف رہیں۔

سنہ ستاسی میں والدہ صاحبہ کو عمرے کی خواہش ہوئی میں نے بطور محرم ان کے ساتھ جانے کا فیصلہ کیا۔ فلائٹ بک ہو گئی ٹکٹ آ گئے بیگم کہتی رہیں اب تو عمرے پر جا رہے ہیں نماز کی پابندی کر لیں اور میں کوئی حیلہ بہانہ کر لیتا یا کہہ دیتا پڑھ لی ہے اور وہ جانتے ہوئے بھی خاموش ہو جاتیں۔

آخر روانگی کا دن آ گیا۔ میں نے احرام باندھا اور دو رکعت نفل ادا کی اور اماں کو لے کر ائیرپورٹ پہنچا۔ عصر کا وقت تھا، جہاز نے ٹیک آف کیا۔ اماں نے جہاز کی نشست پر ہی نماز ادا کی اور میں نے بھی نیت باندھ لی اور نماز عصر ادا کی۔ اس کے بعد لبیک اللھم لبیک کا ورد شروع کر دیا۔ شاید وہ قبولیت کی گھڑی تھی یا میری آنکھوں پر بندھی پٹی اترنے کا وقت تھا کہ اس نماز کے بعد سے آج تک نماز کی پابندی نصیب ہے۔

عمرے سے واپسی کے کچھ دنوں بعد رمضان آ گیا اور شاید پہلی مرتبہ پورے روزے رکھ لیے وہ دن بھر بھوکا پیاسا رہنے کا خوف بھی نہ رہا۔ یقیناً وہ ایک بدبختی اور شیطانی وسوسہ تھا جو ختم ہوا اور اس کے بعد روزے کی... پابندی بھی نصیب ہوئی۔

میرا ماننا ہے کہ یہ دونوں نعمتیں مجھے والدہ کو عمرہ کرانے کے انعام کے طور پر اللہ نے عطا کیں۔

اب سوچتا ہوں کہ کیوں اپنے فرائض سے غافل رہا۔ اکثر والد مرحوم ہم بھائیوں سے بڑے کرب سے کہا کرتے تھے۔ ''آپ لوگوں نے ہمیشہ مجھے نماز روزے کا پابند دیکھا اس کے باوجود آپ اس کی پابندی نہیں کرتے، سوچیں جب آپ کی اولاد آپ کو نماز اور دوسرے دینی فرائض ادا کرتے نہیں دیکھیں گی تو وہ کیونکر اس کی اہمیت جانیں گے اور آپ کس منہ سے ان کو ان فرائض کی تکمیل کے لیے کہہ سکیں گے۔''

مقام شکر ہے جب میرے بچوں نے ہوش سنبھالا تو مجھے صوم وصلاۃ... کا پابند دیکھا اور وہ فرنگیوں کے دیس میں رہنے کے باوجود نماز روزے اور حرام حلال کا خیال رکھتے ہیں۔ یہ واقعہ میں نے اس لیے سنایا کہ بچپن میں احکامات سے روگردانی کچھ موقعوں پر کی ہے لیکن اللہ کے آگے سوال دراز کرنے میں پیچھے نہیں تھے۔ کچھ اچھا کرنے کا اللہ تعالیٰ موقع فراہم کر دے۔ اور اللہ تعالیٰ نے کیسے موقع فراہم کیا یہ آگے بتاؤں گا۔

اسی دوران میری شادی ہو گئی۔ شادی کو ایک سال بھی نہیں ہوا تھا، میں نے بغیر کسی سے مشورہ کیے وہ جاب چھوڑ دی۔ اس اچانک فیصلے سے سب ہی حیران ہوئے لیکن مجھ پر تو اپنے خواب پورے کرنے کا جنون سوار تھا۔ بے روزگاری کا یہ عرصہ تقریباً ایک سال رہا اور میں کسی ''بہت اچھی'' ملازمت کے لیے سرگرداں رہا۔ اس دوران کٹھن وقت بھی آئے لیکن میری رفیقہ حیات نے مجھے حوصلہ دیا اور ہر مشکل

میں میرے ساتھ کھڑی رہیں۔ انہوں نے کبھی کوئی شکایت نہیں کی اور مجھے کمزور نہیں ہونے دیا اور میں دلجمعی کے ساتھ اپنی منزل کی تلاش میں لگا رہا۔

فراغت اور بیروزگاری کے ان دنوں اکثر میں اپنے ایک دیرینہ دوست مرزا عارف الدین کے آفس چلا جاتا۔ عارف ایک امریکن آئل کمپنی یونین ٹیکساس میں ملازم تھے۔ مجھے وہاں کا ماحول بہت اچھا لگتا اور یہی خواہش ہوتی کہ کوئی ایسی ہی ملازمت مل جائے۔ بہرحال تگ ودو جاری رہی۔

اور پھر اللہ نے ایک پیارا سا بیٹا دیا۔ بیٹے کے لیے بہت کچھ کرنے کا ارمان تھا لیکن جیب خالی تھی اور کسی کا احسان لینا گوارا نہ تھا۔ بڑے بھائیوں نے جب بھی کچھ دینا چاہا تو میں انکار کر دیتا۔ ایک دن والد مرحوم نے کچھ رقم میری جیب میں ڈال دی۔ ان کو انکار کی ہمت نہیں تھی لیکن یہ ضرور کہا کہ یہ مجھ پر قرض ہے اسے بڑھا کر واپس کروں گا جس پر ابا نے خوب سرزنش کی۔

میرا ان دنوں معمول تھا کہ صبح جوگنگ کے لیے نکل جاتا واپس آکر ناشتا کرنے کے بعد پھر سو جاتا۔ نو بجے اٹھ کر اخبار میں وانٹیڈ کے اشتہارات دیکھتا اور جگہ جگہ درخواستیں بھیجتا۔ اس وقت تک ای میل وغیرہ کی سہولت تو تھی نہیں لہٰذا ڈاک کے ذریعے درخواست بھیج دیتا۔ کبھی کبھی انٹرویو کی کال آجاتی اور اکثر مایوس ہی ہونا پڑتا۔

ایک صبح اخبار کھولا تو کسی برٹش آئل کمپنی (Siesmograph Services Ltd. SSL) کا اشتہار دیکھا۔ انہیں ایک سینئر پوزیشن کے لیے منیجر کی ضرورت تھی تو مجھے یوں لگا کہ بس یہی میری منزل ہے۔ والد کو اشتہار دکھایا تو انہوں نے فرمایا کافی سینئر پوزیشن ہے شاید تم کوالیفائی نہ کر سکو لیکن دل کی آواز تھی کہ مجھے کوشش ضرور کرنا چاہیے۔ اشتہار میں واک ان انٹرویو کا وقت صبح دس بجے سے تین بجے کا تھا۔ میں اپنی بائیک پر ڈیفنس سوسائٹی میں تلاش بسیار کے بعد کمپنی کے آفس پہنچ گیا۔ ایک بڑے سے ہال میں پندرہ بیس لوگ انٹرویو کے لیے بیٹھے تھے۔ سب کے سب بہت اچھے اور باصلاحیت دکھائی دے رہے تھے۔ میں بھی اپنا نام سیکریٹری کو دے کر اپنی باری کے انتظار میں ایک گوشہ میں جا بیٹھا۔ دل میں وسوسے اٹھ رہے تھے کہ یہاں دال گلنا مشکل ہے۔

سیکریٹری نام پکارتا اور امیدوار کنٹری منیجر کے کمرے میں بھیج دیا جاتا۔ دو چار منٹ کے بعد وہ نکلتا تو دوسرا بھیج دیا جاتا۔ یہ سلسلہ چلتا رہا، آخر میرا نام بھی پکارا گیا اور میں دھڑکتے دل کے ساتھ کمرے میں داخل ہوا۔ سامنے ایک بڑی سی میز کے پیچھے تین انگریز بیٹھے تھے۔ میرے حواس گم ہوگئے۔ انہوں نے کھڑے ہو کر مجھ سے ہاتھ ملائے اور اپنا اپنا تعارف کرایا جو مجھے بالکل یاد نہیں بس اتنا یاد رہا کہ درمیان والے شخص کا نام JonesAlan ایلن جونز تھا جو کنٹری چیف تھا۔ انٹرویو شروع ہوا، پہلے چند منٹ تو ان کی انگریزی میرے سر سے گزر گئی لیکن چونکہ میں انگلش میں کافی رواں تھا لہٰذا جلد ہی سنبھل گیا اور ان کے سوالات کے جواب اپنی استطاعت کے مطابق دیتا رہا، کچھ دیر بعد اعتماد بحال ہوا تو مزید کھل کر بات شروع ہوئی۔ میں نے خود ہی ان سے سوالات شروع کر دیئے کہ کمپنی کیا کرتی ہے۔ سیسمک سروے کیا ہوتا ہے وغیرہ وغیرہ۔

انٹرویو تقریباً بیس منٹ ہوا۔ اس کے بعد پینل کے ہیڈ نے کہا کل صبح دس بجے فون کر لینا۔ میں کچھ مطمئن سا باہر نکلا اور گھر کی راہ لی۔ گھر پہنچا تو کسی نے کوئی خاص اہمیت نہیں دی کیونکہ میں اکثر انٹرویو کے لیے جایا ہی کرتا تھا۔ رات کو والد مرحوم نے تفصیل سے بات کی اور وہ پُرامید نظر آئے۔ انہوں نے خود ساری زندگی انگریزوں کے ساتھ گزاری ان کا کہنا تھا کہ گورے کسی کو بلاوجہ اتنا وقت نہیں دیتے اور یہی میں نے وہاں دیکھا بھی کہ کسی بھی اُمیدوار کو چند منٹ سے زیادہ نہیں دیئے تھے۔ وہ رات بڑی مشکل سے گزری۔ میں اور بیگم رات گئے تک باتیں کرتے رہے اور شاید تہجد بھی پڑھی۔

صبح کا بے چینی سے انتظار تھا۔ خدا خدا کر کے دس بجے دیئے ہوئے نمبر پر دھڑکتے دل کے ساتھ فون ملایا۔ سیکریٹری نے مسٹر ایلن جونز سے ملا دیا۔ انہوں نے مختصر بات کی اور کہا دو بجے ان سے مل لوں۔ میں بے یقینی کی کیفیت میں گھر آیا اور تیار ہو کر کمپنی کے آفس پہنچا۔ آفس کے گارڈ نے اندر جانے نہ دیا۔ میں نے کہا بھی مجھے جونز صاحب نے بلایا ہے تو جواب ملا۔ ''ادھر جو بھی آتا ہے جونز ساب سے ملنا چاہتا ہے۔ بس تم ادھر کھڑا ہو جاؤ۔''

اتفاقاً آفس سیکریٹری نے دیکھ لیا اور چوکیدار کو اشارہ کیا تو مجھے اندر جانے دیا۔ سیکریٹری نے تپاک سے استقبال کیا اور مبارکباد دی کہ آپ کا سلیکشن ہو گیا ہے لیکن مجھے اپنے کانوں پر یقین نہیں آیا۔ انہوں نے پوچھا آپ کتنی تنخواہ کی توقع کرتے ہیں تو میں نے کچھ زیادہ بتا دی اس پر انہوں نے

حیرت سے کہا۔ ”کیا؟“ ابھی میں اس کیا کا مفہوم سمجھ بھی نہیں پایا تھا کہ اتنے میں مسٹر ایلین نے مجھے اندر بلوالیا اور بڑی گرمجوشی سے ہاتھ ملایا اور کہا انٹرویو پینل نے مجھے ریکمنڈ کردیا ہے اور پھر میری ذمّہ داریوں کی تفصیل۔ میری کمپنی میں پوزیشن اور دوسری سہولیات کے بارے میں بتانا شروع کیا تو مجھے یوں لگا کہ مجھ سے مذاق کیا جارہا ہے اور ابھی یہ سننے کو ملے گا کہ بس بہت ہوگیا اب جاؤ کہ انہوں نے اپنی گمبھیر آواز میں پوچھا۔ ”آپ کتنی تنخواہ کی توقع کرتے ہیں۔“

میں گومگو کی حالت میں تھا کہ انہوں نے خود ہی کہا سردست ہم آپ کو...... دیں گے اور اگر آپ ہمارے معیار پر پورے اترے تو تین ماہ بعد آپ کی ماہانہ تنخواہ...... ہوجائے گی۔ میں بے یقینی کی کیفیت میں تھا ان کی بتائی ہوئی تنخواہ تو اس سے بھی کہیں زیادہ تھی جو میں نے آفس سیکریٹری کو بتائی تھی۔ اس سکوت کو مسٹر جونز نے توڑا اور پوچھا کہ میں کب سے جوائن کررہا ہوں۔ میں نے بے صبری سے جواب دیا کل صبح ہی سے۔

وہ خوش ہوئے اور جاتے وقت کہا سیکریٹری سے اپنا اپوائنٹمنٹ لیٹر لے لوں۔ مجھے معلوم نہیں گھر کیسے پہنچا۔ فاصلہ تھا کہ ختم ہی نہیں ہورہا تھا اور میں اپنی بائیک کو اس کی صلاحیت سے تیز بھگا رہا تھا۔

خدا خدا کرکے گھر پہنچا، شام ہوچکی تھی۔ سب میرے منتظر تھے۔ داخل ہوتے ہی سب نے پوچھا کیا ہوا میں نے بتایا کہ میرا سلیکشن ہوگیا اور کل سے جوائن کرنا ہے۔ اگلا سوال یہی تھا تنخواہ کیا ہے؟ جب میں نے بتایا تو کوئی یقین کرنے کو تیار ہی نہیں تھا کیونکہ اس زمانے میں اتنی تنخواہ اور ایسے پیکج کا تصور بھی محال تھا۔

میں نے والد مرحوم کے سامنے اپوائنٹمنٹ لیٹر رکھ دیا جسے پڑھ کر انہوں نے اللہ کا شکر ادا کیا۔ اماں شکرانے کی نماز کے لیے چلی گئیں۔ بیگم کی آنکھوں میں بھی تشکر کے آنسو تھے اور میرے پاس تو کہنے کو کچھ بھی نہیں تھا بس اپنے مالک کے حضور سجدہ ریز ہوگیا اور اسے مدد اور استقامت کے لیے دل سے پکارا۔ اللہ کے آگے دست سوال دراز کرنے کا پھل مل چکا تھا۔

دوسرے دن وقت مقررہ سے پہلے ہی SSL کے آفس پہنچ گیا۔ اسی کرخت چوکیدار جس کا نام شاہ طور خان تھا نے بڑے تپاک سے ہاتھ ملایا۔ سیکریٹری صاحب نے فوراً مسٹر ایلین کے کمرے میں بھیج دیا، وہ بھی بہت گرمجوشی سے ملے۔ کافی منگوائی اور ہلکی پھلکی باتیں شروع کردیں۔ یہ گورے بڑے سلیقے سے دل میں گھر کرلیتے ہیں اور پھر مجھے دوسرے کمرے میں لے جاکر اپنے نمبر ٹو ”ٹم ولسن“ سے ملوایا اور کہا میں انہی کی زیرنگرانی کام کروں گا اور انہیں ہی کو رپورٹ کروں گا۔

ٹم بہت ہنس مکھ اور شوخ قسم کا انسان تھا۔ کافی اور پائپ کا رسیا۔ ٹم میرا آئل انڈسٹری کا پہلا استاد تھا جو وقت کے ساتھ دوست بن گیا۔ ہم ایک دوسرے کو خوب سمجھتے تھے اس کے ساتھ وقت کا پتا ہی نہیں چلتا۔ اکثر وہ مجھے لے کر کئی کئی دن کے لیے چولستان کے صحرا میں چلا جاتا جہاں ہماری کمپنی شیل پیٹرولیم کے لیے (Seismic Survey) سیسمک سروے کررہی تھی۔

ایس ایس ایل کا شمار دنیا کی چند بہترین سیسمک کمپنی میں ہوتا تھا جس کے ہاں جدید ترین آلات اور دیوہیکل مشینری اور کچھ عجیب سی گاڑیاں جنہیں وائبریٹر کہا جاتا ہے موجود تھیں۔ ان ہیوی گاڑیوں کے نیچے ایک چوڑی آہنی پلیٹ ہوتی ہے جو سطح زمین سے چپک کے زمین میں ارتعاش پیدا کرکے مصنوعی زلزلہ کی سی کیفیت پیدا کرکے ہزاروں فٹ نیچے زمین کی ساخت کی تصویر کشی کرتی تھیں۔ ان کی مدد سے ریکارڈ میں نصب جدید ترین آلات سے معلوم کیا جاسکتا ہے کہ تیل کس مقام پر پایا جاسکتا ہے۔ ایس ایس کے پاس تجربہ کار مولوجسٹ اور جیولوجسٹ تھے جو اپنی فیلڈ کے ماہر تھے۔

چولستان اور جنوبی پنجاب چونکہ میدانی اور ریگستانی علاقہ ہے لہٰذا یہاں یہ سروے وائبریٹرز سے کیا جارہا تھا۔ اور پھر اسی سیسمک رپورٹس کی بنیاد پر رگ کے ذریعہ ڈرلنگ کرکے آئل نکالا جاتا ہے۔ ڈرلنگ ایک بہت مہنگا آپریشن ہوتا ہے اس لیے ہر جگہ نہیں کیا جاتا بلکہ ان مخصوص مقامات پر ہی کیا جاتا ہے جہاں زیر زمین ساخت کسی ایسے پیالے کی شکل کی ہوتی ہے جسے اوندھا کردیا ہو۔ اس مخصوص ساخت جسے Fault کہتے ہیں۔

سیسمک سروے کے اس پروجیکٹ میں کئی سو انتہائی تجربے کار افراد کا گروپ تھا جس میں مقامیوں کے علاوہ تقریباً تیس یورپین جن میں زیادہ برٹش تھے۔ مجھے اس پروجیکٹ پر بطور ایڈمن منیجر بھیجا گیا تھا جو میری اہلیت اور تجربے کے لحاظ سے بہت زیادہ تھا۔ میرے پاس تو والدین کی دعاؤں اور

کچھ کر دکھانے کے عزم کے سوا کچھ نہیں تھا۔ بس اللہ سے دعا کی اور پوری دل جمعی سے شروع ہوگیا۔ شروع میں بہت مشکلات کا سامنا کرنا پڑا لیکن ان نا مساعد حالات کے باوجود میں نے ہمت نہیں ہاری۔ ٹم کی مکمل سپورٹ اور آشیرباد مجھے حاصل تھی اور میں نے جلد ہی خود کو منوالیا۔

ہمارا کیمپ جنگل میں منگل کی مثال تھا۔ بھاولپور میں واقع قلعہ ڈراور سے متصل صحرا چولستان جہاں دور دور تک کسی آبادی کا نشان نہیں تھا۔ ہر طرف ریت کے ٹیلوں اور سرسراتی ریتیلی ہواؤں کے کچھ اور نہ تھا۔ یہ کیمپ روشنی سے جگمگا رہا تھا اور اس میں ہر آسائش موجود تھیں۔

نہایت شاندار میس سینئر اسٹاف کے لیے جس میں انواع و اقسام کے یورپین کھانے۔ مشروب مغرب اور مؤدب ویٹر۔ اسی طرح لوکل کریو کے لیے الگ میس اور کیمپ جو کئی سو ملازمین پر مشتمل تھا اس میں بھی ہر قسم کی سہولت موجود تھی۔

انگریز بھی خوب ہیں جب کام کا وقت ہو تو انتھک محنت کرتے اور نہایت دیانتداری سے اپنے فرائض نبھاتے ہیں۔ صبح ٹھیک سات بجے اپنی ٹیموں کے ساتھ چولستان کے صحرا میں نکل جاتے۔ انتہائی گرم اور سخت گرمی میں سارا دن بڑی تندہی سے کام کرتے لیکن جب فارغ ہو جائیں تو گورے ساری آسائشیں اور ہر تفریح اپنے لیے روا سمجھتے ہیں۔ شام پانچ بجے کیمپ واپس آتے۔ نہا دھو کر میس ہی سے متصل بار میں آ بیٹھتے۔ جو کسی کلب کا منظر پیش کر رہا ہوتا۔ جگمگاتے قمقمے اور جلتی بجھتی ڈسکو لائٹس کے درمیان تاش، شطرنج اور ڈارٹ کھیلتے، ساتھ ہی بیئر اور واڈکا کے گھونٹ بھرتے اور تیز موسیقی پر تھرکتے۔ ساڑھے سات بجے ڈنر ٹیبل پر آجاتے جہاں انواع و اقسام کے انگریزی کھانے اور بہترین وائن ان کی منتظر ہوتی۔ کھانے کے بعد کافی کا دور چلتا لیکن کیا مجال کہ کبھی کوئی پی کر بہکا ہو یا چال میں ذرا بھی لغزش آجائے۔ اور اگر کبھی کوئی ٹن ہو جاتا یا کوئی اور غلطی کر بیٹھتا تو پروجیکٹ چیف اس پر جرمانہ عائد کر دیتا جو بیئر کے چند کریٹ ہوتے اور یہ بار کو دیے جاتے۔ اب یہ غلطی یا بہکنے پر منحصر کہ ایک دو یا تین کریٹ جرمانہ ہو اور اس پر بھی کسی کو اعتراض بھی نہیں ہوتا اور سب خوب انجوائے کرتے۔

ایس ایس ایل کمپنی کے ساتھ کام کرنے سے ایک نئی دنیا میرے سامنے کھل گئی۔ مجھے وہ ماحول میسر آیا جو میں نے اپنے دوست عارف کے آفس میں دیکھا تھا۔ یہاں کام کر کے مجھ میں اعتماد آیا اور کارپوریٹ نظام سے متعرف ہوا جو میرے آنے والے کیریئر میں بہت کام آیا۔

چولستان اور اس کے ملحقہ علاقوں سے کام ختم ہونے کے بعد برٹش پٹرولیم کے ایک نئے پروجیکٹ کے لیے ہماری کمپنی کو بلوچستان جانا پڑا۔ پہلا پڑاؤ سبی کے قریب بھاگ کے مقام پر ہوا، وہاں کئی ہفتوں کا کام تھا۔ سخت ترین گرمی کا موسم تھا۔ سبی جو دنیا کے گرم ترین مقامات میں سے ایک ہے۔ گرمی کی شدت کی وجہ سے دن میں کام کرنا ناممکن تھا اس لیے فیلڈ ورک اور سروے کا کام صبح چار بجے شروع ہوتا اور نو بجے ختم کیونکہ اس کے بعد وہاں کی گرمی اور دھوپ انسانی جسم کے لیے ناقابلِ برداشت تھی۔ اکثر ورکرز کھڑے کھڑے گر پڑتے۔ ہیٹ اسٹروک اور ڈی ہائیڈریشن عام بات تھی۔ مریض کو فوری طور پر خصوصی بنائے گئے کولڈ روم میں پہنچایا جاتا۔ آفرین ہے گوروں پر جو اس گرمی اور لو کے موسم میں بھی کام کرتے اور واپسی پر یخ بستہ بیئر میں ڈوب جاتے۔

گرمی کے علاوہ ایک اور عذاب سانپ، بچھو اور دوسرے حشرات الارض تھے جو گرمی سے بچنے کے لیے ہمارے کیمپ کی طرف آجاتے۔ بھاگ کے بعد ڈھاڈھر کی پہاڑیوں اور اس کے اطراف میں سیسمک سروے تھا۔ ناقابل عبور پہاڑوں تک رسائی ممکن نہ تھی لہٰذا امریکا کی ایک کمپنی کانٹینیل سے تین ہیلی کاپٹرز منگوائے گئے۔ ہیلی کاپٹر جسے گورے چاپر Chopper کہتے۔ کریو اور ایکوپمنٹ لے کر صبح سات بجے پہاڑوں کے اس پار مقررہ جگہ پر پہنچا آتے اور پھر شام گہری ہونے سے پہلے کریو واپس لے آتے۔ ہیلی کاپٹر پائلٹ ویتنام جنگ کے ریٹائرڈ تھے۔ وہ اپنی شرارتوں اور مہم جوئی سے باز نہ آتے اور کبھی کبھی ہیلی کاپٹر کو اچانک اوپر لے جاتے یا شارپ ٹرن لے لیتے۔ بیچارے ورکرز کا دل اچھل کر حلق میں آجاتا اور اکثر کو الٹیاں لگ جاتیں۔ پائلٹ ان پر ہنستے اور مذاق کرتے۔ ایک مرتبہ مجھے کسی انسپکشن کے لیے جانا تھا۔

John جو ایک خوش طبع شرارتی انسان تھا وہ صرف ایک چھوٹی سی نیکر ہی پہنتا اور سر پر کیپ۔ اکثر وہ پائلٹ سائڈ کے دروازے بھی نکال دیتا، عجیب نڈر شخص تھا۔ ایک دن مجھے انسپکشن کے لیے سائٹ پر جانا پڑ گیا۔ جان نے ہیلی کاپٹر اسٹارٹ کیا اور پہاڑوں کی طرف رخ کیا۔ میں اس

کے برابر والی سیٹ پر تھا۔ کمبخت ایک پہاڑ کے بالکل قریب پہنچ گیا۔ میں چلّایا جان جان ٹیک کیئر، وہ ہنسا اور پھر اس نے بالکل عمودی پرواز شروع کردی۔ میرا دل حلق میں آگیا کہ اچانک اس نے کاپٹر کو نوز ڈاؤن پوزیشن پر لاکر سیدھا زمین کی طرف تیزی سے نیچے لانا شروع کردیا۔ مجھے یوں لگا کہ زمین مجھے نگل رہی ہے، میں چلّایا۔ ''جان لفٹ اپ جان لفٹ اپ۔'' اور وہ زور زور سے ہنس رہا تھا۔ واپسی پر میں اس سے ناراض تھا لیکن یہ ناراضگی عارضی ہوتی اور شام کو سب میس میں ہنس گا رہے ہوتے۔

ڈھاڈر جہاں ہمارا کیمپ تھا اس سے کچھ ہی فاصلے پہ ایک فرنچ جیالوجیکل ٹیم مہر گڑھ میں آثار قدیمہ کی تلاش کررہی تھی۔ اس ٹیم میں چند خوبصورت لڑکیاں بھی تھیں جو جیالوجی اسٹوڈنٹس تھیں۔ ایک شام انہوں نے ہمارے سینئر اسٹاف کو پارٹی پر مدعو کیا۔ یہاں Mike Moss اور میں نہ صرف اکٹھے کام کرتے بلکہ اچھے دوست بھی تھے۔ مائیک برٹش آرمی کا سابقہ کیپٹن تھا۔ وہ میرین کمانڈو رہ چکا تھا، انتہائی پھرتیلا، فٹ اور اتنا ہی خوش اخلاق بھی تھا۔ میں مائیک اور چند دوسرے برٹشرز فرنچ کیمپ پہنچے۔ بڑی آؤ بھگت ہوئی، کھانے کے بعد کیمپ فائر اور پھر تیز موسیقی پر گورے تھرکنے لگے۔ میں نے محسوس کیا کہ مائیک ایک انتہائی خوبصورت فرنچ لڑکی جیسمین میں کچھ زیادہ ہی دلچسپی لے رہا تھا۔ اس کے بعد بھی مائیک اکثر مجھے لے کر فرنچ کیمپ چلا آتا یا کبھی ہم بھی انہیں انوائٹ کرلیتے۔ ایک دن مائیک بنا کسی کو بتائے اس لڑکی کو کیمپ سے نکال کر کوئٹہ لے گیا اور پھر کراچی سے دونوں پیرس چلے گئے جہاں انہوں نے شادی کرلی۔ اس واقعہ پر بہت ہنگامہ ہوا۔

مہر گڑھ جہاں آثار قدیمہ کے لیے کھدائی ہورہی تھی رئیسانی قبیلہ کی ملکیت میں تھا وہاں کے سرداروں نے بھی اس واقعہ کا نوٹس لیا لیکن معاملہ برٹش نیشنل کا تھا اور بات یہیں ختم ہوگئی۔

کئی سال بعد مائیک پھر پاکستان آیا اس بار وہ اکیلا نہیں بلکہ جیسمین کے ساتھ تھا۔ وہ پی سی میں ٹھہرے ہوئے تھے۔ مائیک نے مجھے فون کیا اور شام کو ہم تینوں بیٹھے پرانی باتیں یاد کرکے ہنس رہے تھے۔ جیسمین نے مجھے بتایا کہ میں تمہارے بارے میں سب جانتی ہوں، مائیک ہر وقت تمہاری ہی باتیں کیا کرتا تھا۔

مائیک اور جیسمین کو ہم نے کئی بار گھر پر بھی بلایا، انہیں میرے بچے اچھے لگے پھر جب تک وہ کراچی میں رہے میرے بچوں کو اسکول کے بعد ہوٹل بلا لیتے۔ انہیں کھلاتے پلاتے سوئمنگ کراتے اور پھر شام کو میں آفس سے واپسی پر مائیک کے پاس چلا جاتا۔ ہم تفریح کرتے۔ باتیں کرتے اور پھر میں بچوں کو لے کر واپس گھر آجاتا۔

مائیک کی طرح دوست کم ہی ملتے ہیں۔ برٹش روایت پسند ہوتے ہیں اور دیسیوں کو کم ہی منہ لگاتے ہیں لیکن اگر دوستی ہوجائے تو بہت خلوص کا مظاہرہ کرتے ہیں۔ میں تقریباً تیس برس گوروں کے ساتھ رہا، یورپین اور امریکن کے ساتھ کام کیا اور بس یہی دیکھا، اگر آپ اپنا کام سو فیصد کرتے ہیں اور کوئی دو نمبری نہیں کرتے۔ جھوٹ نہیں بولتے اور اگر کبھی کوئی غلطی ہوجائے اور اسے تسلیم کرلیں تو وہ دل و جان سے آپ کی قدر کرتے ہیں اور شاید یہی ان کی کامیابی کی وجہ ہے۔

ایس ایس ایل کا پاکستان میں پروجیکٹ مکمل ہوچکا تھا اور نیا پروجیکٹ لیبیا میں شروع ہونے والا تھا۔ پیکنگ اور ایکوپمنٹ ایکسپورٹ کا عمل شروع ہوچکا تھا۔ ایلن نے مجھے بھی لیبیا جانے کی آفر کی جو میرے لیے ممکن نہ تھا جس کی وجہ بچوں کی تعلیم اور والدین کی ذمہ داریاں تھیں، ساتھ ہی یہ بھی تشویش تھی کہ اب میرے مستقبل کا کیا بنے گا، جس ماحول میں رہ چکا تھا اور جتنی تنخواہ لے رہا تھا وہ کسی دیسی سیٹ اپ میں ممکن نہ تھا۔

لیکن اوپر والے کا کرم ہو تو راستے خود نکل آتے ہیں۔

☆☆☆

میں SSL ہی کے پے رول پر تھا۔ مصروفیت کوئی خاص نہ تھی بس روز کنٹری ہیڈ Alan کو فون کرکے پوچھ لیا کرتا تھا اور اگر ضروری ہوتا تو آفس چلا جاتا۔ ایک دن ایلن نے مجھے اپنے آفس بلایا، وہاں ایک ادھیڑ عمر کا شخص بھی موجود تھا۔ میرا ان سے تعارف کرایا۔ وہ فرنچ تھے ان کا نام Pierre Lasara پیئر لزارا تھا۔ انہوں نے بڑے تپاک سے مجھ سے ہاتھ ملایا اور ساتھ ہی بٹھالیا۔ اتنے میں کافی آگئی اور ہم باتیں کرتے رہے۔ ایلن نے موسیو لزارا سے کہا یہی انوار ہے جس کے بارے میں آپ کو بتایا تھا۔ کافی کے بعد موسیو لزارا مجھے اپنے ساتھ دوسرے کمرے میں لے گئے اور اپنا مکمل تعارف کراتے ہوئے بتایا کہ وہ ایک فرنچ آئل ڈرلنگ کمپنی SA Forasol کے ڈائریکٹر مارکٹنگ ہیں۔ ان کی کمپنی نے شیل پیٹرولیم سے پاکستان میں

ڈرلنگ کنٹریکٹ سائن کیا ہے۔ بہت جلد ان کے ڈرلنگ رگ اور فرنچ اسٹاف پاکستان پہنچ جائیں گے۔ اب انہیں کسی پاکستانی کی تلاش تھی جو اس پروجیکٹ کی مینجمنٹ کر سکے۔ ایلن جونز نے میرا نام تجویز کیا تھا۔ اسی کی سفارش پر مجھے منتخب کیا گیا ہے۔"

مسٹر لزارا نے وہیں اپوائنٹمنٹ لیٹر ٹائپ کر کے مجھے تھمادیا اور ہنستے ہوئے کہا۔ "مجھے اُمید ہے کہ ہماری پیشکش آپ کو قبول ہوگی۔ میری پوزیشن مینجر ہیومن ریسورس اینڈ لوجسٹک اور تنخواہ میری موجودہ سیلری سے تقریباً دوگنی تھی۔ مجھے اپنی آنکھوں پر یقین نہیں آرہا تھا، اپنے رب کی عنایت پر آنکھیں نمناک ہوگئیں۔

انہوں نے ہدایت دی کہ مجھے ایس ایس ایل چھوڑ کر فوراسول ڈرلنگ جوائن کرنا ہوگی۔ میں اس سلیکشن پر حیران بھی تھا اور اپنے رب کا شکرگزار بھی۔ ایس ایس ایل میں برٹشرز کے ساتھ کام کر کے تجربہ اور سب سے بڑی بات خود اعتمادی آ گئی تھی۔ لیکن دشواری یہ تھی کہ میں سیسمک تو سمجھتا تھا مگر ڈرلنگ آپریشن اور اس سے متعلق امور سے لاعلم تھا اور اب یہ میرے سامنے ایک اور بڑا چیلنج تھا۔

موسیو لزارا اسی رات پیرس چلے گئے اور مجھے اپنا فون نمبر دے گئے کہ ان سے کنٹیکٹ میں رہوں۔ یہ بات ستمبر 1982ء کی ہے۔ میری اوّلین ذمہ داری تھی کہ مجھے SAForasol کو پاکستان میں زیرو سے بنانا اور اسے اسٹیبلش کرنا تھا۔ اس کے علاوہ آنے والے رگ کے لیے ڈرلنگ کریو، آفس اسٹاف کا سلیکشن۔ آفس۔ فرنیچر اور اس کی تزئین سے لے کر متعلقہ حکومتی اداروں سے کوآرڈینیشن۔ مختلف اجازت ناموں کا حصول اور پھر رگ کی امپورٹ۔ کلیرنس اور اس کی ڈرلنگ سائٹ تک ٹرانسپورٹیشن وغیرہ کو ترتیب دینا تھا۔

یہ امور انتہائی دشوار اور پیچیدہ تھے اور کمپنی نے مجھ پر اعتبار کیا تھا۔ میں نے اس چیلنج کو قبول کیا اور پوری تندہی سے اس کی تکمیل میں لگ گیا۔ اس وقت فوراسول کمپنی صرف میری ذات تک محدود تھی۔ نہ دفتر تھا، نہ فرنیچر اور نہ ہی کوئی اسٹاف۔ بس میری ذات تھی اور میری ایک کار جس پر میں سارا دن مختلف دفاتر کے چکر لگاتا رہتا۔ کبھی آنے والے رگ اور مشنری کے لیے کسٹم لوازمات۔ کبھی کلیرنگ ایجنٹ سے مشاورت اور کبھی ٹرانسپورٹرز سے میٹنگز ساتھ ہی آنے والے فرنچ کریو کے لیے سیکیورٹی کلیرنس۔ ورک پرمٹ کا حصول۔ یہ سب اتنا آسان نہیں تھا اور میں تن تنہا لیکن ہمت اور محنت ہو تو راستے نکل آتے ہیں اور پھر SSL میں تقریباً تین سال کام کر کے بہت کچھ سیکھ چکا تھا۔ کسی نے سچ کہا کہ وقت بہت بڑا استاد ہوتا ہے۔

ایک اور وقت طلب مسئلہ رگ کے لیے لوکل کریو اور آفس اسٹاف کا اپوائنٹمنٹ بھی تھا۔ زیادہ مشکل ڈرلنگ کریو کی تلاش اور رگ کے آنے سے پہلے ان کی ٹریننگ اور سرٹیفکیشن تھی۔ رگ پر کام کرنے کے لیے جب تک سیفٹی اور ڈرلنگ کورسز اپ ڈیٹ نہ ہوں ڈرلنگ فلور پر کام نہیں کیا جا سکتا۔ میں سیسمک کریو اور آئل انڈسٹری سے بڑی حد تک متعارف تو ہو چکا تھا لیکن ڈرلنگ میرے لیے ایک نیا تجربہ تھا۔ آفس اسٹاف تو آسانی سے مل گیا لیکن ڈرلنگ کریو کی سلیکشن ایک انتہائی اہم اور دشوار مرحلہ تھا۔ میرے دوست حمایت علی جو ایک کینیڈین ڈرلنگ کمپنی Challengers میں ایچ آر مینجر تھے ان کی مدد سے یہ مسئلہ بھی حل ہو گیا اور میں نے رگ کے آنے سے پہلے مکمل کریو تیار کر لیا تھا اور ان کی سرٹیفکیشن بھی کروائی تھی۔

اگلے ماہ کنٹری ہیڈ Bernard Chevallier کے ساتھ فرنچ کریو بھی کراچی پہنچ چکا تھا اور اس کے چند روز بعد ایک بحری جہاز کراچی بندرگاہ پر لنگر انداز ہوا اور انلوڈنگ شروع ہوئی۔ میرے وہم و گمان میں بھی نہیں تھا کہ ڈرلنگ رگ اتنا بڑا ہوتا ہے کہ پورے جہاز پر صرف وہی لوڈ تھا جس کے مختلف حصے کھول کر جہاز میں سما سکے تھے اور اسے بندرگاہ سے سائٹ تک لے جانے کے لیے تقریباً ایک سو دس ہائی بیڈ اور لو بیڈ ٹریلرز درکار تھے جس کے لیے ایک بہت معتبر کمپنی Edward & Robertson کو رگ کی پورٹ کلیرنس اور اس کی کراچی پورٹ سے جہلم کے قریب ورنالی اور ہی کے مقام تک ٹرانسپورٹیشن کی ذمہ داری دی گئی جو انہوں نے بخوبی انجام دیا۔

مجھے برنارڈ کے ساتھ کام کرتا تھا۔ وہ ایک انتہائی منظم اور قابل شخص تھا۔ اس نے مجھے خود اعتمادی دی اور ہر میٹنگ میں اپنے ساتھ رکھتا بلکہ اکثر اوقات تو انتہائی اہم معاملات اور حکومتی عہدیداروں سے میٹنگ میں مجھے ہی آگے رکھتا۔ لیکن جب بھی کوئی ٹیکنیکل معاملات سامنے آتے تو میری جگہ لے لیتا۔ اسی کے کہنے پر میں نے فرنچ لینگویج سیکھنے کے لیے FrancaisAliance الیانس فرانسیز میں داخلہ

لے لیا جو فرنچ کمپنی میں کام کرنے کے لیے ضروری تھا۔
ادھر رگ جس کا کمپنی کوڈ National 110/9 تھا ڈرلنگ لوکیشن پہ بھی پہنچ چکا تھا۔ تقریباً تین ہفتے بعد ایکوپمنٹ اسمبل کر کے رگ تیار ہوا۔ کریو بھی مکمل تھا اور ڈرلنگ کے لیے تیار تھا۔ اس سے قبل ایک بہت بڑی پارٹی منعقد ہوئی۔ میں کراچی سے گیا اور رگ کو دیکھ کر حیرت زدہ ہوگیا۔ دوسرے دن ڈرلنگ آپریشن شروع ہوگیا جو میرے لیے ایک نیا تجربہ تھا۔

میں SA Forasol آفس میں بحیثیت منیجر ہیومن ریسورس اینڈ لوجسٹک تھا۔ ترقی کا سفر تیزی سے طے کرنے لگا، چند ماہ بعد مجھے بزنس ڈیولپمنٹ کا اسائنمنٹ بھی دے دیا گیا اور پھر انٹرنیشنل پے رول پر لے لیا گیا۔ اب میری تنخواہ ڈالرز میں ہوگئی۔ میرے پاس اپنا اسٹاف تھا۔ اور ایک پارسی لڑکی جو انگریزی کے علاوہ فرنچ زبان بھی بخوبی بولتی تھی بطور سیکریٹری مل گئی۔ میری مصروفیات میں اضافہ ہوتا چلا گیا۔ بعض اوقات کئی کئی روز گھر کے کھانے سے بھی محروم رہتا۔ نہ آفس جانے کا کوئی وقت اور نہ ہی واپسی کا۔

کمپنی کی طرف سے متعدد کورسز۔ سرٹیفکیشن۔ سیمینارز اور کانفرنس میں شرکت کیں جو کبھی پاکستان میں اور کبھی یورپ یا امریکا میں منعقد ہوتیں اور میں اپنی کمپنی کی نمائندگی کرتا جس سے میری شخصیت اور کارکردگی میں بھی اضافہ ہوا۔

فوراسول اپنی جدید ڈرلنگ اور کارکردگی کی بنا پر آئل کمپنیز میں بہترین جانی جاتی تھی۔ اگلے ہی سال ہمیں ایک اور بہت بڑا ڈرلنگ کانٹریکٹ مل گیا جس کے لیے مزید ایک اور رگ جو پہلے سے بڑا تھا امپورٹ کرنا پڑا۔ اب میں اپنے کام۔ مارکیٹنگ اور متعدد امور میں چل نکلا تھا۔ کمپنی نے میری صلاحیتوں پر اعتماد کیا۔ برنارڈ شیو الیر نے مجھے بہت گروم کیا۔ میرا نام کنٹری جنرل منیجر کے پوزیشن کے لیے کئی بار لیا گیا لیکن میرے پاس انجینئرنگ بیک گراؤنڈ نہ تھا جس کی وجہ سے یہ پوزیشن نہ لے سکا لیکن بارہا کنٹری ہیڈ کی غیر موجودگی میں یہ ذمہ داری بھی میں ہی نبھاتا۔

پاکستان کے علاوہ کئی دوسرے ممالک کے لیے بھی مجھے ہیومن ریسورس کی ذمہ داری سونپی گئی جو میں بخوبی ادا کرتا رہا۔ کمپنی نے میری کارکردگی کے پیش نظر مجھے کئی اور ممالک کے لیے بھی کریو سلیکشن کی ذمہ داری بھی دے دی جس میں، میں سرخرو ہوا۔

پاکستان میں میری پوزیشن بہت مستحکم ہو چکی تھی۔ آئل انڈسٹری میں میرا نام معتبر سمجھا جاتا تھا بلکہ کئی دوسری کمپنیوں سے بہت اچھی آفرز بھی ملیں، لیکن میں فوراسول کے ماحول میں اس قدر رچ بس گیا تھا کہ اسے چھوڑنا ممکن نہیں تھا، اور پھر جس کمپنی نے مجھے اس مقام تک پہنچایا اسے محض مالی فائدے کے لیے چھوڑ دینا مجھے گوارا نہ ہوا۔

اس وقت آئل کمپنیز کی شان ہی الگ ہوتی تھی۔ آئل کمپنیز سے متعلق افراد بھی الگ ہی نظر آتے جس کی وجہ شاندار تنخواہ اور دیگر مراعات تھیں۔

حکومت کی طرف سے بھی آئل کمپنیز اور ڈپلومیٹ کے لیے خصوصی مراعات ملتیں جس میں الکحل۔ امپورٹیڈ الیکٹرونکس۔ پرفیوم اور چاکلیٹ کے علاوہ دیگر اشیا انتہائی کم قیمت پر مل جاتیں۔

آئل کمپنیز کا اپنا ایک الگ کلچر تھا۔ یہ سب خوب کام کرتے لیکن اسی طرح کمپنی اپنے ملازمین کی تفریح کا بھی خیال رکھتی۔ کراچی میں زیادہ تر غیر ملکی کمپنی کے دفاتر کلفٹن اور ڈیفنس کے علاقے میں تھے۔ اسی طرح مختلف یورپین ممالک کے دفاتر اور ڈپلومیٹک اسٹاف بھی وہیں رہتے اور ان دونوں گروپس میں خوب بنتی تھی۔ اکثر ویک اینڈ پر پارٹیز ہوتیں جو رات گئے تک جاری رہتیں۔ ہر مہینے کسی سہ پہر واک یا میراتھون ہوتی جو کسی ڈپلومیٹ یا آئل کمپنی کے آفیشل کے گھر سے شروع ہوتی۔ شرکا کو نمبر الاٹ کیے جاتے اور روٹ میپ دے دیا جاتا اور پھر اسٹارٹ ٹائم شروع ہوجاتا۔ میراتھن کا اختتام بھی کسی کے گھر پر ہوتا۔ سب سے آخر میں پہنچنے والے پر جرمانہ کیا جاتا اور پھر پارٹی شروع ہوجاتی۔ خوب ہلا گلا کرتے۔ کیسا پرامن وقت تھا۔ یورپین مرد و خواتین شارٹس میں ملبوس ڈیفنس کی گلیوں اور سڑکوں پر دوڑتے پھرتے بغیر کسی خوف و ہراس کے۔

فرنچ کمیونٹی کچھ زیادہ ہی پارٹی کی شوقین ہوتی ہے۔ ان دنوں ہر تین ماہ بعد فرنچ نیوی کا Flotilla آتا اور کراچی پورٹ سے کچھ دور لنگر انداز ہوجاتا۔ ہم سب اس کی آمد کے شدید منتظر رہتے۔ آلیانس فرانسز۔ فرنچ کونسل جنرل۔ فرنچ کمیونٹی اور مختلف ڈپلومیٹ کو ایسٹ وہارف تک ہم پرائیوٹ کوسٹرز میں لے جاتے۔ وہاں سے نیوی کی بوٹس فرنچ نیوی شپ تک پہنچا دیتی۔ شام ہوتے ہی بحری جہاز رنگ برنگے قمقموں سے سج جاتا، ڈیک پر پارٹی اور ڈنر ہوتا اور دیر تک جاری رہتی۔ ایسی ہی پارٹیز اسلام آباد میں بھی ہوتیں۔ وہاں مارگلہ ہلز پر رات کو سرچ لائٹ میں شکار کے

لیے جاتے۔ کبھی سوات کی سیر پر چلے جاتے اور کبھی لاہور بسنت منانے چلے جاتے۔ اندرون شہر کی مکانوں کی چھتوں کو کرائے پر لے کر ہم رات بھر پتنگ بازی کرتے۔ اب تو بسنت کا تہوار بھی خون آلود کردیا گیا اور ایک خوبصورت روایت ختم ہوگئی۔

زندگی خوب گزر رہی تھی۔ 1995 میں فوراسول کمپنی کا اشتراک ایک بہت بڑی امریکن ڈرلنگ کمپنی پرائڈ انٹرنیشنل Pride Intl. سے ہوگیا اور ہماری کمپنی فرنچ سے امریکن ہوگئی۔ اس کے ساتھ ہی کمپنی کا کلچر بھی تبدیل ہونے لگا اور فرنچ اسٹاف کی جگہ امریکی آنے لگے۔ اکھاڑ پچھاڑ شروع ہوگئی۔ مجھے بھی ہوسٹن آفس پوسٹنگ کی آفر دی گئی۔ بہت اچھا پیکج تھا پوری فیملی کے ساتھ H1 ویزا لیکن میں نے معذرت کرلی جس کی اہم وجہ میرا گھر اور بچے تھے جو ابھی اسکول لیول پر تھے اس کے علاوہ یہ کہ پاکستان میں میری اپنی زندگی تھی اور ہر قسم کی سہولت بھی جبکہ امریکا میں زندگی اتنی آسان نہیں ہوتی جو میں بار بار دیکھ چکا تھا۔

عراق کے جنگ کے خاتمہ پر کمپنی نے ایک عراقی پیٹرولیم انجینئر صباح محمود کو پاکستان بھیجا۔ میں اسے ریسیو کرنے ائیرپورٹ گیا۔ وہ اپنی بیگم اور تین بچوں کے ساتھ انتہائی خستہ حالت میں باہر آیا۔ اسے دیکھ کر مجھے بہت ترس آیا اور ساتھ ہی خوشی بھی ہوئی کہ چلو ایک پریشان حال مسلمان ہے اس کی مدد ہوجائے گی۔ صباح کو بمشکل انگریزی بولنا آتی تھی بس کام چلا لیتا تھا اور لکھنے میں تو بالکل کورا تھا۔ میں اس کی طرف سے ای میل اور لیٹرز کے جواب لکھتا۔ کلائنٹ اور دوسرے محکموں کے سربراہان سے اس کا تعارف کراتا اور ہر قدم پر اس کی معاونت کی۔ وہ بظاہر ایک انتہائی عاجز اور کم گو انسان تھا۔ ہر کسی سے نہایت انکساری سے ملتا اور بہت خاموشی سے میری ہدایات پر عمل کرتا۔ یہ وہ دور تھا جب پاکستان میں بدامنی اپنے عروج پر تھی۔ دھماکے اور تشدد کے واقعات جابجا ہو رہے تھے ایسے میں یورپین اور امریکن پاکستان آنے سے کترانے لگے۔ آخری فرنچ کنٹری ہیڈ رابرٹ منگو Robert Mingot تھا اس نے اپنے ٹرانسفر پر اس پوزیشن کے لیے میرا نام تجویز بھی کیا لیکن میرا تعلیمی بیک گراؤنڈ اس پوزیشن کے لیے موزوں نہیں تھا۔ کوئی یورپین یا امریکن پاکستان کے حالات کے سبب آنے کو تیار نہ تھا لہٰذا صباح محمود جو انجینئر تھا اسے پاکستان کا کنٹری ہیڈ بنا دیا گیا۔

پاکستان میں کمپنی کا ایک آفس اسلام آباد اور ایک کراچی میں تھا۔ صباح اسلام آباد میں تھا۔ ڈرلنگ آپریشن اس کے پاس تھا اور میں کراچی آپریشن کا ہیڈ تھا۔ ڈرلنگ اور اکاؤنٹ کے علاوہ باقی تمام امور میرے پاس تھے جس میں بزنس ڈیولپمنٹ اور مارکٹنگ بھی شامل تھے۔ کراچی کے مخدوش حالات کی وجہ سے زیادہ تر آئل کمپنیز اسلام آباد شفٹ ہوگئی تھیں۔ سنہ ننانوے میں ہماری کمپنی کا کراچی آپریشن بند کردیا گیا اور میں بھی اسلام آباد شفٹ ہوگیا۔ فوراسول سے میری جذباتی وابستگی بھی تھی۔ یہیں سے میں نے کمپنی کو زیرو سے ترقی کرتے دیکھا تھا۔ اس کی ایک ایک چیز سے مجھے پیار تھا۔ میں نے تقریباً بیس برس یہاں گزارے۔ یہیں مجھے کامیابیوں کی منزلیں ملیں۔ میرا اسٹاف مجھے بے حد عزیز تھا ان کے بے روزگار ہونے کا بھی مجھے قلق تھا۔

لیکن مجھے خوشی ہے کہ کراچی آفس بند کرنے سے پہلے میں نے ان کے لیے متبادل جاب کا بندوبست کردیا تھا۔

کنٹینرز میں آفس کا سامان اور ریکارڈ لوڈ کیا جا رہا تھا اور میں اداس یہ سب دیکھ رہا تھا۔ میرے اسٹاف کی آنکھوں میں آنسو تھے وہ سب بھی میری طرح تکلیف میں تھے لیکن جہاں کا رزق ہو جانا ہی پڑتا ہے۔

میں اپنی فیملی کے ساتھ اسلام آباد چلا گیا۔ صباح محمود کو اب زیادہ قریب سے دیکھا تو وہ میری توقعات سے بھی زیادہ گرا ہوا شخص ثابت ہوا۔

صباح نے کنٹری منیجر بنتے ہی اپنا اصل رنگ دکھانا شروع کردیا۔ وہ ایک نہایت میسنا، چاپلوس اور مکار شخص ثابت ہوا۔ بات بات پر جزاک اللہ، الحمدللہ کہتا اور پھر اپنی ہی کہی ہوئی بات سے فوراً مکر بھی جاتا اور پھر واللہ، قسم باللہ کا ورد شروع کردیتا۔ مختلف امور پر میرا اس سے اختلاف رہنے لگا۔

میرے تمام احسانات کے باوجود اس نے پہلے ہی دن سے میری لیے مشکلات پیدا کرنے کی کوشش کیں لیکن کمپنی کی مینجمنٹ مجھے جانتی بھی تھی اور میری خدمات کی قدر بھی کرتی تھی اس لیے وہ زیادہ کچھ نہ کرسکا۔ خود کو مضبوط کرنے اور مجھے سائڈ لائن کرنے کے لیے اس نے اپنے ہاتھ پاؤں پھیلانے شروع کردیے اور آفس میں کئی اور عراقی لے آیا۔ وہ مجھ سے چھوٹی چھوٹی باتوں پر الجھنے لگا۔ میری بھی اس سے تکرار رہتی۔ میں نے کمپنی کا عروج دیکھا

تھا اب ان نالائقوں کو بھگتنا میرے لیے مشکل تھا اسی لیے مجھے زیادہ تکلیف ہوتی اور اس کی حرکتیں نا قابلِ برداشت تھیں۔

ان اٹھارہ برسوں میں متعدد قابل اور اچھے انسان بطور کنٹری منیجرز آئے ہم سب نے مل کر کمپنی کو عروج دیا۔ سندھ، پنجاب اور بلوچستان میں متعدد آئل اور گیس کے ذخائر دریافت کیے۔

صباح محمود کی کمینگی بڑھتی جارہی تھیں۔ ایک دن بات بہت بڑھ گئی تو میں نے پیرس آفس میں پاکستان آپریشن کی چیف Gerald Vidal کو فون کرکے ساری صورتِ حال بتائی اور ان سے ملاقات کی درخواست کی۔

انہوں نے مجھے پیرس بلایا میری باتیں سنیں اور مجھے پرائڈ انٹرنیشنل ہیوسٹن میں Hemisp Eastern کے پریذیڈنٹ Pierre Lamourox کے پاس بھیج دیا جو مجھے اور میرے کام سے اچھی طرح واقف تھے۔ میں نے بتایا کہ میں صباح کے ساتھ مزید کام نہیں کرسکتا۔ انہوں نے میری باتیں غور سے سنیں اور مجھے تین آپشن دیئے۔ ایک نائیجریا۔ دوسرا ساؤتھ افریقا اور تیسرا سعودی عرب پوسٹنگ کا تھا۔ سعودی عرب میں کمپنی کو آرامکو کا ایک بہت بڑا آف شور ڈرلنگ کانٹریکٹ ملا تھا جس کے لیے وہاں سینئر منیجر کی ضرورت بھی تھی۔ میں نے سعودی عرب کے لیے ہامی بھرلی اس کی ایک وجہ تو یہ بھی تھی کہ دہران کراچی سے صرف دو گھنٹے کی فلائٹ پر تھا اور کراچی آنا جانا آسان تھا۔ اس میٹنگ کے بعد میں اسلام آباد آیا۔ صباح محمود کو تکلیف تو بہت ہوئی کہ میری پشت پر ہیوسٹن اور پیرس آفس بھی تھا انہوں نے مزید اختیارات دے کر بہتر جگہ پوسٹنگ کردی۔

اسلام آباد سے اپنے اہلِ خانہ کو واپس کراچی لے آیا اسی دوران سعودی عرب سے میرا ویزا آگیا اور تاکید کی گئی کہ جلد از جلد دہران سے متصل شہر الخوبر پہنچوں جہاں پرائڈ انٹرنیشنل کا آفس تھا۔

سفری دستاویزات مکمل ہونے میں تقریباً دو ہفتے لگے اسی دوران اسلام آباد سے ہمارا کنٹینر بھی گھریلو سامان اور فرنیچر لے کر آگیا۔ ابھی گھر ٹھیک سے سیٹ بھی نہیں ہوا تھا اور مجھے سعودی عرب سے فون آرہے تھے کہ جلد از جلد پہنچوں۔ گھر اور بچوں کو اسی حالت میں چھوڑ کر میں دہران کے لیے روانہ ہوگیا۔

دمام ایئرپورٹ پر کمپنی کی کار اور ڈرائیور میرا منتظر تھا جو مجھے الخوبر کے ایک ہوٹل لے گیا جہاں میرے لیے کمرا بک تھا۔ دوسری صبح ڈرائیور ہمیں لے کر آفس آیا۔ جہاں جنرل منیجر Jan V Proyeen میرے منتظر تھے۔ وہ ڈچ نیشنل تھے انہوں نے مجھے آفس اسٹاف سے ملوایا اور میرا آفس دکھایا۔ منیجریل اسٹاف میں ان کے بعد ایک امریکن Jack Langley تھے وہ آپریشن منیجر اور اب میں بطور ہیومن ریسورس اینڈ لوجسٹک منیجر تھا۔

یان اور جیک انتہائی سینئر، جہاندیدہ اور اپنی فیلڈ کے ماسٹر تھے اسی طرح وہ دونوں اپنے اسٹاف اور رگ کریو کی چھوٹی چھوٹی باتوں کا بھی خیال رکھتے۔ وہ بہت شفیق تھے لیکن پرفارمنس پر کبھی سمجھوتا نہیں کرتے تھے۔ سعودی عرب میں ہمارے دو آف شور رگ MontanaPride اور AmericaNorthPride تھے جو کویت کی سمندری حدود کے قریب ڈرلنگ کررہے تھے۔ رگ کریو میں امریکن، فرنچ، انڈین، پاکستانی، فلپینی کے علاوہ سعودی بھی تھے۔ دونوں رگز راس التنا جیب اور راس تنورہ سے کئی کلومیٹر دور سمندر میں تھے۔ آمدورفت کے لیے آرامکو کے ہیلی کاپٹر استعمال کیے جاتے جس کے لیے اسپیشل کورس Survival Sea لازمی ہوتا یہ کورس آرامکو کی نگرانی میں ایک آسٹریلوی کمپنی کراتی تھی۔

کمپنی کی طرف سے مجھے ایک امریکی کمپاؤنڈ میں فرنشڈ رہائش گاہ مل گئی۔ جو سعودی عرب میں کمپاؤنڈ لائف سے واقف ہیں جانتے ہوں گے کہ وہاں سعودی قانون کا اطلاق نہیں ہوتا اور وہ تمام ”سہولتیں“ میسر ہوتی ہیں جو کسی بھی امریکی شہر میں ہوسکتی ہیں۔

بیگم اور بچوں کے ویزے بھی ہوگئے۔ بچے کراچی میں زیرِ تعلیم تھے لہٰذا صرف چھٹیوں میں ہی آتے لیکن بیگم وقتاً فوقتاً آتی رہتیں اور میں بھی ہر چھے ہفتوں بعد تین ہفتے کے لیے کراچی جاتا۔ کمپنی کی طرف سے مجھے اور بچوں کو بزنس کلاس کا ٹکٹ ملتا...... زندگی آرام سے گزر رہی تھی۔

آف شور آپریشن میرے لیے نئی چیز تھی۔ حیرت انگیز اور چیلنج سے بھرپور۔ آفس کا ماحول بہت فرینڈلی اور پروفیشنل تھا۔ یان اور جیک کسی شفیق استاد کی طرح سب کی رہنمائی کرتے۔ اسی طرح وہ اسٹاف کی تفریح کا بھی خیال رکھتے۔ مہینے میں ایک بار بحرین کے سیون اسٹار ہوٹل رٹز کارلٹن میں ڈنر ہوتا۔ بحرین الخُبر کے اس پار تھا دونوں شہر Bridge

Causeway سے منسلک تھے۔ تقریباً پچیس کلومیٹر کے اس پل سے ایک گھنٹے کی ڈرائیو پر بحرین واقع ہے۔ اکثر سعودی اور گورے ویک اینڈ پر بحرین چلے جاتے اور وہاں کی رنگینیوں میں ڈوب جاتے۔ ہماری کمپنی بھی اپنے اسٹاف اور کریو کی ٹریننگ۔ سرٹیفکیشن۔ روڈ شوز اور کانفرنس وہیں رکھتی کیونکہ سعودی عرب میں مشروب مغرب پر پابندی تھی اور بحرین میں مے گلفام عام تھی۔ کام سے فارغ ہونے کے بعد شام کو سب ہی بار میں نظر آتے یا فلمیں دیکھتے۔

فلمیں دیکھنا مجھے بھی پسند تھا۔ فلم بینی کے کئی واقعات اب تک یاد ہیں کہ پہلے تو اردو فلمیں دیکھتے پھر جب کچھ بڑے ہوئے تو انگریزی فلموں کا شوق ہوا۔ ہماری کچھ انگریزی بولنے والے اینگلو انڈین گوانیز لڑکے اور لڑکیوں سے دوستی بھی ہوگئی اور ہم بھی منہ ٹیڑھا کر کے ان کی طرح انگریزی بولنے لگے۔ کامکس اور فکشن پڑھتے۔ انگریزی فلمیں دیکھتے اور اردو فلم دیکھنے والوں کو خود سے کمتر سمجھتے۔

بمبینو۔ لیرک۔ کیپیٹل۔ پیراڈائز۔ ریکس۔ ریو اور پیلس سینما اب ہماری نئی منزل تھے وہاں بہت سی فلمیں دیکھیں۔ پیلس سینما ایک معیاری درجہ کا سینما تھا۔ سین کونری کی فلم Dr.No پیلس میں لگی اس پر بہت رش تھا ٹکٹ ملنا محال تھا ایسے میں ایک اینگلو انڈین دوست نوبرٹ جسے ہم نوبی پکارتے کسی طرح تین ٹکٹ لے آیا اس کے ساتھ اس کی گرل فرینڈ بھی تھی اور ہم تینوں نے ڈاکٹر نو اکھٹی دیکھی جو آج بھی یاد ہے اور پھر فلم کے ایک سین میں جب ایجنٹ ڈبل او سیون جیمز بونڈ کا سگریٹ سلگا کر اپنا نام بتانا۔ بونڈ۔ جیمز بونڈ۔ ہمارے ذہنوں پر چھا گیا اور ہم بھی اس کی نقل کرنے لگے۔

صدر میں فلم دیکھنے کے بعد اکثر ہم cool Punch آئسکریم پارلر میں آئسکریم کھاتے۔ غالباً کول پنچ کراچی میں پہلا یورپین طرز کا آئسکریم پارلر تھا وہاں ایک مشین لگی تھی جس میں چند سکے ڈال کر اپنی پسند کے انگریزی گانے سنتے۔ فرینک سناترا۔ ایلوس پریسلے۔ کلف رچرڈ اور بوبی ڈارن کے گانوں پر قدم خود بخود تھرکنے لگتے۔ بول پوری طرح نہ بھی سمجھ میں آتے لیکن گانوں کی بیٹ اچھی لگتی۔ اس زمانے میں فلم کم کالمبر کی میوزک جس پر راک ہڈسن اور جینا لولو برجیڈا کا ٹوئسٹ ڈانس بہت مقبول ہوا۔ وہ دھن آج بھی کبھی سنتا ہوں تو ذہن بیتے دنوں میں کھو جاتا ہے۔

انہی دنوں ہم نے سگریٹ بھی شروع کر دی تھی۔ چسٹر فیلڈ یا تھری کاسلز سگریٹ کے کش لگاتے اور خود کو جیمز بانڈ سمجھتے۔ انگریزی بولتے۔ کریو کٹ بال، چست پھولدار شرٹ۔ اسکن ٹائٹ ٹیڈی پینٹ، پوائنٹڈ جوتے، گلے میں لاکٹ پہنے ہاتھ میں ہیرلڈ رابنس یا کسی اور مصنف کے ناول لیے ہم بھی اینگلوز کی صحبت میں خاصے گورے نما ہوگئے تھے۔ لیکن کوشش بھی کرتے کہ اس حلیے میں ابا یا کسی بزرگ کا سامنا نہ ہو جائے۔

ان دنوں سینما گھروں کا اپنا کلچر تھا۔ ٹکٹ کے لیے لائن لگتی زیادہ رش ہونے پر سینما کے ''دادا'' جو اکثر ہمارے مکرانی بھائی ہوتے ان کے ہاتھ میں ایک خردم یا کین ہوتی جس کے زور پر لائن لگوائی جاتی۔ بہت زیادہ رش ہوتا تو ٹکٹ بلیک میں بکتے۔ کبھی کبھی ہنگامہ بھی ہو جاتا اور سات گراری والا چاقو بھی نکل آتا۔ پہلا شو دیکھنے کا ایک الگ نشہ ہوتا اور فخریہ کہا جاتا میں نے پہلے شو میں فلم دیکھی ہے یا ایڈوانس بکنگ کرائی ہے۔

کبھی کراچی میں ڈرائیوان سینما بھی ہوا کرتا تھا۔ لوگ اپنے اہل خانہ کے ساتھ بلا خوف خطر آتے، اپنی کار ہی میں بیٹھے بیٹھے فلم دیکھتے، مائک کار میں ڈال لیتے تو ساؤنڈ بھی آجاتا۔ اگر دل چاہے تو کار کی سائڈ یا سامنے فولڈنگ چیر یا دری بچھا کر فلم انجوائے کرتے۔

کیسا امن و امان تھا اور تفریح کے کتنے مواقع تھے۔ اب تو یاد ہی نہیں کہ آخری بار کب کسی سینما میں کوئی فلم دیکھی تھی۔

اور پھر سینما کا زوال شروع ہوگیا۔ وی سی آر نے مزید تباہی پھیلائی۔ ہر گھر میں سینما آگیا اور۔ سینما ہال پہلے تو ویران ہوئے پھر مسمار کر دیے گئے اور ان کی جگہ شاپنگ پلازا بن گئے۔

لبرٹی، شالیمار اور ریکس بھی مسمار کر دیے گئے اور اب وہاں فلیٹ بن گئے ہیں۔ جب کبھی وہاں سے گزرتا ہوں تو بہت تکلیف ہوتی ہے۔ کیسی خوبصورت یادیں وابستہ ہیں ان سینماؤں سے۔

کچھ عرصہ پہلے ایک فون کے خریداری کے لیے جاوید جاگ بھائی کی دکان لیرک مارکیٹ جانا ہوا۔ اس بلڈنگ میں کبھی لیرک سینما ہوا کرتا تھا۔ گنز آف نیوارون اور ہیروز آف ٹیلیمارک یہیں دیکھی تھی۔ جاوید جاگ برابر میں مرحوم بمبینو سینما کی بلڈنگ میں لے گئے جہاں کبھی اس کے

سائن بورڈ پر نیون سائن کی ایک رقاصہ رقص کرتی دور سے دکھائی دیتی تھی۔ دل پر ایک دھچکا لگا اس کی حالت زار دیکھ کر۔ کبھی یہاں کلوپیٹرا اور فال آف رومن ایمپائر کا پریمیر ہوا تھا۔ صدر ایوب نے اسی تھیٹر میں یہ فلم دیکھی تھی اور اب وہاں بھی موبائل مارکیٹ ہے۔

سنیما مر گیا اور اپنے ساتھ ایک کلچر۔ بہت سی یادیں اور سستی تفریح بھی لے گیا۔ جب کسی معاشرے سے کھیل۔ تفریح۔ فنون لطیفہ اور کتاب اٹھ جائے تو پھر وہاں وحشت۔ عدم برداشت۔ چڑچڑاپن اور تنگ نظری کے سوا کچھ نہیں رہتا۔

شکوہ کریں تو کس سے ہم نے تو خود ہی اپنی روایات۔ ثقافت اور تہذیب کا قتل کیا ہے۔ بس دعا ہی کی جاسکتی ہے کہ ایک بار پھر سنیما اور دیگر ثقافتی مقامات بحال ہوں اور عام آدمی کو سستی تفریح میسر ہو۔

Prooven Jan کا ٹرانسفر کہیں اور ہو گیا اور جیک لینگلی نئے جی ایم ہو گئے۔ جیسا کہ اوپر بیان کر چکا ہوں جیک ایک انتہائی پروفیشنل لیکن اتنا ہی شفیق انسان تھا۔ میری اس سے اور اس کی بیگم کیتھی Cathy سے بہت دوستی تھی جب میری بیگم آتیں تو کیتھی ہمیں ضرور مدعو کرتی۔

ایک سال بعد جیک کی بھی ہیوسٹن آفس پوسٹنگ ہو گئی۔ جیک کے جانے پر مجھ سمیت سب ہی اداس تھے۔ اس جیسے مہربان اور شفیق لوگ کم ہی دیکھنے میں آئے۔

جیک کو ہیڈ آفس ہیوسٹن بلا لیا گیا اور ان کی جگہ ایک فلسطینی نژاد امریکن احمد الخطیب صاحب نے بحیثیت جنرل منیجر چارج لے لیا۔

احمد الخطیب نے پہلی ہی میٹنگ جس میں جیک بھی شامل تھا کہ اپنے ارادے ظاہر کر دیئے۔ جیک کے الوداعی خطاب کے بعد احمد نے سب سے کہا آج جو بھی مطالبات اور سہولتیں مانگنا ہوں جیک سے لے لو۔ کل سے جب میں چارج لے لوں تو کسی لون۔ ایکسٹرا سہولیات یا تعطیل کے لیے میرے پاس کوئی گنجائش نہیں ہوگی۔ سالانہ انکریمنٹ کم کر کے پانچ فیصد اور پرفارمنس بونس بھی زیرو کر دیا۔ میرے ذہن میں گھنٹی بجنا شروع ہو گئیں کہ میں ایک عرب کو بھگت چکا تھا۔

احمد الخطیب آئل انڈسٹری کا ایک معتبر نام تھا۔ کام کام اور صرف کام اس کا موٹو تھا۔ وہ چھٹیوں اور یہاں تک کے لنچ بریک کو بھی ویسٹ آف ٹائم کہتا۔ رات گئے تک اکیلا

پروفیسر منور مرزا

(1933ء - 7فروری 2000ء)

معلم، ادیب، شاعر اور ماہر اقبالیات۔ وہ مرزا ہاشم الدین کے ہاں بھیرہ ضلع سرگودھا میں پیدا ہوئے۔ گورنمنٹ ہائی اسکول سرگودھا سے میٹرک، زمیندار کالج گجرات سے ایف اے اور بی اے کے امتحانات پاس کیے۔ پنجاب یونیورسٹی سے ایم اے اردو، ایم اے عربی اور ایم اے فلسفہ کیا۔ ابتداء میں ریلوے میں کمرشل کلرک پھر محکمہ انہار میں غلہ دار کی حیثیت سے خدمات انجام دیں۔ اکتوبر 1953ء میں گورنمنٹ کالج فیصل آباد میں لیکچرار کے طور پر ان کی تعیناتی ہوئی۔ آٹھ برس گورنمنٹ کالج فیصل آباد اور بیس برس گورنمنٹ کالج لاہور میں تدریسی فرائض انجام دیئے۔ پنجاب یونیورسٹی شعبہ اقبالیات کا صدر رہنے کے بعد اقبال اکیڈمی لاہور کے ڈائریکٹر مقرر ہوئے۔ انجمن حمایت اسلام لاہور اور مجلس اقبال فیصل آباد و لاہور کے رکن رہے۔ علامہ اقبال پر سند کا درجہ رکھتے ہیں۔

مرسلہ: اظہر حسین زیدی۔ ملتان

منطقہ معتدلہ جنوبی

ساڑھے تئیس درجے جنوبی عرض بلد سے ساڑھے چھیاسٹھ درجے عرض بلد جنوبی یعنی خط جدی سے دائرہ قطب جنوبی کے درمیان واقع ہے۔ اس کو منطقہ معتدلہ جنوبی یا (SouthTemperate zone) کہتے ہیں۔ اس منطقہ میں سورج کی شعاعیں کبھی عموداً نہیں پڑتیں پھر بھی یہاں پر گرمیوں میں کافی گرمی پڑتی ہے اور سردیوں میں اچھی خاصی سردی ہوتی ہے مگر اس کے سالانہ درجہ حرارت کی اوسط منطقہ باردہ کی گرمی کے مقابلے میں بہت کم ہوتی ہے اور منطقہ باردہ کے مقابلے میں اس کی سردی بھی کم ہوتی ہے چونکہ یہ منطقہ حارہ جتنا گرم اور منطقہ باردہ جیسا سرد نہیں اس لیے اسے منطقہ معتدلہ کہتے ہیں۔

مرسلہ: رعنا تبسم۔ لاہور

آفس میں بیٹھا رہتا اور دوسری صبح سب سے پہلے آجاتا۔ اسی طرح فریش اور تروتازہ۔ نہ کبھی تھکاوٹ اس کے چہرے پر ظاہر ہوتی۔ وہ ایک Workaholic شخص تھا اور چاہتا تھا کہ دوسرے بھی اسی کی طرح ہو جائیں۔

احمد ذاتی زندگی میں ایک اچھا انسان تھا۔ بااخلاق اور ہر قسم کے تکبر سے دور۔ اسی طرح وہ صوم و صلاۃ... کا بھی پابند تھا۔ میری بہت عزت کرتا اور ہمیشہ شیخ انوار کہہ کر مخاطب کرتا۔ اس نے آفس کے ایک حصے کو نماز کے کمرے میں تبدیل کر دیا اور سارا مسلم اسٹاف اس کی امامت میں ظہر، عصر اور اکثر مغرب کی نماز باجماعت ادا کرتے۔

ہر عرب کی طرح احمد بھی عرب نسل پرستی کا مارا تھا۔ نمعلوم کہاں کہاں سے فلسطینی۔ اردنی۔ یمنی اور شامی لڑکوں کو لے آتا اور مجھ سے کہتا انہیں اپائنٹ کرلوں اور ٹریننگ بھی دوں۔ میں اکثر اپنے تحفظات کا اظہار بھی کرتا لیکن اس کی بات مان لیتا کیونکہ یہ سب جونیئر پوزیشن کے لیے ہوتے۔

ایک دن خطیب نے مجھے ایک انڈین جس کا نام یوسف تھا کی سی وی بھیجی کہ میں اس کا انٹرویو کرلوں۔ پوزیشن سینئر آفیسر کی تھی اور بہت اہمیت کی حامل تھی۔ میں نے اسے کال کر کے انٹرویو کے لیے بلایا۔ اس کی ڈگری اور سرٹیفکیٹس دیکھے۔ اس کا انٹرویو کیا تو مجھے اس کی باتیں مبہم اور اس کی انٹرمیڈیٹ سے ایم بی اے تک کی تعلیم میں بھی کوئی ربط نظر نہیں آیا اور میں نے اسے اس پوزیشن کے لیے ناموزوں قرار دیا اور اپنے فیصلے سے خطیب کو مطلع کر دیا۔

یہیں سے میرے اور خطیب کے درمیان ایک خلیج پیدا ہوئی۔ میرے اعتراضات کے باوجود ان کے اصرار پر میں نے یوسف کا اپوائنٹمنٹ کرلیا لیکن مجھے یقین تھا کہ یہ فراڈ ہے۔ جس کی وجوہات بھی میرے پاس تھیں۔ یوسف نے گریجویشن جھاڑ کنڈ بہار سے کی تھی اور ایم بی اے عثمانیہ یونیورسٹی حیدرآباد سے۔ ایک دن ہم انڈیا کی بات کر رہے تھے میں نے قصداً اس سے پوچھ لیا۔ ”یوسف حیدرآباد کیسا شہر ہے؟“ تو جواب دیا۔ سر میں تو حیدرآباد کبھی نہیں گیا۔ اب مجھے یقین ہوگیا کہ جب موصوف کبھی حیدرآباد گئے ہی نہیں تو عثمانیہ یونیورسٹی سے ایم بی اے کیونکر کرلیا؟ اس کے بعد کئی اور باتوں سے میرا شبہ یقین میں تبدیل ہوگیا چنانچہ میں نے ان کی گریجویشن کی ڈگری جھاڑ کھنڈ اور ایم بی اے کی ڈگری عثمانیہ یونیورسٹی تصدیق کے لیے بھجوادی۔ تقریباً دو ہفتے بعد دونوں یونیورسٹیوں سے جواب آگیا کہ ڈگریاں جعلی ہیں۔

یوسف کا ایک جرم یہ بھی نکلا کہ انہوں نے ڈگریاں بھارت کی منسٹری آف فارن افیئر سے جعلی طور پر تصدیق بھی کرائیں تھی جس کے بعد ہی سعودی کونصلیٹ نے ویزا جاری کیا تھا۔

میں نے سارے ثبوت خطیب کے سامنے رکھ دیے تو وہ طیش میں آگئے کہ تم نے میری اجازت کے بغیر ڈگریاں تصدیق کے لیے کیوں بھیجیں۔ میں نے نہایت تحمل کا مظاہرہ کیا اور جواب دیا۔ بحیثیت ایچ آر منیجر یہ میری ذمّہ داری اور حق ہے کہ کسی بھی شبہ کو دور کرنے کے لیے اسٹاف کی اسناد کی تصدیق کراؤں۔ الخطیب نے یوسف کو بلایا اور جب اس کے سامنے سارے شواہد رکھے تو وہ تھر تھر کانپنے لگا اور اپنی دو نمبری کا اقرار کرلیا۔ اب خطیب کے پاس دوسرا راستہ نہیں تھا، انہوں نے مجھ سے کہا کہ میں فوری طور پر یوسف کو نوکری سے برخواست کردوں۔ میں نے یوسف سے کہا کہ تم سعودی عرب اور بھارت دونوں کے مجرم ہو اور اگر میں اس کی رپورٹ کردوں تو فوراً جیل جاؤ گے لیکن میں ایسا نہیں کروں گا اور الخطیب سے کہا میں اسے معاف کرتا ہوں اور سفارش کرتا ہوں کہ اسے برخاست نہ کیا جائے۔ میں نہیں چاہتا کہ اس کے بچوں اور فیملی کو تکلیف پہنچے۔ اس کے بعد وہ حسب سابق کام کرتا رہا۔

الخطیب اور میرے درمیان اس واقعہ کے بعد مزید دوری پیدا ہوگئی۔ بات چیت بھی صرف کام ہی تک محدود ہوگئی حالانکہ میں نے یوسف کے خلاف کوئی کارروائی بھی نہیں کی اور معاف بھی کر دیا لیکن شاید خطیب نے اسے پرسنل لے لیا۔ بہرحال ہمارے درمیان کشیدگی بڑھتی گئی یہاں تک کہ میں نے اس کی امامت میں نماز پڑھنا بھی چھوڑ دی اور اکیلے نماز پڑھنے لگا۔ یہ صورتِ حال چھ ماہ سے زیادہ جاری رہی۔

ہماری کمپنی میں Oxley & Sarbines کے تحت کمپلائنس اور ایتھکس Compliance & Ethics کے وہی اصول لاگو تھے جو کسی بھی امریکی کمپنیوں اور اس کے عہدیداروں پر نافذ ہوتے ہیں۔ اس کی تعمیل اور رپورٹنگ کے لیے ٹول فری نمبر و فنتر اور رگ پر دیئے گئے تھے جس پر فون کر کے کوئی بھی کسی کی بھی شکایت کرسکتا تھا۔ اور اس کی باقاعدہ خفیہ انکوائری بھی ہوتی اور شکایت کرنے والے کا نام بھی ظاہر نہیں کیا جاتا تھا اور اگر الزام یا شکایت ثابت ہوجائے تو سخت کارروائی ہوتی اور نوکری سے

برخواست بھی کیا جاسکتا تھا۔

میں نے محسوس کیا کہ اب میرا الخطیب کے ساتھ مزید کام کرنا ممکن نہیں۔ ایک جمعہ جب آفس کی چھٹی تھی لیکن خطیب حسب معمول اپنے آفس میں ہی تھا میں خطیب کے آفس گیا۔ اس نے یا شیخ انوار فدل فدل کہہ کر میرا خیر مقدم کیا۔ تمام تر اختلاف کے باوجود اس کا رویّہ مجھ سے ہمیشہ اچھا ہی رہا اور وہ میری عزت بھی کرتا تھا۔ میں اس کے سامنے کرسی پر بیٹھ گیا، رسمی باتوں کے بعد میں نے کہا کہ میں آج بہت بڑا فیصلہ کر کے آیا ہوں۔ وہ ہمہ تن گوش تھا میں نے کہا اگر میں چاہوں تو آپ کے خلاف کمپلائنس سیل میں رپورٹ کر کے آپ کو مشکلات میں ڈال سکتا ہوں اور کمپلائنس کی خلاف ورزی پر آپ کی نوکری بھی ختم کرا سکتا ہوں لیکن میں ایسا نہیں کروں گا اور اب میں مزید آپ کے ساتھ کام نہیں کرسکتا۔ میں نے جیب سے استعفیٰ نکال کر ان کے سامنے رکھ دیا اور یہ بھی کہا کہ میں کئی ماہ سے آپ کے پیچھے نماز نہیں پڑھ رہا تھا جس کی وجہ یہ تھی کہ میرا دل آپ سے صاف نہیں تھا اور میں نماز اللہ کے لیے پڑھتا ہوں آپ کی خوشنودی کے لیے نہیں۔ آج جب میں نے آپ کو معاف کردیا ہے اور اپنا دل صاف کرلیا ہے تو اب میں آپ کی امامت میں نماز ادا کروں گا...... شاید ہی اس طرح کا استعفیٰ کبھی کسی نے دیا ہو۔ حقیقت تو یہ ہے کہ اس عمر میں جبکہ گھریلو مسائل اور ذمّہ داریاں بڑھ جاتی ہیں تو لوگ اپنی مدت ملازمت میں محض توسیع کے لیے اپنے ایمپلائر کے پاؤں پڑ جاتے ہیں، لیکن میں نے نتائج کی پرواہ کیے بغیر اتنا بڑا قدم اٹھایا اور شاندار اٹھائیس سالہ ملازمت سے استعفیٰ دے دیا۔ اس وقت میں چار ممالک کا ایچ آر ہیڈ تھا۔ میری خدمات اور کارکردگی کی میری مینجمنٹ معترف تھی اور میرا مستقبل روشن تھا لیکن مجھے اپنی عزت نفس زیادہ عزیز تھی۔

الخطیب کے لیے یہ خبر حیران کن تھی۔ وہ کھڑا ہو گیا اور کہا لیکن میں نہیں چاہتا کہ تم جاؤ۔ تو میں نے جواب دیا، کیا میں اس وقت کا انتظار کروں کہ تم مجھے بتاؤ کہ میں اب چلا جاؤں۔ اس نے مجھے منانے اور فیصلہ واپس لینے کی بہت کوشش کی لیکن میں اپنے فیصلے پر قائم رہا اور صرف اتنا کیا کہ فوری استعفیٰ کی بجائے دو ہفتوں کا وقت دے دیا تا کہ میرا کوئی ریپلیسمنٹ آجائے اور میں اسے ہینڈ اوور کرسکوں۔ کچھ دن بعد ایک امریکن ہیوسٹن آفس سے بھیجا گیا اور میں اسے چارج دے کر دس سال سعودی عرب میں گزار کر عزت

جھیل کیسے مرتی ہے

جھیلیں جانوروں کی طرح ہیں جو پیدا ہوتی ہیں پھلتی پھولتی ہیں اور پھر مرجاتی ہیں۔ کچھ جھیلیں تب مرجاتی ہیں جب ان کے پانی کا ماخذ ختم ہوجائے۔ جھیلیں ایک اور طرح سے بھی مرتی ہیں اس عمل کو Eutrophication کہتے ہیں جس میں جھیلوں میں مٹی یا پھر مردہ پودے اور جانور بھر جاتے ہیں۔ یہ چیزیں رفتہ رفتہ جھیل کی گہرائی کم کردیتی ہیں اور وہ ایک دلدل کی شکل اختیار کرلیتی ہیں اور پھر آخر کار مرجاتی ہیں۔

مرسلہ: راحت علی۔ کراچی

مدینے کے وہ مسلمان جنہوں نے ہجرت کے بعد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور مکہ سے آنے والے مسلمان مہاجرین کی مدد کی۔ انصار کہلائے۔ انصار و مہاجرین کا ذکر قرآن حکیم کی سورۃ الانفال اور سورۃ برأت میں آیا ہے اور لوگوں کو ان کے اتباع کی تلقین کی گئی ہے۔ مدنی زندگی میں اگرچہ مسلمانوں میں یہ دو گروہ تھے مگر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ابتدا ہی سے ان میں بھائی چارہ کرا دیا تھا۔ غزوۂ بدر سے پہلے جب حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے صحابہؓ کو مشورے کے لیے جمع کیا تو مہاجرین نے جاں نثارانہ تقریریں کیں۔ اس کے بعد حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے انصار کی طرف دیکھا کیوں کہ ان سے معاہدہ تھا کہ وہ صرف اس وقت تلوار اٹھائیں گے جب دشمن مدینے پر چڑھ آئیں گے۔ سعد بن عبادہ سردار خزرج نے کہا کہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم فرمائیں تو ہم سمندر میں کود پڑیں۔ حضرت مقدادؓ نے کہا کہ ہم حضرت موسیٰؑ کی قوم کی طرح یہ نہیں کہیں گے کہ آپ اور آپ کا خدا لڑیں، ہم یہاں بیٹھے ہیں۔ ہم تو آپ کے داہنے سے، بائیں سے، سامنے سے اور پیچھے سے لڑیں گے۔ اس پر حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے مسرت کا اظہار فرمایا۔

مرسلہ: فیض محمد۔ سکھر

سے گھر آ گیا۔ بیگم اور اہلِ خانہ کو جب بتایا کہ میں ملازمت چھوڑ کر آ گیا ہوں تو سب ہی حیران اور فکرمند ہوئے لیکن میں اندر سے مطمئن تھا اور مجھے کسی قسم کا افسوس بھی نہیں تھا اور یقین تھا کہ میرا اللہ میرے لیے بہتر کرے گا۔

اسی دوران مجھے دبئی سے ایک بڑے بزنس گروپ سے بہت اچھی ملازمت کی آفر آ گئی اور میں نے اسے جوائن بھی کر لیا لیکن میرا وہاں دل نہ لگا۔ ایک دفعہ کوئی آئل کمپنی میں کام کرلے تو کوئی اور ملازمت جچتی ہی نہیں حالانکہ میرا پیکج بہت اچھا تھا لیکن میں تین ماہ بعد ہی اس جاب کو بھی چھوڑ کر گھر آ گیا۔

ایک سال تک میں نے صرف آرام اور سیر و تفریح کی اور امریکا چلا گیا۔ پھر سوچا کہ کچھ کیا جائے۔ بڑے بیٹے نے مشورہ دیا کہ اپنی کمپنی شروع کی جائے لہٰذا امریکا میں ایک کمپنی Manpower Adisory Services کے نام سے شروع کی اور اسے نیویارک اسٹاک ایکسچینج میں رجسٹرڈ بھی کرالی۔ میں کمپنی کا CEO اور بیٹے کو ڈائرکٹر بنایا۔

دنیا کی بڑی آئل کمپنیز۔ ڈرلنگ کمپنیز اور اس سے متعلق افراد میں میری ریپوٹیشن بہت اچھی تھی جو خوب کام آئی۔ جب میں نے ان سے رابطہ کیا اور بتایا کہ میری کمپنی اسٹافنگ اور کریو پلیسمنٹ۔ سرٹیفکیشن اور اس سے متعلق سروسز مہیا کرے گی تو مجھے دھڑا دھڑ کانٹریکٹ ملنا شروع ہو گئے۔ چند ہی ماہ میں میرا کام خوب چل نکلا۔ گھر بیٹھے اپنے لیپ ٹاپ پر آئل کمپنیز سے رابطہ کرتا اور ان کو دنیا کے مختلف علاقوں میں ضرورت کے مطابق کریو اور اسٹاف کی پلیسمنٹ کر دیتا۔ میرے سابقہ ایچ آر کا تجربہ اور نیک نامی کی وجہ سے آئل کمپنیز مجھ سے رابطہ کرتیں اور میں ان کے لیے مطلوبہ شخص مختلف ممالک سے سلیکٹ کر کے بھیج دیتا جس کا مجھے بہترین معاوضہ ملتا جو ڈالرز میں ہوتا۔ میں سوچنے لگا کہ یہ کام میں نے پہلے کیوں نہیں کیا، تین سال میں نے خوب کام کیا اور بہت کمایا۔

اس دوران تینوں بیٹے تعلیم مکمل کر کے بہترین جاب پر لگ چکے تھے۔

اکثر میرے جاننے والے مجھ سے پوچھتے کہ تم تو خود کئی ممالک کے ایچ آر ہیڈ ہو اور دنیا بھر سے اپوائنٹمنٹ کرتے ہو لیکن اپنے کسی بیٹے کو اس لائن میں نہیں لائے، جبکہ آئل کمپنی کی جاب دنیا کی بہترین ملازمت مانی جاتی ہے۔ لوگ اس کے لیے ترستے ہیں۔ تو میرا جواب یہی ہوتا کہ میں چاہتا ہوں کہ میرے بچے خود کچھ بنیں اپنی قابلیت اور صلاحیتوں سے آگے جائیں انہیں میرے سہارے کی ضرورت نہ پڑے۔

اللہ نے میری لاج رکھ لی اور آج بچے جو بھی ہیں وہ صرف اپنی محنت اور صلاحیتوں کی بنا پر ہیں۔ انہیں کوئی نہیں کہہ سکتا کہ انہوں نے باپ کی سفارش اور اثر و رسوخ کی وجہ سے یہ مقام حاصل کیا۔ بیٹوں کو میں نے ان کی مرضی کے مطابق اپنا کیریئر منتخب کرنے کی آزادی دی۔ تینوں بیٹوں نے اپنے لیے الگ الگ فیلڈ منتخب کیں اور ماشاءاللہ کامیاب ہوئے۔

مقامِ شکر ہے کہ میں نے بطور ہیومن ریسورس ہیڈ اپنی ذمہ داریاں ایک عبادت کی طرح نبھائیں۔ ہمیشہ یہی کوشش رہی کہ کسی طرح دوسروں کے کام آ جاؤں۔ مجھے نہیں یاد ہے کہ میں نے ان اٹھائیس برسوں میں کسی کو نوکری سے برخواست کیا ہو جبکہ آئل کمپنی کا اصول ہی ''ہائر اینڈ فائر'' ہوتا ہے، لیکن میں نے کسی کے پیٹ پر کبھی لات نہیں ماری۔ اگر کبھی بات حد سے بڑھ جاتی تو اس ملازم کو بلا کر وارننگ دیتا یا کوئی اور چھوٹی موٹی سزا دے دیتا۔ اسے بتاتا بھی کہ تمہیں فائر کر دینا میرے لیے بہت آسان ہے لیکن میں ایسا نہیں کروں گا کیونکہ اس سے تمہارے بچے اور اہلِ خانہ متاثر ہوں گے اور میں ایسا نہیں کروں گا۔ میرے اس طرزِ عمل سے اکثر ملازمین خود کو بہتر کر لیتے اور دعائیں بھی دیتے اور یقیناً انہی کی دعاؤں کے سبب اللہ نے میرے بچوں کو اعلیٰ ترین منصب پر فائز کیا۔

سعودی عرب کے ویزے اور آئل کمپنی کی جاب میں بہت کشش ہے اور لوگ منہ مانگی رقم دے کر اسے حاصل کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ ایجنٹ بھی لائن سے ہاتھ باندھے کھڑے ہوتے ہیں۔ مجھے بھی بہت آفرز ملیں اور بڑی بڑی رقم پیش کی گئیں لیکن میں نے ٹھکرا دیں کہ میرے لیے میرا کام عبادت تھا۔ خاص طور سے کسی کے روزگار کا معاملہ میرے نزدیک ایک خاندان کے رزق سے مشروط تھا۔ میں خود کو اللہ اور بندے کے درمیان ایک واسطہ سمجھتا تھا۔

میری کمپنی MAS خوب چل نکلی اور میں گھر بیٹھے توقع سے زیادہ کما بھی رہا تھا جو ریٹائرمنٹ کے بعد ناممکن ہوتا ہے۔ مجھ پر تو ہمیشہ ہی سے میرے مالک نے کرم کیا اور

کبھی مایوس نہیں ہونے دیا۔ میں مطمئن تھا اس کام میں صرف ایک دشواری بھی کہ رات کو جاگنا پڑتا تھا اور آرام نہیں ملتا۔ جس کی وجہ پاکستان اور دوسرے ممالک میں ٹائم زون کا فرق تھا۔ بچوں نے فرمائش کی کہ بس اب آرام کریں آپ نے بہت کام کرلیا اور ہم سب کو اس قابل بنادیا اب ہم آپ کو مزید کچھ نہیں کرنے دیں گے...... میں مزید کچھ نہ کہہ سکا اور ان کا فیصلہ قبول کرلیا۔ مزید پیسے کما کر میں کرتا بھی کیا۔ اللہ نے تمام نعمتوں سے مجھے نوازا تھا۔ ساری ذمہ داریاں پوری کرچکا تھا۔ بیٹی اپنے گھر کی ہوچکی تھی۔ تینوں بیٹے بھی اچھی پوزیشن پر تھے اور سعادتمند بھی۔ میرے پاس تو شکر ادا کرنے کے لیے بھی الفاظ نہیں تھے کہ میں کس طرح اپنے مالک کی رحمتوں کے لیے شکریہ ادا کرسکوں۔ میرے ضمیر پر کوئی بوجھ نہیں مجھے خوشی ہے کہ میرے مالک نے مجھ سے کچھ بہتر کام لے لیے اور میں کسی حد تک خلق خدا کی خدمت کرسکا اور مجھے اس کا صلہ بھی خوب ملا۔

ملازمت اور اپنی کمپنی کے اختتام کے بعد میری کوئی مصروفیت نہ رہی ماسوائے کتابیں پڑھنے۔ سیر و تفریح یا پھر سوشل میڈیا پر ان دیکھے دوستوں سے بحث و مباحثہ کے۔ اس فورم پر مجھے متعدد نئے دوست ملے جو باعلم بھی تھے اور شائستہ بھی۔ ان کی ترغیب پر میں نے سیل فون پر اردو کی بورڈ لوڈ کیا اور انگریزی یا رومن میں اپنے تبصرے کرنے کے بجائے اردو لکھنے لگ گیا اور یہیں سے مجھے کالمز اور مضامین لکھنے کی تحریک بھی ملی۔ لکھنے لکھانے کا شوق مجھے پہلے بھی تھا لیکن میں انگریزی میں لکھا کرتا تھا جو کبھی کبھار چھپ بھی جایا کرتے تھے۔

جب سیل فون پر اردو لکھنے میں مہارت ہوگئی اور وقت کی بھی کمی نہ تھی تو میں نے مختلف موضوعات پر لکھنا شروع کردیا۔ میرے مضامین ملکی و غیر ملکی میگزین۔ اخبارات اور بلاگ میں چھپنے لگے جس سے مجھے بہت حوصلہ ملا اور پھر میں باقاعدہ لکھنے لگا اس طرح لگ بھگ دو سو مضامین ہو گئے تو دوستوں نے مشورہ دیا کہ اسے کتابی شکل دے دی جائے۔ اس طرح میری تحریریں اور مضامین محفوظ بھی ہوجائیں گی اور شاید اگلی نسل کو کچھ اپنی ثقافت اور روایات سے آگہی بھی ہوجائے۔

بات دل کو لگی اور کتاب چھاپنے کا ارادہ کیا۔ اس کٹھن کام میں محترم معراج جامی نے میری اعانت کی۔ کتاب کے نام کے لیے کئی لوگوں سے مشورے کیے کئی نام سامنے آئے لیکن دل کو نہیں لگے کہ اچانک ایک نام میرے ذہن میں آیا۔ ”کچھ خاکے کچھ باتیں“ اور یہی موضوع میرے مضامین اور تحریروں کے بھی تھے جن میں میرے عزیزوں اور دوستوں کے خاکے اور کچھ سماجی۔ معاشرتی۔ تاریخی اور سیاسی باتیں بغیر کسی تصنع اور بناوٹ کے سیدھی سادی زبان میں بیان کیے گئے تھے۔ معراج جامی صاحب کی شبانہ روز کوششوں سے کتاب شائع ہوگئی۔

اب سوال یہ تھا کہ اس کا اجرا کب کہاں اور کیسے ہو۔ ایک بار پھر میرے مخلص دوست سامنے آگئے۔ کراچی آرٹس کونسل کے روح رواں محترم احمد شاہ اور اقبال لطیف کے تعاون سے میری پہلی کتاب کا اجرا آرٹس کونسل کراچی میں اٹھائیس دسمبر 2022 کو حسینہ معین ہال میں ہوا۔ ان دنوں میرے بچے امریکا سے چھوٹے بیٹے کی شادی میں شرکت کے لیے آئے ہوئے تھے۔ شادی کی تقریبات کے بعد کتاب کے اجرا کی تقریب منعقد ہوئی جس میں ان کی بھی شرکت ہوگئی اور شہر کے معتزز اور صاحب علم شخصیات نے بھی اس تقریب میں شرکت کرکے رونق دوبالا کردی۔ میرے مضامین پر مقالے پڑھے جن میں ڈاکٹر فاطمہ حسن، نامور شاعرہ ریحانہ روحی، گل بانو، ادریس غازی، اقبال الرحمان، شکور پٹھان، ڈاکٹر شبنم امان اور اقبال لطیف شامل تھے۔

تقریب کی صدارت نامور محقق۔ علم و ادب کی معروف شخصیت اور متعدد کتابوں کے مصنف ڈاکٹر عقیل عباس جعفری (ستارۂ امتیاز) نے کی اور میرے مضامین کو سراہا۔ تقریب شاندار تھی جس کی مختلف ٹی وی چینلز نے کوریج بھی کی۔

کتاب چھپ گئی اس کا اجرا بھی ہوگیا اور علمی و ادبی حلقوں میں اس کی خوب پزیرائی ہوئی اور میں بھی قلم قبیلہ کا رکن بن گیا جس کا میں قطعی اہل نہ تھا۔ میں نے تو کبھی سوچا بھی نہ تھا کہ میں ایک کتاب کا مصنف بن جاؤں گا اور میری کتاب علمی حلقوں میں سراہی جائے گی۔ میں اس عزت افزائی کے لیے فرداً فرداً تمام احباب اور اہلِ قلم کا ممنون ہوں۔

”کچھ خاکے کچھ باتیں۔“ کی پزیرائی کے بعد مجھے حوصلہ ملا۔ دوسری کتاب ”مزید خاکے مزید باتیں“ لے آیا۔ ابھی اس کتاب کی پزیرائی کا خمار اترا نہیں تھا کہ ایک اور اہم کتاب لے آیا۔ اردو کے ایک بہت بڑے شاعر نازش پرتاب گڑھی کا انتخاب کلام ترتیب دے لیا۔ نازش پرتاب

گڑھی کا شمار صف اوّل کے شعرا میں ہوتا ہے لیکن پاکستان میں ان پر بہت کم لکھا گیا اس لیے متلاشیان ادب نے بہت سراہا تب میں نے ''ادھوری کہانیاں'' کے عنوان سے ایک اور کتاب پر کام شروع کر دیا جو بہت جلد آپ کے ہاتھوں میں ہوگی۔

میں سپاس گزار ہوں اپنے مالک حقیقی کا جس نے ریٹائرمنٹ کے بعد مجھے ایک نئی مصروفیت اور پہچان دی اور علمی و ادبی محفل میں میرا نام بھی لیا جانے لگا۔ متعدد اخبارات۔ میگزین اور لاگ پر میرے مضامین چھپتے رہتے ہیں اس کے علاوہ بہت سے چینلز کے ٹاک شوز اور ایف ایم ریڈیو پر مختلف موضوعات پر گفتگو کرنے کا موقع ملا جو میرے لیے باعث اعزاز ہے۔

معاشی تگ و دو ختم ہونے کے بعد میں پاکستان میں ایک اچھی زندگی گزار رہا تھا اور ہم میاں بیوی پاکستان ہی میں رہنا چاہتے تھے۔ بس ہر سال بچوں سے ملنے چند ماہ کے لیے امریکا بھی چلے جاتے لیکن بچوں کا اصرار تھا کہ ہم انہی کے پاس امریکا منتقل ہو جائیں۔ ان کے خدشات اور دلائل مضبوط تھے کہ جب سب بچے امریکا میں ہیں تو ہمارا پاکستان میں رہنے کا کیا جواز ہے۔ وہ ہماری صحت کے بارے میں بھی فکرمند رہتے اور وطن عزیز کے دگرگوں سیاسی و معاشرتی ابتری اور امن و امان کی بگڑتی صورت حال کے پیش نظر ان کی تشویش بجا تھی۔ اگر کبھی ہم ان کا فون نہ اٹھائیں یا دیر کردیں تو بچے پریشان ہو جاتے اور ہمیں جواب دینا مشکل ہو جاتا۔ بچوں کی ضد بڑھتی گئی بالآخر ہم نے ان کے سامنے ہتھیار ڈال دیئے اور اس شرط پر امریکا منتقل ہونے پر راضی ہوگئے کہ ہر سال کم از کم دو تین مہینے پاکستان میں ہی گزاریں گے۔ بچوں نے ہماری یہ شرط مان لی اور ''دوسری ہجرت'' پر تیار ہوگئے۔ اب ہم میاں بیوی سال کا بیشتر حصہ امریکا میں گزارتے ہیں۔

امریکا منتقل تو ہوگئے لیکن دل پاکستان ہی میں کہیں چھوڑ آئے کراچی کی وہ گلیاں اور دوست یاد آتے ہیں جہاں ایک عمر گزاری۔ بھلا ہو واٹس ایپ اور فیس بک کا کہ ان سے رابطہ رہتا ہے۔

امریکا میں بچے مختلف اسٹیٹس میں ہیں تینوں کا یہی اصرار ہوتا ہے کہ ہم زیادہ وقت ان کے پاس رہیں۔ اور ہم اپنی مرضی سے جب تک چاہتے ہیں کسی ایک کے پاس قیام کرتے ہیں جب چاہتے ہیں دوسرے کے پاس چلے جاتے ہیں ان کے بچوں سے کھیلتے ہیں۔ واک کرتے ہیں اور خوش رہتے ہیں۔ بیگم بچوں کے لیے مزے مزے کے کھانے بناتی ہیں، میں کتابیں پڑھتا ہوں۔ مضامین لکھتا ہوں اور اپنے رب کا شکر ادا کرتا ہوں۔ اولاد سعادت مند ہے جو ہمارا ہر طرح خیال رکھتی ہے اور ہمارے پاس علاوہ سجدہ شکر کے کچھ اور نہیں۔

میں تمام احباب کا تہ دل سے شکر گزار ہوں جنہوں نے زندگی کے ہر موڑ پر میری حوصلہ افزائی کی، اور میں ان سب کا بھی ممنون ہوں جن کی تلخ نوائیوں اور حوصلہ شکنی نے مجھے مزید ہمت دی، اور تمام ترنشتر زنی کے باوجود نہ تو کبھی میرے پاؤں میں کوئی لغزش آئی اور نہ ہی کبھی میں نے پیچھے مڑ کر دیکھا۔

میرے والدین کی دعائیں ہمیشہ میرے ساتھ رہیں جن کی بدولت میں ہر مشکل گھڑی سے سرخرو ہو کر نکلا۔

میں اپنی رفیقہ حیات کا بھی احسان مند ہوں کہ وہ ہر گھڑی میرے ساتھ رہیں اور میری غیر موجودگی میں بھی بچوں کی اچھی بہترین تربیت کی۔ مجھ سے کبھی کوئی شکوہ نہیں کیا اور میری والدہ مرحومہ کی بھی خوب خدمت کی اور ان کی دعائیں سمیٹیں۔ میں ہمیشہ سے انتہائی خرچیلا اور لاابالی طبیعت کا تھا لیکن بیگم کے سلیقے نے میرے گھر کو جنت بنا دیا اور مجھے وہ یکسوئی میسر آئی جس کے بغیر وہ سب کچھ حاصل کر لینا محال تھا جو مجھے نصیب ہوا۔

میں اپنے بچوں کا بھی ممنون ہوں جنہوں نے میرا سر فخر سے بلند کیا اور اپنی محنت سے خود اپنا مقام بنایا۔ ان کی سعادت مندی پر ان کے لیے دل کی گہرائیوں سے دعا نکلتی ہے کہ ان کی اولاد بھی ان کی ایسی ہی خدمت کرے جیسی وہ ہماری کرتے ہیں اور اس سے بہتر مقام دے جو وہ ہمیں دیتے ہیں۔

میرے پاس لفظ تو نہیں کہ میں کیسے اپنے رب کا شکر ادا کروں جس نے مجھے میری استطاعت اور قابلیت سے بڑھ کر عطا کیا۔ میں اس کرم کا حقدار تو ہرگز نہیں تھا لیکن وہ جب چاہے جسے چاہے نواز دے۔ اس کے خزانوں میں کوئی کمی نہیں اور دل کی گہرائیوں سے بس یہی صدا آتی ہے۔

جو طلب میں نے کیا مجھ کو عنایت سے دیا
تیرے قربان میرے ناز اٹھانے والے

انوار احمد

++

غیبی میزبان

حسن رزاقی

یہ واقعہ سوا سو سال پرانا ہے، حضرت صاحب کے مسودوں سے ملا ہے۔ تبرکاً شامل کررہا ہوں کہ بعض اسرار کی کوئی توجیہ نہیں ہوتی لیکن اسے جھٹلا بھی نہیں سکتے۔

ایمان کی تازگی کے لیے تحفۂ درویش

حضرت مولانا عبدالباری صاحب ہر سال اجمیر شریف کے عرس میں جایا کرتے تھے جب وہ عرس میں شرکت کے لیے نکلتے تو ان کے ساتھ ایک قافلہ سا ہوتا۔ دس پندرہ آدمیوں کو وہ اپنے خرچ سے لے جاتے تھے۔ میں بھی اکثر ان کے ساتھ ہوتا۔

1913ء یا 1914ء میں بعد عرس وہ احمد آباد حضرت میر عبدالصمد خدا نما کے مزار کی زیارت کے لیے گئے اس لیے واپسی میں تاخیر ہوئی۔ اجمیر سے گجرات اور پھر دہلی واپسی، سفر طویل ہونا ہی تھا۔ 16 رجب کو دہلی واپس پہنچے۔ حسب معمول نواب نصرالدین احمد خان عرف آغا جان کے یہاں قیام ہوا۔ دوسرے روز آس پاس کے اولیاء کے مزار پر حاضری دینی تھی مگر شہر میں کوئی بڑی تقریب تھی جس کی وجہ سے گھوڑا

گاڑیاں نہیں مل رہی تھیں۔ اس وقت دہلی میں یہی ایک سواری تھی جو تیز رفتار تھی۔ ایک آدھ گھوڑا گاڑی ملی بھی تو اس نے آنے جانے کے پانچ روپے مانگے جو بہت زیادہ تھے۔

عصر کی نماز کے بعد دعا مانگنے کی محفل منعقد ہوئی اور باری میاں جانے کے لیے تیار ہوگئے۔

''الطاف میاں نے پوچھا کیا قصہ ہے کیوں وہاں جانے پر مصر ہیں۔''

فرمایا۔ ''میں دہلی چاندنی چوک کی سیر کو نہیں آیا ہوں پیدل ہی جاؤں گا زیارت کرنا ضروری ہے۔'' یہ سن کر الطاف میاں نے بھی اپنا رومال ڈنڈا اٹھالیا، میں کہاں رہتا۔ میں بھی تیار ہوگیا۔ دولارے میاں، قاسم میاں، نور میاں، میر علی حسن جملہ آدمی چل کھڑے ہوئے۔ ہمایوں کے مقبرے میں مغرب کی نماز پڑھی گئی۔ اب اندھیرا ہوگیا تھا مگر تیز چلتے رہے۔ قطب صاحب سے آگے اولیاء مسجد ہے جو بہت بابرکت سمجھی جاتی ہے وہاں پہنچ کر عشاء کی نماز پڑھی گئی۔ واپس ہوتے ہوئے شمس تالاب کے قریب حضرت محدثین دہلی کے مقبرے میں مولانا کا ارادہ ہوا ہے کہ وہاں فاتحہ پڑھ لی جائے۔

مزارات بالکل ویران جگہ تھے اور اطراف میں جھاڑیاں بھی تھیں۔ دو ایک روز قبل بارش ہوچکی تھی اس لیے جا بہ جا کیچڑ پانی بھی تھا اس پر غضب کہ گھور اندھیرا۔

ان جھاڑیوں میں پورا چکر لگایا گیا لیکن راستہ نہ ملا۔ مولانا نے فرمایا کہ ''مجبوری ہے یہیں ایک طرف کھڑے ہوکر فاتحہ پڑھ لی جائے۔'' چلتے ہوئے مولانا نے بہ آواز بلند فرمایا۔ ''ہم تو حاضر ہونا چاہتے تھے مگر اجازت ہی نہ دی گئی۔ فرنگی محل سے اگر رقابت تھی تو بڑوں کے ساتھ ہم کیوں محروم کیے گئے۔''

یہ انداز خلاف توقع تھا۔ ہر کوئی حیران کہ اتنی سخت بات کیوں کہی گئی۔ آگے چل کر قطب صاحب کے مزار کے پاس جو طویل بازار ہے ایک گلی سے ہوکر اس کے پاس پہنچے۔ بازار میں بڑی روشنی تھی ہجوم و شور و غل تھا۔ ابھی گلی میں ہی تھے کہ ایک درخت کے پاس ایک صاحب کھڑے تھے۔ اس وقت کے دلی کے شرفا کے لباس میں ملبوس۔ انہوں نے بڑھ کر مولانا سے صاحب سلامت و مصافحہ کیا۔

مولانا نے ان سے فرمایا کہ ''میں حاضر ہونا چاہتا تھا لیکن راستہ ہی نہیں ملا۔''

انہوں نے ہاتھ بڑھا کر کہا کہ ''تشریف لے چلیے۔'' حاجی مخدوم ملازم بھی ساتھ تھے۔ ایک ''لوٹ کی لالٹین'' جس میں موم بتی جلائی جاتی تھی وہ لیے ہوئے تھے۔ وہ اتنی دیر ٹھہرے کہ انہوں نے اسے جوڑ کر جلالیا اور چل پڑے۔ جہاں وہ لے جانا چاہتے تھے وہ مقام قریب ہی تھا سب آسانی سے پہنچ گئے۔

مقبرے بالکل سنسان تھے۔ اب معلوم ہوا کہ یہاں کوئی آتا ہی نہیں۔ جلدی جلدی فاتحہ پڑھی۔ تبھی ان رہبر صاحب نے ایک شکستہ خانقاہ کی جانب اشارہ کیا۔ یہ ایک دالان در دالان کی بوسیدہ عمارت تھی جس کی ایک سمت کی چھت بھی گر گئی تھی۔ سالم حصے میں ایک کھلا ہوا زینہ تھا جس پر دائیں بائیں گر جانے کا خطرہ تھا۔ آگے آگے وہ بزرگ اور انہی کے سہارے ہم سب چھت پر پہنچے۔ وہاں کیا دیکھتے ہیں کہ فرش پر وسیع دسترخوان بچھا ہوا ہے۔ بڑے بڑے کاسوں میں مرغ کا گرم سالن اور طباقوں میں تر بہ تر پراٹھے۔ مٹی کے پیالوں میں چاندی کے ورق لگی کھیر رکھی ہے۔ جن کا شمار بالکل حاضرین کے مطابق ہے۔ ہاتھ دھونے کے لیے پانی، پینے کے لیے صراحیاں آبخورے رکھے ہیں اور دو مقدس صورت دہلی کے شرفا کے مروجہ لباس میں ہم لوگوں کی پذیرائی کے لیے دسترخوان کے کنارے بیٹھے ہیں۔ ان کے علاوہ نہ کوئی آدم نہ آدم زاد۔

ہاتھ دھوکر دسترخوان پر پہنچے۔ دونوں حضرات نے مولانا سے مصافحہ کیا اور چند رسمی مزاج پرسی ایسی باتیں کیں اور کھانے میں مشغول ہوگئے۔ ہم سب تھکے ہوئے بھوکے تھے، حیرت تو تھی کہ اس ویرانے میں ایسا بروقت انتظام کس کی جانب سے؟ یہ کون ہیں؟ لیکن یہ امور کھانے میں حارج نہیں ہوئے۔ خوب سیر ہوکر کھایا ہاتھ دھویا رخصتی سلام و مصافحے ہوئے۔ اللہ اللہ خیر صلا۔

احاطہ سے باہر نکل کر دولارے میاں نے حضرت سے پوچھا کہ ''یہ کون حضرات تھے اور اس ویرانے میں اتنا لذیذ کھانا کیسے آیا۔''

حضرت نے فرمایا۔ ''مل گیا کھالیا اس سے زیادہ تفصیل میں جانے کی کیا ضرورت۔'' مگر وہ تعجب آج تک ہے کہ وہ لوگ کون تھے؟ کئی برسوں بعد ایک مرتبہ پھر گئے تھے ہر طرف ہو کا عالم اور مرغی کا پر بھی نہ تھا۔

حضرت قطب صاحب کے مزار پر حاضر ہوئے وہاں بے حد ہجوم، قوالی ہو رہی تھی۔ خدام اس طرح پیچھے پڑ گئے کہ فاتحہ پڑھنا دشوار ہوگیا۔

واپسی کے لیے نکلے تو اندھیرا حائل تھا۔ حاجی مخدوم

نے اپنی دھندلی لالٹین جلائی اس پر بھی راستہ دکھائی نہ دیتا تھا۔ کچھ دور چلنے کے بعد ایک شخص ملا ان سے راستہ پوچھا۔ انہوں نے کہا کہ یہ راستہ چراغ دہلی کو جاتا ہے۔

مولانا نے کہا۔ "ہاں ٹھیک ہے اسی پر چلے چلو۔"

نہ جانے کتنی ٹھوکریں کھاتے رات کو ایک بجے چراغ دہلی کے مزار پر پہنچے۔ پھاٹک بند تھا شور وغل کر کے کھلوایا۔ حضرت پیر نصیر الدین کے مزار پر حاضری دی مسقیفہ مسجد میں کچھ دم لیا۔ دو بج گئے ہوں گے۔ مولانا نے نماز تہجد پڑھی۔ ہم لوگ بجری کے فرش پر اتنی دیر چت پڑے رہے۔

اس کے بعد پھر وہی سفر۔ بھولتے بھٹکتے صبح سے پہلے مزار محبوب الٰہی میں پہنچے۔ وہاں آخر شب میں بھی زوروں کی قوالی ہو رہی تھی۔ ایک ازدحام تھا۔ ان میں سے کچھ لوگوں نے حضرت کو پہچانا اور سجادہ نشین کو اطلاع دینے گئے لیکن ہم فاتحہ ختم کرتے ہی گویا بھاگے، اس لیے کہ ہم فاتحہ کی نیت سے آئے تھے۔ خوامخواہ کی مہمانداری میں وقت برباد ہوتا۔ گرتے پڑتے پہاڑ گنج پہنچے۔ وہاں قریب آبادی سے باہر ایک شکستہ عیدگاہ میں فجر کی نماز پڑھی۔ میر صاحب نے رکوع کیا تو ٹخنوں سے ہاتھ پھسل کر منہ کے بل سجدے میں گر پڑے۔ پہلی رکعت کے بعد پھر کھڑے ہونا دشوار ہوگیا۔ بہر حال سورج نکلنے کے بعد فراش زندہ پہنچے۔ یہاں سب رات بھر پریشان رہے کہ کہاں چلے گئے۔ جب اپنا سفرنامہ بیان کیا تو میزبان حضرات کو یقین نہیں آرہا تھا کہ راتوں رات اتنے مزارات ہو آئے، جب تک کہ مولانا نے خود تصدیق نہ فرمادی۔

ناشتے کا انتظام ہونے لگا، تب تک مولانا کے فرمانے پر آرام کے لیے لیٹ گئے۔ کچھ خبر نہ رہی، لوٹا گرنے کی آواز پر ہوش میں آیا تو دیکھا کہ دوپہر ہے اور مولانا الطاف الرحمٰن جمعہ کے لیے وضو کر رہے ہیں۔ بقیہ رات کے مجاہد فرش پر بے جان الٹے سیدھے پڑے ہیں، گویا میدان قتال ہے۔ اٹھنے کی کوشش کی تو بند بند جکڑا ہوا۔ زور لگا کر اٹھ کھڑا ہوا اور جلدی جلدی وضو کر کے ساتھ ہولیا۔ فتح پوری میں نماز مل گئی۔ واپس آئے تو بقیہ سب بھی اٹھ گئے تھے۔ کھانا کھایا گیا۔ شام کو مرحوم باقر علی شاہ کے مشورے پر حمام گیا۔ زبردست ملائی بالائی سے طبیعت چاق ہوگئی۔ نور جی میاں اور قاسم میاں سے کچھ دیر زور آزمائی کی تو اور بھی بحال ہوگئے اور لکھنو روانہ ہوئے۔ تمام راستے میں پُراسرار میزبانوں کے بارے میں سوچتا آیا۔ یہ راز نہ کھلا کہ وہ حضرات کون تھے انسان، اجنہ یا روحیں؟

++

ٹوکیلاؤ

یہ جنوبی بحرالکاہل میں واقع ہے۔ اس کے مشرق میں شمالی کک آئی لینڈ اور جنوب میں مغربی سموا اور مغرب میں ٹوالو ہے۔ رقبہ 4 مربع میل یا 10 مربع کلومیٹر، ساحل 62 میل لمبا ہے۔ یہ مونگے کے تین جزیروں اٹافو، نوکونونو اور فکاؤفا پر مشتمل ہے۔ ہر ایک کا اپنا اپنا انتظامی مرکز ہے۔ تمام تر تعداد پولینیشیائی باشندوں کی ہے۔ ٹوکیلاؤن، انگریزی بولی، سمجھی جاتی ہے جبکہ مذہب، عیسائیت ہے۔ یہ نیوزی لینڈ کا علاقہ ہے۔ سکہ، نیوزی لینڈ ڈالر۔ ناریل، کھوپرا، کیلا، ریاپا نقد آور فصلیں ہیں۔ کشتیں، سکے اور لکڑی پر کندہ کاری اہم صنعتیں ہیں۔

مرسلہ: ناصر خان، پشاور

میجر آفتاب حسن

(1909ء۔1993ء)

سائنسی کتب کے مصنف اور ماہر تعلیم۔ وہ بازید پور (صوبہ بہار) میں پیدا ہوئے، ابتدائی تعلیم وہیں مکمل کی۔ 1921ء سے 1923ء تک علی گڑھ یونیورسٹی میں زیر تعلیم رہے۔ فطری میلان سائنس کی طرف تھا چنانچہ علی گڑھ یونیورسٹی سے ہی علم کیمیا میں ایم ایس سی کیا۔ تکمیل کے بعد حیدرآباد دکن میں ملازمت اختیار کرلی۔ ابتداء میں اورنگ آباد میں انسپکٹر تعلیم سائنس اور بعدازاں مددگار ناظم تعلیمات رہے۔ 1948ء میں جب بھارت نے حیدرآباد دکن پر غاصبانہ قبضہ کرلیا تو 12 ستمبر 1948ء کو سنڈنی کاشن جہاز پر سوار ہو کر پاکستان چلے آئے۔ 1949ء میں پاکستان ملٹری اکیڈمی کاکول میں اور پھر 1953ء میں اردو کالج کراچی میں پرنسپل کی حیثیت سے تقرر ہوا۔ چھ سات سال تک اردو کالج میں تدریسی خدمات انجام دینے کے بعد جامعہ کراچی میں دارالترجمہ وتالیف کے شعبے کے ناظم مقرر ہوئے۔ معلومات سائنس، سائنس کی باتیں، سائنس سب کے لیے، سائنس ہمارے لیے، آئن اسٹائن اور کائنات، سائنس کی پہلی تا چوتھی کتاب، طریقہ تعلیم سائنس اہم تصانیف ہیں۔ مقتدرہ قومی زبان میں سیکریٹری اور قائم مقام چیئرمین کی حیثیت سے بھی خدمات انجام دیں۔

جان بچا

زین مہدی

حادثات کی روداد ایک اچھی کہانی کو جنم دیتے ہیں۔ اس کی زندگی تو حادثات و واقعات کا مجموعہ بن گئی تھی کہ جہاں بھی جاتا حادثات تعاقب میں رہتے۔ وہ ان پہ در پہ رونما واقعات کے گرداب سے نکلنا چاہتا تھا۔ لوٹ کر وطن آنا چاہتا تھا لیکن راہ نہیں مل رہی تھی۔

لمحہ بہ لمحہ رنگ بدلتی لہو رنگ روداد کا سولہواں حصہ

نئے پڑھنے والے یہاں سے شروع کریں

نذر محمد سومرو سندھ کے تپتے ریگستان کا باسی تھا مگر اسے ہریالی پسند تھی۔ وہ سرسبز علاقوں کو دیکھنے مشرقی پاکستان پہنچا تھا کہ سقوط ڈھاکا کا المیہ رونما ہوگیا۔ انڈین فوج اور مکتی باہنی پاکستان کی حمایت کرنے والوں کا قتل عام کرنے لگی۔ وہ جان بچانے کے لیے دریا کنارے بنے ایک گھر میں پناہ لیے ہوئے تھا کہ اس گھر کو مکتی باہنی نے گھیر لیا۔ فائرنگ شروع ہوئی تو گھر والوں نے دریا میں چھلانگ لگا کر فرار کی راہ منتخب کی۔ وہ بھی دریا میں کود گیا۔ دریا میں گرنے سے وہ بے ہوش ہوگیا تھا۔ اسے ہوش آیا تو وہ انڈیا کے سرحدی قصبہ بن گاؤں کے ایک گھر میں بستر پر لیٹا تھا۔ ریکھا نامی لڑکی نے بتایا کہ وہ اس کا جیجا (بہنوئی) آنند ہے جسے ملاحوں نے دریا میں بہتے ہوئے پایا ہے۔ وہ برابر سسرال آتا جاتا تھا اس لیے انہوں نے اسے پہچان لیا تھا اور گھر لے آئے تھے۔ وہیں رہتے ہوئے چائے کے ایک تاجر سے نذر محمد کی ملاقات ہوئی جس نے کہا کہ وہ اس کا دوست ہے۔ وہ دوست ہوٹل میں ٹھہرا ہوا تھا۔ نذر محمد اس دوست کے کمرے میں بیٹھا اسے کرید رہا تھا کہ وہ اسے اپنا دوست کیوں کہہ رہا ہے۔ اسی وقت مقامی غنڈے اس دوست سے بھتا مانگنے آگئے۔ غنڈوں نے اس شخص پر ہاتھ اٹھایا تو نذر محمد کو غصہ آگیا۔ انہی غنڈوں کے چاقو سے اس نے ایک غنڈے کو قتل کردیا۔ چائے کے تاجر نے کہا کہ یہ بہت برا ہوا ہے۔ غنڈوں کی تنظیم اسے چھوڑے گی نہیں۔ وہ تاجر کے ساتھ کلکتہ آگیا۔ وہیں اس کی ملاقات شیر علی نامی کشمیری نوجوان سے ہوئی۔ وہ اسے اپنے گھر لے گیا۔ وہاں برابر والے گھر میں ایک خوانچہ فروش کی بیوی کو مقامی غنڈے کالومیاں نے اغوا کرلیا۔ نذر محمد سومرو نے غنڈے کے اڈے پر جا کر ان کی پٹائی کی اور عدیل کی بیوی کو چھڑا لایا۔ یہ خبر غنڈوں کے سردار گلفام کو ملی تو اس نے کالومیاں کو علاقہ بدر کرکے ایک دوسرے شخص کو وہاں کی سرداری دے دی۔ گلفام نذر محمد کی بہادری کا معتقد ہوگیا تھا۔ اس نے اسے رہنے کے لیے ایک بنگلا دے دیا تھا۔ بن گاؤں کے جس گھر میں وہ آنند بن کر رہ رہا تھا اس گھر کی لڑکی ریکھا جو اسے اپنا بہنوئی کہتی تھی وہ آگئی۔ اس نے بتایا کہ تم نے غنڈوں کی تنظیم کے بندے کو قتل کیا اس کا بدلہ لینے کے لیے غنڈوں نے اس کے پورے گھر کو قتل کردیا۔ وہ اکیلی زندہ بچی ہے۔ اسے معلوم تھا کہ نذر محمد عرف آنند اپنے دوست چائے کے تاجر کے گھر میں ہوگا اسی لیے وہ کلکتہ آگئی۔ اس دوست نے اسے گھر میں گھسنے بھی نہیں دیا۔ مقامی غنڈوں نے ریکھا کو آنند (نذر محمد) کے پاس پہنچا دیا۔ مخالف گروہ کے غنڈے اس کی جان کے درپے تھے۔ گلفام نے خبر دی کہ عدیل کے پورے گھرانے کو مخالفین نے قتل کردیا ہے صرف عدیل کی سالی زندہ ہے۔ رشیدہ کو بھی نذر محمد کے پاس پہنچا دیا گیا۔ اسی دوران گلفام کو خبر ملی کہ کلکتہ کی سی آئی ڈی نذر محمد کو گھیر رہی ہے۔ اس نے مشورہ دیا کہ وہ شہر کی حدود سے نکل جائے۔ وہ ریکھا، رشیدہ اور احسن اقبال کے ساتھ ایک دوسرے شہر آگیا مگر وہاں بھی اسے خطرہ محسوس ہوا تو وہ اقبال کے مشورے پر ایک دوسرے شہر بہرام پور آگیا۔ وہاں سے وہ سب لکھنو پہنچے تو رشیدہ جو ریکھا اور اقبال کے ساتھ سینما میں فلم دیکھنے گئی تھی پُراسرار انداز میں غائب ہوگئی۔ ریکھا سے یہ خبر سنتے ہی نذر محمد سومرو سینما ہال پہنچا جہاں اقبال رشیدہ کو تلاش کررہا تھا۔ اقبال کو ساتھ لے کر واپس ہوٹل آیا پھر اگلے روز کیسینو پہنچ گیا۔ نذر محمد کو شک تھا کہ رشیدہ کے اغوا میں کیسینو والوں کا ہاتھ ہے۔ وہاں اسے وہی لڑکا نظر آگیا جو ٹرین میں نظر آیا تھا۔ باہر آکر نذر محمد اور اقبال کھڑے ہوگئے جیسے ہی لڑکا باہر آیا اسے بے ہوش کرکے نذر محمد اور اقبال لے جارہے تھے کہ پولیس نے گھیر لیا۔ ان سے جان بچا کر نذر محمد بھاگ رہا تھا کہ ایک کار والے نے اسے اپنی کار میں بٹھالیا۔ بعد میں کار والے نے بتایا کہ وہ شہر کا مشہور غنڈا ہے۔ وہ ایک دوسرے غنڈے رستوگی کا مدمقابل ہے۔ وہ رشیدہ کو رستوگی کے چنگل سے چھڑا سکتا ہے اس کے لیے نذر محمد کو اس کی مدد کرنی ہوگی۔ رستوگی کا مال ریل گاڑی سے بمبئی جارہا ہے اسے

حاصل کرنا ہوگا۔ لیکن یہ مہم ناکام ہوگئی۔ تب دوبے نے کہا کہ ایک اور کام کردو۔ رستوگی کی جس عمارت میں تجوری ہے۔ وہاں ڈاکا مارنا ہے۔ کل وہاں بیس لاکھ روپے آئے ہیں اگر لوٹ لیے تو میں تمہاری مدد بھرپور انداز میں کروں گا۔ ان روپوں میں تمہارا بھی حصہ ہوگا۔ رشیدہ کو بھی رستوگی کی قید سے چھڑالوں گا۔ نذر محمد نے اس کے کہنے پر مزید دو آدمیوں کو ساتھ ملایا اور اس عمارت میں پہنچ گیا۔ عمارت کے کیئر ٹیکر نے اسے رستوگی کا آدمی سمجھا کیونکہ رستوگی نے فون پر کہا تھا کہ اس کا بندہ آرہا ہے اسے رقم دے دینا۔ یہ لوگ وہاں ڈاکا ڈالنے پہنچے تو اس نے بغیر کچھ پوچھے اسے رقم دے دی۔ وہ رقم لے کر..... دور پہنچے تو وہاں ایک ایمبولینس کھڑی تھی۔ وہ سب اس پر سوار ہو کر ایک حویلی میں پہنچے۔ بکس اتارے گئے۔ ابھی وہ آرام کررہے تھے کہ تر پاٹھی آگیا۔ اس نے بتایا کہ رستوگی نے انسپکٹر رتن لال کے قتل کا حکم دیا ہے۔ ساتھ ہی ساتھ دوبے کو ڈھونڈنے کے لیے اسے کہا ہے۔ اگلے دن دوبے رشیدہ کو رستوگی کے قید سے چھڑالایا۔ وہ سب باتیں کررہے تھے کہ روشن لال پڑھا لکھا ہے پھر غنڈہ گردی میں کیسے آگیا تو روشن نے بتانا شروع کیا کہ وہ پولیس میں انسپکٹر تھا۔ اس کے افسر نے اسے ڈیوٹی سونپی کہ وہ شہر کے ایک بہت بڑے منشیات کے اسمگلر کالیا کو پکڑنے کے لیے اس کے گینگ میں شامل ہوجائے۔ وہ شامل ہوگیا۔ کالیا نے اسے ایک بیگ پہنچانے کی ذمے داری سونپی۔ وہ بیگ لے کر آرہا تھا کہ ایک گاڑی تعاقب میں لگ گئی۔

(اب آگے پڑھیں)

اس نے مجھے ایک بیگ دیا اور کہا۔ "اسے سیٹھ تک پہنچادے اور ہاں کوئی گڑبڑ نہیں۔"

میں نے بیگ لیا اور اسے اپنی گاڑی میں رکھا لیکن جیسے ہی میں وہاں سے نکلنے والا تھا مجھے کچھ دور پر ایک گاڑی کی ہیڈ لائٹس دکھی۔ میرے دل کی دھڑکن تیز ہوگئی "پولیس" میرے ذہن میں گونج پیدا ہوئی "یہ بہت غلط ہوا۔" میں نے جلدی سے اپنی گاڑی اسٹارٹ کی اور وہاں سے نہایت تیز رفتاری سے نکل گیا۔ بیک ویو مرر میں دیکھا تو میرے پیچھے وہ گاڑی بھی چلی آرہی تھی۔ میں جانتا تھا کہ اگر وہ مجھے پکڑ لیتے تو میرا مشن ختم تھا۔ مجھے یقین تھا کہ کالیا کے لوگ جو مجھ پر نظریں رکھے ہوئے تھے میں ان کی نظروں میں مشکوک ہو جاتا کیونکہ پولیس والے مجھے سیلوٹ دیتے اور وہ لوگ ہوشیار ہو جاتے کہ میں ان کے درمیان کالی بھیڑ ہوں۔ پولیس سے بچنے کے لیے میں نے اپنی گاڑی کو شہر کی تنگ گلیوں میں گھمایا ہر موڑ پر اپنی رفتار بڑھائی مگر میرے پیچھے کی گاڑی بھی پیچھا کرتی آرہی تھی تنگ آکر میں نے ایک پرانی گلی میں گاڑی موڑ دی جہاں میں نے اپنے بچپن کا حصہ گزارا تھا۔ وہ گلیوں کا ایک جال تھا۔ جلدی میں نے پولیس

موبائل کو گلیوں میں الجھا کر فرار ہونے میں کامیاب ہو گیا اور سیدھا اپنی اسی کھولی میں پہنچا جہاں زندگی کے بہت سے ابواب مکمل ہوئے تھے جو اب عرصہ سے بند پڑی تھی لیکن اب وہی کھولی دوبارہ سے میری رہائش گاہ بن چکی تھی۔

دروازہ کھول کر اندر آیا اور بیگ کو ایک کونے میں رکھ دیا۔ پھر اکلوتی چوکی پر بچھے بستر کی چادر بدلی اور لیٹ گیا۔ فوراً ہی ذہن میں ایک خیال آیا اور میں بستر پر اٹھ کر بیٹھ گیا پھر چوکی کے نچلے حصے میں بنے ایک خانے سے ٹیلی فون سیٹ نکالا اور دیوار پر جھولتے تار سے اٹیچ کر دیا پھر زاٹھور سر کا نمبر ملایا اور کہا۔ ”سر میں روشن بول رہا ہوں، موبائل جیپ میری کھولی کے آس پاس کہیں ہے انہیں واپس بلالیں ورنہ سارا کام بگڑ جائے گا۔“ پھر سرہانے کے تکیہ کے نیچے سے ڈائری نکالی اور لکھا۔ ”آج میں نے ایک اور جنگ جیت لی......لیکن ہر جنگ کے ساتھ میں اپنے آپ سے اور دور ہوتا جا رہا ہوں۔ میں دشنو ہوں یا روشن لال یہ سوال مجھے ہر پل ستاتا ہے۔“

اگلی صبح بھینسا میری کھولی پر آدھمکا۔ ”کالیا تجھ سے ملنا چاہتا ہے۔“ اس نے کہا۔ ”لیکن اس بار تجھے اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر بات کرنی ہوگی۔ وہ تجھے پرکھے گا دشنو، اگر تو نے ایک بھی غلطی کی تو تیرا کھیل ختم۔“

میں نے سر ہلایا لیکن میرے اندر ایک ڈر تھا۔ کالی چرن عرف کالیا سے ملنا میرے مشن کا سب سے بڑا قدم تھا لیکن یہ میری زندگی کا سب سے خطرناک پل بھی ہو سکتا تھا۔ میں نے اپنی وردی کو ایک بار خیالوں میں دیکھا، اسے سیلوٹ کیا جو اب میری الماری میں دھول کھا رہی تھی۔ میں نے اپنے آپ سے وعدہ کیا کہ میں اس مشن کو پورا کروں گا چاہے اس کے لیے مجھے کتنا بھی نیچے کیوں نہ گرنا پڑے۔

بھینسا بولا۔ ”رات میں تیار رہنا میں تجھے لینے آجاؤں گا۔“

☆☆☆

رات کا اندھیرا میرے چاروں طرف پھیلا تھا جیسے وہ مجھے نگل لینا چاہتا ہو۔ میں اس پرانے ہوٹل کے تہ خانے کی جانب بڑھ رہا تھا جہاں کالیا میرا انتظار کر رہا تھا۔ میرے قدم بھاری تھے لیکن میرا ارادہ پکا تھا۔ بھینسا میرے ساتھ تھا اس کی آنکھوں میں ایک عجیب سی چمک تھی جیسے وہ میرے ہر قدم کو پرکھ رہا ہو۔

”دشنو“ اس نے دھیمی آواز میں کہا۔ ”کالیا کی نظریں باز کی طرح ہیں۔ وہ تیرا ایک لفظ تیرا ایک اشارہ سب کچھ دیکھے گا، ہوشیار رہنا۔“

میں نے سر ہلایا لیکن میرے دماغ میں ایک طوفان چل رہا تھا۔ میں ایک پولیس والا تھا جس نے حفاظت قانون کی قسم کھائی تھی حلف اٹھایا تھا۔ لیکن آج میں اس شخص کے سامنے کھڑا ہونے جا رہا تھا جو قانون کو اپنے جوتے کی نوک پر رکھتا تھا۔ کالیا کوئی معمولی جرائم پیشہ نہیں تھا وہ ایک ایسا شخص تھا جس کے پاس نہ صرف طاقت تھی بلکہ دماغ بھی تھا۔ اس کی ایک غلطی مجھے اپنی زندگی سے ہاتھ دھونے پر مجبور کر سکتی تھی۔

تہ خانے کا دروازہ کھلا اور میں نے کالیا کو دیکھ لیا۔ اس بار وہ میز کے پیچھے نہیں بلکہ ایک پرانی کرسی پر بیٹھا تھا۔ اس کے اس پاس کچھ لوگ کھڑے تھے لیکن اس کی موجودگی اتنی بھاری تھی کہ باقی سب ٹھگنے لگ رہے تھے۔ اس نے مجھے دیکھا۔ اس کی آنکھوں میں ایک ٹھنڈی چمک تھی۔ ”آجا دشنو“ اس نے کہا۔ اس کی آواز میں ایک عجیب سا بھاری پن تھا۔

”بیٹھ......“ اس نے کہا۔

میں نے آہستگی سے ایک خالی کرسی کھینچی اور اس کے سامنے بیٹھ گیا۔ میرے ہاتھ میری گود میں تھے اور ریوالور میری جیکٹ کے نیچے تھا۔ کالیا نے اپنے سگار کا ایک لمبا کش لیا اور پھر میری طرف دیکھا۔ ”تو نے میرے لیے کچھ کام کیے ہیں۔“ اس نے کہا۔ ”سیٹھ کہتا ہے کہ تو بھروسے مند ہے لیکن مجھے بھروسا تجھ پر نہیں تیرے کام پر ہونا مانگتا، سمجھا۔“

”میں نے سر ہلایا۔“ جی میں سمجھتا ہوں۔

کالیا نے اپنی کرسی پیچھے کی جانب جھکائی اور مجھے غور سے دیکھا پھر بولا۔ ”مجھے ایک آدمی چاہیے جو نہ صرف کام کرے بلکہ میرے لیے جنگ بھی لڑے۔ لگتا ہے تو ایسا ہی ہے۔“

میں نے ایک پل کے لیے سوچا۔ یہ میرا موقع تھا اگر میں نے اس کا بھروسا جیت لیا تو میں اس کے اور قریب پہنچ سکتا تھا لیکن ایک غلط جواب میرا کھیل ختم کر دیتا۔

”میں نے زندگی میں کئی جنگیں لڑی ہیں۔“ میں نے اپنی آواز کو جتنا ہو سکے پُرسکون رکھتے ہوئے کہا۔ ”سڑکوں پر گلیوں میں اور اپنے دماغ میں۔ ہر موقع پر دماغ کو ٹھنڈا رکھتے ہوئے اگر آپ کو جنگ چاہیے تو میں تیار ہوں۔“

کالیا نے قہقہہ لگایا۔ اس کی ہنسی کمرے میں گونج اٹھی۔ ''تو مزیدار ہے وشنو۔'' اس نے کہا۔ ''مجھے ایسے لوگ پسند ہیں جو اپنی بات کو مزیدار بنا کر پیش کرتے ہیں لیکن اب تیرا اصلی امتحان ہے۔''

اس نے اپنے ایک آدمی کو اشارہ کیا۔ اس نے میرے سامنے ایک چھوٹا سا بوکس لاکر رکھ دیا۔

کالیا نے کہا۔ ''گتے کے اس بکسے میں کچھ خاص ہے۔ اسے تجھے شہر کے باہر ایک آدمی تک پہنچانا ہے لیکن یہ کام آسان نہیں ہے۔ راستے میں کچھ لوگ ہوں گے جو اسے تجھ سے چھین لینا چاہیں گے۔ اگر تو نے یہ کام ٹھیک سے کیا تو تو میرے خاص لوگوں میں شامل ہو جائے گا۔''

میں نے بوکس اٹھالیا اور اس کی آنکھوں میں دیکھا۔

''میں یہ کام کردوں گا۔''

کالیا ایک بار پھر مسکرایا لیکن اس بار اس کی مسکان میں کچھ اور تھا۔ شاید ایک مقابلے کی دعوت۔

''دیکھتے ہیں وشنو۔'' اس نے کہا۔

اسی رات میں اس بوکس کو لے کر شہر کے باہر کی طرف نکل پڑا۔ میرے ساتھ بھینسا کے دو آدمی تھے لیکن مجھے ان پر بھروسا نہیں تھا۔ میں جانتا تھا کہ کالیا مجھے آزما رہا ہے اور یہ بکس میرے لیے ایک جال بھی ہوسکتا ہے۔

راستے میں ہوا ٹھنڈی تھی اور سڑکیں سنسان تھیں۔ میں نے اپنی گاڑی کو تیزی سے چلایا لیکن میری آنکھیں آس پاس کی حرکتوں پر تھیں۔ اچانک میرے پیچھے گاڑی کی ہیڈ لائٹس چمکیں۔ میں نے اپنی رفتار بڑھائی لیکن وہ گاڑی میرے پیچھے پیچھے آرہی تھی میرے ساتھ والے آدمیوں نے اپنے پستولیں نکال لیں۔ ایک نے کہا۔ ''وشنو ہوشیار یہ ہمارے دشمن ہوسکتے ہیں۔''

میں نے اپنے دماغ کو پرسکون رکھا اور گاڑی کو ایک سنسان راستے کی جانب موڑا لیکن تبھی سامنے سے ایک اور گاڑی آئی اور اس نے میرا راستہ روک لیا۔ میں نے بریک مارا اور میرے ساتھ والے آدمی باہر نکل گئے۔ وہ نیچے اترتے ہی دیواروں سے لگ کر کھڑے ہوگئے۔ تبھی مجھ پر فائر ہوا۔ میں نے بھی اپنے آپ کو گاڑی کے پیچھے چھپایا اور اپنا ریوالور نکالا۔ میرے سامنے چار لوگ تھے۔ سبھی کے پاس ہتھیار تھے۔ میں نے ایک گہری سانس لی اور گولی چلائی۔ ایک آدمی زمین پر گر گیا اور باقی نے میری طرف گولیاں چلانی شروع کر دیں۔ جنگ چھوٹی تھی لیکن خطرناک بھی...... میں نے اپنے ساتھ والے آدمیوں کے ساتھ مل کر ان چاروں کو شوٹ کردیا جبکہ میرے ایک ساتھی کو بھی گولی لگی تھی اور وہ زمین پر پڑا کراہ رہا تھا۔ میں نے بوکس کو کس کر پکڑا اور اپنی گاڑی میں دوبارہ بیٹھ گیا۔ ''تو رک۔'' میں نے اپنے دوسرے ساتھی سے کہا۔ ''اسے سنبھال میں بکس پہنچادوں گا۔''

میں نے گاڑی کو پھر سے اسٹارٹ کیا اور اس آدمی کی تلاش میں آگے بڑھتا چلا گیا جس کے بارے میں کالیا نے بتایا تھا۔

کچھ آگے جانے کے بعد وہ گودام نظر آگیا۔ ایک پرانا گودام۔ اسی کے باہر وہ شخص کھڑا تھا۔ تمام نشانیاں مل رہی تھیں لیکن اس کا چہرہ ڈھکا ہوا تھا۔ میں نے بوکس اسے دیا اور اس نے بنا کچھ کہے اسے لے لیا پھر بولا۔ ''کالی چرن کو بول دینا کہ کام ہوگیا۔''

''اوکے......'' میں نے کہا اور واپسی کے لیے مڑ گیا۔

جب میں واپس ہوٹل پہنچا، کالیا میرا منتظر تھا۔ اس نے مجھے دیکھا اور کہا۔ ''سنا ہے تو نے اچھا کام کیا۔''

میں نے اثبات میں سر ہلایا لیکن میرے اندر ایک عجیب سی بے چینی تھی۔ میں نے آج کئی لوگوں کی جان لی تھی بھلے ہی وہ جرائم پیشہ تھے لیکن انسان تو تھے۔ میرے ہاتھ خون میں رنگ گئے تھے۔ میں نے اپنے آپ کو یاد دلایا کہ میں ایک پولیس والا ہوں اور میرا مشن اس شہر کو صاف کرنا ہے لیکن اس وقت میں صرف وشنو تھا، کالیا کا ایک نیا سپاہی۔

اس رات جب میں اپنی کھولی میں لوٹا میں نے اپنی ڈائری کھولی میرے ہاتھ کانپ رہے تھے لیکن میں نے لکھا۔

''آج میں نے کالیا کا بھروسا جیت لیا ہے لیکن اس بھروسے کی قیمت کیا ہے؟ میں نے آج خون بہایا ہے اور میں جانتا ہوں کہ یہ آخری بار نہیں ہوگا۔ میں روشن لال ہوں لیکن وشنو بنتا جارہا ہوں۔ کیا میں اس اندھیرے سے کبھی باہر نکل پاؤں گا؟''

میں نے اپنی وردی کو دیکھا جو اب میری الماری میں ایک بھولی ہوئی یاد کی طرح تھی۔ میں نے اپنے آپ سے وعدہ کیا کہ میں اس مشن کو پورا کروں گا چاہے اس کے لیے مجھے کتنا بھی خون کیوں نہ بہانا پڑے لیکن میرے دل میں ایک ڈر تھا۔ کیا میں واقعی اندھیرے سے باہر نکل پاؤں گا؟ یا پھر یہ اندھیرا مجھے ہمیشہ کے لیے نگل لے گا۔

رات کی سیاہی میرے چاروں طرف پھیلی تھی اور میں

اس پرانے ہوٹل کے تہ خانے میں پھر سے کھڑا تھا۔ کالیا کی نظریں مجھ پر تھیں جیسے وہ میرے دل کی ہر دھڑکن کو سن سکتا ہو۔ میں نے اس کا بھروسا جیت لیا تھا۔ اس کے دشمنوں کو کم کردیا تھا۔ میں جانتا تھا کہ یہ صرف شروعات تھی۔ کالیا کا گروہ ایک ایسی مشین تھی جو بنا رکے چلتی تھی اور میں اب اس کا حصہ بن چکا تھا۔

”وشنو۔“ کالیا نے اپنی پُرسکون لیکن بھاری آواز میں کہا۔ ”تو نے اچھا کام کیا۔ اب تجھے میرے خاص لوگوں میں جگہ ملے گی لیکن یاد رکھ میرے ساتھ رہنے کے لیے تجھے ہر بار خود کو ثابت کرنا ہوگا۔“

میں نے ہاں میں سر ہلایا لیکن میرے اندر ایک جنگ چل رہی تھی ایک طرف میرا مشن تھا، کالیا کے گروہ کو اندر سے توڑنا۔ اس کے سارے راز اجاگر کرنا۔ دوسری طرف میں ہر پل اس اندھیرے میں ڈوبتا جا رہا تھا جس سے لڑنے کی میں قسم کھا چکا تھا۔ میں روشن لال تھا ایک پولیس والا لیکن ہر بار جب کالیا مجھے وشنو کہہ کر بلاتا مجھے لگتا تھا کہ میں اپنے اصلی وجود سے دور ہوتا جا رہا ہوں۔ اس رات کالیا نے مجھے ایک نیا کام سونپا۔

”شہر میں ایک نیا کھلاڑی آیا ہے۔“ اس نے کہا اور اپنے سگار کا دھواں ہوا میں اڑاتے ہوئے بولا۔ ”وہ ہمارا مال چھیننا چاہتا ہے۔ تجھے اسے سبق سکھانا ہے۔“

اس نے مجھے ایک فوٹو دیا جس میں ایک جوان آدمی کا چہرہ تھا اس کا نام تھا روی اور کالیا کے مطابق وہ ایک نیا گینگ بنا رہا ہے جو کالیا کے کاروبار کو ختم کرنے کے در پہ ہے۔

”یہ کام تجھے اکیلے کرنا ہے۔ اس کے اڈے کا پتا میرے آدمی بتا دیں گے۔“ کالیا نے کہا۔ ”کوئی غلطی نہیں۔“

میں نے فوٹو کو جیب میں رکھا اور وہاں سے نکل گیا۔ میرے دماغ میں سوالوں کا تانا لگا تھا۔ روی کون تھا، کیا وہ واقعی کالیا کا دشمن تھا یا یہ کالیا کی کوئی اور چال تھی۔ میں جانتا تھا کہ اگر میں نے یہ کام ٹھیک سے نہیں کیا تو میرا مشن ختم ہو سکتا ہے لیکن اگر میں نے روی کو نقصان پہنچایا تو میں ایک اور قدم اس اندھیرے کی طرف بڑھ جاؤں گا جس سے میں بچنا چاہتا تھا۔

اگلی رات میں اس جگہ پہنچا جہاں روی کا اڈا تھا۔ علاقے کی تفصیل بھینسا نے بتا دی تھی۔ یہ ایک پرانا بار تھا جو شہر کے کنارے پر تھا، باہر سے بند لگ رہا تھا لیکن اندر سے ہلکی ہلکی آوازیں آرہی تھیں۔ میں نے اپنی جیکٹ کے نیچے اپنے ریوالور کو ٹٹولا اور دھیرے سے دروازہ کھولا۔ اندر کا ماحول بھاری تھا۔ دھواں، شراب کی بو اور کچھ لوگ جو انتہائی نیچی آواز میں باتیں کر رہے تھے۔ میری نظریں اِدھر اُدھر چکرانے لگیں میں نے روی کو ایک کونے میں دیکھ لیا۔ وہ اکیلا بیٹھا تھا ایک گلاس ہاتھ میں لیے۔ میں نے اپنے آپ کو سنبھالا اور اس کے پاس پہنچا۔ ”روی۔“ میں نے سوالیہ انداز میں پوچھا۔ اپنی آواز کو جتنا ہو سکے سخت رکھتے ہوئے سوال کیا تھا۔

اس نے میری طرف دیکھا۔ اس کی آنکھوں میں ایک عجیب سا ٹھہراؤ تھا۔ ”تو کون ہے؟“ اس نے پوچھا۔

”وشنو۔“ میں نے کہا۔ ”کالی چرن نے مجھے بھیجا ہے۔“

روی کے ہونٹوں پر ایک ہلکی سی مسکان بکھر گئی لیکن اس کی آنکھیں میرے چہرے پر ٹکی تھیں۔ ”کالیا؟“

”ہاں؟“

اس نے کہا۔ ”وہ ڈر رہا ہے۔ ہے نا؟ اس لیے تجھ جیسے نئے لڑکے کو بھیجا۔“

میں نے اپنے غصے کو قابو میں رکھا۔ ”میں یہاں بات کرنے نہیں آیا۔“ میں نے کہا۔ ”تجھے ایک مشورہ دینا ہے۔ کالی چرن کے کاروبار سے دور رہ ورنہ اچھا نہیں ہوگا۔“

روی نے اپنے گلاس کو ٹیبل پر رکھا اور میری طرف جھکا۔ ”تو جانتا ہے وشنو؟“ اس نے دھیمی آواز میں کہا۔ ”کالیا کا وقت ختم ہو رہا ہے۔ وہ ایک بوڑھا شیر ہے جو اب تھک چکا ہے۔ میں بس وہی کر رہا ہوں جو وہ سالوں پہلے کرتا تھا۔“ اس کے الفاظ میرے دماغ میں گونجنے لگے۔ میں نے اپنے آپ کو یاد دلایا کہ میں ایک پولیس والا ہوں اور میرا کام کالیا کو پکڑنا ہے نہ کہ روی جیسے نئے کھلاڑیوں کے ساتھ الجھنا لیکن اگر میں نے کالیا کا حکم نہیں مانا تو میرا مشن خطرے میں پڑ سکتا تھا۔

”تو اپنی زبان سنبھال۔“ میں نے اپنی آواز میں ایک ٹھنڈک لاتے ہوئے کہا۔ ”یہ آخری چیتاونی ہے۔“

روی ہنسا اور اپنے گلاس کو پھر سے اٹھایا۔ ”ٹھیک ہے وشنو۔“ اس نے کہا۔ ”جا اپنے مالک کو بتا دے کہ میں نے انتباہ سن لیا ہے لیکن یہ بھی بتا دینا کہ میں ڈرنے والا نہیں ہوں۔“

میں وہاں سے نکل گیا لیکن میرے دماغ میں ایک

عجیب سی الجھن تھی۔ روی کی باتوں میں کچھ ایسا تھا جو مجھے پریشان کررہا تھا۔ کیا وہ سچ کہہ رہا تھا کہ کیا کالیا کا وقت واقعی ختم ہورہا ہے اور اگر ایسا ہے تو میرا مشن کیا تھا؟" میں نے اپنے آپ کو یاد دلایا کہ میرا کام کالیا کے گروہ کو توڑنا ہے نہ کہ نئے گینگز کے ساتھ الجھنا۔

جب میں کالیا کے پاس واپس پہنچا اس نے میری بات سنی اور ایک ٹھنڈی مسکان بکھیری۔ "اچھا اس نے ایسا کہا......ویسے تو نے میرا کام اچھے طریقے سے کیا لیکن یہ ابھی ختم نہیں ہوا ہے۔ روی کو اور سبق سکھانا ہوگا۔"

اس نے مجھے ایک نیا کام سونپا۔ روی کے ایک ٹھکانے پر حملہ کرنا۔ یہ کام بڑا تھا اور اس میں کئی لوگ شامل تھے۔ میں جانتا تھا کہ یہ میرے لیے ایک اور امتحان ہے۔ اگر میں نے یہ کام ٹھیک سے کیا تو میں کالیا کے اور قریب پہنچ جاؤں گا۔

اب مجھے اس کے اڈے کو تباہ کرنا تھا۔ میں نے ہامی بھر لی تھی۔ کالیا نے مجھے کچھ لوگ دیے تھے جو میری مدد کرتے لیکن روی کو شکست دینا میرا کام تھا۔ میں نے کالیا کی دی ہوئی گاڑی لی۔ وہ تینوں میری گاڑی میں آکر بیٹھ گئے۔ یہ ایک ایمبسڈر کار تھی۔ اس کار کو ڈرائیو بھی مجھے کرنا تھی۔ میں نے ڈرائیونگ سیٹ سنبھال لی اور روی کے اڈے کی جانب چل پڑا۔

روی کا اڈا ایک پرانا بار تھا جیسا کہ میں پہلے ہی بتا چکا ہوں اور وہ بار شہر سے باہر کانپور روڈ پر تھا۔ اس بار میں زیادہ تر ٹرک ڈرائیوز اپنی تھکن مٹانے آتے تھے۔ شہر سے باہر ہونے کی وجہ سے وہ کالیا کے علاقے میں نہیں آتا تھا اس لیے روی اتنی شان سے وہاں بیٹھتا تھا۔ اسی وجہ سے کالیا نے مجھے ٹاسک دیا تھا کہ اگر بات بڑھے تو وہ خود کو صاف بچالے کہ دشمنوں تو میرا آدمی ہے ہی نہیں...... یا پھر ایسا بھی ہوسکتا تھا کہ روی ایک ڈمی ہو۔ صرف مجھے الجھانے کے لیے اسے سامنے لایا گیا ہے۔ کچھ بھی ہو مجھے تو کالیا کا اعتماد حاصل کرنے کے لیے اس پر حملہ کرنا ہی تھا۔ اسی وجہ سے میں پوری رفتار سے کار بھگاتا ہوا اس کے اڈے کی طرف بڑھ رہا تھا۔

کچھ ہی دیر بعد میں اس بار تک پہنچ گیا۔ وہاں سستی شراب ملتی تھی اس لیے وہاں آنے والے بھی سستے لوگ تھے۔ ان سے کوئی خاص خطرہ بھی نہیں تھا۔ میں نے کار کچھ فاصلے پر روکی اور نیچے اتر آیا۔ میرے ساتھی بھی نیچے اتر آئے پھر ہم آہستہ قدموں سے اس طرف بڑھے۔ ابھی اس بار

انڈیانا (Indiana)

ریاست ہائے متحدہ امریکا کی ایک ریاست، رقبہ 26168 مربع میل یا 93700 مربع کلومیٹر۔ 1816ء میں یہ ریاست 19 ویں ریاست کی حیثیت سے ریاست ہائے متحدہ امریکا میں شامل ہوئی۔ دارالحکومت انڈیاپولس ہے۔ آب وہوا گرمیوں میں گرم اور سردیوں میں سرد ہوتی ہے۔ شروع میں اس پر فرانسیسیوں نے قبضہ کیا۔ 1763ء میں انگریز مسلط ہوئے۔ 1783ء میں امریکیوں کے قبضے میں آئی۔ اناج، تمباکو وغیرہ اہم فصلیں ہیں۔ معدنیات بھی بہ افراط پائی جاتی ہیں۔ ادویہ سازی، موٹریں، بجلی کا سامان اور لوہے اور فولاد کی صنعتیں روز افزوں ہیں۔

مرسلہ: عطیہ اکبر۔ کوئٹہ

انڈیاناپولس

ریاست ہائے متحدہ امریکا کی ریاست انڈیانا کا صدر مقام۔ ریلوے اسٹیشن، ہوائی اڈا اور یونیورسٹی (1855ء) بھی ہیں۔ یہاں باسکٹ بال، فٹ بال اور کاروں کی دوڑ کے عالمی مقابلے بھی منعقد ہوتے ہیں۔ خصوصی طور پر یہ 500 موٹر کاروں کی دوڑ کے لیے مشہور ہے۔

مرسلہ: عطیہ اکبر۔ کوئٹہ

انسانیت (Anthropology)

علم الانسان۔ انسان کا مطالعہ طبعی اور تمدنی نکتہ نظر سے طبعی علم الانسان میں انسان کی قدرتی تاریخ اور اس کے پیش روؤں کے حالات کا مطالعہ کیا جاتا ہے۔ اس میں معدومیات یعنی قدیم انسانوں کی ہڈیوں، آثار قدیمہ، ہمعصر نامیاتی مرکبات، عضویات اور حیاتیات کا مطالعہ شامل ہے۔ ثقافتی یا تمدنی علم الانسان میں انسانی تہذیب اور تمدن کی سرگزشت سے پردہ اٹھایا جاتا ہے۔ ہربرٹ سپنسر نے اسے سوشیالوجی (علم عمرانیات) کا نام دیا ہے۔ اس سلسلے میں مختلف انسانی نسلوں کی خصوصیات اور باہمی تعلقات کے علم سے بھی مدد لی جاتی ہے جسے اتھنالوجی کہتے ہیں۔ ایک جداگانہ شعبہ علم کی حیثیت سے علم الانسان کا آغاز اٹھارویں صدی کے اواخر یا 19 ویں صدی کے آغاز میں ہوا۔

مرسلہ: سلطان۔ کراچی

سے کچھ دور ہی تھے کہ ادھر سے کسی نے للکارا۔ ”کون ہے......؟ رک جاؤ۔“

میں نے قدم روک کر آواز دی۔ ”روی سے کہو دشنو اس سے ملنے آرہا ہے۔“

ادھر سے جواب آیا۔ ”لو سنو اس نے یہ جواب دیا ہے۔“ ساتھ ہی ساتھ ادھر سے فائر ہوا۔

دور کھڑے جواب دینے والے شخص کا ہاتھ بلند ہوتے میں نے دیکھ لیا تھا اس لیے بے اختیاری میں جھک گیا تھا۔ یہ میرے لیے اچھا ثابت ہوا۔ گولی میرے سر سے ایک فٹ اوپر سے گزر گئی تھی۔ جواب میں ہماری طرف سے بھی فائر ہوا۔

میں نے سمجھ لیا تھا کہ روی بھی شاطر بندہ ہے۔ اس نے تیاری کررکھی ہے۔

اب دونوں طرف سے گولیاں چلنے لگیں۔ میں نے اپنے آپ کو ایک دیوار کے پیچھے چھپایا اور اپنا ریوالور نکال لیا۔ میرے سامنے جنگ کا ماحول تھا، گولیاں چیخیں اور خون۔ میں نے اپنے آپ کو یاد دلایا کہ میں ایک پولیس والا ہوں لیکن اس وقت میں صرف دشنو کالیا کا ایک سپاہی۔

یہ جنگ زیادہ دیر چل نہ سکی۔ میں نے اپنے بندوں کو وہیں کھڑے ہو کر فائر کرتے رہنے کا حکم دیا تھا اور خود سڑک سے نیچے اتر گیا تھا۔ سامنے کی سمت میں مقابلہ جاری تھا اور میں پیچھے کی طرف سے اس بار کی جانب بڑھ رہا تھا۔ میں نے بہت بڑا رسک لیا تھا۔ اگر وہ لوگ تعداد میں زیادہ ہوتے اور کچھ لوگ پیچھے کی جانب آگئے تو میں پوری طرح پھنس جاؤں گا۔ وہ مجھے سیدھے سیدھے شوٹ کر سکتے تھے۔ میں اب بار کے بالکل نزدیک پہنچ چکا تھا۔ ادھر کوئی بھی نہیں تھا۔ شاید سب کے سب سامنے کی طرف تھے۔ میں نے بغلی ہولسٹر سے دوسرا پستول بھی نکال لیا۔ اور پھر ایک ساتھ دونوں پستولوں سے فائرنگ شروع کر دی۔ پچھلے دروازے کو نشانہ بنایا تھا۔ پہلی گولی دروازے پر پڑی تھی کہ بار کے داہنی جانب کا دروازہ کھلا اور کئی آدمی جھکے جھکے سے دوڑتے ہوئے سڑک کی الٹی طرف بھاگنے لگے۔ میں سمجھ گیا کہ روی کے آدمی اسے چھوڑ کر بھاگ رہے ہیں۔ پھر ادھر سے فائرنگ کی آواز میں کمی آنے لگی۔ جبکہ ہماری ایمبسڈر کار کی طرف سے مسلسل فائر آرہے تھے۔

پھر میں نے محسوس کیا کہ روی کی جانب سے فائرنگ بالکل ہی بند ہو چکی ہے۔ تب میں نے للکارا۔ ”روی سیدھے سیدھے باہر آجاؤ ورنہ میں بار پر گرنیڈ ماروں گا۔ سب کے سب ٹکڑوں میں بٹ جاؤ گے۔“

کچھ دیر بعد اندر سے ایک منمناتی آواز آئی۔ ”روی فرار ہو چکا ہے۔“

”تم کون ہو؟“ میں نے پوچھا۔

”میں بار کا مالک شیلیندر رہوں۔“

”اندر جتنے بھی لوگ ہیں سب ہاتھ اٹھا کر باہر آجائیں۔“

جواب میں اندر سے کہا گیا۔ ”ہم باہر آرہے ہیں کوئی فائر نہ کرے۔“

پہلے دروازے پر پیٹرومیکس رکھو تاکہ روشنی میں ہم دیکھ سکیں کہ کون کون باہر آرہا ہے۔“

”ٹھیک ہے۔ ہم پہلے پیٹرومیکس کو باہر دھکیل کر رکھیں گے پھر باہر آئیں گے۔“

واقعی پہلے پیٹرومیکس باہر دھکیل کر رکھا گیا اور پھر اندر سے تین آدمی برآمد ہوئے۔ ان تینوں کے ہاتھ اوپر اٹھے ہوئے تھے۔ ان کے لباس سے سمجھ آگئی کہ وہ سب ملازم ہیں۔

جب وہ سڑک پر کافی آگے آگئے تب میں آگے بڑھا۔ اور اپنے ساتھیوں کو مخاطب کیا۔ ”اب میں سڑک پر آرہا ہوں۔ تم ان سب کو کور کرنے کے ساتھ بار پر بھی نظر رکھنا۔ ہوسکتا ہو روی اندر ہمارا منتظر ہو۔“

اتنا کہہ کر میں نے بار کے کھلے ہوئے عقبی دروازے سے اندر جھانکا۔ اندر کوئی بھی نظر نہیں آیا۔ سڑک کی جانب کھلنے والے دروازے سے پیٹرومیکس کی روشنی اندر تک آرہی تھی۔ میں اس عقبی دروازے سے اندر داخل ہو گیا۔ میرے دونوں ہاتھوں میں پستول تھے اور آنکھیں سرچ لائٹ کی طرح ہر طرف چکرا رہی تھیں۔ لیکن اندر کوئی بھی نہیں تھا۔ بھائیں بھائیں کرتے ہال کو پار کر کے میں نے دوسرے اور پھر تیسرے کمرے میں جھانکا۔ واقعی وہاں کوئی نہیں تھا۔ اب میں مرکزی دروازے پر پہنچا اور پھر باہر نکل آیا۔

سڑک پر پہنچ کر میں نے دیکھا۔ وہ تینوں اب تک ہاتھ بلند کیے کھڑے تھے۔ میں نے کہا۔ ”اب تم لوگ ہاتھ نیچے گرالو اور ایک جانب بیٹھ جاؤ۔“

ان لوگوں نے حکم کی تعمیل کی۔

”تم لوگ یہیں بیٹھے رہنا۔ جب تک میں نہ کہوں کوئی

"اپنی جگہ سے کھڑا نہ ہو ورنہ گولی اس کا مقدر ٹھہرے گی۔" کہتے ہوئے میں اپنی ایمبیسڈر کی جانب بڑھنے لگا۔

ہمارے تینوں ساتھی بخیریت تھے۔ کسی کو خراش تک نہیں آئی تھی۔ صرف میرے بازو کو چھوتی ہوئی ایک گولی گزر گئی تھی۔

روی کا ٹھکانا تباہ ہو چکا تھا۔ اس کے کئی لوگ مارے گئے تھے اور باقی بھاگ گئے تھے۔ یہاں فائرنگ زور و شور سے ہوئی تھی۔ دونوں طرف کی ٹریفک رک گئی تھی۔ کان پور اور لکھنؤ کا راستہ مکمل طور پر بند ہو چکا تھا۔ اب تب میں پولیس بھی آسکتی تھی اس لیے میں نے وہاں رکنا مناسب نہیں سمجھا اور اپنے بندوں سے کہا۔ "سب گاڑی میں بیٹھو۔" اور میں نے کار کا رخ موڑ لیا۔ پھر نہایت تیز رفتاری سے کار کو ٹھاکر گنج جانے والی پتلی سڑک پر بھگانا شروع کردیا۔

کافی آگے جانے کے بعد میں نے ایک دوسرے راستے کا انتخاب کیا اور کچھ دور جاتے ہی ایک میڈیکل اسٹور پر کار کھڑی کردی۔ دراصل وہاں مجھے ٹیلی فون بوتھ نظر آگیا تھا۔ میں نے آٹھ آنے کا سکہ ڈالا اور لائین کلیئر ہوتے ہی کالی چرن کا نمبر ڈائل کیا۔ پہلی ہی گھنٹی پر کال ریسیو ہوگئی۔ دوسری جانب کالیا ہی تھا۔ میں نے ہیلو کی آواز سنتے ہی کہا۔ "مہاراج کام مکمل ہوگیا۔ میں نے اس کے اڈے کو خالی کرالیا ہے۔"

اس نے میری بات سنی اور کہا۔ "مجھے خبر مل چکی ہے۔ اب تو میرے خاص لوگوں میں سے ایک ہے۔"

اس رات جب میں اپنی کھولی میں لوٹا اور اپنے آپ کو آئینے میں دیکھا تو عجیب سا احساس ہوا۔ میرا چہرہ دھول سے اٹا ہوا تھا۔ میں وہ پرانا روشن لال نہیں تھا۔

میں نے اپنے آپ کو بستر پر ڈال دیا کچھ دیر کمر سیدھی کی پھر اپنی ڈائری کھولی اور لکھا۔ "آج میں نے ایک اور جنگ جیت لی لیکن ہر جنگ کے ساتھ میں اپنے آپ سے اور دور ہوتا جا رہا ہوں۔ میں نے خون بہایا۔ قتل کیا اور میں جانتا ہوں کہ یہ آخری بار نہیں۔ میں روشن لال ہوں لیکن وشنو بنتا جا رہا ہوں۔ کیا میں کبھی اس اندھیرے سے باہر نکل پاؤں گا؟"

میں نے اپنی وردی کو دیکھا جو اب میری الماری میں ایک بھولی ہوئی یاد تھی۔ میں نے اپنے آپ سے وعدہ کیا کہ میں اس مشن کو پورا کروں گا چاہے اس کے لیے مجھے کتنا بھی خون کیوں نہ بہانا پڑے۔ کالیا اس معاشرے کا ناسور ہے، نوجوانوں میں نشہ بانٹ کر پوری نسل کو برباد کر رہا ہے۔ اسے ختم ہو جانا چاہیے۔ جو کام پورا محکمہ نہ کرسکا وہ میں اکیلے کروں گا۔ لیکن میرے دل میں ایک ڈر تھا کہ کیا میں واقعی اس اندھیرے سے باہر نکل پاؤں گا یا یہ اندھیرا مجھے ہمیشہ کے لیے نگل لے گا؟

رات کی سیاہی میرے چاروں طرف پھیلی تھی اور میں اپنی کھولی میں بیٹھا اس جنگ کی گونج کو محسوس کر رہا تھا جو میں نے روی کے ٹھکانے پر لڑی تھی۔ میرے ہاتھ اب بھی کانپ رہے تھے اور میرے کپڑوں پر خون کے دھبے تھے، کچھ میرا کچھ دوسروں کا۔ میں نے کالی چرن عرف کالیا کا بھروسا جیت لیا تھا لیکن اس جیت کی قیمت میرے لیے بھاری پڑ رہی تھی۔ ہر قدم کے ساتھ میں اپنے آپ سے اور دور ہوتا جا رہا تھا۔ روشن لال جو ایک پولیس والا تھا اب دھیرے دھیرے وشنو بنتا جا رہا تھا ایک ایسا شخص جس کے ہاتھ خون سے لتھڑے تھے۔ میں نے اپنی ڈائری کھولی اور اس رات کی ہر بات پر دوبارہ نظر ڈالنے کی کوشش کی لیکن میرے الفاظ ادھورے لگ رہے تھے۔ میں نے مزید سطر کا اضافہ کیا۔

"آج میں نے کالیا کے لیے جو جنگ لڑی ہے یہ جنگ صرف گولیوں اور خون کی نہیں تھی یہ میرے اندر کی جنگ تھی میں کون ہوں روشن لال جو قانون کی حفاظت کرتا ہے یا وشنو جو کالیا کا سپاہی بن چکا ہے۔"

میں نے قلم نیچے رکھ دیا میرے پاس جواب نہیں تھا۔

صبح کے اجالے کے ساتھ بھینسا کا فون آیا۔ (یہ بتا دوں کہ میری اس کھولی میں میں نے پیسے کھلا کر فون کا غیر قانونی کنکشن لگوالیا تھا۔ "لائین مین" نے کھمبے سے ایک تار کھینچ کر میری کھولی تک پہنچا دیا تھا۔ اسی تار کا کمال تھا کہ میرے ہاں فون جیسی اہم سہولت آگئی تھی)

"وشنو تیار ہو جا۔" اس نے کہا۔ "کالیا تجھے آج اپنے خاص ٹھکانے پر لے جانا چاہتا ہے۔ یہ تیرا اب تک کا سب سے بڑا موقع ہے۔" اس کی آواز میں ایک عجیب سا احساس تھا جیسے وہ خوش بھی ہے اور مجھ سے جلن بھی محسوس کر رہا ہو۔ لیکن میرے لیے یہ ایک اور امتحان تھا، کالیا کا خاص ٹھکانا کوئی معمولی جگہ نہیں ہوسکتی تھی۔ میں نے اپنے پرانے کپڑے پہنے اپنا ریوالور لیا اور اسے جیکٹ کے نیچے چھپایا پھر بھورا سے ملنے نکل پڑا۔

وہ مجھے شہر کے باہر ایک سنسان علاقے میں لے گیا جہاں ایک پرانا بنگلا تھا۔ باہر سے وہ بنگلا کھنڈر جیسا لگتا تھا

لیکن اندر کا نظارہ بالکل الگ تھا۔ وہاں کی دیواریں صاف تھیں فرش چمک رہا تھا اور ہر کونے میں مسلح لوگ کھڑے تھے۔ یہ کالیا کا ہیڈ کوارٹر تھا، اس کی طاقت کا مرکز۔ کالیا ایک بڑے سے کمرے میں بیٹھا تھا جس کے سامنے ایک بھاری بھرکم میز تھی۔ میز پر کچھ کاغذات اور ایک پرانا ریڈیو رکھا تھا۔ اس نے مجھے دیکھا اور مسکراتے ہوئے بولا۔ ''آجا دشنو۔ یہ میرا اصلی گھر ہے۔''

میں نے سر ہلایا اور اس کے سامنے بیٹھ گیا۔ میری آنکھیں کمرے کے ہر کونے کو اسکین کر رہی تھیں۔ وہاں موجود ہر شخص ہر چیز میرے لیے اہمیت رکھتی تھی۔ کالیا نے ایک کاغذ میری طرف بڑھایا۔

''یہ ہمارا اگلا بڑا کام ہے۔'' اس نے کہا۔ ''ایک شپمنٹ آرہی ہے ڈرگز کی، یہ ہمارا اب تک کا سب سے بڑا سودا ہے، تجھے اس کی ذمہ داری لینی ہے۔''

میں نے کاغذ کو دیکھا۔ اس میں کچھ نام، تاریخیں اور ایک جگہ کا ذکر تھا۔ ایک ہالٹ اسٹیشن کا جہاں صرف پسنجر ٹرینیں رکتی تھیں۔ لکھنو سے قریب ہی تھا۔

میں جانتا تھا کہ یہ مشن میرے لیے ایک سنہرا موقع تھا اگر میں اس شپمنٹ کی پوری جانکاری پولیس تک پہنچا سکا اور پولیس نے مال پکڑ لیا تو کالیا کے گروہ کی کمر ٹوٹ جائے گی۔ لیکن اس کے لیے مجھے اور گہرائی تک جانا ہوگا اور یہ راستہ مزید خطرناک تھا۔

''میں تیار ہوں۔'' میں نے کہا۔

'' کالیا نے میری آنکھوں میں دیکھا جیسے وہ میرے ارادوں کو پڑھنے کی کوشش کر رہا ہو۔'' اچھا اس نے کہا۔ لیکن یاد رکھ دشنو اس میں کوئی غلطی نہیں، اگر یہ سودا گڑبڑ ہوا تو تیرا نام میری لسٹ میں سب سے اوپر ہوگا۔''

میں نے سر ہلایا اور وہاں سے نکل گیا۔

میرے دماغ میں ایک پلان بن رہا تھا۔ مجھے شپمنٹ کی پوری جانکاری ڈی سی پی راٹھور تک پہنچانی تھی لیکن اس کے لیے مجھے بہت محتاط رہنا پڑے گا۔ کالیا کے لوگ ہر جگہ تھے اور اگر کسی کو میرے اصلی مقصد کا ذرا سا بھی شک ہوا تو میرا کھیل ختم تھا۔

☆☆☆

اگلی رات میں بھینسا اور ایک نوجوان کو ساتھ لے کر اس ہالٹ اسٹیشن پر پہنچا۔ وہاں کا ماحول بھاری تھا، ہر طرف ویرانی تھی۔ میں ایک عجیب سی ٹھنڈک اپنے اندر محسوس کر رہا تھا۔ میں نے دیکھا کہ کچھ لوگ پہلے سے وہاں موجود تھے۔ سبھی مسلح تھے۔ بھینسا میرے ساتھ تھا اور اس نے مجھے ایک رکی ہوئی بوگی کی طرف اشارہ کیا۔ ''شپمنٹ وہاں ہے۔'' اس نے کہا۔ ''تجھے اس سے مال اتارنا ہے اور شہر تک لے جانا ہے بلکہ شہر کے دوسرے کنارے تک لے جانا ہے۔''

میں نے مال گاڑی کی بوگی کا جائزہ لیا پھر آگے بڑھا۔ وہاں کھڑے شخص نے بوگی کا بند دروازہ کھول دیا۔ میں نے اندر جھانکا۔ بڑے بڑے پیکٹوں کا ایک ڈھیر تھا...... میں نے وہاں کھڑے شخص سے کہا۔ ''میں اکیلا تو اسے کار تک پہنچانے سے رہا۔''

''میرے آدمی مال کار میں رکھ دیں گے۔''

اس کی بات ختم بھی نہیں ہوئی تھی کہ چار آدمی بوگی میں چڑھ گئے۔ انہوں نے کئی کئی پیکٹ ایک ساتھ اٹھائے اور بوگی کے باہر کھڑے لوگوں کو تھمایا۔ وہ اسے لے جا کر میری کار میں رکھنے لگے۔ دیکھتے ہی دیکھتے ڈگی اور پھر پچھلی سیٹ بھر گئی۔ کچھ پیکٹ آگے بھی رکھ دیے گئے۔

وہاں پہنچ کر بوگی کے سامنے کھڑے جس شخص کو میں نے کالیا کا دیا گیا پانچ روپے کا پھٹا ہوا آدھا نوٹ دکھایا تھا اس نے وہ نوٹ مجھ سے لے لیا اور اسی نوٹ کا وہ حصہ جو اس کے پاس تھا اس نے مجھے دے دیا۔ اور واپس اپنی کار کی جانب بڑھ گیا کیونکہ بوگی خالی ہو چکی تھی۔ میں نے بھی اپنی ایمبسڈر کار اسٹارٹ کی۔ میرے ساتھ بھینسا اور اس کا ایک ساتھی بھی تھا۔ ہم ٹھس ٹھسا کر بیٹھے تھے۔ وہ کالیا کا بھروسے مند آدمی تھا پھر بھی راستے میں میں نے اپنی آنکھیں کھلی رکھیں مجھے ہر اس نشانی کو یاد رکھنا تھا جو میرے مشن کے لیے کام آسکتی تھیں پیکٹ میں کیا تھا کتنا مال تھا اور اسے کہاں لے جانا تھا میں نے اپنے دماغ میں ہر بات کو درج کیا لیکن تبھی راستے میں ایک گاڑی نے ہمارا پیچھا شروع کر دیا۔ میں نے بھینسا کو دیکھا جو پہلے سے ہی اپنا ریوالور نکال چکا تھا۔

''یہ روی کے لوگ ہو سکتے ہیں۔'' بھینسا نے کہا۔

میرے دماغ میں گھنٹیاں بجنے لگیں۔ روی وہ آدمی جسے میں نے شکست دی تھی۔ کیا وہ اب بھی کالیا کے خلاف جنگ لڑ رہا ہے؟ میرے دماغ میں لہر اٹھی لیکن میرے پاس جواب نہیں تھا۔

میں نے اپنی رفتار بڑھائی لیکن پیچھے والی گاڑی بھی تیز ہو گئی۔ اب ہم لکھنو جانے والی مرکزی شاہراہ پر تھے

جہاں ہر طرف سناٹے کا راج تھا۔

میں نے رفتار مزید تیز کر دی۔ ہائی وے پر اس رفتار سے چلنا خطرناک تھا اس لیے کہ ہر دو منٹ بعد بھاری ٹرک گزرتا۔ ٹرک ڈرائیور کس قسم کی ڈرائیونگ کرتے ہیں سب کو معلوم ہے۔ اس لیے میں نے دائیں بائیں دیکھنا شروع کر دیا۔ کچھ آگے جاتے ہی ایک کچی سڑک نظر آئی جو دور ایک چھوٹے سے گاؤں کی جانب جا رہی تھی۔ اس سڑک پر تھوڑی تھوڑی دوری پر جھونپڑے بنے تھے۔ یقیناً وہ دکانیں ہوں گی۔ میں نے ایمبسڈر کار کو اس کچی سڑک پر اتار دیا۔

”ارے یہ کیا کر رہے ہو۔ ہم پھنس جائیں گے۔“ بھینسا چلایا۔

”دشمن کو گھیر کر مارنا میرا پرانا شوق ہے اب تو بغیر ان کا شکار کیے آگے بڑھنا میرے نزدیک بے وقوفی ہے۔ انہیں ان کی اوقات یاد دلانا ضروری ہے۔“ کہتے ہوئے میں نے اسپیڈ کچھ کم کر لی۔ اس لیے کہ اوبڑ کھابڑ سڑک پر ایمبسڈر کا چلنا خاصہ مشکل لگ رہا تھا۔ میں نے بیک ویو مرر میں دیکھا۔ تعاقب میں آنے والی گاڑی بھی اسی سڑک پر آ گئی تھی۔

”میری سمجھ میں نہیں آ رہا کہ تم اس بند راستے پر کیوں آ گئے۔“ بھینسا تیز آواز میں بولا۔

”یہ بند راستہ نہیں ہے۔ میرا دیکھا بھالا راستہ ہے۔ گاؤں سے گزر کر یہ پتلی سڑک مہاجن پور جاتی ہے اور مہاجن پور سے ہم پھر مرکزی سڑک پر آ جائیں گے۔ ہائی وے پر گولیاں چل رہی تھیں جو آگے جانے والے ٹرک ڈرائیوروں کے ذریعہ اگلی چوکی تک خبر پہنچ گئی ہوگی اور مداخلت کے لیے پولیس آنے والی ہوگی۔“ میں نے جواب میں کہا۔

”یار تو واقعی میں دماغ والا ہے۔ سچ کہا کہ اکیلے میں لے جا کر مارنا زیادہ بہتر ہے۔“ بھینسا نے ہنستے ہوئے کہا۔ ریوالور اب تک اس کے ہاتھ میں تھا۔ کچھ آگے جانے کے بعد میں نے گاڑی ہلکی کی اور کہا۔ ”تم اتر کر اس دکان کی دیوار کی آڑ میں کھڑے ہو جانا، میں اگلی دکان کی آڑ میں رک کر اس سے مقابلہ کروں گا۔ آگے سے میں اور پیچھے سے تم۔ اس طرح وہ لوگ دو اطراف سے گھر جائیں گے۔“

میں نے جیسے ہی کار کی رفتار کم کی، اس نے اور اس کے ساتھی نے باہر چھلانگ لگا دی۔ دونوں زمین پر گرتے ہی پیٹ کے بل آگے کی طرف رینگنے لگے۔ رینگتے ہوئے دکان کی طرف بڑھ گئے تھے۔ اتنی دیر میں میں اگلی دکان سے کچھ آگے آ گیا پھر کار روک کر نیچے اتر کر انہی دونوں کی طرح سینے کے بل کرولنگ کرتے ہوئے دکان کی آڑ میں پہنچ گیا۔

پیچھے آنے والی کار کچھ سست ہوئی پھر رک گئی اور کھڑکی سے ہاتھ باہر نکلا ساتھ ہی ساتھ فائر ہوا۔ گولی خالی پڑی کار کے پچھلے شیشے پر پڑی۔ شیشے کے ٹوٹنے کی آواز دور تک سنائی دی۔ میں دم سادھے کھڑا تھا کہ اس کار سے ایک آدمی باہر نکلا۔ وہ جھک کر ایمبسڈر کی جانب بڑھ رہا تھا کہ باقی لوگ بھی گاڑی سے اتر آئے۔ وہ کل چار آدمی تھے۔ سب کے ہاتھ میں ریوالور تھے۔ میں نے درمیان والے شخص کا نشانہ لیا اور فائر کیا۔ یہ فائر ایک ٹرینڈ پولیس انسپکٹر کا تھا۔ سامنے والے کا بھیجا اڑ گیا۔ گھٹی گھٹی چیخ نکلی اور دم توڑ گئی۔ باقی تینوں بھی ہوشیار ہو گئے۔ انہوں نے دوبارہ میری طرف فائر کیا۔ تبھی ایک ساتھ دو فائر پیچھے سے ہوئے اور ایک ساتھ دو بندے چیخ کر گرے۔ یقیناً یہ گولیاں بھینسا اور اس کے ساتھی نے چلائی ہوں گی۔ چار میں سے تین گرے تو چوتھا چیخا۔ ”مجھے نہ مار میرے چھوٹے چھوٹے بچے ہیں۔“ اس کی پکار ایسی تھی جیسے کوئی فقیر صدا لگا رہا ہو لیکن بھینسا اور

خراسان

تاریخ کے مطابق افغانستان میں حضرت عمر فاروقؓ کے دورِ خلافت یعنی 12 ہجری میں اسلام کا نور پھیلنا شروع ہوا۔ حضرت احنف بن قیس کی امارت میں مجاہدین اسلام ایران کے بادشاہ کسریٰ ”یزدگرد“ کے تعاقب میں ہرات پہنچے۔ اس کے بعد بلخ میں اسے آخری شکست دی۔ علاقہ خلافتِ اسلامیہ میں شامل ہو گیا۔ لوگ حلقہ بگوشِ اسلام ہونے لگے۔ حضرت عثمان غنیؓ کے دور یعنی 30 ہجری میں حضرت عبداللہ بن عامر کی امارت میں کابل اور نیشاپور کے علاقے فتح ہوئے اور کابل شاہی کے نام سے کابل میں ایک چھوٹی سی ریاست قائم کی۔ قرونِ وسطیٰ سے لے کر انیسویں صدی تک اس پورے علاقے کو ”خراسان“ کہا جاتا تھا۔ خراسان کے چند اہم مراکز کابل، بلخ، ہرات اور غزنی آج بھی افغانستان کے معروف صوبے ہیں۔

اقتباس: شیخ اسامہ از انور غازی

رحم دو الگ چیز ہے۔ اس نے یا اس کے ساتھی نے بندے کے سر میں گولی اتار دی۔ میں نے آگے بڑھ کر معائنہ کیا اور بھینسا کو مخاطب کر کے کہا۔ ”میں ایمبسڈر لا رہا ہوں۔ فوراً یہاں سے دور ہو جانا ہے۔ گاؤں کے لوگ دور کھڑے تماشا دیکھ رہے ہیں۔ ہو سکتا ہے ادھر بھی آجائیں۔ ہمارے پاس کالی چرن کا مال ہے جو بہت قیمتی ہے۔ یہاں سے بھاگنا ضروری ہے۔“

میں مڑ گیا اور پھر ایمبسڈر تک پہنچا، اسے واپس موڑا اور ان کے قریب پہنچ کر رکا پھر ان دونوں کو ساتھ لے کر واپس ہائی وے پر پہنچا۔ ہائی وے پر پہنچ کر میں نے اپنا رخ لکھنؤ کی طرف کر لیا۔

سڑک پر خاموشی تھی۔ رہ رہ کر ٹرک یا کار گزرنے پر آواز گونجتی پھر خاموشی چھا جاتی۔

شہر میں داخل ہوا تو شہر جگ مگا رہا تھا۔ ایک ٹیلی فون بوتھ پر رکا اور کالیا کو فون کیا۔ اس نے میری آواز سنتے ہی کہا۔ ”سیدھا ہیڈ کوارٹر پہنچو۔ میں انتظار میں بیٹھا ہوں۔ تم لوگوں پر کیا گزری مجھے معلوم ہے اس لیے کہ تمہاری حفاظت کے لیے ایک اور گاڑی پیچھے تھی۔ اسے ہدایت تھی کہ وہ لوگ تبھی مداخلت کریں گے جب تم لوگوں سے کوئی مال چھیننے گا۔ کامیابی کی خبر مل چکی ہے اس لیے جلدی آؤ۔“

میں نے دل ہی دل میں کالیا کو ایک موٹی سی گالی دی اور کار میں آکر بیٹھ گیا۔ دماغ میں ایک ہی بات گردش کر رہی تھی کہ کروڑوں کا مال ہے۔ اسی لیے اسے مال کی پڑی ہوئی ہے۔

کار 80 کی رفتار سے چلاتا ہوا اس پرانی حویلی میں پہنچا جسے کل ہی اندر سے دیکھا تھا۔ یعنی کالیا کا ہیڈ کوارٹر۔

اندر داخل ہوا تو وہاں کا ماحول بھاری تھا۔ بہت سے بندے ادھر ادھر بیٹھے باتیں کر رہے تھے۔ میں انہیں نظر انداز کرتا ہوا کالیا کے کمرے کی طرف بڑھا۔ اندر کالیا موجود تھا۔ مجھے دیکھتے ہی مسکراہٹ اس کے ہونٹوں پر آگئی۔

”آؤ مہارتھی آؤ۔ خوب میدان مارا ہے۔ میں تو روی کو بھول چکا تھا۔ کیا خبر تھی کہ وہ دوبارہ سے میرا مال چھین لینے کی کوشش کرے گا۔ اچھا سبق دیا ہے۔ دل خوش کر دیا۔ آج سے تم میرے خاص آدمیوں میں سے ایک ہو لیکن یاد رکھنا ہر بار خود کو منواتے رہنا ہے۔ میں بزدلی بھی معاف نہیں کرتا۔“

کہہ کر اس نے نوٹوں کی دو گڈیاں میری طرف بڑھائیں کہ یہ خرچ کے لیے ہے۔ حصہ کل پرسوں میں ملے گا۔

اس کی آواز میں وہی ٹھنڈی قوت تھی۔ میں سوچ رہا تھا کہ اعتماد تو حاصل کرتا جا رہا ہوں۔ اب دیکھنا ہے کہ ڈی ایس پی راٹھور میرے کام سے کس قدر خوش ہوتے ہیں۔

کیونکہ کالیا بہت چالاک بندہ ہے اس وقت بھی اس کی آنکھیں میرا اسکین کر رہی تھیں۔

”وشنو۔“ اس نے دبی ہوئی آواز میں کہا۔ ”تو نے میرے لیے یہ کام کیا گویا میرا داہنا ہاتھ جیسا ہو گیا۔“

لیکن میرے دل میں ایک ڈر تھا کالیا میرے دماغ کو پڑھنے کی کوشش بھی کر رہا تھا۔ تبھی اس نے چونک کر کہا۔ ”وشنو تو زخمی ہے؟“

اپنے درد کو چھپاتے ہوئے میں نے کہا۔ ”ٹھیک ہوں کوئی خاص زخم نہیں ہے۔ بازو کو چھوتی ہوئی گولی گزری ہے۔ میں نے دیکھ لیا۔ زخم بڑا نہیں ہے۔“

”پھر بھی تو جا کر ڈریسنگ کرا لے۔ زخم کا ہونا اچھی بات نہیں ہے پھر کل تجھے ایک اور معرکہ سر کرنا ہے۔“

”حکم سر؟“

”کل بتاؤں گا۔“ کالیا نے مسکراتے ہوئے کہا۔ ”تو نے آج میرا بھروسا اور مضبوط کیا وشنو۔“ سانس لے کر دوبارہ بولا۔ ”اب تو میرے ساتھ ہے۔“

لیکن میں کہیں اور تھا۔ میرے ذہن میں ایک ہی بات گونج رہی تھی۔ مجھے یہ ساری معلومات راٹھور تک پہنچانی ہے۔ مجھے ایک موقع چاہیے، ایک ایسا موقع کہ کوئی مجھے دیکھ نہ سکے اور سر راٹھور سے بات بھی ہو جائے۔

وہاں سے اٹھ کر میں اپنی کھولی میں پہنچا۔ ایمبسڈر کار اب میری ہو چکی تھی۔ کالیا نے مجھے بخش دیا تھا۔

کھولی میں داخل ہوا تو بدن چیخ رہا تھا۔ درد کا طوفان جسم و جاں میں اٹھ رہا تھا پھر بھی میں نے اپنی ڈائری کھولی اور لکھا۔ ”آج میں نے کالیا کا بھروسا جیتا لیکن میرے کندھے میں لگی گولی مجھے یاد دلا رہی ہے کہ یہ خطرناک ہے اب مجھے کسی بھی طرح راٹھور تک پیغام پہنچانا ہے تاکہ کالیا کا گینگ توڑا جا سکے اور مجھے اس عذاب بھری زندگی سے نجات ملے اور میں پھر سے محکمہ پولیس کا انسپکٹر بن سکوں۔“

رات کا سناٹا پھیلا تھا لیکن میرے دل میں ایک طوفان اٹھ رہا تھا۔ میرے کندھے کا درد اب بھی مجھے ستا رہا تھا اور اس ڈائری میں لکھے الفاظ میرے سامنے تیر رہے تھے

ہے۔ ڈائری میں مزید لکھا۔ ”میں کالیا کے قریب پہنچ چکا ہوں میں نے اس کا بھروسا حاصل کرلیا ہے۔ کالیا کے لوگ میرے پیچھے اور آگے ہیں۔ کسی کو میرے اصلی مقصد کا ذرا سا بھی شبہ ہوا تو میرا کھیل ختم۔“

ڈائری بند کر کے میں نے ایک طرف رکھی اور چادر اوڑھ کر سونے کی کوشش کرنے لگا۔

صبح اٹھا اور آئینہ میں بازو کے زخم کو دیکھا۔ قسمت اچھی تھی۔ صرف ایک خراش سی آئی تھی۔ باہر نکلنے کی تیاری کر رہا تھا کہ بھینسا آ گیا۔ اس نے بتایا کہ مجھے کالیا نے بلایا ہے۔

جلدی جلدی تیاری کی اور اس کے ساتھ نکل پڑا۔ سڑک پر آیا تو چائے ناشتے والے ہوٹل کھل چکے تھے۔ ایک ہوٹل پر بیٹھ کر ہم نے ناشتا کیا پھر کالیا کی اس حویلی کی طرف چل پڑے جسے اس نے اپنا ہیڈ کوارٹر بنا رکھا تھا۔

ڈرائیو کرتے ہوئے کچھ ہی دیر میں ہم اس پرانی حویلی تک پہنچ گئے۔ بھینسا باہر سے ہی لوٹ گیا۔ میں اندر داخل ہوا۔ اس وقت پورا بنگلا خالی پڑا تھا۔ دو چار لوگ دکھائی دیے۔ یہ وہ لوگ تھے جو وہاں کے مکین تھے، ملازم تھے، ایک قسم کے گارڈ تھے۔ میرا رخ اس جانب تھا جو کالیا کا خاص کمرا تھا۔ جہاں اس سے کل ملاقات کر چکا تھا۔ راستے میں ایک دو نے ہاتھ جوڑ کر نمسکار کیا۔ یہ وہ لوگ تھے جو مجھے کل یہاں آتے دیکھ چکے تھے۔ جواب میں میں نے بھی ہاتھ جوڑ کر نمسکار کیا تھا۔

کالیا کے کمرے کے سامنے پہنچ کر میں نے بند دروازے کو دیکھا اور پھر دروازے پر دستک دی۔

”آ جاؤ۔“ اندر سے کالیا کی آواز سنائی دی۔

میں نے دروازے کو ہلکے سے دھکا دیا۔ دروازہ کھل گیا اور میں اندر داخل ہوا۔ سامنے اپنی مخصوص کرسی پر کالیا بیٹھا ہوا تھا۔ میز پر کچھ کاغذات رکھے تھے۔ اس نے مجھے دیکھتے ہی کہا۔ ”تجھے حیرت نہیں ہو رہی ہے کہ اتنی صبح صبح تجھے بلا لیا۔“

میں نے مسکرا کر کہا۔ ”حیرت کی کیا بات ہے۔ ضرور کوئی کام ہوگا اسی لیے بلایا ہے۔“

کالیا کے چہرے پر مسکراہٹ پھیل گئی۔ اس نے کہا۔

”ایک بات بتائے گا؟“

”پوچھو سیٹھ!“

”تو کس کے لیے کام کرتا ہے؟“

”آپ کے لیے۔“ میرے لہجے میں حیرت تھی۔ مگر کالیا کے چہرے پر پھیکی مسکان تھی۔ میرے اندر ڈر کی ایک لہر سی اٹھی۔ آج اس کا لہجہ کچھ عجیب سا ہو رہا تھا۔ میرے دل کی دھڑکن تیز ہو گئی تھی لیکن میں نے اپنے چہرے پر ظاہر ہونے نہیں دیا۔ اس نے پھر پوچھا۔ ”تو کس کے لیے کام کرتا ہے؟“

میں نے جواب میں کہا۔ ”میں آپ کے لیے کام کرتا ہوں۔“

کالیا نے میری آنکھوں میں دیکھا جیسے وہ میرے دماغ کو پڑھ رہا ہے۔ اس نے کہا۔ ”آج تجھے ایک خاص بندے سے ملانا ہے۔ ایک خاص مہمان سے۔ وہ ایک بڑا اور اہم آدمی ہے۔ اگر تو نے اسے امپریس کر لیا تو سمجھ کہ تیرا بیڑا پار۔“

میں نے جواب میں سر ہلانے پر اکتفا کیا لیکن میرے دماغ میں سوالوں کا تانتا بندھ گیا تھا۔ کیا وہ کوئی پولیس کا اعلیٰ افسر ہے جو کالیا سے ملا ہوا ہے یا کوئی بڑا سیاسی آدمی؟ یقیناً یہ ملاقات میرے مشن کے لیے ایک اور اہم کڑی ہو سکتی تھی یا پھر ایسا بھی تو ہو سکتا ہے کہ کالیا کو مجھ پر شک ہو گیا ہے۔ تصدیق کے لیے کسی کو بلایا ہے۔ میرے دل میں ایک ڈر تھا۔ محسوس کر رہا تھا کہ اس کی نظریں میرے ہر قدم پر ہیں اب وہ مجھے ایک بڑے آدمی سے ملوانا چاہ رہا ہے۔

”تو کچھ دیر باہر بیٹھ۔ وہ اب آتا ہی ہوگا۔ جیسے ہی آیا میں تجھے بلا لوں گا۔“

میں باہر آ گیا۔ مجھے علم تھا کہ اس کمرے میں جانے کے کئی دروازے ہیں۔ ہو سکتا ہے کہ کسی دوسرے دروازے سے وہ بندہ آئے جس سے مجھے ملوانا چاہ رہا ہو۔

میں باہر ہال میں بچھی خالی کرسیوں میں سے ایک پر بیٹھ گیا۔ ابھی کچھ ہی دیر گزری تھی کہ اندر سے بلاوا آ گیا۔ میں کالیا کے کمرے میں پہنچا کمرے میں وہ اپنی مخصوص کرسی پر بیٹھا تھا اس کے سامنے ایک شخص تھا جسے دیکھ کر میں نے سوچا کہ یہ کون ہو سکتا ہے؟

کالیا نے اسے صاحب کہہ کر مخاطب کیا۔ مجھے فوراً سمجھ آ گئی کہ شاید کوئی راج نیتا یا کوئی ایسا شخص ہے جس کے بغیر کالیا کا کاروبار ادھورا ہے۔ وہ شخص مجھے بغور دیکھ رہا تھا۔ بالکل ایسے جیسے وہ آنکھوں سے میرا ایکسرے کر رہا ہو۔

کہانی ابھی جاری ہے

بقیہ واقعات اگلے ماہ ملاحظہ کریں

ہرجائی

جناب مدیر سرگزشت

سلام مسنون!

زیرِ نظر سچ بیانی ایسی ہے کہ دل دکھ سے بھر جائے۔ قسمت ہر کسی کو ایک موقع دیتی ہے کہ وہ اپنی زندگی بدل لے۔ اس کی زندگی بھی بدل گئی تھی۔ گاؤں کی معمولی جھگی سے اٹھ کر حویلی میں پہنچی اور پھر جرمنی۔ یہ خوش حالی پاکر اس نے خود اپنے پیروں پر کلہاڑی مار لی مگر کتنے عجیب انداز میں؟ یہ آپ خود ملاحظہ کرلیں۔

زاہد نسیم

(فرینک فروٹ، جرمنی)

لڑکپن بھی کتنا سنہری دور ہوتا ہے۔ بے فکری سے لبریز، اُمیدوں اور آرزوؤں کی کچی کلیوں سے سجا ہوا۔ نہ دل میں کوئی بوجھ، نہ زندگی کے حساب کتاب کی فکر اور نہ ہی زمانے کی اونچ نیچ کی پروا۔ اس عمر میں کھلی آنکھوں سے دیکھا ہر خواب حقیقت بننے کے لیے مچلتا ہے۔ نگہت بھی کھلی آنکھوں سے خواب دیکھتی۔ وہ گڑیوں کے رشتے بناتی، بارش کے قطروں کو ہاتھوں سے پکڑنے کی ناکام کوشش کرتی، تتلیوں کے پیچھے بھاگتی اور چھوٹی چھوٹی چیزوں میں خوشیاں تلاش کرتی۔ نہ آسائشوں کی تمنا، نہ محرومیوں کا شکوہ مگر دل کی چھوٹی سی دنیا میں ہر جذبہ اپنی پوری آب و تاب کے ساتھ موجود تھا۔ اس بات سے بے خبر کہ بے فکری کا یہ موسم، وقت کی تیز دھوپ میں بہت جلد مرجھا جائے گا۔

غربت کے باعث گھر میں پڑھائی لکھائی کا نہ تو کوئی خاص رواج تھا اور نہ ہی اسے خود پڑھنے کا کوئی شوق۔

اس کے دادا قیام پاکستان کے بعد یہاں آبسے تھے۔ مہاجرین کی آبادکاری کے کمیشن نے ان کو ایک مکان الاٹ کردیا تھا۔ پانچ مرلے کا یہ گھر، سرگودھا کے ایک قدیمی قصبے دولت پور میں تھا جو کسی ہندو گھرانے کی متروکہ ملکیت تھا۔

اس کا باپ سلامت علی پاکستان بننے کے دس برس بعد یہیں دولت پور میں پیدا ہوا، یہیں پلا بڑھا، دو چار جماعتیں پڑھنے کے بعد گھر کی گاڑی کھینچنے کی خاطر محنت مزدوری میں جت گیا۔ نوجوانی کی دہلیز پر قدم رکھا تو دادا کو گھر میں بہو لانے کی سوجھی۔ اس کی اماں برادری سے ہی تھیں اور ننھیال کے معاشی حالات بھی کچھ اچھے نہ تھے اس لیے جونہی سلامت علی کے لیے رضیہ کا رشتہ مانگا گیا، اس کے نانا نے جھٹ سے ہاں کردی تھی۔ وقت گزرا نگہت پیدا ہوئی اور پھر وہ عمر کے اس موڑ پر پہنچ گئی جہاں لڑکپن کی پُرسکون ندی بل کھا کر نوجوانی کے منہ زور دریا میں شامل ہوتی ہے۔ شکل وصورت اور نین نقش بھی اچھے تھے اس لیے جوانی کی ترنگ دل کی رگ رگ میں مچلتی تھی۔ کسی کو اپنا بنانے اور کسی کو اپنے من میں بسانے کی آرزوئیں انگڑائی لیتیں۔ کسی کا مان بننے کی خواہش، کسی کی پسند بننے کی آرزو، کوئی ایسا شخص جو اس کے ہاتھوں میں چپکے سے اجالوں کے رنگ بھر دے۔

☆☆☆

فرحان کی فیملی کوئی دس برس قبل چکوال کے کسی گاؤں سے یہاں شفٹ ہوئی تھی۔ اس کے والد محکمہ زراعت میں کلرک تھے جن کا تبادلہ دولت پور میں ہوا تھا۔ وہ اپنے ماں باپ کا اکلوتا بیٹا تھا۔ وہ لوگ انہی کے محلے میں رہتے تھے۔ فرحان کے گھر کا دروازہ عقبی گلی میں تھا لیکن گھر آپس میں ملے ہوئے تھے۔ وہ بازار میں چھوٹی سی دکان چلاتا تھا۔ نگہت کا گھر بازار کے ایک سرے پر تھا جبکہ اسکول دوسرے سرے پر۔ اسکول جانے کے لیے اسے بازار سے گزر کر جانا پڑتا تھا۔ پڑوس کی دو اور لڑکیاں عذرا اور شگفتہ بھی اس کی ہم عمر اور ہم جماعت تھیں۔ تینوں سہیلیاں ہمیشہ اکٹھی اسکول آتی جاتیں۔ شگفتہ اپنے تایا

کے پاس رہتی تھی۔ اس کے بچپن میں ہی اس کے والدین کا یکے بعد دیگرے انتقال ہو چکا تھا۔ اس کے تایا کی اپنی کوئی اولاد نہیں تھی۔ بھائی اور بھابی کے انتقال کے بعد وہ بھتیجی کو اپنے گھر لے آئے تھے۔ عذرا کے والد منڈی میں مزدوری کرتے تھے۔ صبح اسکول جاتے وقت تو بازار کی بیشتر دکانوں کی طرح فرحان کی دکان بند ہوتی لیکن واپسی پر وہ اکثر اپنی دکان کے تھڑے پر کھڑا نظر آتا۔ شروع شروع میں تو نکہت نے کوئی خاص توجہ نہیں دی لیکن کچھ عرصے بعد اس نے نوٹ کیا کہ وہ ہر روز باقاعدگی سے چھٹی کے وقت اپنی دکان کے باہر کھڑا ہوتا ہے اور ان کے وہاں سے گزرنے کے دوران اس کی نظریں مسلسل انہی پر جمی رہتی ہیں۔ چہرے پر مسکان سجائے آنکھ مچولی کھیلتی نظریں جیسے کچھ کہنا چاہ رہی ہوں۔ لیکن اسے اندازہ نہیں تھا کہ وہ تینوں میں سے کس میں دلچسپی لے رہا ہے۔ چند دن بعد نکہت نے شگفتہ اور عذرا سے اس بارے میں بات کی۔

”ایسے بیسیوں دل پھینک ہر بازار میں ہوتے ہیں تم ایسے لفنگوں کی طرف دھیان مت دیا کرو۔“ شگفتہ نے بے نیازی سے کندھے اچکاتے ہوئے جواب دیا۔

”ہاں شگفتہ ٹھیک کہہ رہی ہے۔ بلکہ اگر کوئی حد کراس کرنے کی کوشش کرے تو عقل ٹھکانے لگانے کے لیے سر بازار جوتوں سے مرمت بھی ضروری ہے۔“ عذرا نے اپنا بستہ دوسرے شولڈر پر منتقل کرتے ہوئے کہا۔ نکہت ان دونوں کی باتیں سن کر خاموش ہوگئی۔

☆☆☆

ایک روز چھٹی کے بعد وہ تینوں حسب معمول گھر واپس آرہی تھیں۔ اسکول سے نکل کر انہوں نے سڑک پار کی ہی تھی کہ چار لڑکے ان کے تعاقب میں لگ گئے۔ شکل سے ہی وہ لوفر لگتے تھے۔ کچھ فاصلے تک وہ خاموشی سے ان کے پیچھے پیچھے چلتے رہے۔ پھر انہوں نے آپس میں قہقہے لگانا شروع کر دیئے۔ وقفے وقفے سے وہ ذومعنی جملے بھی اچھالتے جا رہے تھے۔ ایک تو گرمی نے برا حال کر رکھا تھا۔ اوپر سے ان کی بیہودگی کی وجہ سے غصے کی تپش تینوں لڑکیوں کو اندر ہی اندر مزید کھولا رہی تھی۔ مارے شرم کے وہ گردنیں جھکائے چپ چاپ چلتی رہیں۔ چلتے چلتے جب وہ فرحان کی دکان کے سامنے سے گزریں تو دکان کا شٹر کھلا تھا لیکن خلاف معمول وہ خود نظر نہیں آرہا تھا۔ گھر کا فاصلہ بھی آج میلوں پر پھیلا ہوا لگنے لگا۔ خدا خدا کر کے وہ اپنی گلی کے قریب پہنچیں۔ چاروں لڑکے ابھی بھی چند قدم کا فاصلہ رکھے ان کے پیچھے ہی چلتے آرہے تھے۔ ساتھ ساتھ ان کی بیہودہ فقرے بازی بھی جاری تھی۔ بازار سے نکل کر جونہی وہ اپنی گلی میں گھومیں سامنے سے فرحان ایک اور لڑکے کے ساتھ آتا نظر آیا۔ چاروں لڑکے بھی اپنی لہر میں ان کے پیچھے ہی گلی میں داخل ہوئے۔ تینوں لڑکیوں کو دیکھتے ہی فرحان کے چہرے پر مسکراہٹ نمودار ہوئی۔ مگر ان کے چہروں پر اڑتی ہوائیاں کچھ اور ہی کہانی سنا رہی تھیں۔ پہلے تو اسے کچھ سمجھ نہ آئی، لیکن لڑکوں کی ٹولی کو بھی ان کے پیچھے پیچھے گلی میں گھستے دیکھ کر اسے صورتِ حال کا اندازہ لگانے میں دیر نہ لگی۔ پھر یکایک ایک انہونی ہوئی، قبل اس کے کہ وہ کچھ کہتیں فرحان آگے بڑھا اور جھپٹ کر آگے والے لڑکے کے گریبان پر ہاتھ ڈال دیا۔ بائیں ہاتھ سے اس کا گریبان کھینچتے ہوئے اس نے دائیں ہاتھ کا ایک زوردار تھپڑ اس کے منہ پر جڑ دیا۔ اس سے پہلے کہ وہ سنبھلتا فرحان نے دھکا دے کر اسے نیچے گرایا اور اس سے گتھم گتھا ہوگیا۔ یہ سب کچھ ان لڑکوں کے لیے غیر متوقع تھا۔ وہ بوکھلا گئے۔ باقی تینوں لڑکوں میں سے دو تو گھبرا کر وہیں رک گئے۔ تیسرا ایک موٹی سی گالی دیتے ہوئے اپنے ساتھی کو چھڑانے کے لیے فرحان کی طرف لپکا۔ فرحان نے ایک زناٹے دار تھپڑ اس کے گال پر بھی رسید کیا۔ اس دوران فرحان کے ساتھی نے اس دوسرے لڑکے کو دبوچ لیا۔ دونوں ان پر پل پڑے۔ پیچھے والے دونوں کو بھی صورتِ حال کی سنگینی کا اندازہ ہوگیا۔ ساتھیوں کی درگت بنتے دیکھ کر وہ الٹے پاؤں بازار کی طرف بھاگ کھڑے ہوئے۔ باقی دو کو فرحان اور اس کے ساتھی نے نیچے گرایا ہوا تھا۔ وہ گالیوں کے ساتھ، لاتوں اور گھونسوں سے ان کی تواضع کر رہے تھے۔ شور کی آواز سن کر چند راہگیر بھی پہنچ گئے۔ جنہوں نے بیچ بچاؤ کراتے ہوئے انہیں الگ کیا۔ پٹتے ہوئے دونوں لڑکوں نے اس موقع کو غنیمت جانا اور وہاں سے پاؤں سر پر رکھ کر بھاگے۔ دونوں کے گریبان پھٹے ہوئے تھے اور ایک کے پاؤں میں ایک جوتا بھی نہیں تھا۔ اس دن پہلی بار نکہت کے دل میں فرحان کی محبت کے پودے نے جنم لیا۔

☆☆☆

کچھ ہی دن بعد میٹرک کے امتحان شروع ہوگئے۔ امتحانوں کی مصروفیت میں اور کسی چیز کا دھیان ہی نہیں رہا۔

خدا خدا کر کے امتحانات ختم ہوئے اور اس کے ساتھ ہی اسکول کی زندگی کا بھی خاتمہ ہوگیا۔ نتیجہ جو بھی آتا اس نے کون سا کالج جانا تھا۔ قریبی گرلز کالج سرگودھا شہر میں تھا اور اماں ابا اسے بتا چکے تھے کہ وہ یہ خرچا اٹھانے کے قابل نہیں۔ ویسے تو وہ بہت خوش تھی کہ بالآخر پڑھائی اور کتابوں کے عذاب سے جان چھوٹی لیکن افسوس بھی تھا کہ اب ہرروز فرحان کو دیکھنے کا سلسلہ بھی ٹوٹ گیا۔ اب اس کا سارا دن گھر کی چار دیواری میں گزرنے لگا۔ گھر کے کام کاج میں تو وہ بچپن سے ہی ماہر تھی۔ اب اماں نے سلائی کڑھائی بھی سکھانی شروع کردی تھی۔ اکثر اس کا دل مچلتا کہ بازار کا چکر لگائے تاکہ فرحان کو دیکھ سکے۔ چند ایک بار سودا سلف کے بہانے بازار گئی بھی مگر وہ دکھائی نہ دیا۔ یکطرفہ محبت کی چنگاری اندر ہی اندر آہستہ آہستہ بھڑکنا شروع ہو چکی تھی۔ ہر وقت وہ اسی کے خیالوں میں کھوئی رہتی اُس دن بھی وہ برآمدے میں چارپائی پر لیٹی، آسمان پر تیرتے بادلوں کے بیچ اپنی سوچوں کی پتنگ اڑا رہی تھی کہ اماں کی آواز نے اسے خیالات کے افق سے زمین پر واپس کھینچ لیا۔

"نگہت بیٹا، ذرا یہ کپڑے تو چھت پر پھیلا آؤ۔"

اماں نے دھلے ہوئے کپڑوں کا گٹھا اس کے پاس رکھتے ہوئے کہا۔ اوپر نچوڑا ہوا دوپٹا رکھا تھا، جس میں سے صابن کی خفیف سی خوشبو آرہی تھی۔

"جی اماں ابھی جاتی ہوں!" اس نے خوابوں سے واپس لوٹتے ہوئے کہا لیکن دل کہیں آسمان پر ہی اٹکا ہوا تھا۔

کپڑوں کی ٹوکری اٹھا کر وہ چھت پر آئی۔ ابھی پہلا دوپٹا ہی پھیلایا تھا کہ لہراتے ہوئے باریک دوپٹے کے اس پار اسے فرحان کا عکس دکھائی دیا۔ پہلے تو وہ سمجھی شاید یہ اس کا وہم ہے لیکن جب غور سے دیکھا تو وہ واقعی اپنی چھت پر کھڑا تھا۔ اپنی مخصوص مسکراہٹ چہرے پر سجائے وہ اس کی طرف ہی دیکھ رہا تھا۔ وہ ہلکا سا مسکرائی اور دوبارہ کپڑے پھیلانے میں مشغول ہوگئی کچھ لمحوں بعد اس نے کن انکھیوں سے دیکھا تو وہاں کوئی بھی نہیں تھا۔ شاید نیچے اتر گیا ہے۔ وہ کچھ اداس ہوگئی۔ آخری قمیص تار پر ڈال کر وہ سیڑھیوں کی جانب بڑھ رہی تھی کہ ایک چھوٹا سا پتھر اس کے قدموں میں آکر گرا۔ اس نے مڑ کر دیکھا تو وہ اپنی چھت پر کھڑا تھا۔ مسکراتے ہوئے اس نے ہاتھ سے پتھر کی جانب اشارہ

اسکینر سے گزرنے والی خاتون ہلاک

روس میں ایک جوان خاتون ائرپورٹ کی اسکیننگ مشین سے گزرنے کے بعد فوت ہوگئی کیوں کہ اس کے دل میں بیٹری سے چلنے والا پیس میکر نصب تھا۔ روسی اخبار کے حوالے سے ایک سعودی روزنامے کی رپورٹ کے مطابق 30 سالہ ڈیانا ٹولسٹووا اپنے 33 سالہ شوہر میکسم کے ساتھ ائرپورٹ گئی جہاں سے اسے دوسرے شہر جانے کے لیے ایک پرواز میں سوار ہونا تھا۔ میکسم نے بتایا کہ اس کی بیوی نے سیکیورٹی اہلکاروں کو میڈیکل رپورٹ دکھائی جس میں واضح تھا کہ اس کے دل میں پیس میکر لگا ہوا ہے جو اسکینر کی ریڈیائی لہروں سے شدید متاثر ہوسکتا ہے اور خاتون کو نقصان پہنچ سکتا ہے۔ تاہم سیکیورٹی اہلکاروں نے ڈیانا کو پھر بھی اسکینر سے گزرنے پر مجبور کیا۔ میکسم کے مطابق ڈیانا اسکینر سے گزرنے کے بعد... جیسے ہی ویٹنگ لاؤنج میں پہنچی اسے چکر آیا اور وہ اچانک گر گئی۔ میکسم کا کہنا تھا کہ میں طبی امداد کے لیے چیختا رہا مگر اتنی دیر میں وہ دنیا سے جا چکی تھی۔ ائرپورٹ حکام نے اس واقعے کی تحقیقات کا حکم دے دیا ہے۔

مرسلہ: ہانی رضوی۔ لاہور

شاد عظیم آبادی پٹنہ، بہار کے رہنے والے تھے۔ اس دور کے بڑے شعراء میں بڑا مقام رکھتے تھے۔ سرسید اور خواجہ الطاف حسین حالی سے بہت متاثر تھے۔ سرسید احمد خاں سے انہیں خاص تعلق تھا وہ ہمیشہ ان کی علمی و ادبی خدمات کو سراہتے رہے، انہیں جب بھی موقع ملا سرسید کے خیالات و نظریات کی ترویج و اشاعت میں اہم حصہ لیا۔ 1889ء میں شاد دہلی گئے تو واپسی میں علی گڑھ بھی پہنچے اور دو دن تک سرسید کے مہمان رہے، جب مدرسہ اور بورڈنگ ہاؤس کا معائنہ کیا تو سرسید کے کارناموں سے بے حد متاثر ہوئے اور فی البدیہہ کئی رباعیاں نظم کر کے مولانا حالی کے سپرد کردیں۔

کیا۔ ننھے سے پتھر کے گرد ایک چھوٹا سا کاغذ لپٹا ہوا تھا۔ اس کا دل بے قابو ہونے لگا، لرزتے ہاتھوں سے اٹھا کر اس نے کھولا تو پہلی سطر پڑھتے ہی اس پر ایک سرخوشی طاری ہو گئی۔ یہ فرحان کی طرف سے لکھا محبت نامہ تھا۔ اس نے فوراً کاغذ بند کر کے مٹھی میں دبایا اور فرحان کی طرف نگاہ اٹھائے بغیر شرماتے ہوئے نیچے کی طرف بھاگی۔ جلدی جلدی سیڑھیاں پھلانگتی وہ نیچے اتری تو اماں برآمدے میں بیٹھی سبزی کاٹ رہی تھیں۔ چپ چاپ ان کے پاس سے گزرتی ہوئی وہ کمرے میں گھس گئی۔ اس وقت گھر پر ان دونوں کے علاوہ کوئی نہیں تھا۔ کمرے میں پہنچ کر اس نے نہایت بے تابی سے کاغذ کھول کر پڑھنا شروع کیا۔ جوں جوں وہ اس محبت نامے کو پڑھتی جا رہی تھی، دل کے دریا میں جذبات کا جوار بھاٹا بپھرتا جا رہا تھا۔ اس نے کاغذ کو سنبھال کر اپنی کتاب میں رکھ دیا اور سارا دن یہی سوچتی رہی کہ کن الفاظ میں اپنے جذبات کو سموئے؟ شام کے کھانے سے فارغ ہو کر اس نے جوابی خط تحریر کیا جس میں اپنے دل کے بھی جذبات رقم کر دیئے۔ سونے سے پہلے اس خط کو بھی اس نے اپنے سرہانے کے نیچے رکھی کتاب میں چھپا دیا۔ یہ وہ دور تھا جب موبائل فون نہیں ہوا کرتے تھے۔ لیکن اس رات نیند کا آنا محال تھا۔ اگلے روز مقررہ وقت پر وہ دھڑکتے دل کے ساتھ چھت پر گئی۔ فرحان، حسب وعدہ، پہلے ہی اپنی چھت پر موجود تھا۔ گزشتہ روز کی طرح آج بھی دونوں کے درمیان معنی خیز مسکراہٹوں کا تبادلہ ہوا۔ اس نے کاغذ کو ویسے ہی ایک پتھر پر لپیٹ کر اس کی چھت پر پھینکا۔ جسے فرحان نے فوراً اٹھا لیا۔ نگہت نے ہنستے ہوئے ہاتھ سے اسے الوداعی اشارہ کیا اور جلدی جلدی نیچے اتر آئی۔ اس کے بعد باہمی خطوط کے تبادلوں کا یہ سلسلہ چل نکلا۔ پیار کی پینگ پروان چڑھتی رہی۔ اسی دوران امتحانات کا نتیجہ بھی آ گیا۔ اس کے ساتھ ساتھ شگفتہ اور عذرا بھی پاس ہو گئی تھیں۔ ان کے گھر والوں نے انہیں کالج میں داخل کروا دیا اور نگہت گھرداری کے کاموں میں مصروف ہو گئی۔ دسویں جماعت کے بعد نہ صرف نگہت کی پڑھائی چھوٹی، بلکہ خواب بھی آہستہ آہستہ بکھرنے لگے اب کتابوں اور کاپیوں کی جگہ برتنوں کی کھنک، جھاڑو کی سرسراہٹ، پونچھے کی نمی اور چولہے کی آنچ نے لے لی تھی۔

☆☆☆

پھر ایک دن ایک اور واقعہ پیش آیا۔ سردیوں کی ایک شام تھی، سلامت علی کام سے واپس آنے والا تھا۔ اس کی واپسی ہمیشہ عصر اور مغرب کے درمیان ہوتی۔ نگہت نے سوچا ابا کے آنے سے پہلے پہلے چھت پر فرحان کا خط پھینک آئے۔ دونوں کی چھتوں کے درمیان فرحان کے گھر کا چھوٹا سا صحن تھا۔ اس کا جلد بازی میں پھینکا ہوا کنکر بجائے فرحان کی چھت پر گرنے کے نیچے صحن میں جا گرا۔ اس نے کوئی توجہ نہ دی اور بے دھیانی میں نیچے اتر آئی۔ اس بات سے بے خبر کہ آج قسمت نے اس کے جذبوں کے کچے رنگوں پر تند دھوپ کی چادر تاننے کا فیصلہ کر لیا ہے۔ یہ تو اسے بعد میں پتا چلا کہ نیچے صحن میں اس کے ابا اپنے کسی دوست کے ساتھ حقہ گڑگڑا رہے تھے۔ اور وہ خط سیدھا ان کے قدموں میں جا گرا تھا۔

وہ اس سب سے بے خبر نیچے آئی تو سلامت علی بھی اسی لمحے گھر میں داخل ہوا۔ آج اس نے ابا کا پسندیدہ سالن قیمہ کریلے بنائے تھے۔ ہاتھ منہ دھو کر وہ کھانے کے لیے بیٹھا ہی تھا کہ دروازے پر ایسی زوردار دستک ہوئی جیسے کوئی ہتھوڑے برسا رہا ہو۔ اس نے اٹھ کر دروازہ کھولا تو سامنے چوکھٹ پر فرحان کے ابا کھڑے تھے۔

''آیئے آیئے اعوان صاحب کیسے آنا ہوا؟'' سلامت علی کے لہجے سے حیرت عیاں تھی۔

''سلامت علی مجھے تم سے ایک نہایت ضروری بات کرنی ہے۔'' اکھڑے ہوئے لہجے میں انہوں نے جواب دیا۔

''کہیے اعوان صاحب خیریت تو ہے نا؟'' سلامت علی کے چہرے پر پریشانی کے آثار نمودار ہوئے۔

''یہاں دروازے پر نہیں اندر بیٹھ کر بات کرتے ہیں۔''

اس نے انہیں اندر آنے کا راستہ دیا اور وہ دونوں صحن میں پڑی چارپائیوں پر ہی بیٹھ گئے۔

''سلامت علی تمہیں گھر کی بھی کچھ خبر ہے کہ تمہاری غیر موجودگی میں کیا کچھ چل رہا ہے؟'' بیٹھتے ہی فرحان کے والد نے تیز لہجے میں کہا۔

''کیوں کیا ہوا اعوان صاحب؟'' سلامت علی نے کچھ نہ سمجھنے والے انداز میں پوچھا۔

''وہی جو نہیں ہونا چاہیے۔ تمہاری بیٹی محلے میں عشق کی پیچ لڑاتی پھر رہی ہے۔ میرے بیٹے پر بھی ڈورے ڈال رہی ہے۔''

"منہ سنبھال کر بات کریں اعوان صاحب۔"
سلامت علی غصے سے تلملایا۔

"آواز نیچی رکھو سلامتے۔ غصہ تو مجھے بھی بہت آیا تھا۔ میرا تو دل کر رہا تھا کہ پورے محلے کے سامنے یہ بات کروں مگر میں جانتا ہوں یہ عمر ہی ایسی ہوتی ہے۔ اسی لیے گھر کے اندر تجھے آرام سے سمجھانے آیا ہوں۔" انہوں نے غصے پر قابو پاتے ہوئے کہا۔

وہ کمرے کی کھڑکی کے ساتھ چمٹی ان دونوں کے درمیان ہونے والی ساری باتیں سن رہی تھی۔ رضیہ بھی چوکی پر بیٹھی شعلہ بار نظروں سے اسے گھور رہی تھیں۔

"یہ دیکھ اپنی بیٹی کے کرتوت۔" انہوں نے نگہت کا لکھا ہوا خط سلامت علی کے سامنے پھینکتے ہوئے کہا۔

سلامت علی کا دماغ گھوم کر رہ گیا۔ سکتے کے عالم میں کبھی خط کو اور کبھی اعوان صاحب کی طرف دیکھتا۔ "اپنی بیٹی کو لگام ڈال کر رکھو۔ آیندہ اگر اس نے ایسی کوئی حرکت کی تو پھر سارا محلّہ تماشا دیکھے گا۔" اپنی بات ختم کر کے وہ پاؤں پٹختے ہوئے دروازے سے باہر نکل گئے۔

ادھر نگہت کی یہ حالت کہ کاٹو تو بدن میں لہو نہیں۔ وہ کمرے میں کھڑی شرمندگی اور خوف کے مارے کانپ رہی تھی۔ بے عزتی کے احساس سے اس کا جی چاہا کہ زمین پھٹ جائے اور وہ اس میں سما جائے۔ اعوان صاحب کے جانے کے بعد کچھ دیر کے لیے گھر میں مکمل سناٹا چھا گیا۔ جیسے کسی طوفان کے آنے سے پہلے ایک عارضی سکوت ہر طرف چھا جاتا ہے۔ سلامت علی چارپائی پر بیٹھا مٹھیاں بھینچتا رہا۔ کچھ دیر بعد وہ کمرے میں آیا اور کنڈی چڑھا دی۔ اس دن اس نے پہلی بار بیٹی پر ہاتھ اٹھایا۔ رضیہ نے بھی خاوند کو روکنے کی کوشش نہیں کی۔ نگہت چپ چاپ مار کھاتی رہی۔ غصے کی آندھی کچھ تھمی تو سلامت علی اپنی بیوی کی طرف مڑا جو چادر میں منہ چھپائے آنسو بہا رہی تھیں۔

"دیکھا تو نے اپنی لاڈلی کے لچھن۔ ہماری ناک کٹوا کر ساری عزت خاک میں ملا دی۔" وہ گرجا۔ "اس پر عشق کا بھوت سوار ہو چکا ہے۔ آج کے بعد یہ گھر سے باہر قدم نہیں نکالے گی۔" وہ نہ جانے کیا کیا کہتا رہا اور نگہت کسی مجرم کی طرح چہرے کو پلو میں چھپائے سسکتی رہی۔ قیمہ کریلے وہیں پڑے رہے، اس رات کسی نے بھی کھانا نہیں کھایا۔

☆☆☆

اگلے چند دن گھر کی فضا خاصی بوجھل رہی۔ اس کے والدین بھی زیادہ تر خاموش ہی رہتے، وہ سوچتی کیا واقعی اس نے کوئی جرم کیا ہے۔ اور اگر یہ جرم تھا تو اس میں فرحان بھی تو برابر کا شریک تھا اس کے ابا نے اپنے بیٹے کو کیوں کچھ نہیں کہا۔ اس سے پہلے کہ حالات دوبارہ معمول پر آتے اس کی زندگی میں ایک اور بھونچال آ گیا۔ اماں نے اسے بتایا کہ کل اچھے سے کپڑے پہن کر تیار ہو جانا۔ سلیم کے گھر والے تمہیں دیکھنے آ رہے ہیں۔ اس کے تو ہوش اڑ گئے۔ سلیم عرف جھیما اس کی رشتے کی خالہ کا بیٹا تھا جو سرگودھا شہر میں رہتی تھیں اور سلیم بھی وہیں رکشا چلاتا تھا۔ اگلے دن دوپہر کو سلیم، اور اس کے والدین اپنے چند دیگر قریبی رشتہ داروں کے ہمراہ آئے۔ سلیم عمر میں اس سے چند سال بڑا تھا۔ ناٹا سا قد، گہری سانولی رنگت۔ چائے پینے کے دوران وہ اپنے ٹیڑھے میڑھے دانت نکوستا اور بار بار ندیدوں کی طرح آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر اسے دیکھتا۔ نگہت کو تو اسے دیکھ کر ہی وحشت ہو رہی تھی اور اس سے بھی زیادہ اذیت ناک یہ تصور تھا کہ اسے ساری زندگی اس کے ساتھ بتانی پڑے گی۔ شام ڈھلے روانہ ہونے سے قبل ہی سلیم کی اماں نے عندیہ دیا کہ ان کی طرف سے یہ رشتہ پکا سمجھا جائے لیکن شادی کے لیے انہیں دو تین سال کی مہلت چاہیے۔ سلیم کی دو بڑی بہنیں ابھی گھر میں ہی بیٹھی تھیں اور ان کی شادی کی عمر نکلی جا رہی تھی۔ ان کی رخصتی کے فرض سے سبکدوش ہوتے ہی وہ نگہت کو بیاہ کر لے جائیں گے۔

"یہ تو اچھی بات ہے، ہمیں بھی تیاری میں سال دو سال لگ ہی جائیں گے۔" رضیہ کے چہرے پر اطمینان لہرایا۔ جیسے وہ کوئی سامان تھی جسے باندھ کر اگلوں کے حوالے کرنے کے لیے انہیں وقت درکار تھا۔

ان کے جانے کے بعد اسے اپنے خوابوں کی دنیا ملیا میٹ ہوتی نظر آئی۔ ارمانوں کی قبر کی کھدائی شروع ہو چکی تھی۔ خط والے واقعے کو کئی مہینے گزر چکے تھے۔ تب سے وہ نہ تو دوبارہ چھت پر گئی اور نہ ہی گھر سے باہر نکلی۔ رضیہ بھی اس پر کڑی نظر رکھتی۔ شب و روز اپنی ڈگر پر چلتے رہے۔ لیکن پہلی محبت کو دفن کرنا اتنا آسان کہاں ہوتا ہے۔ فرحان کو دیکھنے، اس سے ملنے کو اس کا دل بار بار مچلتا۔ وہ کوئی موقع تلاش کر رہی تھی کہ کسی طرح فرحان کو ساری صورت حال سے آگاہ کرے۔ تاکہ وہ دونوں مل کر اس مشکل سے نکلنے کی کوئی سبیل کریں۔ ایک دن وہ موقع قدرت نے خود

ہی فراہم کر دیا۔ پڑوس کے گاؤں میں کسی رشتہ دار کی شادی تھی۔ سلامت علی اور رضیہ نے اس روز وہاں جانا تھا۔ جانے سے پہلے انہوں نے اسے گھر میں ہی رہنے کی سختی سے تاکید کی۔ صبح دس بجے کے قریب وہ گھر سے نکلے۔ نگہت جانتی تھی کہ فرحان بارہ بجے کے قریب اپنی دکان کھولتا ہے۔ پھر بھی احتیاطاً اس نے ایک بجے تک اپنے آپ کو روکے رکھا۔ ایک بجے وہ اٹھی، اماں کا برقعہ اوڑھا اور ہمت کر کے بازار کی طرف نکل کھڑی ہوئی۔ وہ نہیں چاہتی تھی کہ کوئی اسے وہاں جاتے ہوئے پہچان لے۔ دکان خالی تھی اور فرحان اکیلا ہی بیٹھا ہوا تھا۔ اتنے مہینوں بعد اسے دیکھتے ہی اس کا دل شدت سے دھڑکا، ہمت کر کے وہ اندر داخل ہوئی۔ ایک برقعہ پوش عورت کو اپنی دکان میں داخل ہوتے دیکھ کر وہ گڑبڑا گیا۔ نگہت نے چہرے سے نقاب سرکایا تو، شکل دیکھ کر اسے حیرت کا ایک جھٹکا لگا۔ دونوں کی نظریں ملیں۔ چند لمحوں تک دونوں ساکت وصامت کھڑے رہے۔

”تت تت تم...... تم یہاں؟“ فرحان نے اپنی گھبراہٹ پر قابو پاتے ہوئے کہا۔

”فرحان کب سے تم سے ملنا چاہ رہی تھی۔ بڑی مشکل سے آج موقع ملا ہے۔ تم شاید نہیں جانتے مجھ پر کیا بیت رہی ہے۔“ وہ اسے بتانا چاہ رہی تھی کہ گزشتہ کئی ماہ اس نے کس عذاب میں گزارے۔

”اچھا بیٹھو تو سہی، تم بتاؤ کیسی ہو؟“ اس نے سامنے پڑی کرسی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

”کیا بتاؤں کیسی ہوں، سمجھ لو کہ بس زندہ ہوں۔“ وہ بمشکل کہہ پائی۔

”اس دن جو بھی ہوا اچھا نہیں ہوا نگہت۔ ہمارے گھر میں بھی ایک طوفان کھڑا ہو گیا تھا۔ ابا نے مجھے بھی بہت برا بھلا کہا۔“ کن انکھیوں سے باہر سڑک کی طرف دیکھتے ہوئے وہ بولا۔

”تمہیں نہیں معلوم، گھر والوں نے میرا رشتہ سلیم سے طے کر دیا ہے جبکہ مجھے اسے دیکھ کر ہی گھن آتی ہے۔ تم کچھ کرو فرحان۔ کسی بھی طرح اپنے گھر والوں کو راضی کرو کہ وہ ہمارے گھر رشتہ بھیجیں۔ میں اماں ابا کو راضی کر لوں گی۔“ نگہت نے اس کی بات کاٹتے ہوئے کہا۔

”دیکھو نگہت میرے گھر والے کبھی بھی اس رشتے پر راضی نہیں ہوں گے۔“ چند لمحے خاموش رہنے کے بعد وہ بولا۔

”اگر ہم دونوں کے والدین راضی نہیں ہوں گے تو پھر ہمارے پاس ایک ہی حل ہے۔“ اس نے بڑے اعتماد سے کہا۔

”وہ کیا؟“

”ہم بھاگ کر شادی کر لیتے ہیں۔ یہاں سے دور کسی اور شہر میں چلے جائیں گے۔“

”نہیں نگہت یہ سب کچھ اب ممکن نہیں ہے، میرے والدین نے بھی میرے لیے ایک لڑکی پسند کر لی ہے۔ میری تایازاد کزن، رشتے کی بات پکی ہو چکی ہے اور محرم کے بعد ہمارا نکاح ہے۔“ فرحان نے آنکھیں چراتے ہوئے اس کے کانوں میں پگھلا ہوا سیسہ انڈیلا۔

”یہ کیا کہہ رہے ہو؟ تم نے تو مجھ سے محبت کے عہدو پیمان کیے تھے اور اب تم کسی اور سے شادی کر رہے ہو؟“

”دیکھو نگہت مجھے تم سے محبت تھی بلکہ ہے۔ لیکن میں مجبور ہوں۔ اپنے والدین اور خاندان کو ناراض نہیں کر سکتا۔ زندگی محض خوابوں کے سہارے بسر نہیں کی جا سکتی۔ بہتر یہی ہے کہ ہم دونوں ایک دوسرے کو بھول جائیں۔ تم بھی سلیم سے شادی کر لو۔“ اس نے اپنا فیصلہ سناتے ہوئے کہا۔

نگہت کے تو وہم و گمان میں بھی نہیں تھا کہ اس کے دامن میں پڑے اُمیدوں کے کھنکھناتے سکوں کو وہ یوں کھوٹا قرار دے کر ٹھکرا دے گا۔ اس کی پلکیں نم ہو گئیں، آنسو آنکھوں سے اُمڈ کر پلکوں پر لرزنے لگے۔ دھندلائی ہوئی آنکھوں سے وہ فرحان کو دیکھ رہی تھی، وہ شخص جس کی خاطر اس نے پابندی، ڈانٹ، مار، تہمت، سب کچھ سہہ لیا تھا۔ اس کے لیے اس کی محبت صرف وقت گزاری تھی۔ فرحان بھی نظریں چراتے ہوئے کچھ کہنے کی کوشش کر رہا تھا، مگر الفاظ اس کے حلق میں ہی گھٹ رہے تھے۔ نگہت نے نقاب دوبارہ اپنے چہرے پر ڈالا اور اس کی باقی باتیں سنی ان سنی کرتے دروازے سے باہر نکل آئی۔ نہ تو فرحان نے اسے روکنے کی کوشش کی اور نہ ہی نگہت نے پلٹ کر اس کی طرف دیکھا۔ گھر واپس پہنچ کر وہ دیر تک آنسو بہاتی رہی۔

☆☆☆

چوہدری حکم داد دولت پور کے چند آسودہ حال زمینداروں میں سے ایک تھا۔ قصبے کے قرب و جوار میں

اس نے اپنی زمینیں مختلف لوگوں کو ٹھیکوں پر دے رکھی تھیں۔ سلامت علی بھی برسوں سے اسی کی کچھ زمین پر کھیتی باڑی کرتا چلا آ رہا تھا۔ فصل تیار ہونے کے بعد نصف نصف بانٹ لی جاتی۔ چوہدری نے اگلی فصل کے لیے زمین ان کی بجائے اب اپنے کسی رشتہ دار کو ٹھیکے پر دے دی۔ اور انہیں فارغ کر دیا تھا۔ یہ کوئی اچھی خبر نہیں تھی۔ گھر کی بھر دو آمدن کا بڑا حصہ اسی کاشتکاری کا مرہون منت تھا۔ فصل کی بوائی، کاشت وغیرہ کے بعد کٹائی تک کے درمیانی وقفے میں سلامت علی راج مستریوں کے ساتھ مزدوری بھی کر لیتا تھے۔ سلامت علی نے چوہدری حکم داد کی بہت منت سماجت کی کہ وہ اپنے فیصلے پر نظر ثانی کرے اور ان کی روزی روٹی کا یہ آسرا نہ چھینے مگر وہ راضی نہ ہوا۔ ہوتا بھی کیوں؟ کسی پرائے کی خاطر اپنے رشتے داروں کو بھلا کون ناراض کرتا ہے؟ نتیجہ یہ ہوا کہ چند ہی مہینوں میں گھر کے مالی حالات کی ڈولتی ناؤ ڈوبنا شروع ہو گئی۔ سلامت علی نے مستقل بنیادوں پر دیہاڑی دار مزدور کے طور پر بازاروں کی خاک چھاننی شروع کر دی۔ مزدوری بھی ملتی کبھی نہ ملتی۔ یہ سب دیکھ کر رضیہ نے بھی لوگوں کے گھروں میں کام شروع کر دیا۔ نگہت کو بھی اکثر وہ اپنے ساتھ لے جاتی۔ دونوں ماں بیٹی دولت پور کے امیر اور آسودہ حال گھروں میں برتن مانجھتیں، جھاڑو پونچھا لگاتیں، زمینداروں کی فصلوں کی کٹائی کرتیں۔ زندگی کے سکّے کا رخ پلٹ گیا۔ دن رات کی ہوش نہ رہی۔ ہاتھوں پر نقش غربت کی لکیر برتن مانجھتے مانجھتے بھی ختم نہ ہوئی۔

سلیم کے گھر سے دو تین مہینے کے وقفے سے کوئی نہ کوئی ان کے ہاں ایک آدھ چکر لگا لیتا۔ اس کی دونوں بہنوں کی رخصتی بھی ہو چکی تھی۔ رخصتی پر نگہت کے گھر والوں کو بھی مدعو کیا گیا تھا۔ نہ چاہتے ہوئے بھی اسے اماں ابا کے ساتھ شادی میں شرکت کے لیے سرگودھا جانا پڑا۔ سلیم کے گھر والوں نے ان کی خوب آؤ بھگت کی۔ شادی کے ہنگامے میں سلیم بھی بہانے بہانے سے اس کے آس پاس منڈلانے کی کوشش کرتا رہا۔

☆☆☆

برسات کا موسم تھا۔ سلامت علی ان دنوں بازار میں زیرِ تعمیر ایک عمارت میں کسی ٹھیکیدار کے ساتھ مزدوری کر رہا تھا۔ کئی دنوں سے مسلسل بارشیں ہو رہی تھیں۔ بارشوں کی وجہ سے تعمیراتی کام رکا ہوا تھا۔ وہ بھی دوسرے راج مزدوروں کی طرح گھر بیٹھنے پر مجبور تھا۔ رضیہ اور نگہت سہ پہر کو کام سے واپس آئیں تو شفیق کو برآمدے میں سلامت علی کے پاس بیٹھے پایا۔ شفیق ساتھ والے چک میں رہتا تھا اور سلامت علی کا بچپن کا دوست تھا۔

علیک سلیک کے بعد، اس نے رضیہ سے حال احوال پوچھا۔

''بس گزر رہی ہے شفیق بھائی۔ آپ سنائیں آج ہمارے گھر کا رستہ کیسے بھول گئے؟'' رضیہ نے جواب دیا۔

بڑے دنوں سے سلامت علی سے ملاقات نہیں ہوئی تھی اور آج تو ایک ضروری کام بھی تھا۔ اچھا ہوا تم لوگ بھی آ گئے۔ شفیق نے نگہت کے سر پر ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا۔

''کیسا ضروری کام شفیق بھائی۔'' رضیہ چائے کی دیگچی چولہے پر رکھتے ہوئے بولی۔

''بھابی مجھے معلوم ہے تم لوگوں کے حالات کچھ اچھے نہیں جا رہے۔ پتا چلا ہے کہ چوہدری نے بھی زمین واپس لے لی ہے۔ جب تک کھیتی باڑی کا آسرا تھا تب تک تو ٹھیک تھا۔ اب سلامت علی بھی جوان نہیں رہا کہ ہر روز مزدوری کر سکے۔ میرے پاس ایک حل ہے اگر تم لوگوں کو پسند ہو تو؟'' شفیق نے توقف کرتے ہوئے سوالیہ نظروں سے ان کی جانب دیکھا۔

''کھل کر بتائیں شفیق بھائی کیا بات ہے؟'' رضیہ اس کی بات سن کر مزید بے چین ہو گئی۔

شفیق نے انہیں بتایا کہ اس کے ایک کزن جرمنی میں رہتے ہیں جن کا نام خواجہ شفیق ہے۔ خواجہ صاحب رہتے تو ساتھ والے گاؤں میں ہیں لیکن دولت پور میں بھی ان کی کچھ زمینیں ہیں۔ مدتوں سے وہ جرمنی میں ہی آباد ہیں لیکن سال دو سال میں ایک آدھ چکر پاکستان کا لگاتے رہتے ہیں۔ ان کی والدہ اور بھائی بھاوج گاؤں والی حویلی میں رہتے تھے۔ لیکن بھائی کچھ عرصہ قبل فوت ہو گیا ہے۔ اس کی بیوہ ابھی تک تو اسی حویلی میں ہی رہ رہی ہے مگر میکے والے اب اسے واپس گھر لے جانا چاہ رہے ہیں۔ مسئلہ یہ ہے کہ اس کے جانے کے بعد ان کی والدہ اکیلی رہ جائیں گی۔ وہ ضعیف العمر ہیں اور انہیں دیکھ بھال کی ضرورت بھی رہتی ہے۔ گھر کا کام کاج بھی نہیں کر سکتیں۔ اس لیے انہیں ایک چھوٹی سی فیملی کی تلاش ہے۔ معقول تنخواہ کے ساتھ ساتھ رہائش بھی دی جائے گی۔ اس کے علاوہ زمین بھی کاشتکاری کے لیے ٹھیکے پر مل جائے گی۔ اس لیے خواجہ

صاحب چاہتے ہیں کہ کوئی اچھی اور قابل بھروسا فیملی مل جائے جو گھریلو کام کاج کے ساتھ ساتھ ان کی والدہ کی دیکھ بھال بھی کرسکے۔ میرے ذہن میں چند ایک گھرانے تھے لیکن سب سے پہلے مجھے تم لوگوں کا خیال آیا۔ اس لیے میں نے سوچا پہلے آپ لوگوں سے ہی بات کی جائے۔'' شفیق نے چائے کی پیالی اٹھاتے ہوئے سوالیہ نظروں سے سلامت علی کی جانب دیکھا۔

سلامت علی جو کافی غور سے شفیق کی باتیں سن رہا تھا چند لمحوں کے لیے خاموش ہوگیا۔ اسی اثنا میں رضیہ بھی اٹھ کر ان کے برابر آبیٹھی۔ ''سوچ کیا رہے ہو نگہت کے ابا، بھائی شفیق ٹھیک کہہ رہے ہیں۔ ہم سب کب تک در، در مزدوریاں کرتے رہیں گے۔ جوان بیٹی کا ساتھ ہے سچ پوچھو تو اسے اپنے ساتھ لوگوں کے گھروں میں لے کر جانا مجھے ذرا اچھا نہیں لگتا۔ اور تمہاری بھی دیہاڑی کبھی لگتی ہے کبھی نہیں لگتی۔ میں تو کہتی ہوں اس سے اچھا موقع پھر نہیں ملنے والا۔'' رضیہ نے جوش و خروش سے مشورہ دیا۔

''میرا بھی یہی خیال ہے اور یہ تو شفیق کی مہربانی ہے کہ اس نے ہمارے بارے میں سوچا۔ سچی بات تو یہ ہے کہ اگر خواجہ صاحب ہمیں رکھ لیں تو اس سے زیادہ خوشی کی بات ہمارے لیے اور کیا ہوگی۔ نگہت اور تم ان کی گھرداری سنبھال لینا۔ باہر کے سارے کام میں کر دیا کروں گا۔ زمین کا ٹکڑا بھی کاشت کے لیے مل جائے گا۔ اگلے سال ڈیڑھ تک نگہت کی شادی کا فریضہ بھی ادا کرنا ہے۔'' سلامت علی نے رضامندی ظاہر کرتے ہوئے کہا۔

''تو بس ٹھیک ہے سلامت، میں آج ہی عتیق سے بات کر لیتا ہوں۔ تم لوگ چند دنوں تک تیاری کر لو۔'' شفیق نے اٹھتے ہوئے کہا۔ شفیق کی پیشکش ان کے لیے کسی نعمت غیر مترقبہ سے کم نہ تھی۔ پندرہ ہزار روپے ماہانہ کے ساتھ ساتھ زمین بھی کاشت کاری کے لیے ٹھیکے پر مل رہی تھی۔ رضیہ نے سب گھروں میں بتا دیا کہ ہم لوگ دوسرے گاؤں جا رہے ہیں اور آیندہ کام پر نہیں آئیں گے۔ اگلے اتوار کو انہوں نے ضروری ساز و سامان ساتھ لیا اور حویلی میں پہنچ گئے۔ حویلی میں صرف خواجہ عتیق کی والدہ اور بیوہ بھابی سلطانہ موجود تھیں۔ والدہ ضعیف العمر اور بیمار تھیں جنہیں سب بے جی کہتے تھے۔ وہ ان کے کمرے میں گئے تو وہ بستر پر لیٹی ہوئی تھیں۔ شفیق نے ان کا تعارف کرایا تو وہ بھی بہت خوش ہوئیں۔ سلطانہ نے انہیں سارا گھر دکھایا۔ خواجہ صاحب کی والدہ کی دوائیوں، پرہیزی کھانوں اور نگہداشت کی دیگر ضروری ہدایات سے آگاہ کیا۔ آخر میں حویلی سے متصل دو کمروں کا وہ مکان بھی دکھایا جہاں انہوں نے رہنا تھا۔ کمرے پرانے تھے لیکن پھر بھی ان کے اپنے مکان سے اچھی حالت میں تھے۔ چارپائیاں اور بستر بھی موجود تھے۔ برسوں سے مقفل رہنے کے باعث در و دیوار پر جھاڑ جھنکار اور جالے لٹک رہے تھے۔ سلطانہ نے بتایا کہ اگلے اتوار تک وہ یہیں رہے گی تاکہ وہ لوگ سب کاموں سے اچھی طرح واقف ہو جائیں۔ اس کے بعد سب کچھ انہیں خود ہی سنبھالنا ہوگا۔ وہ ہفتہ بہت مصروف گزرا۔ اپنے کمروں کی صفائی ستھرائی تو انہوں نے دو دن میں ہی مکمل کر لی تھی۔ گھر کے دیگر کام کاج کی روٹین میں بھی وہ چند دن میں ہی ماہر ہوگئیں۔ جو چیز سمجھ نہ آتی سلطانہ انہیں سمجھا دیتی۔

پھر سلطانہ کے جانے کا دن بھی آگیا۔ اس نے اپنے کپڑے لتے ایک سوٹ کیس میں پچھلی شام کو ہی پیک کر لیے تھے۔ دن گیارہ بجے کے قریب اس کے والد اور بھائی اسے لینے کے لیے آئے۔ سلطانہ کی کوئی اولاد نہیں تھی۔ اس کے خاوند کو مرے ایک سال سے اوپر ہو چکا تھا۔ پچیس سال کی عمر میں وہ بیاہ کر اس حویلی میں آئی تھی۔ اب وہ پینتیس سال کی تھی لیکن دیکھنے میں تیس سے کم ہی لگتی تھی۔ اتنی سی عمر میں بیوگی کا داغ لیے وہ پہاڑ جیسی زندگی کیسے گزارتی؟ یہی سوچ کر گھر والوں نے اس کا رشتہ ایک مناسب جگہ طے کر دیا تھا۔ آج وہ نہایت افسردہ نظر آ رہی تھی۔ سب لوگ بے جی کے ساتھ بیٹھے باتوں میں مصروف تھے۔ نگہت اور رضیہ باورچی خانے میں دوپہر کا کھانا تیار کر رہی تھیں۔ اسی دوران شفیق اور سلامت علی بھی آگئے۔ سب نے دوپہر کا کھانا ایک ساتھ کھایا۔ کھانے کے بعد سلطانہ کے والد نے بے جی سے جانے کی اجازت چاہی۔ وہ بھی نہایت اداس تھیں۔ رخصت کرتے وقت وہ سلطانہ کو گلے لگا کر رو پڑیں۔

''بیٹی کتنے ارمانوں سے تجھے بیاہ کر اس حویلی میں لائی تھی۔ لیکن تقدیر میں کچھ اور ہی لکھا تھا۔ چلو جیسے سوہنڑے رب کی مرضی، اوپر والا تجھے مستقبل میں لاکھوں خوشیاں نصیب کرے۔'' ڈھیروں دعاؤں کے ساتھ انہوں نے سلطانہ کو رخصت کیا۔ اس کے جانے کے بعد گھر کی فضا کو کچھ دن کے لیے ایک اداس سی خاموشی نے اپنے

حصار میں لے لیا۔

☆☆☆

اگلے چند ہفتوں کے اندر اندر سلامت علی شفیق کی مدد سے زمین پر ٹریکٹر چلوا کر اسے بوائی کے لیے تیار کر چکا تھا۔ یہ زرعی زمین یوں تو کچھ زیادہ نہ تھی مگر پھر بھی اس سے کافی زیادہ تھی جتنی چوہدری حکم داد نے انہیں دے رکھی تھی۔ خواجہ عتیق کے دادا کی ملکیت میں بہت بڑا زرعی رقبہ تھا جو ان کے مرنے کے بعد ان کے والد اور پانچ بھائیوں میں تقسیم ہو گیا تھا۔ والد کے حصے میں آنے والا رقبہ اب بھائی کی وفات کے بعد پورے کا پورا خواجہ عتیق کا ہی تھا۔ اس زرعی رقبے کے علاوہ ان کی دولت پور میں کچھ کمرشل پراپرٹی بھی تھی۔ جس میں چند پلاٹ ابھی خالی پڑے تھے اور کچھ پر دکانیں تعمیر ہو چکی تھیں۔ دکانوں کے کرائے وغیرہ کا حساب کتاب بھی شفیق ہی رکھتا تھا۔ گھر کا کام ہی کتنا ہوتا تھا۔ صفائی ستھرائی، ہانڈی روٹی، کپڑے دھونا اور بے جی کا خیال رکھنا۔ ضعیف العمری کے باوجود وہ چھڑی کے سہارے گھر میں چل پھر لیتی تھیں۔ مہینے میں ایک بار باقاعدگی سے شہر میں انہیں ڈاکٹر کے پاس لے کر جانا پڑتا۔ خواجہ صاحب کا جرمنی سے ہر دوسرے چوتھے روز فون آتا۔ بے جی سے کافی دیر باتیں کرتے۔ سلامت علی گھر پر ہوتا تو ان سے بھی ان کی بات ہوتی۔ سلامت علی کی شخصیت اور مزاج میں بھی نمایاں تبدیلی آ رہی تھی۔ مزدوری والا بوسیدہ صافہ اتار کر اس نے اب پگڑی پہننا شروع کر دی تھی۔ دھول مٹی میں اَٹے کپڑوں کی جگہ صاف اجلے اور استری شدہ کپڑوں نے لے لی تھی۔ چال میں بھی خود اعتمادی آ گئی تھی۔ سچی بات تو یہ ہے کہ وہاں آنے کے بعد ان سب نے حقیقی معنوں میں سکھ کا سانس لیا تھا۔

☆☆☆

شب و روز کے چابک کھاتے، وقت کا گھوڑا سرپٹ دوڑتا رہا۔ ایک سال بیت گیا جب ایک شام نگہت بے جی کو کھانا دینے ان کے کمرے میں گئی تو وہ بہت خوش دکھائی دیں۔

''کیا بات ہے بے جی بڑی خوش لگ رہی ہیں آج؟'' کھانے کی ٹرے کو میز پر رکھتے ہوئے اس نے پوچھا۔

''ہائے نگہت بات ہی خوشی کی ہے۔ میرا عتیق پورے ڈیڑھ سال بعد جرمنی سے آ رہا ہے۔''

''اچھا یہ تو واقعی خوشی کی بات ہے؟ کب آ رہے ہیں وہ؟''

''اگلے مہینے۔''

کھانا کھلانے کے بعد وہ برتن سمیٹ کر کمرے سے نکل ہی رہی تھی کہ ان کی آواز سنائی دی۔

''سلامت علی کو کہنا کل بازار سے عتیق کے لیے تین چار اچھے سے کپڑوں کے جوڑے خرید کر درزی کو سلائی کے لیے دے آئے۔'' انہوں نے تاکید کی۔

''جی ماں جی میں کہہ دوں گی۔'' اس نے سر ہلایا۔

اگلے چند ہفتے گہما گہمی میں گزرے۔ ماں جی ہر روز دن گنتیں۔ اپنی نگرانی میں انہوں نے بیٹے کا کمرا صاف کروایا۔ بستر کی چادریں اور کھڑکیوں کے پردے وغیرہ دھلوائے۔ جس رات خواجہ عتیق کی آمد ہوئی اس سے اگلی صبح جب وہ ناشتا لے کر گئی تو ان کو بے جی کے ساتھ برآمدے میں ہی بیٹھے پایا۔ سلامت علی بھی ان کے پاس ہی بیٹھا ہوا تھا۔ جب سے وہ لوگ اس گھر میں آئے تھے خواجہ عتیق کے بارے میں باتیں تو بہت سنی تھیں لیکن دیکھنے کا موقع آج پہلی بار مل رہا تھا۔ وہ ابھی تک پینٹ شرٹ میں ہی ملبوس تھے۔ عمر میں وہ سلامت علی سے چار چھ سال بڑے تھے لیکن فربہ اندامی کے باوجود اس سے کم عمر ہی دکھائی دیتے۔ کلین شیو چہرہ، نفاست سے تراشے اور ہیئر کلر کیے چمک دار بال۔ وہ برآمدے میں پہنچی تو لمحہ بھر کے لیے سب لوگ خاموش ہو گئے۔

''خواجہ صاحب یہ نگہت ہے میری بیٹی۔'' سلامت علی نے اس کا تعارف کرایا۔

''ماشا اللہ بہت سگھڑ دکھائی دیتی ہے۔'' انہوں نے اس کے سر پر ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا۔

''پتر یہ سگھڑ دکھائی ہی نہیں دیتی، بلکہ حقیقت میں سگھڑ ہے۔ گھر کا سارا کام کاج اس کے سر پر ہی چلتا ہے۔ اللہ اس کے نصیب اچھے کرے۔'' بے جی نے دعا دی اور وہ شرماتے ہوئے واپس پلٹ آئی۔

ناشتے سے فارغ ہو کر خواجہ عتیق اپنے کمرے میں سونے کے لیے چلے گئے، شفیق پہلے ہی جا چکا تھا، سلامت علی بھی کھیتوں کی طرف نکل گیا۔ خواجہ عتیق دوپہر کے کھانے کے لیے بھی نہیں اٹھے۔ نگہت ماں جی کا کھانا لے کر گئی تو انہوں نے بتایا کہ لمبے سفر کی تھکان ہے شام سے پہلے نہیں اٹھنے والے۔ سورج ڈھلنے میں کچھ ہی دیر باقی تھی

جب وہ کمرے سے نکلے۔نہادھوکر انہوں نے سفید رنگ کی شلوار قمیص پہن رکھی تھی جس میں ان کا موٹاپا قدرے کم محسوس ہو رہا تھا۔صحن میں چہل قدمی کرتے کرتے وہ پودوں کی کیاریوں کے پاس کھڑے ہو گئے۔گلاب کے پودوں پر تازہ پھول کھلے ہوئے تھے۔نگہت پودوں میں پانی دے رہی تھی۔

''نگہت تمہیں پتا ہے مجھے گلاب بہت اچھے لگتے ہیں۔ یہ پودے چار سال پہلے میں نے بڑے شوق سے لگائے تھے۔''

''جی چچا یہ واقعی بہت خوبصورت ہیں، میں ان کی تراش خراش اور گوڈی باقاعدگی سے کرتی ہوں۔'' اس نے پانی کا پائپ دوسری کیاری میں رکھتے ہوئے جواب دیا۔

نگہت۔کے انداز تخاطب پر انہوں نے اسے عجیب سی نظروں سے دیکھا اور پھر خاموش ہو گئے۔

☆☆☆

خواجہ عتیق کا پورا ہفتہ میل ملاقاتوں میں گزرا۔کبھی کوئی رشتے دار تو کبھی کوئی دوست یار ملنے آ جاتا۔کبھی وہ خود کسی کے گھر ملنے کے لیے چلے جاتے۔بیچ بیچ میں وہ اپنی فصلوں یا دکانوں کی طرف بھی نکل جاتے۔شب و روز کے ہنگامے جاری تھے۔پچھلے کئی دنوں سے وہ ہر روز شہر چلے جاتے۔ان کے کچھ دیوانی مقدمات کچہری میں چل رہے تھے۔ اصل میں خواجہ عتیق کوئی بہت بڑے یا خاندانی زمیندار نہیں تھے۔یہ زمینیں خاندان میں ان کے دادا کے زمانے سے ہی آئی تھیں۔تقسیم کے بعد جہاں ہجرت کر کے پاکستان آنے والے مہاجرین کو ان کا حق مکمل طور پر نہیں ملا وہیں مقامی لوگوں نے بھی کلیموں، الاٹمنٹوں اور قبضوں کی بہتی گنگا میں خوب ہاتھ دھوئے تھے۔ایسے ہی چند غریب اور سادہ لوح الاٹیوں سے عتیق کے دادا اور ان کے دوستوں نے بہت سے کلیم اونے پونے میں خرید لیے تھے۔ الاٹمنٹ اور قبضے میں ان سب کے ایک مشترکہ پٹواری دوست کی مدد سے کام مزید آسان ہو گیا تھا۔اب ان الاٹیوں کی اگلی نسل میں سے چند لوگوں نے دعویٰ کر دیا تھا جس کا فیصلہ خواجہ عتیق کے حق میں ہو چکا تھا۔لیکن ان میں سے ایک پارٹی نے اس فیصلے کے خلاف اپیل کر رکھی تھی۔ بھائی کی وفات کے بعد شفیق ہی ان کے یہ سب معاملات بھی دیکھتا۔ وہ ہر معاملے میں ہی ان کا دست راست تھا۔ پاکستان آئے ایک مہینا ہو چکا تھا اور ان کی واپسی میں چند ہی دن باقی تھے۔اس لیے وہ زیادہ وقت گھر پر ماں جی کے ساتھ ہی گزارتے۔

☆☆☆

اس دن موسم ابر آلود تھا۔گھٹاؤں نے آسمان کو اپنے حصار میں لے رکھا تھا۔نگہت چھوٹے موٹے کام نمٹا کر خواجہ عتیق کے کمرے کی صفائی کے لیے گئی تو وہ ابھی تک بستر پر ہی لیٹے ہوئے تھے۔

''آپ ابھی تک اٹھے نہیں؟'' اس نے کھڑکیوں کے پردے سرکاتے ہوئے پوچھا۔

''بس رات ذرا دیر سے سویا تھا اس لیے آج آنکھ بھی دیر سے کھلی۔'' انہوں نے لیٹے لیٹے جواب دیا۔

''اچھا ٹھیک ہے پھر میں دوپہر کی ہانڈی پکا لیتی ہوں تب تک آپ بھی اٹھ جائیں گے۔اس کے بعد میں کمرے کی صفائی کر دوں گی۔''

''بھئی آج تو موسم پکوڑوں کا لگ رہا ہے۔انہوں نے کھڑکی سے کالے بادلوں کو دیکھتے ہوئے کہا۔تم ایسا کرو آج کڑھی پکوڑے بناؤ، ویسے بھی کڑھی پکوڑے کھائے مدتیں ہو گئیں۔''

''مدتیں ہو گئیں؟ آپ کی بیوی کو کڑھی پکوڑے بنانے نہیں آتے کیا؟'' اس نے حیرانی سے پوچھا۔

''نہیں بھئی وہ جرمن گوری ہے اسے کڑھی پکوڑے تو کیا کوئی بھی ہانڈی بنانی نہیں آتی۔'' انہوں نے ہنستے ہوئے جواب دیا۔

''ہائیں تو پھر آپ کے گھر کھانا کون بناتا ہے؟''

''میں خود بناتا ہوں بھئی وہاں کا ماحول بہت مختلف ہے۔''

''چلیں آپ اٹھ جائیں، تب تک میں کھانا تیار کرتی ہوں۔'' یہ کہہ کر وہ دروازے کی جانب لپکی لیکن خواجہ عتیق کی نگاہیں اس پر ہی ٹکی ہوئی تھیں۔وہ کسی گہری سوچ میں گم تھے۔

☆☆☆

جرمنی واپسی سے دو دن قبل خواجہ عتیق شہر سے شاپنگ کر کے لدے پھندے واپس آئے۔اپنے بیوی بچوں اور بے جی کے ساتھ ساتھ وہ نگہت کے لیے بھی کپڑے لے کر آئے تھے۔

''یہ میں خاص طور پر تمہارے لیے لایا ہوں۔'' انہوں نے آسمانی رنگ کا ایک مہنگا جوڑا سامان سے نکال کر

اسے دیتے ہوئے کہا۔ نئے کپڑے اسے صرف عید یا کسی شادی بیاہ پر ہی نصیب ہوتے تھے۔ اسے وہ جوڑا بہت پسند آیا۔ اس نے شرماتے ہوئے پہلے تو انکار کیا لیکن ان کے اصرار پر شکریہ ادا کرتے ہوئے ان کے ہاتھوں سے لے لیا۔ شام کو کھانے کے بعد نگہت اور رضیہ حسب معمول اپنے کمرے میں آگئیں۔ سلامت علی، خواجہ صاحب، بے جی، شفیق کے ساتھ ڈرائنگ روم میں ہی بیٹھا رہا۔ کافی وقت گزر گیا وہ دونوں اس کا انتظار کرتے کرتے سونے ہی والی تھیں کہ گیارہ بجے کے قریب سلامت علی آیا۔

''تم لوگ سو تو نہیں گئے۔'' اس نے کھنکارتے ہوئے پوچھا۔

''بس سونے ہی والے تھے، تم نے بڑی دیر لگا دی آج۔'' رضیہ نے پوچھا۔

''سمجھ نہیں آرہی، تم لوگوں کو کیسے بتاؤں۔ آج ان لوگوں نے ایک بہت ہی ضروری بات کے لیے روک لیا تھا۔ اس لیے اتنا وقت لگ گیا۔ اچھا ہے تم لوگ ابھی جاگ رہے ہو۔'' سلامت علی کے لہجے میں سنجیدگی تھی۔

''کیسی ضروری بات نگہت کے ابا؟'' رضیہ حیران پریشان سی اٹھ بیٹھی۔

'' خواجہ صاحب نے نگہت کا ہاتھ مانگا ہے۔'' چارپائی پر بیٹھتے ہوئے اس نے دھماکا کیا۔

''کیا ان کا کوئی بیٹا بھی ہے؟'' رضیہ نے بھنویں اچکائیں۔

''نہیں نیک بخت، بیٹا کوئی نہیں ہے، انہوں نے اپنے لیے نگہت کا رشتہ مانگا ہے۔''

رضیہ یہ سن کر یوں اچھلی جیسے کسی بچھو نے کاٹ لیا ہو۔ اس کے بعد سلامت علی نے جب ساری روداد سنائی تو وہ دونوں ہکا بکا رہ گئیں۔

''تو پھر تم نے انہیں کیا جواب دیا؟'' کافی دیر سکتے کے عالم میں رہنے کے بعد اس نے سوال کیا۔

''بھئی میں کیا جواب دیتا، میں نے انہیں بتایا کہ تم دونوں سے پوچھ کر بتاؤں گا۔ اب تم لوگ سوچ لو، مجھے تو اس میں کوئی قباحت نظر نہیں آتی، گو وہ عمر میں ہماری نگہت سے بڑے ہیں لیکن صاحب جائیداد اور حیثیت والے ہیں اور یہ بھی سوچو کہ اس رشتے کے بعد ہم نوکر نہیں رہیں گے اس گھر کے فرد بن جائیں گے۔ ان کے جرمنی والے بچوں کے ساتھ ساتھ نگہت اور اس کے ہونے والے بچے بھی اس جائیداد کے وارث ہوں گے۔'' سلامت علی کے لہجے سے لالچ صاف جھلک رہا تھا۔

''مگر ہم تو سلیم کے گھر والوں کو زبان دے چکے ہیں، ان لوگوں کو ہم کیا جواب دیں گے؟'' رضیہ نے خاوند کی طرف دیکھتے ہوئے سوال کیا۔

''بھلی لوک، تم خود ہی سوچو کہاں وہ چھیما چنگ چی رکشا چلانے والا اور کہاں خواجہ صاحب۔ ان لوگوں کی اوقات ہی کیا ہے؟ ہم خود یہ رشتہ توڑ دیں گے۔''

یہ سن کر رضیہ سوچ میں پڑ گئی۔ سلیم اس کی کزن کا بیٹا تھا۔ رشتہ توڑنے کی صورت میں ان لوگوں کی طرف سے ناراضگی کا بھی ڈر تھا۔ لیکن اس کے چہرے کے تاثرات اس بات کی گواہی دے رہے تھے کہ وہ بھی اپنے میاں کی بات سے متفق ہے۔

''کل خواجہ صاحب کی واپسی کی فلائٹ ہے۔ ویسے تو انہوں نے کہا ہے کہ ہم لوگ سوچنے کے لیے جتنا مرضی وقت لے لیں، انہیں کوئی جلدی نہیں ہے۔ مگر شفیق کا کہنا ہے کہ اگر ہم اس رشتے پر راضی ہوں تو بہتر ہے ان کو واپسی سے قبل ہی بتا دیا جائے۔'' سلامت علی نے مزید انکشاف کرتے ہوئے بتایا۔

نگہت کے تو پیروں تلے سے زمین نکل گئی۔ ٹھیک ہے خواجہ صاحب پیسے والے تھے مگر عمر میں وہ اس کے باپ سے بھی کچھ سال بڑے تھے۔ سلیم سے جان چھوٹ رہی تھی مگر دوسری طرف اپنے سے عمر میں تین گنا بڑے مرد کے ساتھ شادی کے بندھن میں باندھا جا رہا تھا۔ لیکن وہ جانتی تھی کہ اس کی رائے ویسے بھی کوئی اہمیت نہیں رکھتی۔ سلیم کا انتخاب کرتے وقت کون سا کسی نے اس کی رضامندی پوچھی تھی؟ اب بھی اماں، ابا خود ہی طے کر رہے تھے کہ اسے کس کھونٹے سے باندھا جائے۔ اسی ادھیڑ بن میں پہلو بدلتے ساری رات گزر گئی۔ اگلے دن کا سورج نگہت کی زندگی کے ایک نئے رخ کا تعین کرتے ہوئے طلوع ہوا۔ ناشتے میں چائے سڑکتے ہوئے سلامت علی نے اپنا فیصلہ سنایا کہ وہ اس رشتے کو قبول کر چکے ہیں۔ اور اسے بھی یہ سمجھ لینا چاہیے کہ یہ رشتہ اس کی قسمت چمکا دے گا۔ بے جی کب تک زندہ رہیں گی۔ ان کے بعد وہ ہی اس حویلی اور ساری جائیداد کی مالک و مختار ہوگی۔ وہ سر جھکائے ان کی ساری باتیں سنتی رہی۔

☆☆☆

گھر میں خاموشی تھی۔ ماں جی اپنے کمرے میں سو رہی تھیں۔ خواجہ عتیق، شفیق اور سلامت علی بھی نظر نہیں آ رہے تھے۔ نگہت نے سوچا سب لوگ شاید باہر کہیں گئے ہوئے ہیں۔ وہ خواجہ صاحب کے کمرے کی صفائی کے لیے گئی۔ کمرے کا دروازہ بند تھا۔ دروازہ کھلتے ہی وہ ٹھٹک گئی۔ خواجہ صاحب کمرے میں ہی موجود تھے اور کچھ سامان سوٹ کیس میں پیک کرنے میں مصروف تھے۔ رشتے والی بات کے بعد وہ ان کے سامنے آنے سے کتراتی تھی، الٹے پاؤں واپس پلٹی لیکن انہوں نے آواز دے کر اسے روک لیا۔ وہ رک گئی لیکن شرم سے آنکھیں جھکی ہوئی تھیں۔

”نگہت میں تمہارے ہی بارے میں سوچ رہا تھا۔ آؤ پانچ منٹ بیٹھ جاؤ مجھے تم سے کچھ بات کرنی ہے۔“ سوٹ کیس کی زپ بند کرتے ہوئے انہوں نے کرسی پر اسے بیٹھنے کا اشارہ کیا۔

وہ گردن جھکائے کرسی پر بیٹھ گئی۔

”نگہت اب جب رشتے کی بات دونوں طرف سے طے ہو چکی ہے۔ نہ جانے تم میرے بارے میں کیا سوچتی ہو گی۔ اس لیے میں نے سوچا تم سے میں خود بھی صاف صاف بات کرلوں۔“ سوٹ کیس بند کر کے وہ اس کے سامنے کرسی پر بیٹھتے ہوئے بولے۔

”بات یہ ہے کہ میں سیدھا سادہ بندہ ہوں۔ نوجوانی میں ہی جرمنی چلا گیا تھا، ساری زندگی وہیں گزاری۔ جوانی میں ہی میں نے ایک جرمن لڑکی سے شادی کرلی۔ اس کا نام ریناٹا ہے۔ سچی بات تو یہ ہے کہ اس وقت وہ شادی میں نے وہاں پر سیٹل ہونے کی نیت سے کی تھی اور ارادہ یہی تھا کہ سیٹل ہونے کے بعد اسے طلاق دے دوں گا۔ اس کے والدین فوت ہو چکے تھے اور وہ بیچاری اکیلی رہتی تھی۔ وقت کے ساتھ ساتھ ہم دونوں میں ہم آہنگی پیدا ہو گئی۔ زندگی میں نہ اس نے مجھے کبھی شکایت کا موقع دیا اور نہ ہی میں نے اسے۔ اس زمانے میں میرے والد ابھی زندہ تھے۔ پاکستان میں والدین نے میرے لیے کئی رشتے دیکھ رکھے تھے اور ان کی خواہش تھی کہ میں پاکستان آکر شادی کروں اور سچ بتاؤں تو میں بھی چاہتا تھا کہ دوسری شادی کرلوں ایک بیوی پاکستان میں ہو ایک وہاں، لیکن اس دوران میری پہلی بیٹی پیدا ہوئی جس کی وجہ سے میں نے دوسری شادی سے انکار کر دیا۔ بیٹی کی پیدائش کے بعد ریناٹا میرے ساتھ ایک بار پاکستان بھی آئی۔ میرے والدین اور گھر والوں سے مل کر وہ بہت خوش ہوئی۔ اس کی سادگی میرے والدین کو بھی اچھی لگی اور آہستہ آہستہ انہوں نے دوسری شادی کی ضد چھوڑ دی۔ پھر چند سال کے وقفے سے دوسری بیٹی کی پیدائش کے بعد تو کبھی کسی نے اس موضوع کو چھیڑنے کی کوشش ہی نہیں کی۔ میں بھی اپنی زندگی میں خوش تھا۔ میری بیوی ایک اچھی جاب کرتی ہے دونوں بیٹیاں جوانی کی حدود میں قدم رکھ چکی ہیں۔ لیکن بھائی کی وفات کے بعد یہاں پاکستان میں اب ہمارے گھریلو حالات ویسے نہیں رہے۔ بے جی اکیلی رہ گئی ہیں۔ گھر زمین جائیداد سب کچھ ہے لیکن میری اپنی مجبوریاں ہیں۔ تم جتنی توجہ سے ان کا اور گھر کا خیال رکھتی ہو یہ سب دیکھ کر تم میرے دل کو بھا گئیں۔ اور میں نے سوچا کیوں نہ تمہیں اس گھر کے فرد کے طور پر اپنی زندگی میں شامل کرلوں۔“ یہاں تک کہہ کر وہ ایک لمحے کے لیے خاموش ہو گئے۔

”ریناٹا کو معلوم ہے کہ آپ دوسری شادی کرنے جا رہے ہیں؟“ جی کڑا کر کے اس نے پوچھا۔

”ہاں میں نے اسے فون پر سب کچھ بتا دیا ہے۔ اور اسے اس پر کوئی اعتراض نہیں۔ بیٹیوں سے اس سلسلے میں ابھی کوئی بات نہیں ہوئی۔ میں واپس پہنچ کر ان سے بات کروں گا۔ اور مجھے یقین ہے انہیں بھی کوئی اعتراض نہیں ہوگا۔“ انہوں نے بڑے اعتماد سے جواب دیا۔ ”تم سے ایک بار پوچھنا چاہتا ہوں کہ اگر تمہیں اس رشتے پر کوئی اعتراض ہے تو تم صاف صاف مجھے بتا سکتی ہو۔“

وہ انہیں کیا بتاتی کہ اس کی مرضی تو فرحان نے بھی نہیں مانی، اور نہ ہی سلیم سے رشتہ کرتے وقت کسی نے اس کی مرضی پوچھی تھی۔ لیکن وہ یہ ساری باتیں لب پر نہ لا سکی۔ سلیم کا خیال آتے ہی وہ سوچ رہی تھی کہ سلیم کے پلے بندھنے سے تو بہتر ہے کہ خواجہ صاحب کے ساتھ ہی زندگی کا سفر کٹ جائے۔ پیدائش سے لے کر آج تک غربت اور محنت مزدوری کے جس کٹھن رستے پر چلتی آ رہی ہے اس سے تو نجات ملے گی۔

”تم نے میری بات کا کوئی جواب نہیں دیا؟“ انہوں نے اسے خاموش پا کر سوال کیا۔

”میری مرضی تو اماں ابا کی خوشی میں ہی ہے۔“ نظریں اٹھائے بغیر اس نے شرماتے ہوئے جواب دیا۔

☆☆☆

وہ موسم گرما کی ایک خوشگوار شام تھی سورج دھیرے دھیرے افق کی سیڑھیاں اتر رہا تھا خواجہ عتیق کو واپس گئے ایک مہینا بیت چکا تھا۔ نگہت گملوں کو پانی دے رہی تھی جب برآمدے میں پڑے لینڈ لائن فون کی گھنٹی بجی۔ عموماً بے جی ہی فون اٹھاتی تھیں۔ لیکن اس وقت شاید وہ اپنے کمرے میں سو رہی تھیں۔ چند گھنٹیوں کے بعد اس نے ریسیور اٹھایا تو ہیلو کے جواب میں اسے خواجہ صاحب کی آواز سنائی دی۔

''نگہت؟'' انہوں نے سوال کیا۔

''جی۔'' وہ گھبرائی ہوئی آواز میں بولی۔

''بھئی کیا حال ہے تمہارا۔ جب سے واپس آیا ہوں تم سے تو بات ہی نہیں ہوئی۔'' انہوں نے شکوہ کیا۔

''جی میں ٹھیک ہوں۔ آپ ہولڈ کریں میں بے جی کو جگاتی ہوں۔'' وہ منمنائی۔

''نہیں وہ سو رہی ہیں تو انہیں سونے دو۔ ان سے بعد میں بات کرلوں گا۔ ابھی تو تمہاری آواز سننے کا دل کر رہا ہے۔'' شوخ لہجے میں وہ بولے۔

اسے سمجھ نہیں آ رہی تھی کہ ان سے کیا بات کرے۔ تھوڑی دیر وہ اس سے اِدھر اُدھر کی باتیں کرتے رہے اور وہ ہوں ہاں میں ان کو جواب دیتی رہی۔

فون بند کرنے کے بعد وہ سوچنے لگی اس نے بھی کیا قسمت پائی ہے۔ جس سے اس کو محبت تھی وہ بے وفا نکلا اور زندگی کا ہم سفر بننے سے انکار کردیا اور جس سے اس کو محبت نہیں اب زندگی اس کے سنگ گزارنی پڑے گی۔ کسی نے ٹھیک ہی کہا ہے کہ عورت کو پہلی محبت سے دکھ ملنے کے بعد اس کے اندر سے ایک نئی عورت جنم لیتی ہے۔ اس کے اندر بھی ایک نئی عورت نے جنم لے لیا تھا اور وہ نئی عورت یہ سوچ رہی تھی کہ اگر نصیب میں ایک ادھیڑ عمر شخص کی دوسری بیوی بننا ہی لکھا ہے تو یوں ہی سہی۔ خواجہ صاحب ویسے بھی پردیس میں ہوتے ہیں۔ کبھی کبھار پاکستان آیا کریں گے اور وہ مالکن بن کر راج کرے گی۔

خواجہ نے واپس پہنچ کر ریناٹا کو نگہت کے بارے میں بتایا۔ پہلے تو وہ نہایت جز بز ہوئی کیونکہ جس معاشرے میں اس نے آنکھ کھولی تھی وہاں دوسری بیوی کا تصور ہی ناپید تھا۔ اور پھر عورت چاہے مشرق کی ہو یا مغرب کی، گوری ہو یا کالی، سوتن نامی مخلوق کا وجود برداشت کرنا اس کے خمیر میں ہی نہیں ہوتا۔ لیکن عتیق نے اپنے گھریلو حالات اور والدہ کی بیماری و لاچاری کا ایسا نقشہ کھینچا کہ وہ بھی سوچنے پر مجبور ہوگئی۔ وہ جانتی تھی کہ اس کی ساس کو دیکھ بھال کی مستقل ضرورت ہے اور اس کی بیوہ جیٹھانی کے جانے کے بعد اب وہ اکیلی بھی ہیں۔ کافی رد و قدح کے بعد جب خواجہ نے اسے یقین دلایا کہ نگہت پاکستان میں ہی رہے گی اس لیے اسے فکرمند ہونے کی کوئی ضرورت نہیں۔ نہ چاہتے ہوئے بھی ریناٹا نے اجازت دے دی۔ دونوں بیٹیاں کالج میں پڑھتی تھیں ان کو بھی انہوں نے اپنے فیصلے سے آگاہ کیا تو وہ بھی بہت حیران ہوئیں۔ وہ دونوں ویسے بھی فرمانبردار تھیں۔ جب انہوں نے دیکھا کہ ماما بھی راضی ہے تو انہیں کیا اعتراض ہونا تھا۔

☆☆☆

نگہت ایک دن ناشتا لے کر بے جی کے کمرے میں گئی تو ہنوز ان کو لحاف میں ہی دبکا ہوا پایا۔ وہ تھوڑی حیران ہوئی کیونکہ وہ تو ہمیشہ فجر کے وقت اٹھنے کی عادی تھیں۔ جب بھی وہ ناشتا لے کر جاتی وہ قرآن کی تلاوت کر رہی ہوتیں یا برآمدے میں بیٹھی تسبیح پر ذکر اذکار میں مصروف ہوتیں۔ اس نے ناشتے کی ٹرے سائیڈ ٹیبل پر رکھتے ہوئے انہیں آواز دی مگر جواب ندارد، پاس جا کر دیکھا تو ان کو نیم بے ہوشی کے عالم میں پایا۔ جسم بھی بخار کی تپش سے پھنک رہا تھا۔ وہ الٹے قدموں پلٹی اور اماں ابا کو ان کی طبیعت کے بارے میں بتایا۔ وہ دونوں بھی پریشان ہوگئے۔ رضیہ اس کے ساتھ بے جی کے کمرے کی طرف لپکی اور سلامت علی سائیکل نکال کر شفیق کو اطلاع کرنے چلا گیا۔ وہ شفیق کو لے کر واپس آیا تو نگہت اور رضیہ بے جی کے سرہانے بیٹھی ہوئی تھیں۔ وہ لمحے بھر کو آنکھیں کھولتیں اور پھر بند کرلیتی۔ بات بھی بمشکل ان کے منہ سے نکل رہی تھی۔ شفیق نے فوراً گاڑی نکالی اور ان کو لے کر... شہر کی طرف روانہ ہوگئے۔ شہر کے ایک بڑے کلینک میں پہنچنے تک مزید ایک گھنٹا لگ گیا۔ ڈاکٹروں نے ان کی حالت کے پیش نظر داخل کرتے ہوئے ابتدائی دوا دارو کی۔ دن بھر مختلف ٹیسٹ ہوتے رہے۔ اگلے روز ڈاکٹر نے بتایا کہ ان کے گردے فیل ہونے کے قریب ہیں۔ اس عمر میں ان کا ٹرانسپلانٹ بھی ناممکن ہے۔ ڈائیلاسز کے علاوہ اور کوئی حل نہیں۔ ہر ہفتے باقاعدگی سے ایک بار ڈائیلاسز ہوتا رہا تو سانسیں چلتی رہیں گی۔ تین دن وہاں رہنے اور پہلا ڈائیلاسز کروانے کے بعد ان کی حالت قدرے سنبھلی تو وہ انہیں لے کر واپس...

گاؤں آگئے۔خواجہ صاحب کو بھی اطلاع مل چکی تھی۔اسی ہفتے وہ بھی دوبارہ واپس آگئے۔بے جی کی طبیعت ان کے آنے سے کچھ اور سنبھل گئی۔بڑھاپے میں پردیس بسنے والی اولاد کی آمد بوڑھے والدین کے لیے دوا سے بڑھ کر ہوتی ہے۔

ہفتہ بھر بعد وہ لوگ اگلا ڈائیلاسز کروا کر واپس آرہے تھے۔ شفیق گاڑی ڈرائیو کررہا تھا۔بے جی کے چہرے پر سنجیدگی چھائی ہوئی تھی۔وہ کسی گہری سوچ میں ڈوبی ہوئی تھیں۔

''فکر مت کریں بے جی،آپ بالکل ٹھیک ٹھاک ہو جائیں گی!''خواجہ عتیق ان کو یوں متفکر دیکھ کر بولے۔

''پتر زندگی موت تو اللہ کے ہاتھ میں ہے۔لیکن مجھے لگتا ہے میرا وقت اب تھوڑا ہی رہ گیا ہے۔''انہوں نے سر اٹھاتے ہوئے کہا۔

''نہ بے جی ایسی باتیں منہ سے نہ نکالیں۔''

''پتر میری زندگی کا کوئی بھروسا نہیں۔ میری خواہش ہے کہ اب تم آہی گئے ہو تو اس بار واپس جانے سے پہلے تمہارا اور نگہت کا نکاح کردیا جائے۔''

''بے جی ٹھیک کہہ رہی ہیں عتیق ویسے بھی کون سا بینڈ باجے کے ساتھ بارات کہیں لے کر جانی ہے۔گھر کی چاردیواری میں ہی چار بندوں کی موجودگی میں نکاح پڑھا دیا جائے گا۔''شفیق نے بے جی کی ہاں میں ہاں ملائی۔

☆☆☆

سلیم اپنے یار ارشاد عرف شادے کے اڈے پر بیٹھا ہوا تھا۔شادا اس کا بچپن کا دوست تھا۔وہ بھی پہلے رکشا چلاتا تھا۔پھر آہستہ آہستہ اس نے رکشوں کی خرید وفروخت اور کرائے پر دینے کا دھندا شروع کردیا۔اس وقت اس کے پاس دس بارہ رکشے تھے جنہیں اس نے کرائے پر دے رکھا تھا۔خود وہ سارا دن اپنے اڈے پر رہتا اور رکشوں اور ڈرائیوروں کے معاملات کی دیکھ بھال کرتا۔شام کو چھیما اور دیگر چند دوست بھی وہاں آجاتے اور دیر گئے تک چرس اور گپوں کا دور چلتا۔سگریٹوں کے کش لگا کر خوشیاں کشید کی جاتیں اور دھوئیں کے مرغولوں میں دکھ درد اڑائے جاتے۔

''کیا بات ہے چھیمے تیرا موڈ آج کچھ ٹھیک نہیں لگ رہا۔کسی سواری سے جھگڑا تو نہیں ہوا؟'' شادے نے سگریٹ کو ماچس کی تیلی کا شعلہ دکھایا۔

''نہیں یار ایسی کوئی بات نہیں۔''سلیم نے اس سے آنکھیں چراتے ہوئے جواب دیا۔

''کوئی نہ کوئی بات تو ضرور ہے میری جان۔ورنہ تیری شکل بارہ نہ بجا رہی ہوتی؟''

شادے کے کریدنے پر بالآخر سلیم کو نگہت کے گھر والوں کی طرف سے رشتہ توڑنے والی روداد سنانی پڑی۔شادا خاموش بیٹھا ساری بات سنتا رہا۔

''یہ تو ان لوگوں نے تمہارے ساتھ واقعی بڑی زیادتی کی ہے۔اب تیرا کیا ارادہ ہے؟''سلیم خاموش ہوا تو شادے نے آخری کش لگا کر سگریٹ کا ٹوٹا پاؤں کے نیچے مسلتے ہوئے کہا۔

''میرا تو دل کرتا ہے خودکشی کرلوں یا خواجے اور نگہت میں سے کسی کا خون کردوں۔''سلیم دوسرا سگریٹ بھرتے ہوئے بولا۔

''خودکشی تو بزدل لوگوں کا کام ہے چھیمے۔مرد تو بدلہ لیا کرتے ہیں۔بدلہ لینا ہے تو شادا تیرے ساتھ ہے۔''

''بدلے کی آگ کا الاؤ تو مجھے بھی اندر ہی اندر بھسم کیے جارہا ہے لیکن سمجھ نہیں آرہی کیا کروں۔''لال بھبھوکا آنکھوں سے اس نے شادے کی طرف دیکھا۔

تھوڑی دیر سوچنے کے بعد شادے نے اسے پلان بتایا تو سلیم چیتے کی طرح اٹھ کر بیٹھ گیا۔

☆☆☆

رات آدھے سے زیادہ بیت چکی تھی۔بادلوں کے ٹکڑے چاند سے آنکھ مچولی کھیل رہے تھے۔دولت پور کی سڑک پر ویرانی اور تاریکی کا راج تھا۔جھینگروں کی آوازیں رکشے کے انجن نے شور میں دب چکی تھیں۔رکشا آہستہ آہستہ گاؤں کی طرف بڑھ رہا تھا۔سلیم رکشا چلا رہا تھا،شادا اور لطیف عرف طیفا پچھلی سیٹ پر چاق و چوبند بیٹھے تھے۔طیفا بھی ان کا مشترکہ دوست تھا جسے انہوں نے اپنے منصوبے میں شامل کیا تھا۔وہ تینوں آج نگہت کو اغوا کرنے کے لیے جارہے تھے۔شادے نے سلیم کو اس بات پر تیار کرلیا تھا کہ نگہت کو اغوا کرکے ڈیرے پر لے آئیں گے۔جہاں سلیم اس کی عزت خراب کرے گا۔اس کے بعد اس کے گھر والوں کو خفیہ طور پر پیغام بھجوا دیا جائے گا کہ اب چاہیں تو سلیم سے اس کا نکاح کردیں اور چاہیں تو خواجے کے ساتھ بیاہ دیں۔دونوں صورتوں میں یا تو نگہت اس کی ہو جائے گی یا پھر بدلے کی آگ ٹھنڈی ہو جائے گی۔دوسری طرف اس نے طیفے کو لالچ دے رکھا تھا کہ چھیمے کے ساتھ ساتھ وہ دونوں بھی بہتی گنگا میں ہاتھ دھوئیں گے۔پروگرام کے مطابق انہوں نے گاؤں کے قریب پہنچ کر

رکشے کا انجن بند کر دیا تا کہ شور سے آس پڑوس کے گھروں میں کسی کی آنکھ نہ کھل جائے۔ رکشے کا وزن ہی کتنا تھا۔ ہاتھوں سے ہلکا ہلکا دھکیلتے ہوئے انہوں نے اسے حویلی کے قریب گلی میں لا کھڑا کیا۔ خواجہ کی والدہ کی بیماری اور جرمنی سے آمد کی خبر بھی ان کے علم میں تھی۔ تینوں نے اپنے چہرے چادروں کی بکل میں چھپا رکھے تھے۔ شادے کے پاس پسٹل تھا۔ سلیم اور طیفے دونوں نے تیز دھار خنجر نیفے میں اڑس رکھے تھے۔ طیفے کے ہاتھ میں مضبوط رسی کا ایک گچھا بھی تھا۔ محتاط نظروں سے دائیں بائیں دیکھتے ہوئے تینوں حویلی کے بغلی کھیت کی طرف بڑھے اور مکئی کی قد آور فصل میں گم ہو گئے۔ اس کھیت کے ساتھ سلامت علی کی رہائش والے حصے کی دیوار تھی۔ اور مکان کے بعد طویل صحن تھا جس کے دوسرے سرے پر حویلی کی عمارت تھی۔ مناسب جگہ دیکھ کر پہلے شادا دیوار پر چڑھا۔ اس نے دیوار پر اکڑوں بیٹھے بیٹھے اندر کا جائزہ لیا۔ ہر طرف سناٹا پھیلا ہوا تھا۔ دور حویلی کے برآمدے میں ایک بلب جل رہا تھا۔ سلامت علی والا مکان تاریکی میں ڈوبا ہوا تھا۔ ایک کمرے سے زیرو کے بلب کی مدھم سی روشنی دروازے کی جھری سے دکھائی دے رہی تھی۔ اطمینان کرنے کے بعد اس نے سلیم اور طیفے کو اشارہ کیا اور ہاتھ بڑھا کر انہیں بھی دیوار پر کھینچ لیا۔ دبے پاؤں وہ ملگجی سی روشنی والے کمرے کی جانب بڑھے۔ دروازے کے پاس لحہ بھر رکنے کے بعد اسے ہلکا سا دھکیلا تو دروازہ کھل گیا۔ دروازے کے ساتھ والی چارپائی پر سلامت علی سو رہا تھا۔ سامنے والی دیوار کے ساتھ لگی دو چارپائیوں پر نگہت اور رضیہ دنیا و مافیہا سے بے خبر لحاف میں دبکی پڑی تھیں۔ شادے نے سلامت علی کے منہ پر ہاتھ رکھا تو اس نے ہڑبڑا کر آنکھیں کھولیں۔ کمرے میں تین ڈھاٹا پوشوں کو دیکھ کر اس کی گھگھی بندھ گئی۔ وہ کسمسایا لیکن شادے کے ہاتھ میں پستول دیکھ کر بے جان پڑا رہا۔ اتنی دیر میں طیفا اس کے منہ میں کپڑا ٹھونس کر ہاتھ پاؤں رسی سے باندھ چکا تھا۔ اس سے فارغ ہو کر انہوں نے نگہت اور رضیہ کو جگایا وہ دونوں بھی کمرے میں تین اجنبی مردوں کو دیکھ کر گڑبڑا گئیں۔

"کسی نے ذرا سی بھی آواز نکالی تو کھوپڑی اڑانے میں دیر نہیں لگاؤں گا۔" شادا پستول لہراتے ہوئے سرگوشی میں پھنکارا۔ سلیم اور طیفے نے ان دونوں کے منہ میں بھی کپڑا ٹھونس کر دونوں کے ہاتھ پیر باندھ دیے۔ نگہت کو سلیم نے کندھے پر ڈال لیا۔ سلامت علی اور رضیہ رسیوں میں بندھے پھڑپھڑا رہے تھے۔ ان کی آنکھیں التجا کر رہی تھیں مگر کچھ کر نہیں پا رہے تھے۔ دروازہ کھول کر جیسے نے قدم باہر نکالا ہی تھا کہ ایک جھٹکے سے وہ پشت کے بل واپس کمرے میں آن گرا۔ نگہت کا وجود اس کے کاندھے سے کسی بوری کی مانند دور جا گرا۔ اس اچانک افتاد سے وہ بوکھلا گئے۔ حملہ آور لمبا تڑنگا نوجوان شفیق کا بیٹا سجاد تھا۔ اس سے پہلے کہ سلیم اٹھنے کی کوشش کرتا اس نے آگے بڑھ کر اس کی چھاتی پر اپنا بھاری بھرکم پاؤں رکھ دیا۔ اس کے پیچھے پیچھے تین اور بندے بھی کمرے میں گھسے۔ انہوں نے اپنی بندوقوں کا رخ ان تینوں کی طرف کر رکھا تھا۔ شادے نے گھبرا کر سجاد پر گولی چلانے کی کوشش کی لیکن ٹریگر دبانے کے باوجود فائر نہ ہوا۔ اصل میں پسٹل کی میگزین میں تو گولیاں موجود تھیں لیکن کوئی گولی ابھی چیمبر میں نہیں چڑھی تھی۔ اس سے پہلے کہ وہ پسٹل لاک کرتا سجاد کی رائفل ایک بار لاٹھی کی طرح گھومی اور شادے کے کندھے پر لگی۔ ضرب اتنی زوردار تھی کہ اس کا کندھا اتر گیا۔ پستول اس کے ہاتھ سے دور جا گرا۔ دائیں ہاتھ سے کندھے کو پکڑے وہ وہیں ڈھیر ہو گیا۔ یہ منظر دیکھ کر طیفے کے بھی اوسان خطا ہو گئے۔ اس نے ہاتھ میں پکڑا خنجر پھینک کر دونوں ہاتھ اوپر اٹھا دیے۔ شور شرابے کی آواز سن کر شفیق اور خواجہ عتیق بھی آن پہنچے۔ اندر کا منظر دیکھ کر وہ بھی بھونچکا رہ گئے۔

☆☆☆

شادے اور جیسے کے رنگ میں بھنگ اس لیے پڑ گئی کہ وہ حویلی کی تازہ ترین صورت حال سے لاعلم تھے۔ وہ تو یہ سوچ کر آئے تھے کہ وہاں سلامت علی اور خواجہ کے علاوہ تیسرا کوئی مرد موجود نہیں ہوگا۔ اور ان دو ادھیڑ عمر مردوں سے نمٹنے میں انہیں کوئی دقت پیش نہیں آئے گی۔ لیکن ہوا یوں کہ گزشتہ روز خواجہ عتیق کی ایک زمین کے کیس کا فیصلہ تھا جو ان کے حق میں ہو گیا۔ فریق مخالف سخت طیش میں تھے۔ جج کا تو وہ کچھ نہیں بگاڑ سکتے تھے لیکن عدالت سے نکلے تو خواجہ سے ان کی منہ ماری ہو گئی۔ نوبت ہاتھا پائی تک جا پہنچی۔ موقع پر موجود لوگوں کے بیچ بچاؤ کرانے سے معاملہ وقتی طور پر رفع دفع ہو گیا۔ لیکن جاتے جاتے وہ لوگ دھمکیاں دے گئے کہ چھوڑیں گے نہیں۔ شفیق کو خطرہ تھا کہ غصے میں وہ کچھ بھی کر سکتے ہیں۔ یہ سوچ کر اس نے اپنے بیٹے سجاد اور تین بھتیجوں کو چند دنوں کے لیے حویلی بلا لیا تا کہ

اگر مخالفین کوئی اوچھی حرکت کریں تو اس کا جواب دیا جا سکے۔ لیکن ان مخالفین کی بجائے شامت اعمال کے مارے یہ تینوں اس رات وہاں آپہنچے۔ سجاد اپنے تایازاد بھائیوں کے ساتھ چھت پر موجود تھا۔ رات کے سناٹے میں رکشے کی آواز سن کر پہلے تو اس نے توجہ نہ دی لیکن جب وہ لوگ رکشے سے اتر کر اسے دھکیلتے ہوئے حویلی کی نکڑ تک لائے تو وہ چوکنا ہو گیا۔ اس نے فوراً اپنے ساتھیوں کو جگایا اور ساری کارروائی خاموشی سے دیکھتے رہے۔ جب وہ دیوار پھلانگ کر سلامت علی کے کمرے میں گھسے تو اس کا ماتھا ٹھنکا۔ اپنے ہتھیار سنبھال کر وہ نیچے اترے اور خاموشی سے کمرے کے باہر پہنچ گئے۔ جونہی چھیمے نے دروازہ کھولا سجاد نے اپنی بندوق کا بٹ چھیمے کے منہ پر دے مارا تھا۔ بازی پلٹ چکی تھی۔ سلامت علی، رضیہ اور نگہت کو رسیوں سے آزاد کیا جا چکا تھا۔ سلیم کی شناخت کے بعد انہیں معاملے کی تہہ تک پہنچنے میں بالکل دیر نہیں لگی۔ اب نقشہ کچھ یوں تھا کہ وہ تینوں رسیوں سے بندھے کمرے کے وسط میں آڑھے ترچھے لیٹے تھے۔ بندوق کے بٹ کے وار سے چھیمے کے کئی دانت ٹوٹ چکے تھے، کراہتے ہوئے اس کے منہ سے خون رس رہا تھا۔ شادا اور طیفا بھی ان کو کچا کھا جانے والی نظروں سے گھور رہے تھے۔ لیکن بے بس تھے کچھ کر نہیں سکتے تھے۔ گھنٹا بھر میں پولیس کو بھی بلا لیا گیا۔ عزت کے خیال سے انہوں نے اس واردات کو چوری کا رنگ دے کر پرچہ درج کروا دیا۔ جاتے وقت شفیق نے تھانیدار کی مٹھی بھی گرم کر دی۔ اس نے ایف آئی آر میں چوری کے علاوہ خواتین سے دست درازی اور بغیر لائسنس اسلحہ کی دفعات بھی شامل کر دی تھیں۔

☆☆☆

نگہت دلہن بنی حجلۂ عروسی میں بیٹھی تھی۔ گزشتہ ہفتے والی واردات کے بعد سب کی مشاورت سے یہی طے پایا تھا کہ اس فریضے کو جلد از جلد ادا کر دیا جائے۔ خواجہ صاحب کی مرضی بھی یہی تھی۔ جرمنی میں رینا ٹا اور بیٹیوں کو اس سارے معاملے میں اپنا ہمنوا بنا چکے تھے۔ نگہت کے والدین بھی یہی چاہتے تھے کہ وہ اس فریضے سے جتنا جلدی ممکن ہو سبکدوش ہو جائیں۔ سلیم گرفتار ہو چکا تھا لیکن انہیں خدشہ تھا کہ وہ جلد یا بدیر ضمانت پر باہر آ گیا تو کوئی نہ کوئی مسئلہ ضرور کھڑا کرے گا۔ دونوں طرف سے چند قریبی عزیزوں کی موجودگی میں مولوی صاحب نے نکاح پڑھا دیا تھا۔ دولت پور سے اس کی بچپن کی سہیلیاں عذرا اور شگفتہ بھی آئی تھیں۔ سلامت مبارک کی دعاؤں کے سائے میں نگہت اپنے کمرے سے حویلی میں آ گئی۔ اب وہ بیٹھے بیٹھے اپنے مہندی لگے ہاتھوں کو گھور رہی تھی۔ شاید وہ مہندی کے نیچے سے جھانکتی قسمت کی لکیروں کو دیکھ رہی تھی جن میں اسے اپنے ٹوٹے خوابوں کے رنگ نظر آ رہے تھے۔ کچھ دیر بعد مہمانوں کو رخصت کر کے خواجہ صاحب کمرے میں داخل ہوئے۔ اس کے پاس بیٹھتے ہوئے انہوں نے اسے قیمتی نیکلس منہ دکھائی میں دیا۔

''نگہت اب تم اس حویلی کی عزت ہو۔ آج سے تم اس گھر کی ملازمہ نہیں بلکہ مالکن ہو۔ میری زندگی اور اس گھر پر تمہارا بھی اتنا ہی حق ہے جتنا رینا ٹا کا۔''

☆☆☆

شادی کے چھ ماہ بعد بے جی کافی دن اسپتال میں رہنے کے بعد چل بسیں۔ تدفین سے پہلے خواجہ عتیق بھی پاکستان پہنچ گئے۔ بے جی کے جانے کے بعد حویلی مزید سنسان ہو گئی تھی۔ خواجہ عتیق ان دنوں بہت زیادہ اداس رہنے لگے تھے۔ باپ اور بھائی کی وفات کے بعد بے جی کے رشتے کی ڈور نے ان کو پاکستان سے جوڑ رکھا تھا۔ ان کی وفات کے بعد ہر چیز انہیں خالی خالی لگ رہی تھی۔ نگہت نے ان کی دلجوئی میں کوئی کسر نہ اٹھا رکھی۔ لیکن ہر رشتے کا اپنا اپنا مقام ہوتا ہے۔ ایک کی جگہ کوئی دوسرا نہیں لے سکتا۔ سلامت علی اور رضیہ بھی مستقل طور پر حویلی میں ہی منتقل ہو چکے تھے۔ جب نگہت نے انہیں بتایا کہ وہ اُمید سے ہے تو اداسی کی لہر کچھ ٹوٹی لیکن ساتھ ہی ایک نئی فکر بھی دامن گیر ہو گئی کہ بے جی تو اب رہی نہیں۔ ان کے ہونے والا بچہ اور نگہت اب یہاں کیا کریں گے۔ شام کو ان کا دوست شاہد بھٹی ان کی والدہ کی تعزیت کے لیے آیا۔ بھٹی بھی جرمنی میں ہی رہتا تھا اور آج کل پاکستان آیا ہوا تھا۔ خواجہ صاحب نے اپنا مسئلہ اس کے گوش گزار کیا تو اس نے مشورہ دیا کہ بہتر ہے وہ نگہت کو کسی طرح جرمنی لے جائیں۔ بے جی بھی نہیں رہیں۔ نگہت اور اس کے بچے یہاں کہاں رلتے پھریں گے۔ وہاں پر ان کا مستقبل بھی محفوظ ہو جائے گا۔ عتیق تو ان معاملات میں کورا تھا لیکن بھٹی نے اپنے ایک قابل اعتماد ایجنٹ سے ان کے معاملات طے کروا دیے جس نے دس لاکھ کی رقم کے عوض چند ہفتوں کے اندر اندر نگہت کا یورپ کا ویزا لگوا دیا۔ ویزا اٹلی کی ایمبیسی سے جاری ہوا تھا اس لیے ایجنٹ نے تاکید کی کہ وہ لوگ پاکستان سے اٹلی کی فلائٹ

لیں۔اٹلی پہنچنے کے بعد وہاں سے جرمنی چلے جائیں۔خواجہ صاحب نے ویزا ملتے ہی رختِ سفر باندھا۔

ان کو پاکستان سے آئے کافی وقت ہو چکا تھا۔نگہت کا آٹھواں مہینا چل رہا تھا۔اس لیے بھاگم بھاگ آئے تھے کیونکہ تاخیر کی صورت میں خدشہ تھا کہ نئی مشکل پڑ جائے گی۔نئے سرے سے بچے کا بھی ویزا لگوانا پڑ جائے گا اور کیا معلوم وہ لگے یا نہ لگے۔

نگہت کے تو خواب وخیال میں بھی نہ تھا کہ ایک دن وہ یورپ جائے گی۔سلامت علی اور رضیہ بھی خوشی سے نہال تھے۔خواجہ عتیق اپنا گھر بار، سب کچھ ان کے حوالے کر گئے تھے۔جانے سے قبل ہر ماہ ایک معقول رقم بھیجنے کا وعدہ بھی انہوں نے کیا۔روم کے ائیر پورٹ پر اتر کر وہ ایک رات وہیں ہوٹل میں ٹھہرے۔اگلے دن فرینکفرٹ کی ٹرین پکڑی اور جرمنی پہنچ گئے۔

☆☆☆

نگہت کو جرمنی آئے تین ہفتے ہو چکے تھے۔خواجہ عتیق کی بڑی بیٹی آصفہ اس سے چند سال چھوٹی تھی۔اس نے باپ سے تھوڑی بہت پنجابی بھی سیکھ رکھی تھی۔اس لیے وہ اس سے جلد گھل مل گئی۔چھوٹی بیٹی فائزہ زیادہ تر اپنے کام سے کام رکھتی۔ریناٹا کا رویہ اس کے ساتھ شروع دن سے کچھ سرد تھا۔زچگی کے دن بھی قریب تھے۔آصفہ اس کا بہت خیال رکھتی۔خواجہ عتیق خود بھی ہمہ وقت اس کی دیکھ بھال پر توجہ دیتے۔ہمیشہ سے ان کو بیٹے کی شدید خواہش تھی۔ریناٹا دو بیٹیوں کو جنم دینے کے بعد کسی طبی پیچیدگی کے باعث ماں نہیں بن سکتی تھی۔اب نگہت کے بطن سے اپنی دیرینہ اُمید بر آنے کی پوری توقع تھی۔آج بھی ریناٹا گھر آئی تو عتیق اور نگہت کو صوفے پر بیٹھے پایا۔دونوں ہنس ہنس کر باتیں کرتے، ٹی وی دیکھ رہے تھے۔اس نے ایک نظر ان پر ڈالی اور بغیر کچھ کہے اپنے کمرے میں چلی گئی۔عتیق کو اندازہ ہو گیا کہ اس کا موڈ آف ہو گیا ہے۔نگہت کا ویزا ختم ہونے میں بھی اب دو ماہ ہی باقی تھے۔کیونکہ ایجنٹ نے ان کو تین ماہ کا وزٹ ویزا دلوایا تھا۔شام کو انہوں نے بھٹی کو فون کر کے اپنی پریشانی اور ساری صورت حال بتائی۔

"یار خواجے تو بھی کاٹھ کا اُلو ہے۔نگہت کو گھر پر رکھنے کی کیا ضرورت ہے؟"

"کیا مطلب ہے تمہارا؟ بھئی وہ بیوی ہے میری!" خواجہ عتیق نے کچھ نہ سمجھنے والے انداز میں کہا۔

"میں نے کب کہا ہے وہ تمہاری بیوی نہیں لیکن قانونی طور پر وہ صرف پاکستان میں تمہاری بیوی ہے۔ جرمن قانون ایک وقت میں صرف ایک شادی کی اجازت دیتا ہے۔ویسے بھی ایک نیام میں دو تلواریں نہیں سماتیں۔ ریناٹا ابھی تک تو اسے گھر میں برداشت کر رہی ہے لیکن یہ سلسلہ زیادہ دیر تک نہیں چلے گا۔" بھٹی نے خواجہ کو وارننگ دیتے ہوئے کہا۔

"تو پھر کیا کیا جائے؟"

"کرنا کیا ہے وہی جو اس قسم کی صورتِ حال میں سارے پاکستانی یہاں کرتے ہیں۔نگہت کی۔ سیاسی پناہ کی درخواست دائر کرو کہ یہ میری گرل فرینڈ تھی۔جواب مجھ سے حاملہ بھی ہو گئی ہے اور اسی بات پر اسے پاکستان میں اپنے گھر والوں سے جان کا خطرہ ہے۔جس کی وجہ سے وہ کسی نہ کسی طرح پاکستان سے نکل کر یہاں پہنچ گئی ہے۔ درخواست دائر ہوتے ہی اسے رہائش بھی مل جائے گی اور بچے کی ڈلیوری سمیت مستقبل میں اس کے سارے اخراجات بھی گورنمنٹ اٹھائے گی۔سب سے بڑی بات کہ ریناٹا کے ساتھ تمہارا گھر خراب ہونے سے بچ جائے گا۔خواجہ صاحب کی سمجھ میں اس کی بات آ گئی۔نگہت کی سیاسی پناہ کی درخواست جمع کروا دی گئی۔متعلقہ محکمے نے اسے سیاسی پناہ گزینوں کے ایک ہاسٹل میں کمرا الاٹ کر دیا۔ہاسٹل کی چار منزلہ وسیع وعریض عمارت کی ہر منزل پر کئی کمرے تھے جن میں دنیا بھر سے کئی ممالک کے مرد وزن رہائش پذیر تھے۔اٹیچڈ باتھ روم تو ہر کمرے میں تھا لیکن کھانے پکانے کے لیے ہر فلور پر بڑا سا مشترکہ کچن تھا۔ نگہت کے وہاں منتقل ہونے کے بعد خواجہ صاحب کا زیادہ تر دن وہیں گزرتا مگر رات کو چونکہ قیام کی اجازت صرف مکینوں کو ہوتی، اس لیے شام ڈھلتے ہی انہیں گھر لوٹنا پڑتا۔

دھیرے دھیرے وہ وقت بھی آ گیا جب فرینکفرٹ کے سینٹرل اسپتال میں نگہت نے ایک ننھی سی بچی کو جنم دیا۔ خواجہ صاحب کو ہلکا سا ملال تو ہوا، کیونکہ انہیں بیٹے کی دیرینہ حسرت تھی۔لیکن رب کی دین کو انہوں نے خندہ پیشانی سے قبول کیا۔بچی کا نام مائرہ رکھا گیا۔

☆☆☆

وقت کا پرندہ شب و روز کے پروں سے پرواز کرتا رہا۔مائرہ کو پیدائش کے فوراً بعد جرمن نیشنلٹی مل گئی۔کیونکہ خواجہ صاحب کے پاس جرمن پاسپورٹ تھا۔نگہت کو ابھی

تک مستقل رہائش کا ویزا جاری نہیں ہو سکا تھا۔ لیکن بیٹی کو جرمن شہریت ملنے کی وجہ سے اس کا کیس اب مزید مضبوط ہو چکا تھا۔ مستقل ویزا ملنے تک اسے ہر چھ ماہ بعد عارضی ویزا دیا جاتا۔ اس دوران اسے ہاسٹل میں ہی رہنا تھا۔ ہاسٹل میں کئی پاکستانی مرد و خواتین بھی تھے جو سیاسی پناہ کی آڑ میں ویزے کے خواہشمند تھے۔ جاوید بھی انہی میں سے ایک تھا۔ وہ منڈی بہاؤالدین کے لاری اڈے پر ایک ڈھابا چلاتا تھا جس سے معقول آمدنی تھی لیکن پھر گورنمنٹ نے لاری اڈے کو شہر سے باہر شفٹ کر دیا۔ اڈے سے منسلک دیگر سبھی دکانداروں کی طرح اس کا ڈھابا بھی بند ہو گیا۔ نئے لاری اڈے پر کوئی ٹھکانا بنانے کی اس نے بھرپور کوشش کی لیکن سرکار پہلے ہی سارے پرمٹ الاٹ کر چکی تھی۔ اس لیے اس کی دال نہ گل سکی۔ جمع پونجی کا بڑا حصہ بیکاری کے چند ہی مہینوں میں خرچ ہو چکا تھا۔ تنگ آکر اس نے گجرات کے پاس لب سڑک ایک نئے ڈھابے کی ابتدا کی۔ لیکن یہاں بھی قسمت نے یاوری نہ کی۔ چار چھ مہینے میں ہی اسے اندازہ ہو گیا کہ یہاں بات نہیں بننے والی۔ چاروں طرف سے ناکامی کا غلبہ دیکھتے ہوئے اس نے وہ ڈھابا بھی اونے پونے بیچ دیا۔ کچھ مزید رقم اس نے دوستوں یاروں سے ادھار پکڑی اور ایران، ترکی، یونان، اٹلی کے راستے ڈنکیاں لگاتا جرمنی پہنچ گیا۔ اور اب وہ فرینکفرٹ کے اسی ہاسٹل میں تھا جہاں نگہت بھی رہائش پذیر تھی۔

خواجہ عتیق کا چونکہ اکثر وہاں آنا جانا رہتا اس لیے ان کی بھی علیک سلیک جاوید سے رہتی۔ انہوں نے اسے اپنے اور نگہت کے بارے میں ساری رام کہانی بھی سنا دی تھی۔ ایک دن جاوید اور اس کا روم میٹ ارشد ہاسٹل کے لان میں روشن دنوں کے انتظار میں بینچ پر بیٹھے گپیں ہانک رہے تھے۔ سیاسی پناہ کے درخواست گزاروں کو رہائش اور کھانا پینا تو حکومت کی طرف سے مل جاتا ہے لیکن قانونی ویزے کے بغیر کام کاج ملنا انتہائی مشکل ہوتا ہے۔ ملے بھی تو کم اجرت پر کہیں چوری چھپے ہی ملتا ہے۔ اس لیے زیادہ تر وہ ویہلے ہی ہوتے ہیں۔ انہیں بیٹھے کچھ ہی دیر ہوئی تھی کہ خواجہ صاحب نگہت کے ساتھ وہاں سے گزرے۔ نگہت بچی کی پرام کو دھکیل رہی تھی۔ جرمنی کی آب و ہوا نے اس کے رنگ روپ میں مزید نکھار پیدا کر دیا تھا۔ چھریرے بدن کی بہار، اور آنکھوں میں خمار لیے وہ اونچی ایڑی والے سینڈل پہنے ٹک ٹک کرتی وہاں سے گزری تو دونوں اسے دیکھتے ہی

پنجاب کے بعض علاقوں میں مقامیت کے زیر اثر اکثر "کو" کی جگہ "نے" کا استعمال کرتے ہیں مثلاً کس کو جانا ہے کی جگہ کس نے جانا ہے۔ کسی نے رشید احمد صدیقی سے پوچھا "کیا زبان میں اس طرح کی باتیں روا ہیں؟"

رشید صاحب نے کہا "میرا خیال ہے اس میں کوئی حرج نہیں بلکہ اس سے بہ آسانی معلوم ہو جاتا ہے کہ کون کدھر کار ہنے والا ہے۔"

سب سے پہلے فضائی حادثات

☆ سعودی عرب میں سب سے پہلا فضائی حادثہ 20 اگست 1980ء کو ہوا جس میں 300 افراد ہلاک ہو گئے۔

☆ برطانیہ میں سب پہلا فضائی حادثہ 14 اکتوبر 1930ء کو پیش آیا۔ جس میں 48 افراد ہلاک ہوئے۔

☆ امریکا میں بوئنگ طیارے کو حادثہ 21 دسمبر 1988ء کو پیش آیا۔ جس میں 149 افراد ہلاک ہوئے۔

☆ چین میں سب سے پہلا فضائی حادثہ جون 1994ء کو پیش آیا جس میں 146 مسافر ہلاک ہوئے۔

☆ لیبیا میں سب سے پہلا فوکر جہاز گر کر 1973ء میں تباہ ہوا۔ جس میں کل 108 افراد تھے۔

☆ یوروگوا میں سب سے پہلا 12 اکتوبر 1972 کو فضائی حادثہ پیش آیا۔ جس میں 45 افراد ہلاک ہوئے۔

☆ نیوزی لینڈ میں سب سے پہلا حادثہ ڈی سی 10 کو 5 نومبر 1979ء کو پیش آیا۔ 237 افراد ہلاک ہوئے۔

☆ کوریا میں سب سے پہلا فضائی حادثہ یکم ستمبر 1983ء کو پیش آیا۔ 269 افراد ہلاک ہو گئے۔

☆ بھارت کے جمبوجیٹ سب سے پہلے 24 جون 1985ء کو سمندر میں گرا۔ جس میں 329 افراد تھے۔

رانا حبیب الرحمن۔ سینٹرل جیل لاہور

رہ گئے۔

''یار بیٹی تو اس کی قیامت ہے!'' ارشد نے ہلکی سی سیٹی بجاتے ہوئے نگہت کی طرف دیکھا۔

''اوہ نہیں یار، بیٹی نہیں...... بیوی ہے اس کی۔'' جاوید ہنسا۔

ارشد کا منہ حیرت سے کھلے کا کھلا رہ گیا۔ جاوید نے ان دونوں کے بارے میں اسے ساری بات بتائی۔

''واہ مولا تیری شان۔ ایک ہم ہیں جو لنڈورے ہی پردیس میں دھکے کھاتے پھر رہے ہیں اور خواجہ صاحب ولایتی اور دیسی بیویاں رکھے ہوئے ہیں۔''

لگ بھگ ایک سال بیت چکا تھا۔ دو ہزار سولہ میں پناہ گزینوں کا ایک نیا، بے قابو ریلا جرمنی میں داخل ہوا، اور اس کے ساتھ ہی حکومتی مشینری پر بوجھ کئی گنا بڑھ گیا۔ فائلوں کا کام جو پہلے ہی سست روی کا شکار تھا اب تو جیسے رینگنے لگا۔ نگہت بدستور اسی ہاسٹل میں تھی۔ ریناٹا کو کمر کے مہروں کی شدید تکلیف کی وجہ سے قبل از وقت پینشن لینی پڑی۔ زیادہ چلنے پھرنے میں بھی وہ واکنگ اسٹیک کی محتاج ہوگئی تھی۔ اس افتاد پر خواجہ عتیق کو دوبارہ فل ٹائم نوکری کرنی پڑگئی۔ جس کی وجہ سے نگہت کے پاس ہاسٹل آنا جانا بھی پہلے کی نسبت کافی کم ہوگیا۔ اب روز کی بجائے ہفتے میں بمشکل دو چکر لگتے۔ نگہت بھی اپنے آپ کو جرمنی کے ماحول میں کافی حد تک ڈھال چکی تھی۔ شاپنگ، ڈاکخانے کے کام، سوشل آفس کے چکر، سب کچھ اب وہ خود ہی سنبھال لیتی تھی۔ اس کی چال اور رویے سے بھی خود اعتمادی جھلکتی۔ پاکستان گھر والوں سے بھی رابطہ رہتا۔ حیلے بہانے سے وہ خواجہ عتیق سے بھی وقتاً فوقتاً رقم لے کر ماں باپ کو بھیجتی رہتی۔ خواجہ صاحب سے دس مرلے کا پلاٹ بھی والدین کو دلوا دیا تھا۔ جہاں اب سلامت علی اپنا نیا مکان تعمیر کر رہا تھا۔

☆☆☆

فرینکفرٹ شدید برفباری کے سفید لپیٹے میں ڈوبا ہوا تھا۔ برفباری کئی دنوں سے جاری تھی اور تھمنے کا نام نہیں لے رہی تھی۔ مائرہ کا دودھ اور چند ضروری چیزیں لینے کے لیے نگہت بازار گئی۔ واپس پہنچی تو لفٹ خراب پڑی تھی۔ اس کا کمرا تیسرے فلور پر تھا۔ پرام کو وہ نیچے ہی چھوڑ دیتی تب بھی بچی اور شاپنگ بیگز اٹھا کر سیڑھیاں طے کرنا اس کے بس کی بات نہیں تھی۔ ابھی وہ سوچ ہی رہی تھی کہ کیا کرے، اتنے میں جاوید دروازے سے اندر داخل ہوا۔ اس کا کمرا بھی تیسرے فلور پر ہی تھا۔ لفٹ خراب دیکھ کر وہ اس کی مشکل سمجھ گیا۔

''لائیں، یہ بیگز مجھے دے دیں۔ آپ بچی کو اٹھا لیں، میں اوپر تک پہنچا دیتا ہوں۔'' اس نے آفر کی۔

نگہت نے شکریہ ادا کرتے ہوئے تھیلے اسے پکڑا دیے۔

دونوں سیڑھیاں چڑھتے ہوئے موسم اور برفباری پر باتیں کرتے رہے۔

کمرے میں پہنچ کر جاوید نے سامان میز پر رکھا۔

نگہت نے ایک بار پھر اس کا شکریہ ادا کیا۔

''شکریہ کی کیا بات ہے؟ پردیس میں اپنے ہی اپنوں کے کام آتے ہیں۔ کبھی بھی ضرورت ہو، بلا جھجک کہہ دیا کریں۔'' اس نے ہلکا سا مسکراتے ہوئے جواب دیا۔

جاوید کی نظریں چند لمحے اُس کی آنکھوں پر ٹکی رہیں۔

''جی ضرور۔'' نگہت نے نظریں چراتے ہوئے دھیرے سے کہا۔

اس دن کے بعد آپس میں گفتگو اور میل ملاقات کا سلسلہ چل پڑا۔ جاوید کھانے پکانے کا ماہر تو تھا ہی اکثر اس کے لیے بھی کھانا بنا دیتا۔ کبھی بازار سے اسے سودا سلف لا دیتا۔ خواجہ عتیق گھر پر ریناٹا کی بیماری اور نوکری کی وجہ سے پہلے جیسا وقت نہ دے پاتے تھے۔ مائرہ کے سونے کے بعد نگہت اور جاوید اکثر اپنی منزل پر بنے مشترکہ کچن میں بیٹھ کر دیر تک باتیں کرتے رہتے۔ دھیرے دھیرے تکلفات کا پردہ چاک ہوتا چلا گیا۔ جاوید نے اسے بڑی مہارت سے شیشے میں اتارنا شروع کر دیا۔ غیر محسوس طریقے سے اس نے نگہت کو یہ احساس دلانا شروع کر دیا کہ خواجہ عتیق کی ترجیح نگہت کی بجائے ریناٹا ہی رہے گی۔ نگہت کو بھی آج کل خواجہ عتیق سے پہلے جیسا التفات نہیں مل رہا تھا۔ رفتہ رفتہ وہ جاوید کے بہکاوے میں آتی چلی گئی۔ اکثر گھومنے پھرنے پارک میں یا دریا کنارے چہل قدمی کے لیے بھی اکٹھے چلے جاتے۔ ایک دن وہ دونوں پارک میں گھوم رہے تھے۔ خواجہ صاحب کا گاڑی میں وہاں سے گزر ہوا۔ ان کی گاڑی پارک کی باہر والی سڑک پر ٹریفک میں پھنسی ہوئی تھی۔ دونوں درختوں کی درمیانی روش پر ہنستے اور باتیں کرتے چل رہے تھے۔ نگہت کو یوں بے تکلفی سے جاوید کے ساتھ قہقہے لگاتے دیکھ کر انہیں ایک ناخوشگوار حیرت ہوئی۔ لیکن انہوں نے

سوچا دونوں کی ایک ہی وقت پارک میں موجودگی اتفاق بھی ہوسکتی ہے۔ لیکن کچھ ہی دنوں بعد ایک اور واقعہ ہوا۔ فرینکفرٹ کے سینما ہاؤس میں ایک نئی انڈین مووی لگی تھی۔ خواجہ صاحب کی چھوٹی بیٹی فائزہ اپنی ایک سہیلی کے ساتھ فلم دیکھنے گئی۔ انٹرول میں جب ہال کی روشنیاں آن ہوئیں تو اچانک اس کی نظر نگہت پر پڑی جو جاوید کے پہلو میں بیٹھی ہوئی تھی۔ ان کی آپس میں بات چیت سے اسے اندازہ ہو گیا کہ وہ دونوں ساتھ ہی آئے ہیں۔ فائزہ خاموشی سے اپنی سیٹ پر بیٹھی دونوں کو دیکھتی رہی۔ گھر آ کر اس نے یہ بات ماما، پاپا کو بھی بتائی۔ خواجہ صاحب پر تو گھڑوں پانی پڑ گیا۔ اگلے دن انہوں نے نگہت سے استفسار کیا تو اس نے بہانہ کیا کہ ہاسٹل میں ایک پاکستانی عورت نے اسے اس فلم کے بارے میں بتایا تھا۔ وہ زندگی میں کبھی سینما نہیں گئی تھی، اس لیے تجسس کی خاطر فلم دیکھنے چلی گئی جہاں جاوید بھی اتفاق سے آیا ہوا تھا۔ خواجہ صاحب اس کی وضاحت سے مطمئن نہ ہوئے۔ شک کا پوذا ان کے من میں جڑ پکڑ چکا تھا۔ البتہ یہ ہوا کہ اس کے بعد وہ دونوں ساتھ باہر جانے سے گریز کرنے لگے۔ ویسے بھی انہیں ہاسٹل کے اندر میل ملاقات کی کھلی چھوٹ تھی خصوصاً رات کے اوقات میں تو انہیں کوئی ڈر ہی نہیں تھا کیونکہ شام آٹھ بجے کے بعد مکینوں کے علاوہ کسی اور کو اندر آنے کی اجازت نہیں تھی۔ بچی کو سلا کر وہ جاوید کے کمرے میں دیر گئے تک اس کے پاس بیٹھی باتیں کرتی رہتی۔ وہ اس کی طرف کھنچی چلی جا رہی تھی۔ سنجیدگی سے جاوید اور خواجہ صاحب کے درمیان راستے کا انتخاب کرتے وہ ایسی آگ میں جل رہی تھی جو اسے جلا کر نہ تو بھسم کرتی اور نہ ہی بجھ کر دھواں ہوتی۔ جذبات کے آوارہ جھونکوں کی رو میں بہتے ہوئے اب اکثر کیف آور شامیں جاوید کے کمرے میں گزرنے لگیں۔ رفتہ رفتہ وہ خواجہ صاحب سے پیچھا چھڑانے کے طریقے سوچنے لگی۔ لیکن اسی دوران وہ پھر سے اُمید سے ہوگئی۔ خواجہ صاحب کا آنا جانا بھی دوبارہ زیادہ ہوگیا۔ وہ اس کا حتی المقدور خیال رکھنے لگے۔

☆☆☆

وقت گزرتا گیا۔ نگہت کو جرمنی میں مستقل رہائش کا اجازت نامہ مل چکا تھا۔ کچھ عرصے میں حکومت کی طرف سے اسے ہاسٹل کی بجائے الگ فلیٹ ملنے والا تھا۔ اسی دوران اس کے ہاں دوسرے بچے کی پیدائش ہوئی۔ خواجہ صاحب کی اُمید بر آئی تھی۔ اس بار نگہت نے بیٹے کو جنم دیا تھا۔ وہ خوشی سے نہال تھے۔ آخر انہیں اپنا اور اپنی جائیداد کا وارث مل گیا تھا۔ لیکن پھر ایک دن وہ ہوا جس کا انہوں نے کبھی تصور بھی نہیں کیا تھا۔ کافی دنوں سے کام کاج کی زیادتی کے باعث وہ ہاسٹل نہ جا پائے تھے۔ آج بھی رات کے نو بجے وہ کام سے نکلے تو جی میں آئی کہ نگہت اور بچوں سے ملتا چلوں۔ دروازے پر سیکیورٹی گارڈ نے انہیں روک لیا۔ انہوں نے منت سماجت کی کہ ان کے نوزائیدہ بچے کی طبیعت کچھ ٹھیک نہیں ہے۔ اس لیے تھوڑی دیر کے لیے ملنے دیا جائے۔ گارڈ بھی کوئی بال بچوں والا تھا۔ اس نے مجبوری کے پیش نظر انہیں اندر جانے کی اجازت دے دی اور تاکید کی کہ وہ آدھے گھنٹے کے اندر اندر آجائیں۔ خواجہ صاحب اس کا شکریہ ادا کر کے اوپر پہنچے تو دونوں بچے کمرے میں سوئے ہوئے تھے لیکن نگہت غائب تھی۔ وہ تھوڑی دیر انتظار کرتے رہے مگر نگہت نہ آئی۔ دل میں وسوسوں کا طوفان لیے ٹہلتے ٹہلتے وہ جاوید کے کمرے کے باہر آکر رکے۔ اندر سے نگہت اور جاوید کے قہقہوں اور باتوں کی آوازیں صاف سنائی دے رہی تھیں۔ ان کا ضبط جواب دے گیا۔ بے پرواہی میں وہ کمرے کو اندر سے لاک کرنا بھول گئے تھے۔ خواجہ صاحب نے زور سے دھکا دیا تو دروازہ چوپٹ کھل گیا۔ اندر کا منظر ان کے ہوش اڑانے کے لیے کافی تھا۔ سامنے نگہت جاوید کے بستر پر اس کی بانہوں میں لیٹی ہوئی تھی۔ اس اچانک افتاد سے وہ دونوں بوکھلا گئے۔ ہڑبڑا کر یوں اٹھے جیسے بستر میں اچانک کسی نے کرنٹ چھوڑ دیا ہو۔ جاوید کے چہرے سے گھبراہٹ عیاں تھی، نگہت کا بھی کاٹو تو بدن میں لہو نہیں والی حالت تھی۔

"آ......آ، آ......آ......پ۔" جاوید بمشکل ہکلایا۔

"یہ سب کیا ہے، کیا بے ہودگی ہے یہ؟" غصے کی شدت سے کنپٹیوں کی نسیں پھول گئی تھیں۔

نگہت تھر تھر کانپنے لگی۔ اس کی سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ کیا جواب دے۔

"خواجہ صاحب چلّانے کی ضرورت نہیں۔ آرام سے بات کریں۔ اچھا ہوا آپ نے خود اپنی آنکھوں سے دیکھ لیا اور اب بہتر ہے کہ آپ اس بات کو اچھی طرح سے سمجھ بھی لیں۔" جاوید سنبھلتے ہوئے بولا۔

"کیا مطلب ہے تمہارا؟ کیا سمجھ لوں؟"

"میں اور نگہت ایک دوسرے کو پسند کرتے ہیں۔ اور

ہم نے زندگی ساتھ گزارنے کا فیصلہ کرلیا ہے۔ بہتر ہے آپ خود ہی ہمارے راستے سے ہٹ جائیں اور نگہت کو طلاق دے دیں۔" جاوید ڈھٹائی سے خواجہ عتیق کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے بولا۔

"نگہت یہ کیا بکواس کر رہا ہے؟" خواجہ صاحب اب نگہت کی طرف مڑے۔ جاوید کے اعتراف کے بعد وہ بھی اپنے آپ کو قدرے سنبھال چکی تھی۔ ویسے بھی جاوید اسے پٹی پڑھا چکا تھا کہ اس ملک میں قانون کے مطابق خواجہ عتیق اس کا بال بیکا بھی نہیں کرسکتے۔ انسان بھی عجیب چیز ہے وہ اپنے خوابوں کی تعبیر کے لیے مچلتا اور تڑپتا ہے اور پھر بھی انہی تعبیروں کو پاش پاش کرکے خوش بھی ہوتا ہے۔

"آپ نے بالکل ٹھیک سنا ہے۔ جاوید صحیح کہہ رہا ہے میں آپ کے ساتھ نہیں رہنا چاہتی۔ آپ کی ترجیح ویسے بھی رینا ٹا اور آپ کی بیٹیاں ہیں۔ مجھے آپ آزاد کردیں۔ میں نے اپنی زندگی کی ترجیحات کا فیصلہ کرلیا ہے۔" اس نے بڑے فیصلہ کن لہجے میں کہا۔

خواجہ صاحب کے تو پاؤں تلے زمین کھسک گئی۔ ان کے تو سان و گمان میں بھی نہیں تھا کہ نگہت اس حد تک گر جائے گی۔ بے اختیار ان کا ہاتھ نگہت کو تھپڑ مارنے کے لیے اٹھا تو جاوید نے بیچ میں آکر ان کی کلائی پکڑ کر پیچھے دھکیل دیا۔ خواجہ صاحب لڑکھڑا گئے۔ شور شرابے اور ہنگامے کی آوازیں سن کر پاس پڑوس کے کمروں کے مکین بھی نکل آئے۔ کچھ ہی دیر میں سیکیورٹی اسٹاف بھی آ گیا۔ خواجہ صاحب چلّا رہے تھے۔ سیکیورٹی گارڈز نے انہیں قابو میں کیا اور پکڑ کر باہر لے گئے۔ سیکیورٹی کی کال پر پولیس بھی منٹوں میں پہنچ گئی۔ پولیس نے سارا معاملہ سننے اور سمجھنے کے بعد خواجہ صاحب کو بتایا کہ بہتر ہے وہ خاموشی سے یہاں سے چلے جائیں بصورت دیگر انہیں ہنگامہ آرائی کے جرم میں گرفتار... کرلیا جائے گا۔ نگہت یہاں پر سیاسی پناہ گزین ہے۔ آپ کی گرل فرینڈ ہو یا بیوی یا کچھ اور، وہ ایک الگ معاملہ ہے۔ وہ آپ کی قانونی بیوی ہوتی جب بھی وہ بالغ ہے۔ قانون کے مطابق اپنے برے بھلے کا اختیار اس کے اپنے پاس ہے۔ نگہت سے ہم نے بات کی ہے۔ اس نے کہا ہے کہ وہ آپ کی شکل بھی نہیں دیکھنا چاہتی۔ آپ کو وارننگ دی جارہی ہے۔ آئندہ آپ اس ہاسٹل کے اردگرد نظر آئے یا نگہت کو ہراساں کرنے کی کوشش کی تو آپ کے خلاف قانونی کارروائی کی جائے گی۔

خواجہ صاحب ٹوٹے دل اور شکستہ قدموں وہاں سے نکلے۔ گھر پہنچ کر کسی سے بات چیت کے بغیر چپ چاپ اپنے کمرے میں جاکر لیٹ گئے۔ اسی رات انہیں دل کا دورہ پڑا۔ قسمت اچھی تھی کہ بیٹیاں ابھی جاگ رہی تھیں۔ انہوں نے فوراً ایمبولینس کال کی۔ طبی عملہ پہنچا تو ان کی حالت نازک تھی۔ فوراً اسپتال منتقل کرکے ان کے دل میں اسٹنٹ ڈالے گئے۔ چند دن بعد ڈسچارج ہوکر گھر تو آگئے لیکن وہ پہلے والے خواجہ عتیق نہ رہے۔ نگہت والے واقعے اور ہارٹ اٹیک نے ان کی سدھ بدھ ماردی تھی۔ نہ کسی سے بات کرتے، نہ کسی چیز میں دلچسپی لیتے بس چپ چاپ خلاؤں میں گھورتے رہتے۔ ان کی محبت، وفاداری، اور اعتبار کی عمارت زمیں بوس ہوچکی تھی۔ آخرکار بیٹیوں اور رینا ٹا کے کریدنے پر انہیں سارا ماجرا بتانا پڑا۔ سب کچھ سن کر وہ تینوں بھی انگشت بدنداں رہ گئیں۔ طبیعت ذرا سنبھلی تو چند دن بعد نجانے ان کے دل میں کیا سمائی کہ انہوں نے ایک وکیل کے توسط سے عدالت سے اپنے نوزائیدہ بچے کے ڈی این اے ٹیسٹ کی اجازت مانگی جو انہیں فوراً مل گئی۔ کیونکہ سرکاری کاغذات میں ولدیت کے خانے میں ان کا نام درج تھا۔ چند دن بعد ڈی این اے رپورٹ کا سربمہر لفافہ انہیں موصول ہوا۔ کانپتے ہاتھوں سے کھولا تو ان کے بدترین خدشات حقیقت کا روپ دھار چکے تھے۔ رپورٹ میں صاف صاف لکھا تھا کہ ڈی این اے ان سے میچ نہیں کرتا وہ ان کا بیٹا نہیں ہے۔ رینا ٹا اور بیٹیوں نے دلجوئی کی ہرممکن کوشش کی۔ لیکن خواجہ عتیق کو نگہت کی بے وفائی کے روگ کا دیمک اندر اندر ہی چاٹ گیا۔ کچھ عرصے بعد برین ہیمبرج کا جان لیوا اٹیک ہوا جس میں وہ جانبر نہ ہوسکے۔ جاوید اور نگہت اکٹھے رہ رہے تھے لیکن نکاح نہیں کرسکتے تھے کیونکہ خواجہ عتیق نے ابھی اسے طلاق نہیں دی تھی۔ ان کی موت نے دونوں کا یہ مسئلہ بھی حل کردیا۔ کچھ سال جاوید نے نگہت کے ساتھ گزارے۔ پھر اس نے نگہت کو چھوڑ کر پاکستان میں اپنی منگیتر سے شادی کرلی۔ تب جاکر اسے سمجھ آئی کہ جاوید نے محض ویزے کے حصول کے لیے اس سے کھلواڑ کیا تھا۔ لیکن وہ اسے کیا دوش دیتی، ہرجائی تو وہ خود بھی تھی۔ جس نے اس کا سب کچھ چھین لیا۔ جرمنی میں بھی کوئی سہارا نہ رہا اور پاکستان کی جائیداد سے بھی اس کے والدین کو نکال باہر کیا گیا۔ خواجہ کی قانونی بیوی ہونے کی وجہ سے اب سب کچھ رینا ٹا اور اس کی بیٹیوں کو مل چکا تھا۔

++

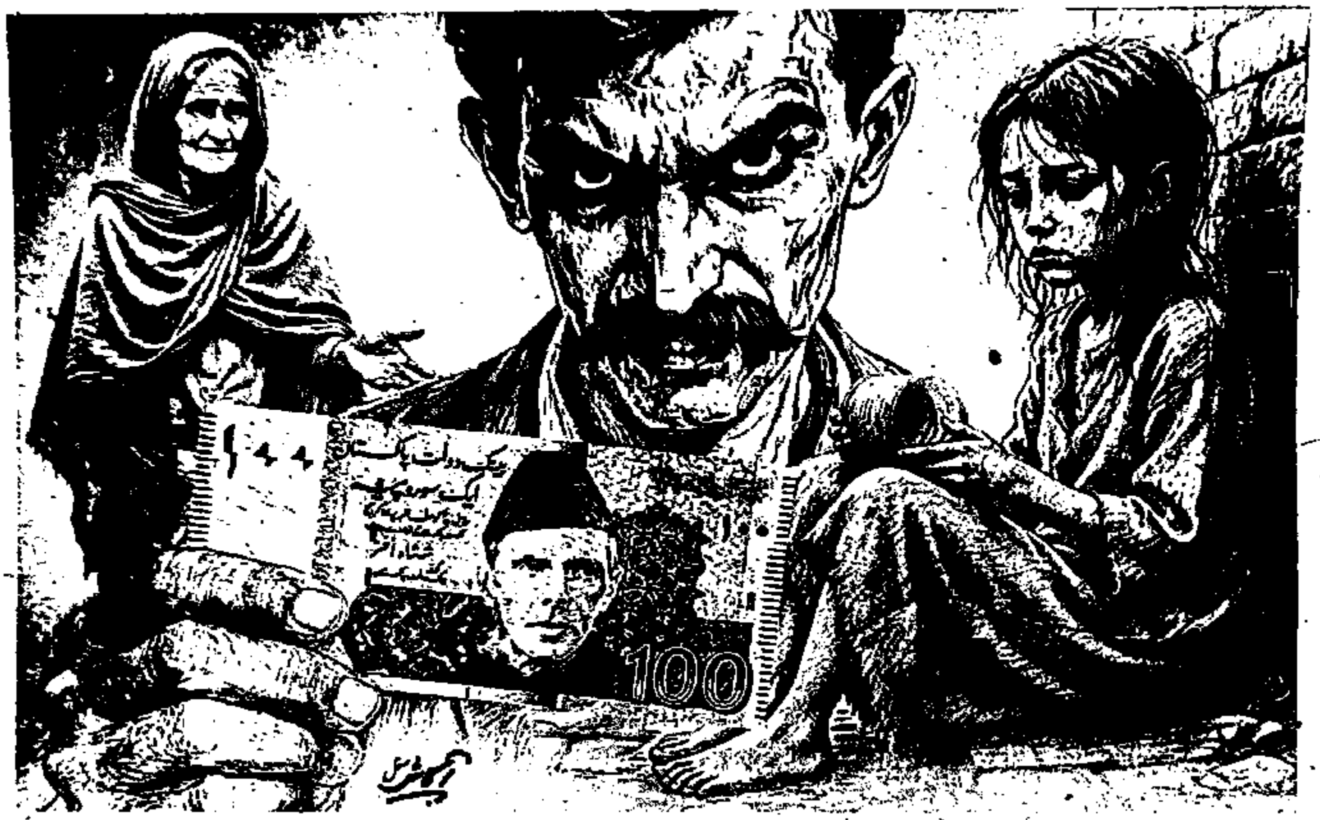

مجبوری

مکرمی مدیر

سلام شوق!

انسان کتنا مجبور ہے، غربت کتنا مجبور بنا دیتی ہے۔ ہر روز بھرے پیٹ سونے والے بھوک کی تپش کیا جانیں۔ نانی بھی نادیدہ خون میں لتھڑے سو روپے کے نوٹ پر بک گئی۔

اقرا عرش
(کراچی)

"بڑی اماں مجھے یہ برگر کھانا ہے بڑی اماں......!"
ہوٹل کے پاس سے گزرتے ہوئے دس سالہ زینو بوڑھی نانی کا بازو جھنجوڑتے ہوئے زور سے بولی۔

"ہے بابو......! اللہ کے نام پر دے دے اندھی کو کچھ۔"
"اللہ تیری آنکھوں کی روشنی سلامت رکھے۔"

بڑھیا نے نواسی کی بات نظر انداز کرتے ہوئے صدا لگائی۔ نوجوان نے بڑبڑاتے ہوئے روپیا کٹورے میں پھینک دیا۔ چھن کی آواز آئی۔ ماسی جمیلہ کے چہرے پر خفیف سی مسکراہٹ ابھری اور وہ دعائیں دیتی صدا لگاتی آگے بڑھ گئی۔

شام ڈھل گئی تھی کشکول میں بھی کافی سکے جمع ہو گئے

تھے۔ ماسی جمیلہ سڑک کنارے بوہڑ کے درخت کے نیچے بیٹھ کر سکے گننے لگی۔ دو روپے نکال کر اس نے زینو کی طرف بڑھائے۔ "یہ لے جا کوئی شے (چیز) کھا لے۔"

"نہ مجھے نہیں کھانی۔" زینو نے بوہڑ کے تنے کو ناخنوں سے کھرچتے ہوئے ناراضگی سے کہا۔

"آئے ہائے چھوری باولی ہوگئی ہے کیا؟ صبح سے کچھ نہیں کھایا۔ مرنا ہے کیا؟"

"ہاں اچھا ہے مر جاؤں۔" وہ ہنوز غصے سے بولی۔

"ارے کاہے کو اتنا گصہ (غصہ) کر رہی ہے۔ چل بول کیا کھانا ہے۔" ماسی جمیلہ نے محبت سے زینو کے سر پر ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا۔

زینو کچھ دیر چپ رہی پھر تیزی سے بولی۔ "وہ برگر......!"

"لو کر لو بات وہ ام گریبو کے کھانے کی چیز تھوڑی ہے۔ پگلی وہ تو امیروں کے چونچلے ہیں اور میں نے سنا ہے اس سے پیٹ کھراب ہوتا ہے۔" ماسی جمیلہ نے زینو کو سمجھاتے ہوئے آخری جملہ رازدارانہ لہجے میں کہا۔

"تو بس پھر مجھے کچھ نہیں کھانا۔" زینو تنک کر بولی اور اٹھ کر تیز تیز قدموں سے سڑک کنارے چلنے لگی۔

"ارے سن تو......" ماسی جمیلہ اپنی چھڑی سنبھالتی اس کے پیچھے لپکی مگر وہ بھاگ کر سڑک کنارے بنے ایک شیشے کے ہوٹل کے سامنے جا کھڑی ہوئی۔ جیسے ہی اس نے ماسی جمیلہ کو اپنی طرف بڑھتے دیکھا وہ شیشے کا دروازہ دھکیلتی ہوٹل میں گھس گئی۔

"ارے ارے کہاں چلی آرہی ہیں آپ؟" منیجر اسے دیکھتے ہی حواس باختہ سا اس کی طرف بھاگا۔

"جی میری ماں مر گئی ہے جی۔ دو دن سے بھوکی ہوں۔ اللہ کے واسطے کچھ کھانے کو دیں دے۔"

اتنے میں ماسی جمیلہ بھی زینو کے سر پر پہنچ چکی تھی۔

"آپ بھی اندر آ گئی؟"

"یہ چوکیدار کہاں مر گیا ہے؟" منیجر غصے سے چلایا۔

"جی یہ میری کاکی (بچی) ہے صاحب جی۔" ماسی جمیلہ نے زینو کا ہاتھ پکڑتے ہوئے کہا۔

"چل نکل جھوٹی۔" منیجر نے لال لال آنکھوں سے اسے گھورتے ہوئے کہا۔ اتنے میں چوکیدار بھی آ گیا۔ وہ ان دونوں کو گھسیٹتے ہوئے ہوٹل سے باہر لے گیا۔ کیونکہ زینو کسی بھی طور ہوٹل سے نکلنے کے لیے راضی نہیں تھی۔

جھونپڑی میں زینو کی گونجتی سسکیاں ماسی جمیلہ کا دل چیر رہی تھی۔ "ری بس کر رونا۔ سمجھایا بھی تھا کہ وہ امارے کھانے کی چیز نہیں اور یہ تو جھوٹ کیوں بول رہی تھی؟" ماسی جمیلہ نے سخت لہجے میں زینو کو گھورتے ہوئے استفسار کیا۔

"جو آپ روز بولتی ہیں؟ اتنا تو نہیں بولا۔ ہر روز خود کو اندھی اندھی کہہ کر مانگتی ہیں۔ میں نے بھی کچھ کہا؟ اور میں نے تو کوئی جھوٹ نہیں بولا تھا۔ اگر میری سگی ماں ہوتی تو وہ مجھے ضرور کھلا دیتی برگر۔" زینو ہاتھ نچا نچا کر یہ کہتے ہوئے ایک بار پھر منہ پر ہاتھ رکھے پھپک پھپک رونے لگی۔

ہوٹل والے تو ہوٹل والے ریڑھی والے بھی انہیں قریب سے گزرنے نہیں دیتے تھے۔ ہوٹلوں میں بیٹھے لوگوں کو بڑا بڑا منہ کھول کر برگر کھاتے دیکھ کر زینو کے منہ سے پانی ٹپک ٹپک جاتا۔ لیکن بس وہ ہونٹوں پر زبان پھیر کر رہ جاتی۔ جیسے جیسے وقت آگے بڑھ رہا تھا اس کی خواہش بھی زور پکڑتی جارہی تھی۔

زینو کی سکھی صبو نے اسے بتایا تھا۔ "اگر صاف اچھے کپڑے پہن کر جاؤ تو ہوٹل والے بالکل نہیں روکتے۔ بلکہ اندر بیٹھنے دیتے ہیں۔ اور پہلے آڈر (آرڈر) لیتے ہیں جو دل کرے کھاؤ۔ پیسے تو کہیں بعد میں مانگتے ہیں۔ بس تم کھا کر کھسک جانا چپکے سے۔ میں نے تو کئی بار ایسے ہی مفت کھایا ہے۔"

"ہاں لیکن جانا رات کو دیر سے تب بہت رش ہوتا ہے ہوٹلوں میں اور زیادہ پتا نہیں چلتا بس ہاتھ دھونے کے بہانے اٹھنا اور بھاگ آنا۔" زینو کو صبو کی باتیں بہت اچھی لگیں۔ اس نے دل ہی دل میں ان پر عمل کرنے کی ٹھان لی۔

اگلے دن جانے کہیں سے ماسی جمیلہ ایک شاپر میں برگر کے ٹکڑے لے آئی۔ زینو نے بھاگ کر بڑی اماں کے ہاتھ سے شاپر جھپٹا اور اشتیاق سے کھولتے ہوئے کیچپ میں لتھڑے برگر کے ٹکڑے کھانے لگی۔

"ہائے بڑی اماں کتنے سوادی (مزے کے) ہیں۔ سچ کہوں اگر مجھے بھی پورا برگر کھانے کو مل جائے نا تو میں تو مر ہی جاؤں خوشی سے۔" زینو باچھیں پھیلاتے ہوئے بولی۔

"نگوڑ ماری یہ ایک پورے برگر سے کہیں زیادہ تھا۔ پر تیری نیت نہیں بھرتی۔"

"ہاں لیکن تھے تو ٹکڑے ہی نا۔ بکھرے ہوئے۔ ویسے تو نہیں تھا نا، پھولا ہوا جیسے وہ ہوٹلوں میں بیٹھے لوگ کھاتے ہیں۔ یوں منہ کھول کھول کر۔" زینو نے بڑا سا منہ کھولتے ہوئے حسرت سے کہا۔

اماں سر جھٹک کر گھٹڑی سر کے نیچے رکھ کر لیٹ گئی۔

صبو کو کوٹھی والی نے اتنے رنگ برنگے کپڑے دیئے تھے۔ صبو نے ایک چمکیلا گلابی جوڑا زینو کو بھی دیا تھا۔ زینو خوشی خوشی جھونپڑی میں آئی اور ماسی جمیلہ کو جوڑا دکھانے لگی۔ چائے پیتی ماسی جمیلہ نے غصے سے اس کی طرف دیکھا اور بولی۔

”کیوں لائی ہے یہ؟“

”پہننے کے لیے۔“ زینو نے اٹھلاتے ہوئے کہا۔

”کم بخت یہ پہن کر مانگے گی تو کوئی بھیک نہیں دے گا۔“

”بڑی اماں ہم کیوں نہیں کالونیوں میں مانگنے جاتے ہیں۔ بس سارا دن سڑکوں بازاروں میں ہی خوار ہوتے رہتے ہیں۔“ زینو نے بڑی اماں کی بات نظرانداز کرتے ہوئے سوال کیا۔

”جاتی تھی پہلے۔ بس پھر زنانیاں خیرات کم دیتی ہیں اور مشورے زیادہ۔“ ماسی جمیلہ ٹھنڈی سانس بھرتے ہوئے بولی۔

”مشورے کیسے بڑی اماں؟“ زینو نے بھنویں سکیڑتے ہوئے بڑی اماں سے پوچھا۔

”کوئی کہتی اگر بچوں نے گھر سے نکال دیا ہے تو اولڈ ہوم چلی جائیں۔ کوئی کہتی ہمارے گھر صفائی کر دیں۔ کوئی کچھ۔ کوئی کچھ۔ بس پھر جب تیری ماں اس دنیا سے چلی گئی... تو تجھے اٹھائے میں انہی سڑکوں بازاروں میں مانگنے لگی۔ بھیک بھی اچھی مل جاتی ہے۔ اور کوئی مشورے بھی نہیں دیتا۔“ بڑی اماں نے یہ کہتے ہوئے چائے کا پیالہ اوندھا زمین پر رکھا اور لیٹ گئی۔

”بڑی اماں میرا ابا کہاں ہے؟“ زینو نے سرسراتے لہجے میں سوال کیا تو لمحے بھر کے لیے بڑھیا ساکت ہو گئی۔

☆☆☆

”نسرین او نسرین کہاں مر جاتی ہے؟“ جمیلہ نے اپنی جوان بیٹی کو گھورتے ہوئے کہا۔

”اماں وہ نالے کے پاس جن کی کوٹھی ہے نا وہ صاحب بہت اچھا ہے۔ مجھے کھانے کو بھی اچھا اچھا دیتا ہے اور باتیں بھی بہت مجھ سے کرتا ہے۔ یہ دیکھ آج بھی باداموں والا حلوا دیا ہے۔“ یہ کہتے ہوئے نسرین نے ماں کے سامنے حلوے سے بھرا کٹورا بڑھایا۔ جمیلہ بھی شوق سے کھانے لگی۔

”اماں وہ کہہ رہا تھا کہ تو آتی بے وقت ہے۔ شام کو آیا کر۔ میں گھر میں ہی ہوتا ہوں۔ تمہیں کچھ کپڑے بھی دوں گا اپنی گھر والی کے۔“ ماسی جمیلہ کا منہ تک جاتا ہاتھ رک گیا۔

”کھا، نا اماں، رک کیوں گئی؟“ نسرین نے الجھ کر ماں کو دیکھا۔

”آہاں بس کھا لیا۔“ ماسی جمیلہ نے چونک کر بیٹی کے رنگین چہرے کی طرف دیکھا اور اپنی گدڑی میں جا لیٹی۔

اگلے دن اس نے بشیرے منڈے سے نسرین کی بات پکی کر دی۔ نسرین نے سنتے ہی ہنگامہ کھڑا کر دیا لیکن اماں نے ایک نہ سنی۔ نسرین ایک دن چپکے سے گھر چھوڑ گئی۔ ماسی جمیلہ نے بہت ڈھونڈا مگر نہ ملی بہت دفعہ وہ اس کوٹھی پر بھی گئی مگر آگے تالا لگا ہوتا۔

تین دن بعد آخر خود ہی نسرین واپس آ گئی۔ ماسی جمیلہ نے کوئی سوال نہ کیا۔ وہ ماں کے قدموں سے لپٹ کر پھوٹ پھوٹ کر روئی۔ ماسی جمیلہ نے سر پر ہاتھ رکھ دیا۔ وہ اور زور زور سے رونے لگی۔

وہ سارا سارا دن جھونپڑی میں پڑی رہتی۔ بشیرے منڈے نے ویاہ کا تقاضا کیا تو ماسی جمیلہ نے کہا ”جا ابھی لے آ بارات۔“

بشیرا کچھ دیر ہکا بکا ماسی جمیلہ کی طرف دیکھتا رہا۔ پھر خوشی سے اپنی ٹوٹی ٹانگ گھسیٹتا چلا گیا۔

ایک جھونپڑے سے دوسرے جھونپڑے میں بیٹی رخصت کر دی۔

☆☆☆

”کچھ پوچھا ہے میں نے بڑی اماں؟“ زینو نے بڑھیا کا بازو ہلایا۔

”ہاں......“ ماسی جمیلہ نے ہڑبڑا کر یوں زینو کی طرف دیکھا جیسے وہ کسی اور سیارے کی مخلوق ہو۔

”میرے ہر سوال پر آپ سو ہی جاتی ہیں۔ بس ٹھیک ہے سو جائیں۔“ زینو ناراضگی سے کہتی ٹوٹے ٹرنک میں اپنا نیا سوٹ رکھنے لگی۔

ماسی جمیلہ نے سر جھٹک کر آنکھیں موند لیں۔ شادی کے فقط سات ماہ بعد نسرین ایک بچی کو جنم دے کر مر گئی۔ بڑھیا کو گویا روزگار مل گیا۔ وہ راتوں رات بچی لے کر شہر آ گئی۔

یہاں بھی کافی جان پہچان ہو گئی تھی۔ شکیلہ اپنی بیٹی کے ساتھ قریبی کالونیوں میں مانگنے جاتی تھی مگر بوڑھی جمیلہ تو اسی کو ساتھ لگائے لاٹھی ٹیکتی ایک بازار سے دوسرے بازار۔ ایک سڑک سے دوسری سڑک پر چکراتی رہتی اور پھر تھک کر یونہی بڑ کے

درخت نیچے ستانے بیٹھ جاتی۔

"ری اٹھ ری چھوری آج تو عید تہوار کا دن ہے۔ بڑی دیہاڑی لگتی ہے۔" ماسی جمیلہ نے اٹھتے ہی خرانٹے لیتی زینو کو چھڑی مار کر جگایا۔

"کیا ہے اماں کچھ دیر سونے دے نا۔" زینو نے بازو سہلاتے ہوئے پھر سے کروٹ بدل لی۔

"جھلی آج تو ہر کوئی بھیک دے گا اور اچھا کھانے کو بھی ملے گا۔"

کھانے کے نام پر سدا کی ندیدی زینو ایک جھٹکے سے اٹھ بیٹھی۔ نلکے سے خوب رگڑ رگڑ کر منہ ہاتھ دھویا اور نیا گلابی چمکیلا سوٹ زیب تن کر کے بکھرے بھورے بالوں کو اکٹھا کر کے چوٹی بنائی پھر بھی بالوں کی کچھ چھوٹی چھوٹی لٹیں باہر رہ گئیں۔ لیکن اس سب کے باوجود وہ بہت خوبصورت لگ رہی تھی۔ ٹوٹے شیشے میں وہ بار بار اپنا عکس دیکھتی اور ایڑھیوں کے بل گھومتے ہوئے کھلکھلا کر ہنسنے لگتی۔

ماسی جمیلہ نے جو اندر جھانکا زینو کو دیکھ کر ہق دق رہ گئی۔

"ارے بڑی اماں وہاں کیوں رک گئی۔ دیکھیں میں کیسی لگ رہی ہوں؟"

"اتار یہ سب۔ اتار......!" ماسی جمیلہ نے اس کی کمر پر زور سے چھڑی کا وار کرتے ہوئے کہا۔

"کیا ہے بڑی اماں آج عید ہے۔ آج تو نہ ماریں۔" زینو خفگی سے کہتی کمر سہلاتی جھونپڑی سے نکل گئی۔ ماسی جمیلہ لاٹھی ٹیکتی اس کے پیچھے لپکی۔ مگر وہ پل بھر میں ہی نظروں سے اوجھل ہوگئی۔ ماسی جمیلہ نے ایک ٹھنڈی سانس بھری اور زمین پر بیٹھ گئی۔ جانتی تھی صبو سے ملنے گئی ہوگی۔

کچھ ہی دیر میں دونوں سہیلیاں ہاتھوں میں ہاتھ ڈالے کھلکھلاتی ہوئی اماں کے پاس آگئیں۔ وہ تینوں سڑک پر چلنے لگیں۔ صبو کالونی کی طرف مڑ گئی اور وہ دونوں بازار کی بھیڑ میں شامل ہوگئیں۔

جو بھی بھیک دیتا ایک بار سر سے پیر تک بغور زینو کو دیکھتا۔ کچھ نے تو چھیڑ خانی بھی کی تھی۔ ماسی جمیلہ تلملا کر رہ گئی۔

شام کو جب ماسی جمیلہ نے سکوں نوٹوں سے بھرا ہوا کٹورا پیوند لگے کپڑے پر الٹایا تو زینو کی آنکھیں چمک اٹھیں۔ "بڑی اماں آج تو دے دے نا پیسے۔"

"کتنے؟" ماسی جمیلہ نے مصروف سے انداز میں کہا۔

"اتنے کہ اس ہوٹل میں بیٹھ کر برگر کھا سکوں۔" زینو نے سڑک کنارے بنے بڑے سے شیشے کے ہوٹل کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

ماسی جمیلہ نے پاس پڑی چھڑی اٹھا کر اس کے کندھے پر دے ماری۔ "چل ہٹ نگوڑ ماری۔ دن بھر کی کمائی تجھے دے دوں۔ کل کلاں کو جب چار پائی پر پڑ گئی تو کسی نے پانی بھی نہیں دینا تو، تو اڑتی تتلی ہے رب جانے کب اڑ جائے۔" ماسی جمیلہ کپڑے کی گانٹھ باندھتے ہوئے بڑبڑائی۔

"اماں وہ دیکھیں وہ مجھے بلا رہا ہے؟" زینو نے سامنے دیکھتے ہوئے ماسی جمیلہ کو ہاتھ کے اشارے سے بتایا۔

"لیکن وہاں تو کوئی نہیں؟" ماسی جمیلہ نے بہتیرا آنکھیں سکیڑی مگر اسے کچھ نظر نہیں آیا سوائے روشنیوں کے۔

"وہ سامنے ہوٹل والا اماں۔" زینو نے جھنجلا کر ماسی جمیلہ سے کہا۔

"ہاں جا سن آ، کیا معلوم کچھ کھانے کو دیتا ہو۔ مجھ بوڑھی ہڈیوں میں تو اب چلنے کی سکت نہیں۔ بس آج رات یہیں گزار لیتے ہیں۔ ویسے بھی دو تو بج ہی گئے ہیں۔" یہ کہتے ساتھ ہی ماسی جمیلہ نے چادر پھیلالی اور بوڑھ کے درخت کے نیچے لیٹ گئی۔ زینو تیزی سے اٹھی اور چھلانگیں لگاتی بھاگ گئی۔

"جلدی آنا......" ماسی جمیلہ نے پیچھے سے ہانک لگائی۔

سورج کی تیز شعاعیں بوہڑ کے درخت کی شاخوں کو چیرتی ہوئی ماسی جمیلہ کے چہرے پر پڑی تو وہ ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھی۔ "زینو......!"

"ری زینو......!"

"کہاں مرگئی؟"

ماسی جمیلہ نے اٹھتے ہوئے اِدھر اُدھر دیکھا مگر وہ کہیں نہیں تھی۔ معارات کا منظر ماسی جمیلہ کی آنکھوں کے سامنے لہرا گیا۔ ماسی جمیلہ کا کلیجہ حلق میں آگیا۔ وہ دوڑتی ہوئی ہوٹل کی طرف گئی۔ مگر چوکیدار نے ایک نہ سنی۔ وہ سارا دن سڑکوں بازاروں میں روتی فریاد کرتی رہی۔

تھک کر اپنی قسمت کو کوستی جھونپڑی میں آگئی۔ کاش میں ساتھ چلی جاتی۔ کاش میں سوتی ہی نہ۔

بہت سے کاش پچھتاوے کے ناگ بن کر مسلسل ماسی جمیلہ کو کاٹ رہے تھے۔

صبو کو پتا چلا تو وہ دوڑتی آئی۔ "ماسی کہاں چلی گئی زینو؟"

"آپ نے اسے کیسے جانے دیا؟"

"بس کچھ سمجھ نہیں آرہی۔ میرے پاس ہی بیٹھی تھی کہ اچانک بولی سامنے ہوٹل والا بلا رہا ہے۔ میں نے کہا جا چلی جا۔

جلدی آنا۔“

”آپ نے کیوں جانے دیا۔“ صبو روتے ہوئے بولی۔

”میں نے سوچا کھانے کو کچھ دیتا ہوگا۔“

”بس میں لیٹ گئی۔ لیٹتے ہی کم بخت میری آنکھ لگ گئی۔ مجھے کیا پتا تھا میرے بھاگ (نصیب) بھی سو جائیں گے میرے ساتھ۔“ ماسی جمیلہ بین کرتے ہوئے بولی۔

”آپ پریشان مت ہو میں کالونی میں جاؤں گی نا تو وہاں بات کروں گی۔ ایک صاحب ہے۔ وہ ٹی وی پر کام کرتا ہے۔ جب خبر لگے گی تو دیکھنا اپنی زینو مل جائے گی ماسی۔“ صبو ماسی جمیلہ کو دلاسہ دیتے ہوئے چلی گئی۔

اگلے روز ہر ٹی وی چینل پر، ہر اخبار میں زینو کی گمشدگی کی خبر لگی تھی۔

شام کو زینو مل گئی۔ ماسی جمیلہ کو جیسے ہی خبر ملی۔ وہ لاٹھی پھینکے دوڑی۔ ”اب میں اسے کہیں نہیں جانے دوں گی۔ بڑی مضبوطی سے اس کا ہاتھ پکڑوں گی۔“ ماسی جمیلہ بڑبڑاتے ہوئے جارہی تھی کہ صبو آگئی۔

”تیری بڑی مہربانی صبو تجھے پتا ہے نا زینو مل گئی۔ مجھے تو جیسے کالے نے بتایا میں تیری طرف دوڑی۔ کالا کہہ رہا تھا وہ لینے جارہا ہے۔“ ماسی جمیلہ نے خوش ہوتے ہوئے کہا۔

”پتا ہے ماسی وہ کہاں سے ملی ہے؟“ صبو نے کھوئے کھوئے لہجے میں کہا۔

ماسی جمیلہ نے چونک کر اس کا ستا ہوا چہرہ دیکھا اور نفی میں سر ہلادیا۔

”کچرے کے ڈھیر سے۔“ صبو کی سرسراتی ہوئی آواز ماسی جمیلہ کے کانوں سے ٹکرائی۔

یکا یک ماسی جمیلہ کی کمر جھک گئی وہ زمین پر بیٹھتی چلی گئی۔

”پولیس آئی جنازہ ہوا۔“ ماسی جمیلہ پتھر کا بت بنے سب دیکھتی رہی۔

وقت گزرتا رہا۔ ایک دن ایک وکیل بڑی سی کار میں آیا، اس نے ماسی جمیلہ سے کہا۔ ”میں آپ کو ضرور انصاف دلاؤں گا۔ جس نے بھی آپ کی بچی کے ساتھ ظلم کیا وہ قانون سے بچ نہیں پائے گا۔“

ماسی جمیلہ طنزیہ انداز میں ہنس دی۔ وہ پچھلے ایک ماہ سے یہی سن رہی تھی۔

”میں جانتا ہوں آپ کو میری بات پر یقین نہیں۔ کیونکہ مجھے بھی آپ دوسروں جیسا خود غرض سمجھ رہی ہیں جنہیں صرف چٹ پٹی خبر چاہیے اور کچھ نہیں۔ لیکن آپ دیکھیں گی۔ میں آپ کو انصاف دلاؤں گا۔ بس آپ صبح تیار رہیے گا۔ عدالت جانا ہے۔ بغیر کسی ڈر خوف کے سچا بیان دینا ہے۔ وہ ہوٹل والا بھی وہاں ہوگا۔“ یہ کہتے ساتھ ہی وکیل کاغذات کی فائل اٹھائے چلا گیا۔

صبح ماسی جمیلہ عدالت گئی۔ ہوٹل والے نے کلین شیو ٹھوڑی پر ہاتھ پھیرتے ہوئے ماسی جمیلہ کی طرف دیکھا۔

ماسی جمیلہ اسے نظر انداز کرتے کٹہرے میں جا کھڑی ہوئی۔ جج نے پہلا سوال کیا۔ ”آپ کی نواسی سے آخری بات چیت کیا ہوئی تھی۔“

”جج جی کچھ خاص نہیں۔“ ماسی جمیلہ نے پیوند لگی سر سے سرکتی چادر کو سر پر جماتے ہوئے کہا۔

وکیل نے تذبذب کے عالم میں اپنی نشست پر پہلو بدلا۔

”آپ کی نواسی آخری بار کہاں گئی تھی؟“

جج نے کچھ وقفے کے بعد اگلا سوال کیا۔

”جی گھر پر ہی تھی بولی پیٹ میں درد ہے۔ میں مانگنے چلی گئی۔ واپس آئی تو مری پڑی تھی۔ کس نے اس کے ساتھ یہ حرکت کی پتا نہیں۔“ ماسی جمیلہ نے بھرائی ہوئی آواز میں کہا۔

وکیل ایک جھٹکے سے اٹھا۔ ”جو سچ ہے آپ وہ بتائیں اماں۔ بغیر کسی دباؤ میں آئے۔“ وکیل نے ہوٹل والے کی طرف دیکھتے ہوئے سخت لہجے میں کہا۔ جج نے وکیل کو خاموش رہنے کا اشارہ کیا۔ وکیل پیچ و تاب کھاتا کرسی پر بیٹھ گیا۔

”سچ ہی بول رہی ہوں پتر تو کیوں مجھ سے جھوٹ بلوانا چاہتا ہے۔“ ماسی جمیلہ نے لڑکھڑاتے ہوئے لہجے میں کہا۔

وکیل پھٹی پھٹی آنکھوں سے ماسی جمیلہ کو دیکھتا رہ گیا۔

عدالت برخاست ہوگئی ہوٹل والا باعزت بری ہوگیا۔

وکیل اپنے کاغذات کا پلندہ وہیں میز پر چھوڑے کسی ہارے ہوئے جواری کی طرح مرے مرے قدموں سے چلتا عدالت سے باہر نکل گیا۔

بوہڑ کے درخت کے نیچے بیٹھ کر ماسی جمیلہ نے پیوند لگے پلو کو کھولا تو اس میں سے سو کا مڑا تڑا اکڑ کتا نوٹ نکلا۔ ماسی جمیلہ سو کا نوٹ اپنی آنکھوں سے لگاتے ہوئے بڑبڑائی۔ مرنے والی چھوری تو مر گئی۔ اسے انصاف دلانے سے۔ کون سا مجھے سو کا نوٹ مل جانا تھا۔

++

خاموش جدوجہد

جانب مدیر محترم
سلام مسنون!
زیرنظر سچ بیانی ایک سچے واقعے پر ہے۔ باپ خود کو تباہ کر کے اپنے کنبے کو بچاتا ہے لیکن اسے بدلے میں کیا ملتا ہے؟

ارشاد العصر جعفری
(مظفر گڑھ)

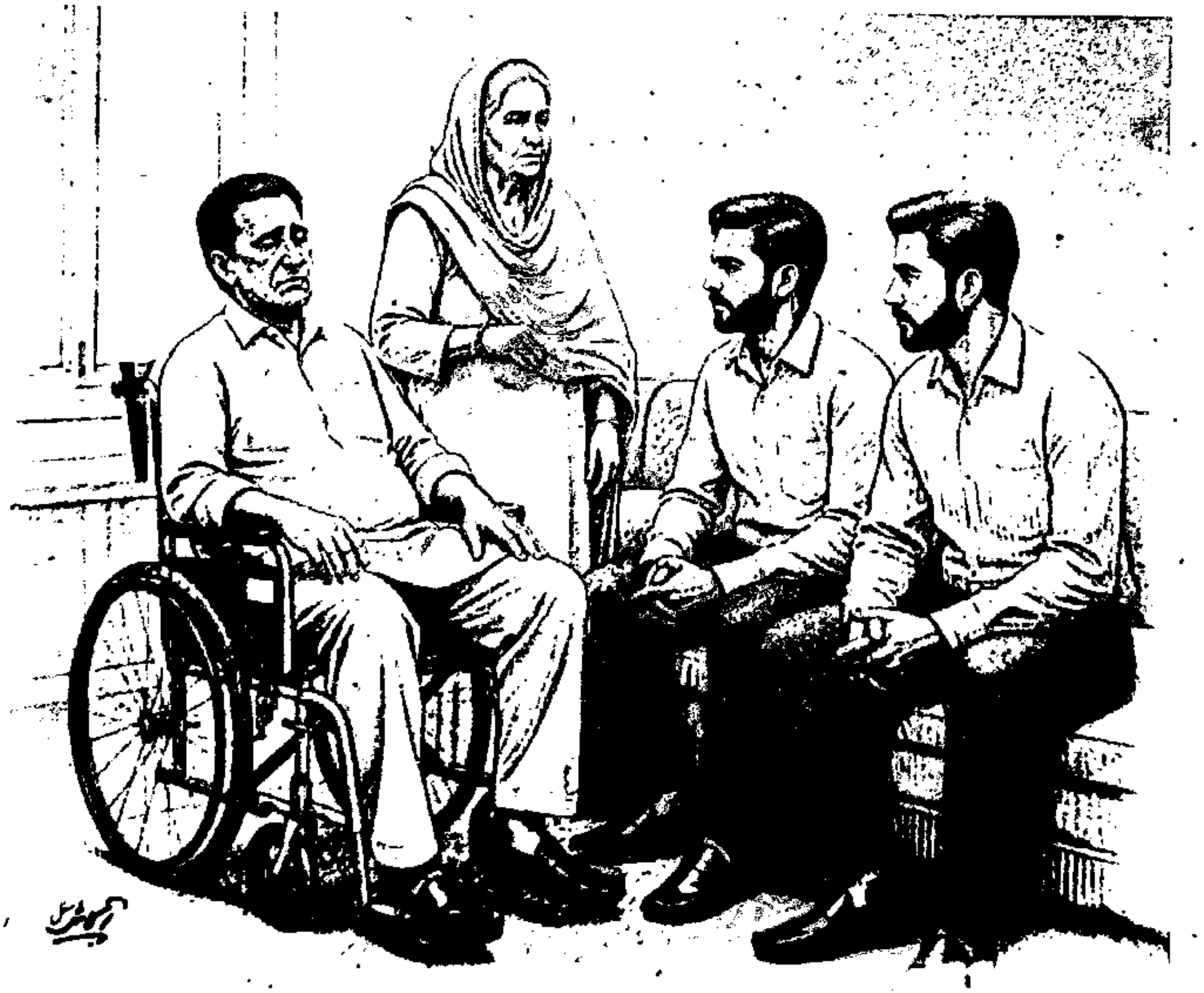

جون کی شام تھی اور ہوا میں چپچپاہٹ تھی جیسے فضاؤں نے بھی اپنا پسینا بہانا شروع کر دیا ہو۔ بس اسٹاپ پر کھڑے ہر شخص کے چہرے پر تھکن اور بے چینی کی ایک جیسی دھند تھی۔ احمد اپنے سفید شرٹ کے کالر کو ڈھیلا کرنے کی کوشش کر رہا تھا جس پر صبح کی استری کی لکیر اب پسینے میں بھیگ کر دھندلا چکی تھی۔ اس کی پیشانی پر موٹے قطرے نمودار ہو رہے تھے اور وہ انہیں رومال سے پونچھتا، مگر وہ فوراً ہی پھر سے ابھر آتے۔

اس کی نظر سامنے ایک بجلی کے کھمبے پر ٹھہر گئی۔ ایک پرانا، زنگ آلود کھمبا جس کے اوپر بجلی کے تار اس بے رحم

گرمی میں بھی جھنجھنا رہے تھے۔ ہائی وولٹیج پاور لائین کی جھنجھناہٹ نے بھی اس کی توجہ نہیں کھینچی تھی۔ اچانک، اس کی آنکھوں کے سامنے ایک عجیب منظر گھوم گیا۔ اس نے محسوس کیا جیسے اس کھمبے سے ایک لاش لٹک رہی ہے۔ ایک بجھتی ہوئی، بے جان لاش، جس کے اعضا میں سے کوئی حرکت نہیں تھی، مگر آنکھیں کھلی تھیں اور خالی تھیں۔ یہ منظر پل بھر میں غائب ہوگیا، مگر اس کی چبھن احمد کے دل و دماغ میں اتر گئی۔

''ہم سب تو اسی ہائی وولٹیج پر جل رہے ہیں۔'' اس نے خود کلامی کی۔ ''فرق صرف اتنا ہے کہ ہمارے جسم پر کوئی دھواں نہیں اٹھتا، کوئی بو نہیں آتی۔ ہم اندر ہی اندر سلگتے رہتے ہیں، یہاں تک کہ راکھ ہوجاتے ہیں۔''

اس کے ذہن میں اسی شہر کے وہ منظر گھومنے لگے جو اس کی روزمرہ کی زندگی کا حصہ تھے۔ سڑک کنارے بیٹھے وہ مزدور جن کے ہاتھوں میں چھالے تھے اور آنکھوں میں نیند کے ڈھیر، پھل فروش کی وہ الٹی ہوئی ریڑھی جس کے پھل سڑک پر بکھرے پڑے تھے اور وہ بے بسی سے انہیں سمیٹنے کی کوشش کر رہا تھا، اور ہوٹل کے کچن میں چولہے کے سامنے کھڑے وہ باورچی جن کے چہرے پسینے اور دھوئیں سے چمک رہے تھے۔ یہ سب خاموش جدوجہد کی داستانیں تھیں۔ ہر ایک اپنے دکھ کو اپنے اندر دبائے، اپنی راکھ کو اپنے سینے میں چھپائے ہوئے۔

بس آتی دکھائی دی۔ احمد نے ایک گہرا سانس لیا اور اپنے بھاری قدموں سے اس کی طرف بڑھا۔

دفتر کی ہوا میں ایئر کنڈیشنر کی ٹھنڈک تھی، مگر وہ احمد کے اندر کی گرمی کو ٹھنڈا نہ کر پا رہی تھی۔ اس کا باس، مسٹر جاوید، اپنی کرسی پر تختہ دار بنا بیٹھا تھا اور احمد اس کے سامنے کھڑا تھا، سر جھکائے، ایک اسکول کے بچے کی مانند جو استاد سے ڈانٹ کھانے والا ہو۔

''احمد صاحب، آپ کو لگتا ہے یہ چیریٹی کی جگہ ہے؟'' مسٹر جاوید کی آواز میں وہی پرانا طنز تھا، وہی تلخی جو ہفتے میں کم از کم تین بار سننے کو ملتی تھی۔ ''آپ کی رپورٹس میں غلطیاں ہیں۔ آپ کی کارکردگی مایوس کن ہے۔ کیا آپ سمجھتے ہیں کہ کمپنی آپ پر احسان کر رہی ہے؟''

احمد کی نظریں اپنے جوتوں پر جمی ہوئی تھیں۔ اس کے کان ان الفاظ سے آشنا تھے۔ وہ جانتا تھا کہ جواب میں کچھ بھی کہنے کا مطلب اپنی نوکری کو خطرے میں ڈالنا ہے۔

چالیس سال کی عمر کے بعد نئی نوکری ملنا اس شہر میں کوئی آسان کام نہ تھا۔ اس کے ذہن میں ایک جملہ گونجا۔ ''اگر کوئی عورت اپنے شوہر سے ایسے الفاظ سنے، تو وہ فوراً طلاق کا مطالبہ کر دے۔ مگر ایک مرد...... ایک مرد کے پاس خاموش رہنے کے سوا کوئی چارہ نہیں ہوتا۔''

اس کی آنکھوں میں نمی چھا گئی۔ اس نے اپنی پلکیں جھکائیں، اپنی سانسیں قابو میں کرنے کی کوشش کی جو اکھڑی ہوئی تھیں۔ اس کا دل تیزی سے دھڑک رہا تھا۔ ایک عجیب سی خواہش ہوئی کہ کاش اس کا دل سینے سے نکل کر اڑ جائے۔ اڑ کر اس کے گھر پہنچ جائے، اپنی بیوی فاطمہ اور اپنے دو بچوں، بلال اور عمر کے پاس، تاکہ وہ انہیں دیکھ سکے، انہیں چھو سکے، ان کے لیے کچھ اور کچھ بہتر کما سکے۔

''میں آپ سے اگلی بار بہتر توقع رکھتا ہوں۔'' مسٹر جاوید کا وائس ٹون بدلا۔ یہ ڈانٹ ختم ہونے کا اشارہ تھا۔

''جی سر، ضرور۔ شکریہ سر۔'' احمد نے سر جھکا کر کہا اور اپنی سیٹ کی طرف مڑا۔ اس کی پیٹھ پر پسینے کا ایک اور ٹھنڈا دھبا پھیل رہا تھا۔

☆☆☆

بس سے اترتے ہی احمد نے ایک گہرا، زہریلی ہوا بھرا سانس لیا۔ شام کا سورج ڈوب رہا تھا اور اس کے سامنے گھر کا وہ راستہ تھا جس پر وہ روز چلتا تھا۔ مگر آج یہ راستہ بہت طویل محسوس ہو رہا تھا۔

اس کے ذہن میں فاطمہ کا چہرہ تیرا، اس کی مسکان، اس کی آنکھوں کی چمک۔ پھر بلال اور عمر کے بچگانہ چہرے، ان کی ہنسی، ان کی فرمائشیں۔ یہ سب تصویریں اس کی تھکاوٹ پر مرہم رکھنے کے لیے کافی تھیں۔

''میں یہ سب کس کے لیے کر رہا ہوں؟'' اس نے اپنے آپ سے سوال کیا۔

سوال کے ساتھ ہی جواب کی ایک لہر اس کے دماغ میں امنڈ آئی۔ عرب کے صحرا کی یاد۔ وہ تپتے ہوئے ریگزار، جہاں سورج انسان کی روح تک کو پگھلا دینے پر تل جاتا تھا۔ وہ نوجوان احمد جس کے ہاتھ مشینوں پر کام کرتے کرتے پھٹ گئے تھے، جس کی کمر ہمیشہ کے لیے جھک گئی تھی۔ وہ لمبے، تنہائی بھرے مہینے جب فون پر گھر والوں کی آواز سننا ہی سب کچھ تھا۔ وہ ہنسی جو وہ فون پر ہنستا تھا، تاکہ گھر والے پریشان نہ ہوں، جبکہ اندر سے اس کا وجود روتا رہتا تھا۔ اسی دور میں اس کے معدے اور گردوں کی

بیماریوں نے جنم لیا تھا۔ اسی تنہائی نے اس کے چہرے پر قبل از وقت جھریاں بھردی تھیں۔

اس کی محنت کی کمائی پر اس کے بھائی بہنوں کی شادیاں ہوئیں، ماں باپ کا سہارا بنا، اور پھر اس کا اپنا گھر بنا۔ اس کی قربانیوں پر اس کے خاندان کی عمارت کھڑی ہوئی تھی۔

اس کا دل ایک عجیب سکون سے بھر گیا۔ یہ وہ سکون تھا جو قربانی کے بعد ملتا ہے۔ فاطمہ اور بچوں کے چہرے دیکھ کر ہر دکھ بھول جاتا تھا۔ مگر پھر، اس کے سینے میں ایک ہلکی سی چبھن محسوس ہوئی۔ ڈاکٹر نے کہا تھا کہ اس کا بلڈ پریشر کنٹرول سے باہر ہے۔ اس کا معدہ کام کرنا چھوڑ رہا تھا۔

ایک نئی سوچ نے اسے بے چین کر دیا۔ ''اگر میں نہ رہا تو......؟''

اس نے سوچ کو اپنے دماغ سے جھٹک دیا۔ وہ گھر کے دروازے تک پہنچ چکا تھا۔ اس نے ایک گہرا سانس لیا، اپنے چہرے پر ایک تھکی ہوئی مسکان سجائی، اور دروازے کی کنڈی کو ہاتھ لگایا۔ اندر سے بچوں کے شور کی آوازیں آرہی تھیں۔

دروازہ کھلتے ہی بچوں کے شور نے احمد کا استقبال کیا، مگر اس کی روح ابھی تک دبئی کے تپتے صحرا میں پھنسی ہوئی تھی۔ وہ اپنے کمرے میں گیا اور کرسی پر بیٹھتے ہی اس کی آنکھیں بند ہوگئیں۔ فلیش بیک نے اسے دس سال پیچھے کھینچ لیا۔

اس کے سامنے وہ لامتناہی ریگستان تھا جہاں ریت کے ذرے ہوا کے دوش پر تیرتے تھے۔ وہ خود ایک کنسٹرکشن سائٹ پر کھڑا تھا، اس کی جیب میں اس کے پاسپورٹ کی فوٹو کاپی تھی اس میں وہ احمد تھا جس کے چہرے پر ابھی جھریاں نہیں تھیں، مگر دھوپ نے اس کی جلد کو جلا کر کالا کر دیا تھا۔ اس کے ہاتھوں میں موٹے دستانے تھے جن کے باوجود چھالے پڑ گئے تھے۔ شام کے چھ بجے، جب سورج کی تپش ذرا کم ہوتی، وہ اپنے کیمپ کی طرف لوٹتا۔ راستے میں وہ فون کرنے والے بوتھ پر رکتا۔

''ہیلو فاطمہ؟ میں ہوں...... ہاں سب ٹھیک ہے۔ یہاں تو بہت اچھا ہے۔ کام آسان ہے...... ہاں پیسے بھیج دیے ہیں۔'' اس کے ہونٹ مسکرا رہے تھے مگر آنکھیں خشک تھیں۔ فاطمہ کی آواز سن کر اس کا دل بھر آتا، مگر وہ روتا نہیں تھا۔ وہ جانتا تھا کہ اس کے آنسوؤں سے گھر والوں کا حوصلہ

ٹوٹے گا۔ یہیں، انہی لمحوں میں، اس کے معدے میں پہلی بار وہ کھنچاؤ محسوس ہوئی تھی جو آگے چل کر زخم بن گئی۔ یہیں اس کے گردوں نے کام کرنا کم کر دیا تھا۔ خاموشی کے انہی لمحوں میں اس کی بیماریوں نے جنم لیا تھا۔

کمرے کی کھڑکی سے آنے والی ہوا نے احمد کو فلیش بیک سے باہر نکالا۔ اس کی نظر بیڈ روم میں لگی شادی کی تصویر پر پڑی۔ وہ دن اسے یاد آیا جب اس نے فاطمہ سے شادی کی تھی۔

وہ دن کتنا حسین تھا۔ احمد نے اپنی ساری جمع پونجی اس شادی پر لگا دی تھی۔ فاطمہ سرخ و سنہری لباس میں کتنی حسین لگ رہی تھی۔ اس رات، جب وہ دونوں اکیلے تھے، احمد نے فاطمہ کے ہاتھ پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا تھا۔ ''فاطمہ، میں تمہاری زندگی ہمیشہ خوشیوں سے بھر دوں گا۔ تمہاری ہر خواہش پوری کروں گا۔''

اس وعدے نے اس کے اندر ایک نئی آگ جلائی تھی۔ وہ عرب سے واپس آیا اور اس نے محسوس کیا کہ اس کی ساری جوانی، اس کی ساری توانائی، اس کی ساری خواہشیں اب اس ایک رشتے کو نبھانے کے لیے وقف ہو چکی تھیں۔

اس کے ذہن میں ایک تلخ حقیقت نے جنم لیا کہ ایک عورت نو مہینے درد سہہ کر ماں بنتی ہے، اور یہ درد اس کی پہچان بن جاتا ہے۔ مگر ایک مرد...... ایک مرد تو اپنی ساری زندگی کے درد کو کاٹ کاٹ کر جیتا ہے۔ وہ اپنی ہڈیوں کا کاربن بنوا کر گھر چلاتا ہے، تاکہ وہ عورت اور اس کے بچے ہنستے رہیں۔

احمد کی آنکھیں کھل گئیں جب فاطمہ نے آواز دی۔ ''کھانا تیار ہے۔''

کھانے کی میز پر وہ خاموشی سے بیٹھا رہا۔ اس کے ذہن میں وہ بدترین دور چل رہا تھا جب اس نے عرب سے واپس آکر کاروبار شروع کیا تھا۔ وہ پُرامید تھا کہ اب اس کی محنت کا پھل اسے ملے گا۔ مگر قسمت کو کچھ اور ہی منظور تھا۔

کاروبار کے پہلے ہی سال، اس کا سارا سرمایہ ڈوب گیا۔ وہ لاکھوں روپے کے قرض میں ڈوب گیا۔ وہ راتوں کو سو نہیں پاتا تھا۔ فاطمہ اور بچوں کے سامنے وہ مضبوط بننے کی کوشش کرتا، مگر رات کے اندھیرے میں اس کا دماغ قرضوں کے اعداد و شمار میں الجھا رہتا۔

پھر وہ رات آئی جب وہ بستر پر لیٹا ہوا تھا۔ اچانک اس کے سینے میں ایک زوردار دباؤ محسوس ہوا، جیسے کوئی ہتھوڑا اس کے سینے پر مار رہا ہو۔ اس کا سانس پھولنے لگا۔

پسلیوں کے درمیان ایک جلن سی ہو رہی تھی۔ فاطمہ نے اسے اسپتال پہنچایا۔ ڈاکٹروں نے بتایا کہ یہ دل کا شدید دورہ تھا۔

اسپتال کے بستر پر احمد بے ہوش پڑا تھا۔ اس کی بے ہوشی میں اس کے دماغ نے اسے ماضی کے دریاؤں میں بہا دیا تھا۔

وہ اپنے آپ سے بات کر رہا تھا۔ ''یہ سب کچھ میں نے کس کے لیے کیا؟ کیا یہ سب اس لیے تھا کہ فاطمہ اور بچے خوش رہیں؟ کیا یہ سب اس لیے تھا کہ ماں باپ کو میرا فخر رہے؟''

اس کے سامنے اس کے بچوں کے چہرے تیرنے لگے۔ بلال کی وہ فرمائش جب اس نے دس ہزار روپے کا جوتا مانگا تھا۔ عمر کی وہ خواہش جب اسے مہنگے ترین اسکول میں داخل کروایا گیا تھا۔ فاطمہ کے وہ زیورات جو اس نے ہر سال بنوائے تھے۔

''ایک عورت تو مہینے میں ماں بنتی ہے، اور اس کا درد سب کو نظر آتا ہے۔'' اس نے اپنے آپ سے کہا۔ ''مگر ایک مرد لمحے میں باپ بن جاتا ہے اور پھر عمر بھر باپ ہی رہتا ہے۔ اس کا درد کسی کو نظر نہیں آتا۔ وہ تو بس دیتا ہی چلا جاتا ہے۔''

اس کی بے ہوشی میں اس کے ہونٹ ہلے۔ ''کیا کبھی کوئی میرا درد بھی سمجھے گا؟''

اسپتال کے کمرے میں فاطمہ احمد کے بستر کے پاس بیٹھی تھی ایک ایک لفظ سن رہی تھی احمد نے بڑبڑاہٹ میں بہت کچھ کہہ دیا تھا۔ وہ سوچتے ہوئے آنسو بہا رہی تھی، آنکھیں سرخ تھیں۔ ڈاکٹر کے الفاظ اس کے کانوں میں گونج رہے تھے۔ ''یہ زندگی بھر کی محنت اور دباؤ کا نتیجہ ہے۔''

فاطمہ نے پہلی بار احمد کے چہرے کو غور سے دیکھا۔ وہ جھریاں جو اس کی پیشانی پر تھیں، وہ سفید بال جو کنپٹیوں پر نمودار ہو رہے تھے، آنکھوں کے گرد حلقے۔ اسے اچانک احساس ہوا کہ وہ احمد کو کبھی غور سے دیکھتی ہی نہیں تھی۔

اس کا ذہن ماضی میں چلا گیا۔ ان کی شادی کے بعد ہر تقریب، ہر پارٹی میں احمد ہمیشہ ایک ہی پینٹ کوٹ پہنتا تھا۔ جبکہ وہ اور بچے ہر سال نئے کپڑے، نئے زیورات بنواتے تھے۔ احمد ہمیشہ کہتا، میرے پرانے کپڑے ابھی چل جائیں گے۔

فاطمہ نے اپنا پرانا کیلکولیٹر نکالا۔ اس نے حساب لگانا شروع کیا۔ ایک مرد کے اخراجات کتنے ہوتے ہیں؟ اسے احساس ہوا کہ احمد اپنی آمدن کا 99 فیصد گھر پر خرچ کر دیتا تھا۔ اس کے اپنے لیے کچھ بچتا ہی نہیں تھا۔

آنکھوں سے آنسوؤں کی ایک لہر بہہ نکلی۔ اسے احساس ہوا کہ وہ کتنی خودغرض بن گئی تھی۔

دو دن بعد احمد ہوش میں آیا۔ اس کی آنکھیں کھلتے ہی اس نے فاطمہ کو اپنے پاس بیٹھے پایا۔

''احمد......'' فاطمہ کی آواز لرز رہی تھی۔ ''مجھے معاف کر دینا۔''

احمد نے حیرت سے اس کی طرف دیکھا۔

فاطمہ روتے ہوئے بولی۔ ''میں نے کبھی تمہاری قربانیوں کو نہیں سمجھا۔ میں نے کبھی نہیں سوچا کہ تم کتنا درد سہہ رہے ہو۔ تمہارے جذبات کا کبھی خیال نہیں رکھا۔''

احمد نے کمزور ہاتھ اٹھایا اور فاطمہ کا ہاتھ تھام لیا۔ ''فاطمہ، تمہیں احساس نہیں ہوا، تو اس میں تمہارا کیا قصور؟ میں نے تو کبھی تمہیں بتایا ہی نہیں۔ مرد ہونے کا مطلب ہی یہ ہے کہ اپنے دکھ دبا کر رکھے۔''

یہ پہلا موقع تھا جب احمد نے اپنے جذبات کا اظہار کیا تھا۔ فاطمہ نے اس کا ہاتھ اور مضبوطی سے تھام لیا۔ ''اب سب کچھ بدل جائے گا احمد۔ میں وعدہ کرتی ہوں۔''

احمد گھر واپس آ چکا تھا۔ ڈاکٹر نے اسے مکمل آرام کا مشورہ دیا تھا۔ پہلے ہفتے میں ہی فاطمہ نے اپنے وعدے کو پورا کرنا شروع کر دیا۔ اس نے بچوں کو باپ کی قربانیوں سے آگاہ کیا سمجھایا کہ باپ کس قدر اہم ہے۔

اس نے احمد کی خوراک کو مکمل طور پر بدل دیا۔ نمک کم، تیل کم، سبزیاں زیادہ۔ وہ خود بازار جاتی اور تازہ پھل سبزی لاتی۔ بچوں کو سمجھایا کہ ابا کو آرام کی ضرورت ہے۔

ایک دن احمد نے دیکھا کہ بلال اور عمر کمرے میں آئے۔ بلال کے ہاتھ میں ایک گلاس تھا جس میں جوس تھا۔ ''ابا، آپ کے لیے تازہ جوس۔''

عمر نے اس کے پاؤں دبانے کی پیشکش کی۔ ''ابا، میں نے ٹی وی پر دیکھا ہے، میں آپ کے پاؤں دبا دوں؟''

احمد کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ یہ پہلا موقع تھا جب اس کے بچوں نے اس کی دیکھ بھال کی تھی۔

ایک مہینا گزر گیا۔ احمد کی صحت میں بتدریج بہتری آ

رہی تھی۔ [illegible] اس کے پاس آئی۔

''احمد، میں نے ایک پارٹ ٹائم جاب شروع کرلی ہے۔'' اس نے کہا۔

احمد حیران رہ گیا۔ ''مگر کیوں؟''

''کیونکہ اب میں سمجھ گئی ہوں کہ گھر چلانا صرف تمہاری ذمّہ داری نہیں۔ ہم دونوں مل کر سب کچھ سنبھالیں گے۔''

فاطمہ نے اسے بتایا کہ وہ ایک اسکول میں پارٹ ٹائم ٹیچر بن گئی ہے۔ اس کے چہرے پر ایک نئی چمک تھی، ایک نیا اعتماد تھا۔

احمد نے پہلی بار محسوس کیا کہ وہ اکیلے اس زندگی کی دوڑ میں نہیں ہے۔ اس کے کندھوں سے بوجھ کا ایک حصہ اتر گیا تھا۔

ہفتے کے آخر میں احمد کے بھائی اور ان کے خاندان والے ملنے آئے۔ عام طور پر یہ ملاقاتیں رسمی ہوا کرتی تھیں، مگر آج کچھ مختلف تھا۔

اس کا چھوٹا بھائی کمال اس کے پاس آیا۔ ''بھائی جان، میں نے کبھی شکریہ تک نہیں کہا۔ آپ نے ہماری پڑھائی کے لیے، ہماری شادیوں کے لیے اپنی جوانی عرب کے صحرا میں گنوا دی۔ آج میں جو کچھ بھی ہوں، آپ کی وجہ سے ہوں۔''

کمال کی بیوی نے کہا۔ ''بھائی صاحب، ہم سب آپ کے مقروض ہیں۔''

احمد نے پہلی بار محسوس کیا کہ اس کی قربانیاں رائیگاں نہیں گئیں۔ اس کے اپنے ہی لوگوں نے آخرکار اس کی قدر کرنی شروع کر دی تھی۔

ایک شام احمد اپنے کمرے کی کھڑکی کے پاس بیٹھا تھا۔ اس کا ذہن ماضی کے ان لمحوں میں گھوم رہا تھا جب وہ ہر شام تھکا ہارا گھر لوٹتا تھا۔

اس نے سوچا کہ کیسے اس نے اپنی ساری زندگی کی اذیت کو اپنے اندر دفن کر دیا تھا۔ وہ اپنے خاندان کو سکون دینے کے لیے اپنا دل اور روح تک نچوڑ دیتا تھا۔ اس نے اپنی ہر خواہش، اپنی ہر آرزو کو قربان کر دیا تھا۔

مگر آج وہ خود کو خوش قسمت محسوس کر رہا تھا۔ نہ صرف اس لیے کہ وہ دل کے دورے سے بچ گیا تھا، بلکہ اس لیے بھی کہ آخرکار اس کے خاندان کو اس کی قربانیوں کا احساس ہو گیا تھا۔

قوم و وطن کی آنکھ کا تارا
سوہنا پاکستان

دستِ جنوں سے ہم نے سنوارا سوہنا پاکستان
خونِ جگر سے ہم نے نکھارا سوہنا پاکستان
پیروجواں کا راج دلارا سوہنا پاکستان
قوم و وطن کی آنکھ کا تارا سوہنا پاکستان
اس دھرتی کی مٹی سونا چاندی جیسا پانی
اس دھرتی کے ذرّوں میں ہے سورج کی تابانی
آن ہماری مان ہمارا سوہنا پاکستان
قوم و وطن کی آنکھ کا تارا سوہنا پاکستان
اس پر صدقے جان ہماری اس پہ دل قربان
اس سے اونچا نام ہمارا اس سے اونچی شان
اس کا چاند ستارا پرچم عظمت کی پہچان
قوم و وطن کی آنکھ کا تارا سوہنا پاکستان

شاعر: بشیر فاروق

پسند: نفیسہ آرا، یو اے ای

حکایت

محمد بن سعد بن مطرب کا معمول تھا کہ سوتے وقت تین سو مرتبہ درود شریف پڑھا کرتے تھے۔ ایک رات خواب میں دیکھا کہ تاجدارِ عرب و عجم حضور نبی پاک صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم تشریف لائے اور فرمایا کہ اے محمد بن سعد جس منہ سے درود پڑھتا ہے، میرے پاس لا کہ میں بوسہ لوں گا۔

ان کو شرم آئی کہ ایسے پاک چہرۂ مبارک کے سامنے گندا اپنا منہ کس طرح لاؤں لیکن چونکہ حکم ادب پر فوقیت رکھتا ہے ناچار اپنا رخسار سامنے کیا، حضورؐ نے کمالِ محبت سے بوسہ کے شرف سے مشرف فرمایا۔ جس وقت خواب سے بیدار ہوئے تو سارا مکان خوشبو سے معطر و منبر تھا اور آٹھ روز تک رخسار خوشبو سے مہکتا رہا۔

محفوظ یار خان عطاری، کراچی

فاطمہ کمرے میں آئی اور اس کے کندھے پر ہاتھ رکھا۔ بغیر کچھ کہے وہ سمجھ گئی کہ احمد کیا سوچ رہا ہے۔

احمد کی صحت مکمل طور پر بحال ہو چکی تھی۔ ڈاکٹر نے اسے ہلکی پھلکی ورزش کی اجازت دے دی تھی۔ ایک دن فاطمہ اور بچے اسے پارک میں سیر کے لیے لے گئے۔

پارک میں بیٹھے ہوئے بلال نے کہا۔ ''ابا، میں نے فیصلہ کیا ہے کہ میں پڑھائی کے ساتھ ساتھ پارٹ ٹائم جاب بھی کروں گا۔ آپ نے ہمارے لیے بہت کچھ کیا، اب ہماری باری ہے۔''

عمر نے کہا۔ ''میں بھی ابا، میں بھی آپ کا ہاتھ بٹاؤں گا۔''

احمد نے اپنے بچوں کو دیکھا۔ ان کی آنکھوں میں وہی عزم تھا جو کبھی اس کی آنکھوں میں ہوا کرتا تھا۔ وہ سمجھ گیا کہ اس کی قربانیاں ضائع نہیں گئیں۔ اس نے اپنے بچوں میں ذمّہ داری کا جذبہ پیدا کر دیا تھا۔

ملازمت سے اسے جواب مل چکا تھا اب احمد نئی جگہ ملازمت کرتا تھا، لیکن یہاں ڈیوٹی آٹھ گھنٹے ہی تھی۔ ایک دن احمد اپنے پرانے باس مسٹر جاوید سے بازار میں ملا۔ مسٹر جاوید نے اسے دیکھا تو کچھ شرمندہ سا ہوا۔

''احمد صاحب، آپ کیسے ہیں؟ میں نے سنا آپ بیمار پڑ گئے تھے۔''

''جی سر، اب ٹھیک ہوں۔''

مسٹر جاوید نے کہا۔ ''سنیئے احمد صاحب، میں...... میں ماضی میں آپ کے ساتھ جو سلوک کرتا تھا، اس کے لیے معافی چاہتا ہوں۔ میں نے کبھی نہیں سوچا تھا کہ آپ پر کتنا دباؤ ہوگا۔''

احمد نے مسکراتے ہوئے کہا۔ ''کوئی بات نہیں سر۔ ہم سب اپنی اپنی جدوجہد میں مصروف ہیں۔''

اس دن احمد نے محسوس کیا کہ معافی اور مفاہمت کا یہ جذبہ نہ صرف اس کے گھر بلکہ باہر کی دنیا میں بھی پھیل رہا تھا۔

ایک سال گزر گیا۔ احمد کی زندگی میں امن و سکون آیا تھا۔ ایک شام وہ اپنے خاندان کے ساتھ بیٹھا تھا۔

فاطمہ نے کہا۔ ''احمد، تمھیں پتا ہے، میں نے اپنی سہیلیوں کو تمہاری کہانی سنائی ہے۔ وہ سب کہتی ہیں کہ انہوں نے کبھی مردوں کی اس خاموش جدوجہد کے بارے میں نہیں سوچا۔''

بلال نے کہا۔ ''ابا، آپ کی کہانی نے ہمیں سکھایا کہ خاندان میں ہر شخص کی قربانی کی اہمیت ہوتی ہے۔''

احمد نے اپنے خاندان کو دیکھا۔ وہ سمجھ گیا کہ اس کی خاموش جدوجہد نے آخر کار رنگ لایا تھا۔ نہ صرف اس کے اپنے خاندان بلکہ دوسرے خاندانوں کے لیے بھی اس کی کہانی ایک سبق بن گئی تھی۔

دوسرے سال بلال کی شادی ہوئی۔ بلال نے اپنی تقریب میں کہا۔ ''میں اپنے ابا کا شکریہ ادا کرنا چاہتا ہوں جنہوں نے مجھے سکھایا کہ شادی صرف خوشیوں کا نام نہیں، بلکہ ذمہ داریوں کا بھی ہے۔ اور میں اپنی بیوی سے وعدہ کرتا ہوں کہ میں ہمیشہ اس کے ساتھ مل کر ہر مشکل کا سامنا کروں گا۔''

احمد نے یہ الفاظ سنے تو اس کی آنکھیں بھر آئیں۔ اس کی اگلی نسل اس کے تجربات سے سیکھ رہی تھی۔ وہ اپنے رشتوں کو بہتر طریقے سے نبھا رہی تھی۔

پانچ سال گزر گئے۔ احمد اب ریٹائر ہو چکا تھا۔ ایک دن وہ اپنے پوتے کو گود میں لیے بیٹھا تھا۔

فاطمہ آ کر اس کے پاس بیٹھی۔ ''کبھی سوچا تھا کہ ہماری زندگی ایسی ہوگی؟''

احمد نے مسکراتے ہوئے کہا۔ ''نہیں، مگر میں اس تبدیلی کا شکر گزار ہوں۔''

اس نے اپنے پوتے کو دیکھا۔ وہ سوچ رہا تھا کہ اس کی کہانی اس نئی نسل تک پہنچے گی۔ وہ نسل جو مردوں اور عورتوں کی قربانیوں کو یکساں طور پر سمجھے گی۔

آج احمد ساٹھ سال کا ہو چکا تھا۔ وہ اپنے باغیچے میں بیٹھا پرندوں کو دانہ ڈال رہا تھا۔ فاطمہ اندر سے چائے لے کر آئی۔

''تمھیں پتا ہے احمد۔'' فاطمہ نے کہا۔ ''تمہاری کہانی نے نہ صرف ہمارے خاندان بلکہ کئی دوسرے خاندانوں کی سوچ بدل دی ہے۔''

احمد نے مسکراتے ہوئے کہا۔ ''ہر انسان کی اپنی خاموش جدوجہد ہوتی ہے فاطمہ۔ فرق صرف اتنا ہے کہ کچھ لوگ بولتے ہیں، کچھ خاموش رہتے ہیں۔ مگر ہر جدوجہد قابلِ احترام ہے۔''

اس کی نظر اس بجلی کے کھمبے پر پڑی جو اب بھی سامنے کھڑا تھا۔ مگر آج اسے وہاں کوئی لاش نظر نہیں آئی۔ اسے ایک مضبوط ستون دکھائی دیا جو سالوں سے موسلا دھار بارش سہہ رہا تھا، مگر ڈٹا کھڑا تھا۔

++

حوریہ

محترم مدیر
السلام علیکم!
انسان چھوٹی چھوٹی نیکیوں سے بھی دوسروں کی زندگی میں بہار لا سکتا ہے جیسے حوریہ کی زندگی میں خوشیوں کی برات سج گئی ہے۔

شاہین کمال
(کیلگری، کینیڈا)

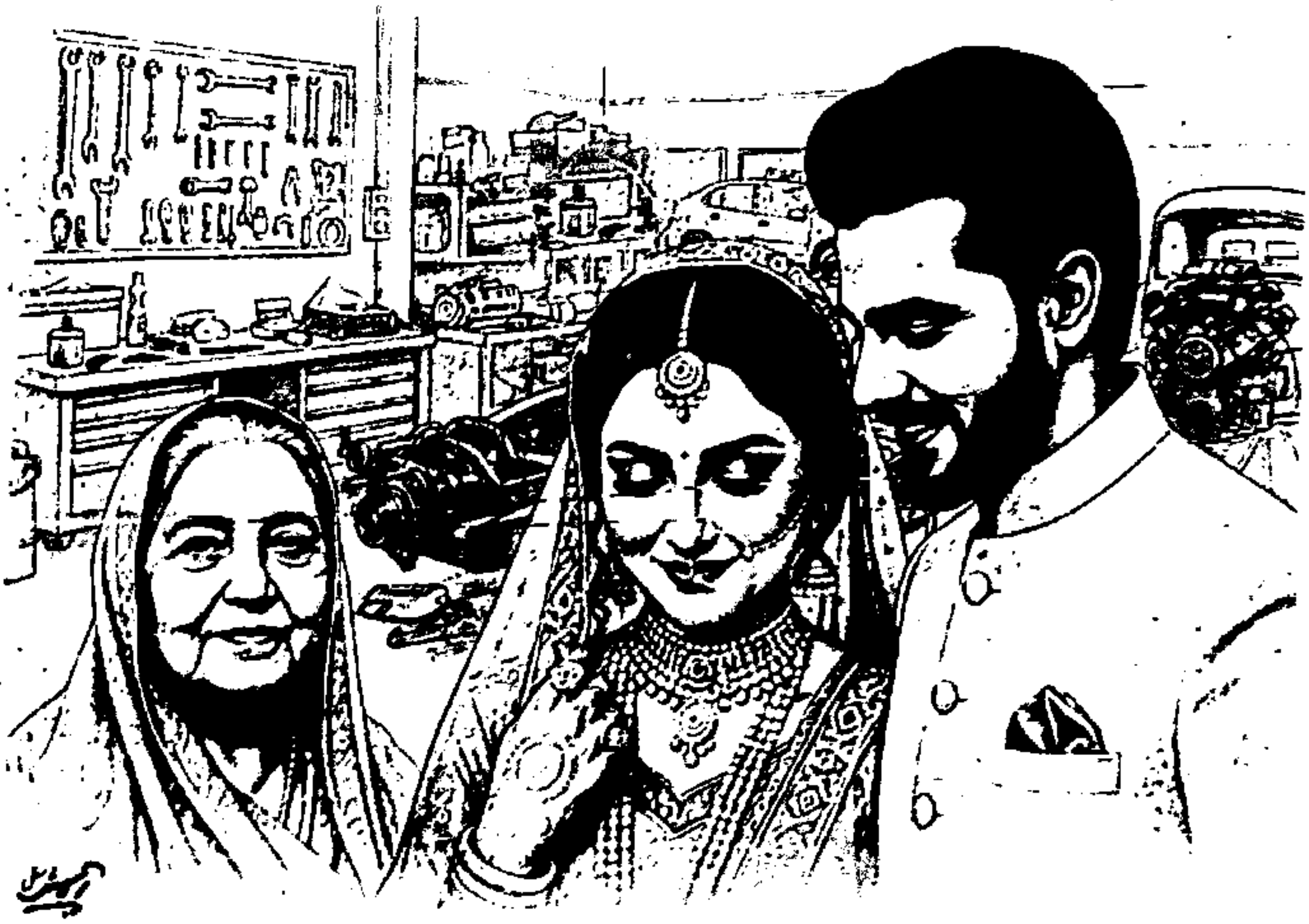

میں اسکول سے واپسی پر بوا کی خیر خبر لینے اور گی ان کے گھر چلی گئی۔ گھر کیا تھا بس کچا پکا سر چھپانے کا آسرا تھا۔ یہ بھی غنیمت کہ بھلے وقتوں میں بوا کے میاں نے جوڑ توڑ کر کے یہ چھپر چھاؤں ڈال لی تھی ورنہ بیوگی اور وہ بھی غریب بیوہ، زمانہ میں جونہ دسا بنتا کم تھا۔ بوا کا امی کے زمانے سے اس گھر میں آنا جانا تھا۔ امی، میری ساس ان کا بہت احترام کرتی تھیں۔ بوا کے ہاتھوں میں بہت صفائی تھی اور وہ روایتی ملبوسات کی تیاری میں سند کا درجہ رکھتیں۔ فرشی غرارہ، شرارہ، آڑا پاجامہ، کلی دار کرتے، فراک اور حیدرآبادی لباس کی کٹائی سلائی میں ماہر۔ بہترین ڈیزائنر۔ کسی بوتیک میں ہوتیں تو

ہزاروں لاکھوں کماتیں۔ سیدھی سادی بوا زمانے کے چلن سے ناآشنا، قناعت پسند اور سادہ طبیعت۔ میری بری کے سارے بھاری جوڑے انہی کے ہنرمند ہاتھوں کے تیار کردہ تھے۔

ساس امی کے گزرنے کے بعد بھی اس گھر میں ان کا وہی احترام روا تھا۔ وہ میرے یہاں عموماً اتوار کو آیا کرتیں تاکہ ان کی ملاقات عباس، میرے میاں سے ہوسکے۔ عباس کو وہ بابو پکارتیں اور عباس بھی ان سے لاڈ اٹھوایا کرتے۔ وہ اکثر اورنگی سے عباس کے لیے لال ساگ، چوڑا، پٹالی گڑ اور کبھی کبھار پٹل بھی لایا کرتیں اور عباس خوشی سے نہال ہو ہو جاتے۔ میرے لیے یہ سوغاتیں بڑی اجنبی سی ہوتیں۔ میری آشنائی چوڑے سے ضرور تھی مگر وہ بھی بچپن کی حد تک۔ پتا چلا یہ سب مشرقی پاکستان میں شوق سے کھایا جاتا تھا۔ میں نے حیرانی سے اپنے میاں سے پوچھا کہ آپ تو یہیں، اسی پاکستان میں پیدا ہوئے ہیں پھر؟

وہ اداسی سے بولے۔ ”یہ سب میں نے اپنے بچپن میں اپنی نانی کے گھر کھائے ہیں۔ وہ گھر جہاں نانا ابو اور نانی جان کا لامتناہی پیار تھا۔ میں نے ان دونوں کو ہمیشہ مشرقی پاکستان کے لیے بلکتے ہی دیکھا۔ انہوں نے مجھے مشرقی پاکستان کے اتنے قصے سنائے کہ وہ خطہ زمین میری روح میں بس گیا ہے۔ یہ سوغاتیں مجھے اسی خوب صورت دور میں لے جاتی ہیں۔ میں اپنی نانی کا پہلا اور چہیتا نواسہ تھا۔ اس زمانے میں بوا بڑی کامنی اور نکھری نکھری سی ہوا کرتی تھیں۔ بوا، امی سے خاصی چھوٹی ہیں مگر پُرمشقت زندگی اور صدمات کی یلغار نے ان پر گہرے نشان ثبت کردیے ہیں خاص کر بیٹی داماد کی موت۔“

عباس کی آواز میں غم گھلا ہوا تھا۔

ہاں بھلا میں کیسے بھول سکتی ہوں اس سانحے کو۔

اس حادثے کے تیسرے دن ہی تو ہمارے گھر ابتسام کی پیدائش ہوئی تھی۔ بوا کے بیٹی تبسم اور داماد بس اسٹاپ پر بس کے انتظار میں کھڑے آپس میں گفتگو میں مصروف تھے کہ ان دونوں کو واٹر ٹینکر کچلتا ہوا نکل گیا۔ اجل بھی کس کس بھیس میں آتی ہے۔ غریب عورت تھیں سو نہ کورٹ نہ کچہری، بس رو پیٹ کر بیٹھ رہیں۔ بیٹی داماد کا غم، بوا کے میاں کو لے بیٹھا اور وہ دو ہی سالوں میں چٹ پٹ ہوگئے۔ آخری دنوں میں بیچارے غم سے تھوڑے سنک گئے تھے۔ اکثر گھر سے نکل جاتے کہ تبسم سے ملنے جارہا ہوں۔ بیچاری بوا جانے کہاں کہاں خجل خوار ہو کر انہیں ڈھونڈ کر لاتیں۔ وہ ان کے لیے بہت مشکل دور تھا۔ گھر میں تبسم کی نشانی اس کی دو سالہ بیٹی حوریہ، جسے بوا کلیجے سے لگا کر رکھا کرتی تھیں۔ پھر بوا کے میاں بھی گزر گئے اور بہتے آنسوؤں کی یلغار نے بوا کی بینائی کو بہت متاثر کیا۔ اب باریک کام ان کے بس کا نہیں تھا سو انہوں نے آرائشی سلائی چھوڑ کر تکیے کے غلاف سینا، چادروں کا کنارہ موڑنا اور تھیلے سینا شروع کردیے پر ان سادہ کاموں کی اُجرت بھی بہت معمولی تھی۔

اب تو ان باتوں کو برسوں بیت گئے اور میرا چھوٹا بیٹا ابتسام بھی سینئر کیمبرج کر کے این ای ڈی میں داخل ہوچکا ہے۔

تبسم کی اکلوتی بیٹی حوریہ بوا کے جینے کا سبب مگر اب بوا حوریہ ہی کی وجہ سے حد درجہ متفکر بھی۔ حوریہ سیانی ہوگئی تھی، خوش جمال وخوش خصال گویا گدڑی میں لعل۔ غربت میں تو بیٹیوں کی جوانی آزار اور یہاں تو حسن بھی سوا۔ بوا نے حوریہ کو میٹرک کرا کر گھر بیٹھا لیا تھا کہ کالج بس سے جانا پڑتا اور اب بوا کی بوڑھی ہڈیوں میں اتنا دم خم نہیں تھا کہ روز بس کے چار پھیرے لگاتیں۔ انہوں نے اپنا سارا گن، ہنر حوریہ کی پوروں میں رچا بسا دیا تھا۔ وہ بہترین سلائی کرتی تھی مگر بوا زمانے سے اتنا ڈری ہوئی تھیں کہ حوریہ کو کسی بوتیک پر کام کرنے کی اجازت دینے کی روادار نہ تھیں۔ میں اکثر اسکول سے اپنی کولیگز کے کپڑے حوریہ سے سلوایا کرتی اور اسے اُجرت بھی اچھی دلاتی۔

آج صبح میرے پاس حوریہ کا فون آیا تھا کہ نانی امی کی طبیعت خراب ہے اور آپ کو بہت یاد کررہی ہیں۔ سو اسکول سے فارغ ہوتے ہی میں پھل اور مرغی وغیرہ خریدتی ہوئی بوا سے ملنے چلی آئی۔ بوا بدلتے موسم کی زد میں تھیں۔ بیماری سے نڈھال کم مگر حوریہ کی فکر سے ہراساں، زیادہ۔ مجھ سے اپنی پریشانی کا ذکر دہرایا مگر بر بازار میں کب مول ملتے ہیں؟ یہ سب تو نصیبوں کا کھیل ہے۔ کب، کہاں اور کس سے سب طے شدہ۔ میں نے کوشش کی، اپنی کولیگز سے بھی ذکر کیا، عباس نے بھی دھیان رکھا مگر بات آگے بڑھتی ہی نہیں تھی۔

حوریہ اچھی سلجھی ہوئی لڑکی ہے۔ شکل صورت، گن، سلیقہ لحاظ مروت سے مرصع۔ اس کی سب سے اچھی عادت جو مجھے بہت پسند ہے، اس کا جانوروں اور پرندوں سے لگاؤ۔ روٹی کے بچے کچھے ٹکڑوں کو چورا کر کے چڑیوں کے آگے ڈالنا اور ایک فالتو روٹی لازمی پکانا تاکہ محلے کی بلیوں کو دے سکے۔ ڈھلتی شام میں اس کے کچے آنگن میں چار چھ آوارہ بلیاں اور

منڈیر پر چڑیوں کے جھنڈ ہوتے ہیں۔ اس کا یہ عمل مجھے بہت پسند کہ شاید یہی ہم دونوں میں قدرِ مشترک بھی۔

میں نے بوا کو مقدور بھر تسلی دی کہ بس اسی تک میری قدرت۔ حوریہ کو تاکید کی کہ مجھے بوا کی خیریت سے برابر آگاہ رکھے۔ میں نے دروازہ بند کرتے ہوئے پلٹ کر بے فکری سے روٹی کا چورا چگتی چڑیوں اور کھانے سے فراغت کے بعد اپنی صفائی میں مصروف بلیوں کے درمیان صحن میں متفکر سی کھڑی حوریہ کو دیکھا، بیساختہ جی سے اس کے نیک نصیبے کی دعا نکلی۔

میں کلفٹن سے آ رہی تھی کہ پل کی چڑھائی پر میری بیچاری پرانی گاڑی ہانپ اور کانپ کر بند ہوگئی۔ چہار جانب سے پیں پاں گونجنے لگی اور اللہ بھلا کرے ایک موٹر سائیکل سوار کا جس نے گاڑی کو دھکیل دھال کر کنارے لگایا اور میں موٹر مکینک کی تلاش میں سرگرداں پھری۔ میری قسمت اچھی تھی کہ پل اترتے ہی دور ایک موٹر مکینک کی دکان نظر آگئی۔ کشتم پشتم وہاں پہنچی، مکینک کوئی بھلا مانس تھا کہ میری افتاں و خیزاں صورت دیکھتے ہی مجھے جلدی سے لوہے کی سال خوردہ کرسی پیش کی اور چھوٹے کو پانی کے لیے آواز دی۔ ایک دس بارہ سال کے بچے نے کولر سے ٹھنڈا پانی نکال کر شیشے کے دھندلے گلاس میں پیش کیا۔ جھجک کے ایک سیکنڈ بعد ہی میں مارے پیاس کے وہ پانی غٹا غٹ پی گئی۔ اوسان یکجا کیے اور اس شریف النفس مکینک کو ساری صورتِ حال بتائی اور گاڑی کی چابی اس کے حوالے کی۔

حواس سنبھلے تو دکان کا طائرانہ معائنہ کیا۔ اس شدید گرمی میں اس دکان کی چھت تلے بڑی فرحت بخش ٹھنڈک اور دکان کی بے ترتیبی میں بھی عجیب سی ترتیب تھی۔ چھوٹے نے دکان میں چلتے اکلوتے پیڈسٹل فین کا رخ میری طرف کر دیا تھا۔ اس کی اس مہمان داری نے جی شاد کیا اور میں نے اس سے اس کا نام پوچھا؟

"شمشاد" اس نے بدستور کام میں منہمک، سر جھکائے جھکائے جواب دیا۔

"تم پنکھے کا رخ اپنی طرف کرلو بیٹا، یہاں دروازے کے پاس اچھی ہوا آ رہی ہے۔" میں نے پسینے میں شرابور شمشاد سے کہا۔

"رہنے دو خالہ، ہم تو عادی ہیں کہ اب گھر کی بجلی بھی کٹ چکی ہے۔"

شمشاد کے جواب نے میرا دل کاٹ کر رکھ دیا اور میں

قادری میاں میر

وفات 1045ھ/1635-36ء

اصل نام میر محمد تھا۔ سندھ کے قدیمی شہر سیوان میں پیدا ہوئے۔ قاضیوں کے خاندان سے تھے جس میں علم و فضل کا بڑا چرچا تھا۔ سات سال کی عمر میں والد کا انتقال ہوگیا۔ علوم دینیہ کے حصول کے ساتھ ساتھ اپنی والدہ سے سلسلہ قادریہ کی تعلیم پائی اس کے بعد علائق دینوی سے منہ موڑ کر شیخ خضر سیوستانی کے مرید ہوئے۔ 25 سال کی عمر میں لاہور آئے اور یہاں تلقین و ہدایت شروع کی۔ آپ قدیم طرز کے صوفی بزرگوں میں سے تھے جو فنافی اللہ ہوتے ہیں۔ آپ عبادات و ریاضت میں اس قدر منہمک رہتے کہ چالیس سال تک اہلِ لاہور کو بھی آپ کے لاہور میں قیام کا پتہ تک نہ چلا۔ آپ حضرت مجدد الف ثانی کے صاحبزادے خواجہ محمد معصوم کے ہم عصر تھے۔ آپ کے ذریعے ہندوستان میں قادریہ سلسلہ کو کافی فروغ حاصل ہوا۔ شہزادہ دارا شکوہ جس نے آپ کے اور آپ کے ممتاز خلفاء کے تفصیلی حالات سفینۃ الاولیا میں لکھے ہیں، آپ کا بڑا معتقد تھا۔ شہنشاہ جہانگیر نے بھی آپ کا ذکر تزک جہانگیری میں کیا ہے۔ شہنشاہ شاہجہان بھی حضرت میاں میر سے کافی عقیدت رکھتا تھا۔ آپ کا مزار لاہور سے پانچ میل کے فاصلے پر ایک گاؤں میں ہے جو اس گاؤں کی وجہ سے میاں میر کہلاتا ہے۔ دارا شکوہ نے آپ کا مزار تعمیر کرانا چاہا لیکن اسے مہلت نہ ملی۔ بعد میں اورنگ زیب نے مزار کی تعمیر و تکمیل کا حکم دیا۔ مزار کے قریب بارہ دری ہے جس میں دارا شکوہ کی رفیقِ حیات نادرہ کی قبر ہے۔

مرسلہ: سلطانہ، کامل پور

کسی نے مشہور افسانہ نگار سعادت حسن منٹو سے کہا "آپ نے افسانے تو بہت لکھے، کوئی ناول کیوں نہیں لکھا؟"

منٹو نے سنجیدگی سے جواب دیا "بھائی میاں! ایم اسلم اور دت بھارتی سلامت رہیں اردو میں ناولوں کی کوئی کمی نہیں۔"

کچھ بھی کہنے کے قابل نہ رہی۔ میں خاموشی سے اٹھی اور پنکھے کا رخ اس کی طرف موڑ دیا۔

اب میں نے نوٹ کیا تو مجھے دکان کے ایک قدرے اندھیرے کونے میں پلاسٹک کے اسٹول پر معقول حلیے بشرے میں ایک شخص بیٹھا نظر آیا جو انتہائی انہماک سے چھیچھڑا کھاتے بلونگڑے کو دیکھ رہا تھا۔ ورک شاپ میں بلونگڑے کی موجودگی یقیناً غیر متوقع و حیرت انگیز تھی۔ میں نے ہنس کر بلی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے شمشاد سے پوچھا۔ ''تم لوگ یہ شوق بھی پالتے ہو؟''

شمشاد نے کولر سے المونیم کے پیالے میں پانی نکال کر بلی کے آگے رکھتے ہوئے کہا۔ ''یہ ان صاحب کا مہمان ہے۔''

اس نے اسٹول پر بیٹھے شخص کی طرف اشارہ کیا۔

''یہ کہاں مل گیا آپ کو؟'' میں نے حیران ہوتے ہوئے ان سے پوچھا۔

''میں کام کے غرض سے نکلا تھا چوں کہ قریب ہی جانا تھا سو پیدل ہی چل پڑا۔ یہ بلونگڑا مجھے ڈرا سہا سڑک کنارے ملا۔ کہیں کسی ٹائر تلے کچلا نہ جائے، اس ڈر سے میں نے اسے اٹھانے کی کوشش کی مگر یہ میرے ہاتھوں پر کھرونچیں ڈالتا نکل بھاگا۔ بس پھر یہ بلونگڑا آگے آگے اور میں اسے بچانے کے چکر میں پیچھے پیچھے بھاگتا پھر۔ آخر کار یہاں پہنچ کر مکینک صاحب اور میں، ہم دونوں مل کر اسے گھیرنے میں کامیاب ہو گئے۔ اب دیکھیے ذرا کیسے آسودگی سے بیٹھا اپنی صفائی میں مصروف ہے۔ مجھے تو تھکا مارا نا ہنجار نے۔'' انہوں نے چہکتے لہجے میں مسکراتے ہوئے کہا۔

تعارف ہونے پر پتا چلا کہ موصوف مصنف ہیں اور ''مواقع کی سرزمین'' یعنی امریکا سے اپنی جنم بھومی کی یاترا پر آئے ہیں۔

شمشاد نے بتایا کہ اس کا استاد بڑا بادشاہ آدمی ہے۔ ابھی آپ دیکھیے گا، بارہ بجتے ہی محلے کے سارے کتے بلی یہاں جمع ہو جائیں گے۔ استاد سب کو چھیچھڑا اور ڈبل روٹی کھلاتا ہے۔

''بڑا دیالو ہے تمہارا استاد، اس کے بال بچے نہیں ہیں کیا؟''

''لے استاد شادی بنائے گا تو بچے ہوں گے نا!'' شمشاد نے ہنستے ہوئے کہا۔

''ویسے اچھا ہی ہے کہ استاد شادی نہیں کرتا۔ کیا فائدہ خسرو کی فوج ظفر موج جمع کرنے کا۔ اب تو کھانے کو اناج بہت ہی کم اور کھانے والے منہ زیادہ ہیں۔'' اس کی آواز میں بڑی تلخی تھی۔

میں نے غور سے اس چھوٹے سقراط کو دیکھا۔ واقعی غریبی بچوں کا بچپنا ہی چھین لیتی ہے۔

اتنے میں مکینک صاحب بھی گاڑی سمیت آموجود ہوئے۔ کہنے لگے۔ ''خالہ ڈیڑھ دو گھنٹے کا کام ہے، آپ کا ادھر کوئی رشتہ دار ہے تو ان کے کنے ہولو۔''

میں نے کہا۔ ''میرا تو یہاں کوئی بھی نہیں اگر آپ کے لیے مسئلہ نہ ہو تو میں یہیں ورکشاپ میں بیٹھ کر انتظار کر لوں۔''

''لیو! ہمیں کائے کا ٹینشن خالہ، جم جم بیٹھو۔'' اس نے گاڑی کا بونٹ کھولتے ہوئے خوش خلقی سے کہا۔

بلونگڑا اب کھا پی کر اوندھے پڑے ٹائر کی گولائی میں دنیا سے بے خبر سو رہا تھا۔

اس بیچ میری مصنف صاحب سے بھی گفتگو چلتی رہی۔ آدرشی آدمی تو تھے ہی ساتھ میں ہم وطنوں کا درد بھی رکھتے تھے۔ انہیں جب پتا چلا کہ میں عرصے دراز سے درس و تدریس سے وابستہ ہوں تو انہوں نے اس خواہش کا اظہار کیا کہ وہ خانماں برباد بچوں کے لیے کچھ کرنا چاہتے ہیں۔ کوئی بھی ہنر، شعور اور آگہی سکھا سکیں تاکہ ان کا مستقبل تاریک نہ ہو اور وہ تاعمر سڑکوں کے راہی نہ رہیں۔

ان کی خواہش جان کر جی شاد ہو۔

میں نے انہیں بتایا کہ میرا بڑا بیٹا جو انجینئرنگ کے آخری سال میں ہے اپنے تین دوستوں کے ساتھ مل کر ہفتے میں تین دن گلشن اقبال کے پل کے نیچے بے گھر بچوں کو پڑھاتا ہے اور کتاب و کاپی پینسل بھی ان بچوں کو وہ چاروں لڑکے ہی فراہم کرتے ہیں۔ سب سے بڑی بات کہ اب تک ان کا ایک بھی شاگرد میدان، چھوڑ کر نہیں بھاگا۔ میں نے انہیں اپنے بیٹے منیب کا ٹیلی فون نمبر دیا اور ان کا بھی اپنے پاس محفوظ کر لیا۔ ان سے ملاقات باعث تقویت کہ اب ایسا درد دل رکھنے والے بہت کمیاب۔

میری نظر ورک شاپ کے باہر تھڑے پر پڑی تو دیکھا کہ وہاں بلیاں اور کتے جمع ہونا شروع ہو چکے ہیں۔ پانچ بلیاں اور تین کتے مگر کمال کی بات کہ نہ کتے بلیوں پر جھپٹے اور نہ ہی بلیاں کتوں پر غرائیں۔ ایک مکمل مفاہمت کی فضا تھی۔ میں نے ایک نظر اپنی کلائی پر بندھی گھڑی پر ڈالی جہاں دونوں سوئیاں اتحاد کی مثال بنی بارہ کے ہندسے پر مجتمع

تھیں۔ میں نے ستائشی لہجے میں مکینک کبیر سے کہا۔ "بھئی تمہارے مہمان تو وقت کے بڑے پابند ہیں۔"

"ہاں نا خالہ بھلا پاپی پیٹ سے زیادہ پابند کون ہوگا؟"

اس نے جانے کس کونے سے ایک شاپر نکالا اور دکان کے تھڑے پر سب کا برابر برابر حصہ لگا دیا پھر ایک مٹی کے کونڈے میں کولر کا سارا ٹھنڈا پانی الٹ دیا۔

میں کبیر کی سخاوت اور نرم دلی پر ششدر تھی۔ ان بے زبانوں کا اتنا خیال! بہت بڑی بات تھی، یقیناً اس میں انسانیت کا جوہر ہے۔

خالی کولر اس نے پاس کھڑے شمشاد کو پکڑایا اور کہا کہ واپسی پر ملباری کو تین کڑک چائے ڈبل ملائی مار کے بولتے آنا۔

"نہیں نہیں میرے لیے چائے مت منگواؤ کبیر، میں چائے نہیں پیتی۔"

"کراچی کی ہوکر چائے نئی پیتی خالہ؟ یہاں تو لوگ پیاس نہیں بلکہ چیاس بجھاتے ہیں۔" اس کی حیرت دیدنی تھی۔

"میں صرف ناشتے پر ایک کپ چائے پیتی ہوں اور بس۔"

"کیا خالہ پھر تو آپ کراچی کی نہ ہوئیں۔ اپن تو جب تک چائے کا چار پانچ کپ نہ پیوں کام میں مزہ ہی نہیں آتا۔" اس نے دوبارہ گاڑی کے کل پرزوں سے کھیلتے ہوئے کہا۔

"مہنگائی کے اس سونامی میں اب تم بھی چائے چھوڑ ہی دو کبیر، کیا رکھا ہے چائے میں؟"

"خالہ غربت میں تو پہلے ہی آٹا گیلا ہے۔ اب تو مشکل سے مہینے میں ایک بار، ایک پلیٹ مرغی کا سالن کھاتا ہوں، بڑے کے گوشت کا مزہ تو بھول ہی چکا ہوں۔ سبزیاں پہلے ہی پہنچ سے باہر، لے دے کر داڑھ گیلی کرنے کو دال ہی بچتی ہے۔ اب کیا کیا چھوڑوں خالہ! کبھی کبھی تو جی کرتا ہے دنیا ہی چھوڑ دوں۔ یقین کرو خالہ میں تو اب تندور سے روٹی بھی نہیں لیتا۔ بھلا بتاؤ بیس روپلی کی ایک روٹی۔ میں تو خود ہی گھر میں کچی پکی روٹی بنا لیتا ہوں۔" مجھے آج کے دیوداس کے مہنگائی پر کیے گئے اس رواں تبصرے پر بے ساختہ ہنسی آگئی۔

"تو شادی کرلو نا کبیر، گھر کا سکھ تو ملے گا۔" میرے

"اس سے پہلے کہ تمہیں سزا کا حکم سنایا جائے تم عدالت کے سامنے کچھ پیش کرنا چاہتے ہو؟" جج نے ملزم سے پوچھا۔

ملزم نے جواب دیا۔ "نہیں جناب والا! جو کچھ میرے پاس تھا سب وکیل کی نذر کرچکا ہوں۔"

......

استاد جب کلاس میں سبق پڑھا چکے تو انہوں نے ایک لڑکے سے سوال کیا۔ "عمران! اب جب کہ تم نے سبق اچھی طرح پڑھ لیا ہے تو یہ بتاؤ کہ جب بیٹے نے باپ کے سامنے اس کا پسندیدہ درخت کاٹ دیا تو باپ نے بیٹے کو مارا تک نہیں کیوں؟"

"سر! اس لیے کہ باپ کو معلوم تھا کہ بیٹے کے ہاتھ میں ابھی تک کلہاڑا موجود ہے۔"

مرسلہ: عنایت علی سرگونہ۔ پشاور

انسانی نسلیں

انسانی نسلوں کے امتیاز کے لیے جسمانی خصوصیات جغرافیائی تقسیم، زبان کی تفریق اور رسوم ورواج کے اختلاف کو عموماً کسوٹی کے طور پر پیش کیا جاتا ہے مگر جسمانی خصوصیات کی اہمیت دوسرے امور سے زیادہ مسلم ہے۔ کھوپڑی کی شکل وصورت چہرے کے زاویے، جلد کی رنگت، بالوں کا رنگ، چہرے کے خط وخال، ہڈیوں کی بناوٹ اور لمبائی چوڑائی دو نسلوں کے درمیان تفریق کی مستند وجوہ سمجھی جاتی ہیں۔ جلد کی رنگت سفید، کالے، سرخ پیلے اور بھورے کا فرق واضح کرتی ہے۔ جدید تحقیقات کے مطابق انسان کو مندرجہ ذیل نسلوں میں تقسیم کیا گیا ہے:

قفقازی، یورپی اور سفید اقوام، افریقی یا سیاہ اقوام، منگول، ایشیائی یا زرد اقوام، ملائی، پولی نیشی یا بھوری اقوام اور امریکی یا سرخ اقوام۔ بعض محقق امریکی اور ملائی اقوام کو بھی منگول اقوام کی شاخیں سمجھتے ہیں۔

مرسلہ: احمد توحید۔ رحیم یار خان

اندر کی مشورہ خانم نے بے اختیار مشورہ داغ دیا۔
''شادی! کیسی بات کر رہی ہو خالہ اس ہوش ربا مہنگائی میں شادی؟''
مجھے ماننا پڑا کہ اس کا استہزائی سوال ناروا نہ تھا۔
''خالہ اب لڑکیوں کے خواب بہت اونچے ہیں اور ٹٹ پونجیے کو کوئی نہیں پوچھتی۔'' اس نے گاڑی کا بونٹ بند کرتے ہوئے صافی سے ہاتھ پونچھے۔
''نہیں اب ایسا بھی کال نہیں، میری نظر میں ایک بہت سلجھی ہوئی لڑکی ہے۔ کہو تو بات کر کے دیکھوں؟''
''ارے خالہ نیکی اور پوچھ پوچھ اگر ایسا ہو جائے تو کیا ہی بات ہے۔'' اس نے خوش ہوتے ہوئے کہا۔
''ایک بھلی مانس ہیں، بوا چمن آرا، لوگوں کے کپڑے سی کر عزت کی روٹی کھاتی ہیں۔ بوا کی نواسی ہے حوریہ۔ وہ جب دو سال کی تھی تو اس کے ماں باپ ٹریفک حادثے میں جاں بحق ہو گئے تھے۔ نانی ہی نے اس کی پرورش کی ہے۔ لڑکی میٹرک پاس اور سلائی کٹائی میں ماہر ہے۔ شکلاً اچھی اور سب سے عمدہ بات یہ کہ منکسر المزاج۔ بوا چوں کہ چراغ سحری ہیں سو چاہتی ہیں کہ کوئی نیک بر جڑے تو نواسی کے فرض سے سبکدوش ہو کر بہشت میں اپنی بیٹی سے سرخرو ہو کر ملیں۔ یقین مانو کبیر تمہارے مہمانوں کو دیکھ کر مجھے بے ساختہ حوریہ یاد آئی تھی کہ وہ اپنی سوکھی روٹی میں بھی گلی کے بھوکے جانوروں کو شامل رکھتی ہے۔ تم دونوں خدا ترس اور محنتی ہو، میرے خیال میں اچھی زندگی گزار لو گے۔''
''خالہ اگر ایسی بات ہے تو میری طرف سے پکی پکی ہاں ہے۔''
''سوچ لو کبیرا لڑکی صرف تن کے کپڑوں کے ساتھ اور نکاح دو گواہوں کی موجودگی میں شربت کے گلاس پر۔'' میں نے سنجیدگی سے کہا۔
''خالہ اس کڑکی میں خدا ترس اور وہ بھی منکسر المزاج لڑکی مل رہی ہے اور کیا چاہیے۔'' اس نے ممنون لہجے میں میرے گھٹنوں کو ہاتھ لگایا۔
مجھے تو کبیر، حوریہ کے لیے بہت مناسب لگا۔ خوش شکل، محنتی اور سب سے بڑی بات کہ محبتی۔ زندگی میں قدر دان ساتھی ہی اہم، باقی رہا مال منال تو وقت لگتا ہے لیکن محنت اور لگن ہو تو سب ممکن۔
میں نے کبیر سے کہا۔ ''تم ذرا منہ ہاتھ دھو لو تو میں تمہاری کچھ تصویریں اتار لوں تا کہ بوا اور حوریہ کو دکھا سکوں!''
شمشاد یہ سنتے ہی تیر کی طرح لپکتا ہوا آیا اور کبیر کو بازوؤں سے کھینچتا ہوا گیراج سے باہر لے گیا۔
کوئی بیس منٹ بعد دونوں لوٹے اور کبیر میاں کی سج دھج دیکھنے والی تھی۔
''اچھا لگ رہا ہے نا استاد، خالہ!'' شمشاد میاں نے پُرجوش انداز میں پوچھا۔
''ہاں ماشاء اللہ بہت اچھا لگ رہا ہے۔''
''خالہ میں استاد کو سلیم ہیئر ڈریسر کے پاس لے گیا تھا۔ آخر بردکھوے کی تصویر اترنی ہے کوئی مذاق تھوڑی نا ہے۔'' شمشاد نے ہنستے ہوئے تفصیل بتائی۔
''ابھی تو تم بڑے جوش میں ہو، کہاں تو کہہ رہے تھے کہ اچھا ہے استاد شادی نہیں کرتا۔'' میں نے شمشاد کو یاد دلایا۔
پر وہ چھنکا بھی بلا کا چلتا پرزہ کہنے لگا۔
''ارے خالہ اپن کے نصیب میں تو دولہا بننا ہے نہیں، کم از کم استاد کی شادی پر شہ بالا تو بنوں گا۔''
میں نے کبیر کی تین چار تصویریں اتاریں اور کبیر میاں کا یہ حال کہ شرم سے بے حال۔
میں نے اپنی ہنسی کو بمشکل قابو کرتے ہوئے کبیر سے کہا کہ ''جتنا تم شرما رہے ہو، اتنا تو اب لڑکیاں بھی نہیں شرماتیں۔''

دوسرے دن اتوار تھا سو میں اور عباس ناشتا کرتے ہی ترنت بوا کے گھر چلے گئے۔ بوا کو کبیر کی ابتدائی معلومات قابل قبول لگیں تو مزید کی کھوج کی گئی۔ بات جب بنی ہو تو سرا سے سرا ملتا چلا جاتا ہے۔ عباس کی برانچ کے چوکیدار کا سسرال کبیر کے محلے میں تھا۔ اس سے پوچھ تاچھ کی اور پھر ہم دونوں ایک رات کبیر کے گھر جا پہنچے۔ جب ہر طرح تسلی کر لی تو کبیر کو بوا کے گھر بلایا تا کہ بوا اور حوریہ بھی کبیر سے مل لیں۔
بس پھر دو ہفتے کے اندر اندر ساری بات طے پا گئی اور ہم نے اپنے گھر سے عزت اور مان کے ساتھ حوریہ کو کبیر کے ساتھ رخصت کر دیا۔
اللہ تعالیٰ کی منصوبہ بندی دیکھیے کہ گیراج میں بیٹھے بیٹھے دو زندگیوں کا اتنا اہم فیصلہ ہو گیا۔
سو دوستو کوئی حادثہ اتفاقی نہیں۔

++

جوا

محترم و مکرم مدیر
السلام علیکم!
ایک کیس کے سلسلے میں عمارہ کی کہانی سامنے آئی۔ جسے الفاظ کا پیرہن دے کر بھیج رہا ہوں۔ قارئین کو بھی یہ واقعہ پسند آئے گا۔

عمار حسین ایڈووکیٹ
(کہروڑ پکا)

یہ معاشرہ مردوں کا ہے، مردوں کی ہی اس پر اجارہ داری ہے۔ عورت خود کو جتنا بھی مضبوط سمجھ لے، مرد کی ایک غصیلی جھلک یا آواز اس کے حوصلے کو ملیا میٹ کر ڈالتی ہے۔

عورت کا اپنا گھر کہاں ہوتا ہے؟ اس پر غور کرنے لگتی ہے۔ والدین کے گھر میں وہ باپ بھائی کی زیرِ نگین رہتی ہے۔ رہ رہ کر کوئی نا کوئی اسے رلاتا رہتا ہے کہ وہ جلد بدیر اپنے گھر جائے گی اور راج کرے گی۔ سسرال کی دہلیز پر قدم رکھتی ہے تو اسے ہر کسی کی گھورتی نظروں کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ جب بھی اس کی آنکھوں سے آنسو گرنے لگتے ہیں تو اس کے چاروں طرف ایک ہی جملہ گردش کرتا ہے۔ ”پرائے گھر سے آئی ہے،

آخر دوسرے کی پسند ناپسند سمجھنے میں وقت تو لگائے گی۔'' گویا وہاں شوہر اور اس کے گھر والوں کی محکوم بنی رہتی ہے۔

پھر جب طلاق کے تین بول سنا کر دھتکاری جاتی ہے تو زندگی کی ویران سڑکوں پر ننگے پاؤں اور ننگے سر بے آسرا ہو کر یہ سوچتی ہے کہ آخر عورت کا گھر کون سا ہے؟ جہاں وہ خود کو محفوظ تصور کر سکے، جہاں اسے تحفظ کا احساس ہو، جہاں اس کی چھوٹی چھوٹی خوشیوں پر سب آنکھیں بچھا دیں اور اس کے غموں پر سب اسے تسلی دیں۔ یہی حسرت لیے وہ جوانی کی دہلیز پار کر کے اس مقام پر پہنچ جاتی ہے جہاں ماضی اور جوانی ایک خواب دکھائی دینے لگتے ہیں۔

میری آنکھ ایسے ہی معاشرے میں کھلی۔ جب میں نے ہوش سنبھالا تو میرے کانوں نے ایک ہی جملہ سنا۔ ''یہ معاشرہ مردوں کا ہے۔ عورت تو کھلونا ہے، جو ٹوٹ جائے تو اسے کسی کچرے پر پھینک دو، کسی کو کوئی فرق نہیں پڑے گا۔''

☆☆☆

میں عمارہ ہوں ایک انتہائی غریب گھر میں جنم لینے والی۔ اسکول کی تعلیم سے نابلد عورت۔ گھر میں اماں نے اردو سکھا دی ہے تو افسانے کہانیاں پڑھنے کے قابل ہوئی۔ اس وقت عمر بھی بہت کم تھی پھر بھی گھر کی تمام ذمے داریاں اٹھائی تھی۔ اماں سارا دن اینٹوں کے بھٹے پر محنت مزدوری کرتی اور میں بھٹے کے قریب ایک جھگی میں اپنی چھوٹی بہن کا خیال رکھتی۔ بہن بھوک کی وجہ سے ماں کو یاد کر کے روتی رہتی اور روتے روتے ہی سو جاتی۔ میری ماں کس لیے اتنی محنت کر رہی تھی؟ وہ ہمارے لیے نہیں، بلکہ اس ظالم مرد کے لیے اپنا پھول جیسا بدن سورج کی بے رحم کرنوں کے سپرد کر رہی تھی، جس کی آوارہ عادتوں نے اسے جیل کی سلاخوں کے پیچھے ہمیشہ کے لیے پہنچا دیا تھا۔

ہم اس دور میں چلتے ہیں جب وہ قیدی ہمارے ساتھ رہتا تھا۔ وہ میرا باپ کہلاتا...... نام اس کا رحیم تھا۔ وہ سارا دن تپتی دھوپ میں ریڑھی لگا کر کھڑا رہتا۔ سارے دن میں وہ کوئی چار سو روپیا کما کر شام کو گھر آتا تو بدن تھکاوٹ سے چور اور آنکھوں سے غصہ ٹپک رہا ہوتا۔ میری ماں شکیلہ شوہر کو دیکھ کر ڈر کے مارے کوئی بات نہ کرتی۔ میں بھی باپ کو دیکھ کر سہم کر ایک کونے میں بیٹھ جاتی۔ ہمارا چھوٹا سا گھر تھا، ایک کمرا، ساتھ ایک باورچی خانہ اور آگے چھوٹا سا کچا صحن۔ مکان کرائے کا تھا مخدوش سا۔ ساون کے دنوں میں جب بارش ہوتی تو چھت سے پانی ٹپکتا رہتا۔ اماں نے کئی بار سوچا کہ کہیں اور مکان دیکھ لیتے ہیں، لیکن ان کے کرائے بہت زیادہ تھے۔ میرا باپ اتنا کہاں کماتا تھا جو ہمارے لیے پکا مکان ڈھونڈتا۔ میری ماں مٹی اور گارے سے دیواروں اور چھت کو پکا کرتی رہتی، تب ہی اتنا عرصہ اس گھر میں گزر گیا تھا۔

ایک دن میری ماں صحن میں مٹی کے چولہے پر رات کا کھانا بنا رہی تھی۔ ابا نے ریڑھی باہر کچی دیوار کے ساتھ لگا دی اور غصے میں ایک ٹانگ سے دروازہ کھولتا ہوا اندر آیا۔ دروازے کے پاس سے لکڑی اٹھائی اور بیوی کی کمر پر زور زور سے وار کرنے لگا۔ اماں بیچاری چیخنے چلانے لگی۔ ماں کی پکار پر میں باہر آئی تو ماں کو باپ کے ہاتھوں روئی کی مانند دھنتے ہوئے دیکھ کر مدد کے لیے پکارنے لگی۔ ابا رحیم کا غصہ جب ٹھنڈا ہوا تو خود ہی لکڑی پھینک کر گالیاں دینے لگا۔ میں بے سدھ دیوار کے ساتھ چپکی رہی۔ ماں کا بدن زخموں سے چور ہو گیا۔

''تجھے کتنی دفعہ کہا ہے کہ عمارہ کو شیدے کے ہاتھ بیچ دے۔ دو بول پڑھا کر ساتھ رکھے گا۔ پھر دوسری بھی تو بڑی ہو رہی ہے لیکن تو نے تو جیسے ان دونوں کو ساتھ لے کر قبر میں اترنا ہے۔ بیٹیاں جوان ہو رہی ہیں، کہاں سے ان کی شادی کے خرچے پورے کرے گی؟ باہر وہ شیدا مجھے طنز کرتا ہے اور ادھر تیری پاک دامنی کے فلسفے پورے نہیں ہوتے۔ میری بات کان کھول کر سن لے، کل میں خود عمارہ کو شیدے کے ہاتھ بیچ آؤں گا۔ پھر شیدا جانے اور اس کا کام۔ مجھے تو صرف کرارے اور سرخ نوٹ چاہیے۔''

ادھر جب میں نے اپنے بکنے کی خبر سنی تو مجھے باپ پر سخت غصہ آیا۔ یہ کیسا باپ ہے؟ جو اپنے کلیجے کے ٹکڑے کو غیروں کے ہاتھ محض چند روپوں کی خاطر بیچنا چاہتا ہے۔ باپ تو اولاد کے لیے گھنی چھاؤں ہوتا ہے۔ اسے سورج کی تمازت اور آوارہ نظروں سے بچا کر رکھتا ہے۔ دوسری طرف ماں کو زخموں سے چور دیکھا تو آنکھوں سے موٹے موٹے آنسو گر کر کچی زمین میں جذب ہونے لگے۔ میری ماں کتنی اچھی تھی۔ میری وجہ سے آج اس نے پھر مار کھائی تھی لیکن شوہر کے آگے ایک لفظ بھی نہ بول سکی۔ میں شوپیس میں پڑا کوئی کھلونا نہیں تھی کہ جب جس کا دل چاہتا، مجھے منہ مانگے دام وصول کر کے لے جاتا۔ میں چودہ پندرہ برس کی دوشیزہ تھی جس پر جوانی اتر کر آ رہی تھی۔ میری ماں کتنے عرصے سے مار کھا رہی تھی۔

رات کو سونے سے پہلے میں نے ماں کے زخموں پر دوائی لگاتے ہوئے کہا۔ ''ماں! تجھ میں اتنا حوصلہ کہاں سے آ

جاتا ہے جو توابا کی مار کھا کر بھی چپ کے تالے اپنے ہونٹوں پر لگائے رکھتی ہے؟ آگے سے جواب کیوں نہیں دیتی؟"

ماں نے خالی نظروں سے میری طرف دیکھا اور پھر کہنے لگی۔ "پھر تو یہ مجھے کب کا بیچ چکا ہوتا۔ مجھے مار کر اس کا غصہ ختم نہیں، کم تو ہو جاتا ہے اور اگلے دن وہ سکون سے ریڑھی لگاتا ہے۔" ماں نے لیٹے لیٹے اپنے رب سے ڈھیر سارے شکوے کیے۔ پھر اپنی بیٹیوں کی سلامتی کی کتنی دیر تک دعائیں مانگتی رہی۔

"اے اللہ! تو ہی ان پر رحم کر۔ میں نہیں جانتی اس رات کے اندھیرے کے پیچھے کل کی روشنی چھپی ہے یا کسی کی عزت داغدار ہونے والی ہے۔ یا اللہ! میری بچیوں کو سلامت رکھنا اور میرے شوہر کے ناپاک ارادوں سے ہم کو اپنی پناہ میں رکھنا۔"

اس نے ایک نظر مجھ پر ڈالی پھر پہلو میں سوئی ہوئی دوسری بیٹی پر ڈالی۔ اپنے بچوں کو دیکھ کر وہ سوچ رہی تھی "کاش! میں تم دونوں کو اس مردوں کے معاشرے سے دور کہیں ویرانوں میں لے جاسکتی، جہاں لال نگاہوں کا وجود نہ ہو۔ تم دونوں کو اپنے دامن میں سمیٹ لوں، جہاں شکاری کتے صرف بھونکتے رہ جائیں پر ہاتھ کچھ نہ آئے۔"

آنسو گر کر میلے سرہانے میں جذب ہو رہے تھے۔ پھر ایک پُرعزم خواہش کے ساتھ اس نے آنکھیں بند کر لیں۔

☆☆☆

"کیوں یار، سودا طے ہو گیا ہے کیا۔ میں نے تجھے آدھے پیسے دے رکھے ہیں۔ آدھے پیسے مال ہاتھ میں آنے کے بعد دوں گا۔" شیدا رحیم کے کندھے پر ہاتھ رکھے ہوئے بولا۔

"سرکار! تمہارا حکم سر آنکھوں پر، لیکن مجھے پیسوں کی ضرورت آن پڑی ہے۔ کیا تم سارے پیسے ابھی دے سکتے ہو؟"

"رحیم! یہ تم کیا کہہ رہے ہو؟ تمہیں پتا بھی ہے ہمارے درمیان سودا طے ہو چکا ہے۔ مال کے بدلے مال۔"

"وہ میں نے کہیں جوا کھیلا تھا، لیکن ہار گیا۔ وہ جواری فوراً پیسے مانگ رہا ہے۔"

"اگر وہ پیسوں کا اصرار کر ہی رہا ہے تو اپنی دوسری بیٹی اسے دے دو اور پھر ایک جوا آج میرے ساتھ بھی کھیلو۔" شیدا کہنے لگا۔

"کیسا جوا؟" رحیم ہونٹوں پر زبان پھیرتے ہوئے کہنے لگا۔

حکیم فقیر محمد چشتی

1870-1937ء

طبیب، ادیب مولد جگراؤں ضلع لدھیانہ (مشرقی پنجاب) ہے۔ عربی، فارسی وغیرہ کی تحصیل کے بعد مدرسہ طبیہ دہلی میں طب پڑھی۔ 1909ء میں لاہور آکر مطب جاری کیا اور قلیل عرصے ہی میں آپ کی قابلیت کا شہرہ دور دور تک پھیل گیا اور حکومت سے شفاء الملک کا خطاب ملا۔ آپ ایک اعلیٰ طبیب ہونے کے ساتھ ساتھ بہت اچھے ادیب، خوشنویس اور اچھے مصور بھی تھے۔ بڑے بذلہ سنج، سخن شناس اور شگفتہ مزاج تھے۔ ادبا و شعراء آپ کی صحبت میں بیٹھنے کو نعمت تصور کرتے تھے۔ حضرت علامہ اقبال کی فارسی نظم میں پہلی کتاب "اسرار خودی" کا پہلا ایڈیشن آپ ہی کے زیرِ اہتمام شائع ہوا تھا۔ حکیم صاحب بے اولاد تھے۔ آپ نے اپنا رہائشی مکان "شفا منزل" طبیہ کالج دہلی کے نام وقف کر دیا تھا۔

فقیر محمد چشتی نظامی

1866-1952ء

نامور طبیب اور صوفی۔ فخر الاطباء لقب تھا۔ وہ امرتسر میں پیدا ہوئے۔ انہوں نے عربی اور فارسی کی تعلیم حاصل کی اور پھر طبی تعلیم کی طرف متوجہ ہوئے۔ حکیم مولوی محمد ابراہیم جالندھری، مولانا حکیم حیدر علی بجنوری اور علامہ محمد عالم آسی سے استفادہ کیا۔ ہندی زبان بھی سیکھی۔ 1900ء میں اپنا مطب شروع کیا۔ میاں غلام محمد چشتی نظامی ہوشیار پوری کے دست حق پرست پر بیعت کی۔ فاضل درس نظامی بھی تھے۔ طبی موضوعات پر متعدد کتب لکھیں۔ جن میں تجربات فخر الاطباء قابل ذکر ہیں۔ لاہور میں انتقال کیا اور حضرت میاں میر صاحب کے جوار میں دفن ہوئے۔

مرسلہ: ذیشان انصاری، لاہور

''اپنی بڑی بیٹی ابھی گھر سے لے آ پھر دیکھنا جوا کیسے کھیلتے ہیں۔''

''شیدے! اپنی زبان بند رکھ۔ یہ تو کیا کہہ رہا ہے؟ وہ میری بیٹی ہے، کوئی تاش کے پتے نہیں جو تم میز پر پھینک کر جیتنے کی اُمید لگا رہے ہو۔''

''آج تو تیرے اندر اپنی بیٹیوں کے لیے بڑی غیرت جاگ رہی ہے۔ میں سارے پیسے اس طرح نہیں دے سکتا اور ویسے بھی ہمارے درمیان سودا طے ہو چکا ہے۔'' شیدا اپنی مونچھوں کو تاؤ دیتے ہوئے گالیاں بکنے لگا۔

''کیسا سودا؟'' ابا کو غصہ آ گیا۔ اس نے وہیں ایک طرف رکھا شیدے کا چاقو لیا اور شیدے پر دو تین وار کر دیے۔ شیدا زمین پر گرتے ہی ہلاک ہو گیا۔

یہ باتیں وہاں موجود ایک شخص نے بعد میں بتائی تھی کیونکہ دوپہر میں ہمارا دروازہ زور سے بجا تھا۔ میں ڈر کے مارے اندر کمرے میں چلی گئی۔ ماں خوف سے کانپتی دروازے پر گئی۔ ٹاٹ کا پردہ اٹھا کر پوچھا۔ ''کون ہے؟''

سامنے بھدی شکل والا بندہ کہہ رہا تھا۔ ''تمہارے شوہر نے شیدے کا قتل کر دیا ہے۔ پولیس اسے پکڑ کر لے گئی ہے۔ سنا ہے وہ جوا بھی کھیلتا تھا۔ ہمیں تو اس بات کا آج پتا چلا ہے۔''

قتل کا سن کر اماں کے ہاتھ پاؤں پھول گئے، زمین گھومتی ہوئی محسوس ہونے لگی۔ ''میرا شوہر قاتل بن گیا۔'' اس لمحے وہ بڑبڑائی۔ ''تیرا شوہر قاتل تو بن گیا، لیکن تیری بیٹیاں بکنے سے بچ گئیں۔ اس نے پہلے کون سے اچھے کام کیے تھے جو آج قتل کر کے میرا سر نیچا کر دیا؟''

ماں ایک دو بار شوہر کو ملنے جیل گئی۔ ابا نے بچوں کا نہ پوچھا۔ بس اس کے منہ پر ایک ہی جملہ ہوتا۔ ''میں جوئے میں ہارا تھا۔ دو لاکھ کی رقم کا بندوبست کر کے اس بندے تک پہنچا دینا، ورنہ وہ کچھ بھی کر سکتا ہے۔ بڑا اثر و رسوخ والا بندہ ہے۔''

''میں کہاں سے لاؤں اتنے پیسے؟ تو نے کون سی اپنے پیچھے جائیداد چھوڑی ہے جو میں اس کو رقم دے سکوں؟'' ماں جواب دیتی۔

''تو ایسا کر، سائرہ کو اس کے ہاتھ فروخت کر دے۔ اس طرح تو چھوٹی بیٹی کی ذمہ داری سے پہلے ہی فارغ ہو جائے گی۔ میری تو یہاں سے نکلنے کی اُمید بہت کم ہے۔''

''اب تو کچھ خدا کا خوف کھا لے۔ کہیں تجھے اپنے ہی بچوں کی بددعا نہ لگ جائے۔'' ماں نے کہا اور جیل سے باہر نکل آئی۔

''میں کیا کروں؟ یہاں کھانے کو پیسے نہیں ہیں۔'' ابا کی باتیں ماں کے دماغ پر ہتھوڑے برسا رہی تھیں۔ ''دو لاکھ کی رقم میں کہاں سے انتظام کروں؟'' نوبت فاقوں تک آ گئی، کرایہ نہ دینے پر مالک مکان نے گھر سے نکال دیا۔

راستے میں اماں کو وہ بندہ مل گیا جس سے ابا رحیم نے جوا ہارا تھا۔ اماں نے ہمیں ایک جھٹکے سے پیچھے چھپا لیا۔ وہ اپنی مونچھوں کو مروڑتا ہوا کہنے لگا۔ ''میں ایک شرط پر تیرے شوہر کو ضمانت پر رہا کروا سکتا ہوں کہ تو اپنی بیٹی ان پیسوں کے عوض میرے حوالے کر دے جو اس نے ادا نہیں کیے۔''

''یہ میری بیٹیاں ہیں، کوئی سبزی کی دکان نہیں جو ساری تیرے حوالے کر دوں۔ مجھے تیری مکاریاں اچھی طرح سمجھ آ رہی ہیں۔ تم لوگوں کی زبان کا کیا بھروسا؟ جو کرتوت تم لوگ کرتے ہو اس سے سارا زمانہ واقف ہے۔ میں اپنی طرف سے پوری کوشش کروں گی کہ تیری رقم تجھے لوٹا سکوں۔ محنت مزدوری کر لوں گی، لوگوں کے گھروں میں جا کر کام کروں گی، یا پھر تپتی دھوپ میں کسی بھٹے پر بھی بیٹھنا پڑا تو ضرور بیٹھوں گی، پر اپنی پھول جیسی بچیاں تیرے حوالے نہیں کروں گی۔''

اماں کی بات سن کر وہ زور سے ہنسا اور اپنی مونچھوں کو بل دیتے ہوئے آگے چلا گیا۔

سر چھپانے کو کوئی ٹھکانا نہ رہا۔ میں ماں کے ساتھ خانہ بدوشوں کے علاقے میں آ گئی، جہاں بہت سے لوگ جھگیاں ڈال کر زندگی گزار رہے تھے۔ اماں نے سردار سے بات کر کے سر چھپانے کے لیے معمولی کی جھگی ڈال لی۔ کم از کم سر چھپانے کا عارضی سہارا تو مل ہی گیا۔ جھگی سے تھوڑے فاصلے پر اینٹوں کے بھٹے پر عورتیں اور مرد کام کر رہے تھے۔ اماں نے مجھے تاکید کی اور سمجھا کر بھٹے کے ٹھیکیدار کے پاس گئی۔ اپنا نام لکھوایا اور پہلی اُجرت لے کر اس نے خدا کا شکر ادا کیا۔

میں اپنے باپ سے ملاقات کرنے نہیں گئی۔ وہ زندہ ہے یا مر گیا، اس نے ہمیں کون سی خوشی دی ہے؟ ساری زندگی جو میری ماں عدالتوں کے چکر کاٹتی رہی، وہ تو میرے باپ کی بوئی ہوئی فصل کاٹ رہی تھی، اور نہ جانے کب تک کاٹتی رہے گی۔

آج بھی میری ماں اینٹوں کے بھٹے پر بیٹھی کچی مٹی سے پکی اینٹیں بنانے میں مگن تھی جسے نہ دھوپ کا خیال تھا، نہ بھوک کا اور نہ اپنا۔ اسے تو بس اس بات کا ڈر تھا کہ جوئے باز کہیں جھگی کی دہلیز پار نہ کر لے اور ایسی دہلیز پار کرنا ان جیسے آوارہ مردوں کے لیے معمولی بات ہے۔ وہ خود کو مطمئن کرنے کے لیے پیسے جمع کر رہی تھی تاکہ اس جواری کا منہ بند کر سکے۔

++

فون کال

محترم مدیر

السلام علیکم!

محبت فاتح عالم یہ تو سنا ہو گا۔ میں نے ایسی ہی، ستّر کی دہائی کی، میٹھی میٹھی لو دیتی محبت کی کہانی کو الفاظ میں پرویا ہے۔ اُمید ہے قارئین کو بھی پسند آئے گی۔

صدف آصف

(آسٹریلیا)

اکثر لوگ بڑے وثوق سے یہ بات کہتے ہیں کہ فون کال پر پروان چڑھنے والی محبتیں محض وقتی ہوتی ہیں۔ نہ ان میں گہرائی ہوتی ہے، نہ سچائی، اور نہ ہی وہ کسی خوشگوار انجام تک پہنچ پاتی ہیں۔ ایسے رشتوں کو محض وقت کا کھیل سمجھ کر نظر انداز کر دیا جاتا ہے۔

مگر زندگی ہر بار لوگوں کی کہی ہوئی باتوں پر نہیں چلتی۔ کچھ کہانیاں روایتوں کو جھٹلا دیتی ہیں، کچھ محبتیں تمام خدشات کے باوجود دلوں میں گھر کر لیتی ہیں۔ یہ وہ محبتیں ہوتی ہیں جو کسی منصوبے کے تحت نہیں، بلکہ قسمت کی ایک شرارتی سی مسکراہٹ کے ساتھ جنم لیتی ہیں۔

سمیع رانا اور مینا رانا کی محبت بھی کچھ ایسی ہی تھی......

ایک سادہ سی شروعات، ایک انجان سا تعلق، اور پھر آہستہ آہستہ دلوں کا جڑ جانا۔ نہ کوئی دعویٰ تھا، نہ کوئی وعدہ، بس باتوں میں سچائی تھی اور احساسوں میں خلوص۔ یہی وہ چیز تھی

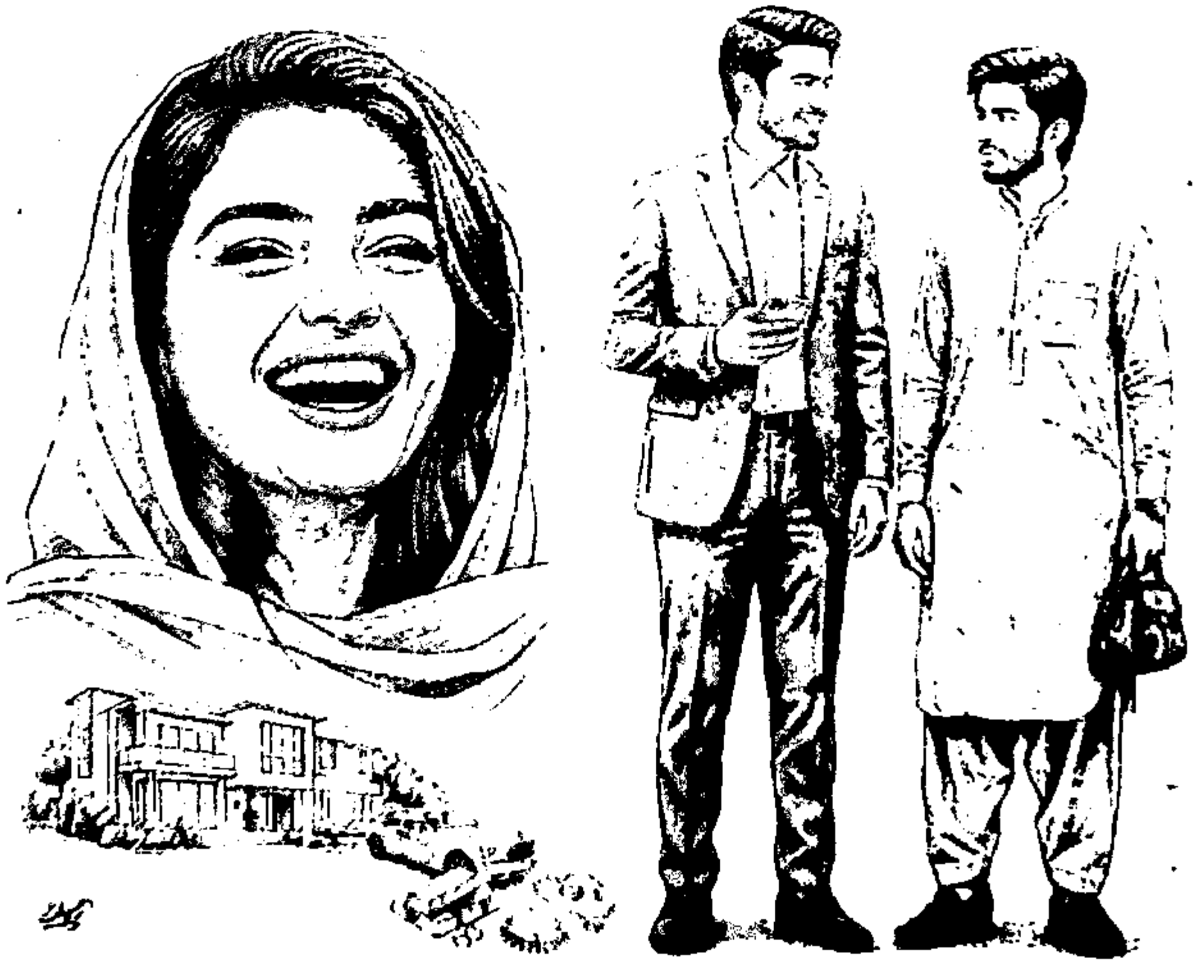

جس نے اس کہانی کو عام محبتوں سے جدا کر دیا، اور وقت نے ثابت کیا کہ ہر فون کال پر ہونے والی محبت فسانہ نہیں ہوتی، کچھ محبتیں واقعی زندگی بھر کا ساتھ بن جاتی ہیں۔

☆☆☆

اس زمانے کی بات ہے جب پکچر ہالوں کی رونقیں عروج پر ہوا کرتی تھیں اور کسی نئی فلم کا فرسٹ شو دیکھنا باقاعدہ ایک تہوار سمجھا جاتا تھا۔ شہر کے ہر سینما کے باہر لمبی قطاریں، ٹکٹ کے لیے بےچینی اور اندر داخل ہوتے ہی روشنیوں، شور اور خوشبوؤں کا عجیب سا امتزاج۔ سب کچھ کسی خواب کی طرح لگتا تھا۔

سمیع رانا بھی اسی خواب کا حصہ تھا۔

وہ ہال کی پچھلی قطار میں بیٹھا تھا، مگر اس کی موجودگی خود میں ایک الگ پہچان رکھتی تھی۔ لمبا قد، مضبوط جسم، صاف ستھرا لائٹ پنک شرٹ پر بلیو بیل باٹم اور چہرے پر سنجیدگی کی ہلکی سی پرچھائیں۔ آنکھوں میں عجیب سی ٹھہری ہوئی گہرائی تھی، جیسے وہ ہر منظر کو محض دیکھتا نہیں بلکہ سمجھنے کی کوشش بھی کرتا ہو۔ اس کی شخصیت میں شور نہیں تھا، مگر کشش ضرور تھی۔ وہ کشش جو خاموش لوگوں میں ہوا کرتی ہے۔

فلم شروع ہونے سے پہلے وہ حسبِ عادت پاپ کارن کے ڈبے میں الجھا ہوا تھا، مگر انداز کچھ ایسا تھا جیسے دانے نہیں بلکہ زندگی کے مسئلے سلجھا رہا ہو۔ کبھی ایک دانہ اٹھاتا، کبھی سوچ میں گم ہو جاتا، اور کبھی ہلکی سی مسکراہٹ اس کے ہونٹوں پر آ جاتی۔ یوں لگتا تھا جیسے وہ بھیڑ میں بیٹھا ہونے کے باوجود اپنے ہی خیالوں کی دنیا میں آباد ہو۔ زندگی میں اس نے سب کچھ کھویا تھا باپ گزر گیا، ماں کی جدوجہد بھری زندگی کا بار کم عمری میں ہی اپنے کاندھوں پہ اٹھالیا، تین چھوٹی بہنوں کی شادی کرنے کے بعد گھر پر نگاہ ڈالی تو گھر کے ساتھ دل بھی خالی خالی سا ہو گیا تھا۔ اس دن دوستوں کے کہنے پر دل بہلانے کے لیے فلم کا فرسٹ شو دیکھنے آ گیا۔

پر اسے خبر نہیں تھی کہ یہی فرسٹ شو، یہی پچھلی قطار اور یہی بے ضرر سا لمحہ اس کی زندگی کا رخ بدلنے والا ہے۔ قسمت اس وقت خاموش تماشائی بنی، اگلی قطار میں بیٹھے ایک چہرے کے ساتھ اس کی کہانی لکھنے میں مصروف تھی۔ کانوں میں سریلی سی گھنٹی بجی اور اس نے سر اٹھایا۔

☆☆☆

سمیع کی نظریں بے اختیار اگلی قطار کی طرف اٹھ گئیں۔

اور پھر جیسے وہیں ٹھہر گئیں۔

یوں لگا جیسے وقت نے ایک لمحے کو سانس روک لی ہو۔

نیلے رنگ کے سوٹ پر ہلکا گلابی دوپٹا اس کے کندھوں پر ایسے پڑا تھا جیسے کسی مصور نے سوچ سمجھ کر رنگ بھرا ہو۔ کھلے چہرے پر قدرتی سی شادابی، آنکھوں میں شوخی کی چمک اور ہونٹوں پر ایسی بے ساختہ ہنسی جو دلوں کے بند دروازے بھی کھول دے۔ وہ اپنی سہیلیوں کے درمیان تھی، مگر موجودگی ایسی تھی کہ نگاہیں خود بخود اسی پر جا ٹھہرتی تھیں۔ وہ سب سے الگ اور خوبصورت تھی۔

فلم کے ہر دلچسپ منظر پر وہ دل کھول کر تالیاں بجاتی، کبھی خوشی میں کھلکھلا اٹھتی کہ اردگرد بیٹھے لوگ چونک کر دیکھنے لگے۔ وہ ہنسی بناوٹ سے پاک، زندگی سے بھری ہوئی اور حد درجہ دلکش تھی۔ جیسے کسی طویل خاموشی کے بعد اچانک خوشی بولنے لگی ہو۔

سمیع کا دل بھی وہیں پلٹ گیا۔ ایک لمحے میں جیسے ساری سنجیدگی، سارا وقار اور ساری خودداری پاپ کارن کے ڈبے میں گر گئی۔

"مائی گاڈ...... یہ ہنسی نہیں، قسطوں میں جان لینے کا سامان ہے!" وہ دل ہی دل میں بڑبڑایا اور اسی لمحے مکمل طور پر لٹو ہو گیا۔

اسے ابھی یہ معلوم نہیں تھا کہ یہ صرف ایک نظر نہیں، بلکہ اس کی زندگی کی کہانی کا پہلا باب ہے۔ وہ باب جس میں اس نے خاموشی سے ہار مان لی اور دل، بنا اجازت کسی اجنبی کے نام ہو گیا تھا۔

☆☆☆

وحید مراد کی فلم "وعدہ" ختم ہوئی، پردہ گرا، لائٹس جل گئیں اور ہال آہستہ آہستہ خالی ہونے لگا مگر سمیع کا دماغ وہیں کا وہیں بند پڑا تھا۔ قدم باہر کی طرف بڑھ رہے تھے مگر خیال اگلی قطار میں اٹکا ہوا تھا۔ یوں لگتا تھا جیسے پوری فلم نہیں، بس ایک چہرہ دیکھنے آیا ہو۔

قسمت نے بھی شاید اس دن خاص موڈ بنا رکھا تھا۔ چند ہی دنوں بعد معلوم ہوا کہ مینا کی ایک سہیلی تزئین سمیع کے جاننے والوں میں سے ہے۔ ایک تقریب میں ملاقات ہوئی۔

یونہی میں جب باتوں باتوں میں ذکر چلا، تو نمبر مانگا گیا اور پھر ایک دن اچانک سمیع کے گھر کی فون کی گھنٹی بجی۔

"ہیلو؟" سمیع نے احتیاط سے کہا، جیسے ذرا سی بلند آواز پر کال کٹ جائے گی۔

دوسری طرف سے وہی ہنستی ہوئی آواز ابھری۔ "میں

مینا بول رہی ہوں...... فلم اچھی لگی تھی نا؟"
سمیع نے فون کان سے لگائے لگائے دل ہی دل میں دعا مانگی کہ یا اللہ، اگر یہ خواب ہے تو ابھی مت توڑنا۔ زبان نے جیسے ہڑتال کر دی تھی، چند لمحوں بعد بس اتنا ہی نکل سکا۔
"جی...... بہت!"
یوں باتوں کا سلسلہ چل نکلا۔ کبھی فلموں پر بحث ہونے لگتی۔ سمیع ہیرو کی اداکاری پر فدا، مینا ولن کو زیادہ حقیقی قرار دیتی۔ کبھی گانوں پر جھگڑا چھڑ جاتا، اور کبھی مینا کی بیساختہ ہنسی سمیع کو اچانک خاموش کر دیتی۔
"سیم...... آپ اچانک خاموش کیوں ہو جاتے ہیں؟" مینا شرارت سے پوچھتی۔
سمیع ذرا سنجیدگی سے جواب دیتا: "میں الفاظ بچا رہا ہوتا ہوں...... مینو ورنہ دل بول پڑتا ہے۔"
"اچھا مجھے لیٹ نائٹ بات کرنا پسند نہیں تو پلیز نو بجے کے بعد فون مت کریئے گا۔" اس نے جانے کیوں تاکید کی یا شاید اسے آزمانا چاہتی ہو۔
ادھر چند لمحوں کی خاموشی ہوئی، سمیع نے کچھ نہیں پوچھا، پھر مینا کی ہنسی فون کی دوسری طرف گونجی اور اگلے ہی لمحے ٹو ٹو کی آواز کے ساتھ کال بند۔
سمیع فون کو دیکھتا رہ جاتا اور مسکرا کر کہتا۔ "یہ لڑکی باتیں کم اور اپنا اثر زیادہ چھوڑ جاتی ہے......"
یوں شرارت، ہنسی اور ہلکی سی سنجیدگی کے بیچ ایک ایسا رشتہ جنم لینے لگا، جس کا نام اس وقت کسی نے نہیں رکھا تھا، مگر دل دونوں طرف پوری طرح شامل ہو چکے تھے۔
☆☆☆
ایک رات سمیع نے جانے کیوں ٹھیک دس بجے کال کی شاید اب کی بار وہ اسے آزمانا چاہتا تھا۔
وہی وقت، جس کے بارے میں پہلے ہی ہدایات جاری ہو چکی تھیں۔
مینا نے کال اٹھائی تو جیسے رات بھی ٹھہر گئی۔
باتوں کا سلسلہ شروع ہوا تو پھر رکنے کا نام نہ لیا۔ کبھی ہنسی، کبھی سنجیدگی، کبھی کسی پرانی فلم کا ذکر اور کبھی آنے والے کل پر ہلکی سی خاموش سوچ۔ گھڑی کی سوئیاں خاموشی سے آگے بڑھتی رہیں، یہاں تک کہ ساڑھے گیارہ بج گئے۔
"اوہو! سیم میں نے آپ کو سونے نہیں دیا!" مینا نے ذرا گھبرا کر کہا، جیسے اپنا ہی بڑا اصول توڑنے پر نالاں ہو۔
"نہیں......" سمیع کی بھاری اور ٹھہری ہوئی آواز ابھری۔
"آج نیند کو چھٹی دے دی ہے مینو۔"
یہ جملہ سن کر مینا کے لبوں پر انجانی سی مسکراہٹ آگئی۔
وہ کچھ نہ بولی، مگر دل کچھ اور سننے کا خواہاں تھا۔
☆☆☆
اس رات کے بعد دن میں ایک نہیں، دو نہیں بلکہ تین تین کالز ہونے لگیں۔ سمیع اکثر باتوں کے بیچ اچانک کوئی غزل گنگنانے لگتا۔ آواز میں ایسی گہرائی ہوتی کہ لفظوں کی کمی محسوس نہ ہوتی۔ مینا کو گانوں سے خاص رغبت نہ تھی، مگر وہ خاموشی سے سنتی رہتی۔ شاید دھن نہیں، جذبہ دل کو چھو رہا تھا۔
پھر ایک دن سمیع نے پہلی بار نظم "فون کال" کہی۔
بغیر کسی تمہید کے، فون پر ہی گنگنا دی۔
فون کے اس پار خاموشی چھا گئی۔
ایسی خاموشی جو بے رخی نہیں، گہرے احساس کی علامت ہوتی ہے۔
کچھ لمحوں بعد مینا کی آواز آئی، دھیمی مگر صاف۔ "سنیں سمیع جی...... مجھے لگتا ہے میں آپ سے محبت کرنے لگی ہوں۔"
"مجھے تو شروع سے ایسا محسوس ہوتا ہے مینا جی۔" وہ تھوڑا شوخ ہوا۔
"مگر ایک بات واضح کر دوں...... ہم کبھی ایک نہیں ہو سکیں گے۔"
یہ کہتے ہوئے اس کی آواز میں خوف بھی تھا اور سچائی بھی۔
سمیع نے کوئی بحث نہ کی، کوئی سوال نہ اٹھایا۔ مگر دل کو دھچکا ضرور لگا تھا۔
اسی لمحے، بغیر کسی وعدے اور بغیر کسی یقین دہانی کے، دونوں نے اپنی محبت کا اعتراف کر لیا۔
ایک ایسی محبت، جو شرطوں سے مشروط ہونے کے باوجود مکمل تھی۔
☆☆☆
یوں وقت آہستہ آہستہ آگے بڑھتا رہا۔
دن مہینوں میں اور مہینے پورے دو برس میں بدل گیا۔
اس دوران کچھ ملاقاتیں بھی ہوئیں، کبھی خاموش سی چائے کے کپ پر، کبھی کسی ہجوم والی جگہ میں، اور کبھی چند لمحوں کی مختصر سی مسکراہٹ کے ساتھ۔ اور کبھی کوئی نئی فلم دیکھتے ہوئے مگران سب ملاقاتوں میں ایک بات مشترک تھی۔ انہیں کسی بات کی

جلدی نہیں تھی، نہ ہی ان پر محبت کا کوئی دباؤ تھا۔
فیصلہ دونوں کا تھا کہ اس رشتے کو شادی کے بندھن میں نہیں باندھیں گے۔ بس دوستوں کی طرح کملڈ رہیں گے، ایک دوسرے کے ساتھ مگر بغیر کسی حتمی انجام کے وعدے کے۔
سمیع اس فیصلے کو سمجھتا تھا، اس پر سوال نہیں اٹھاتا تھا۔
وجہ بھی کمزور نہیں تھی۔ سمیع کو تزئین سے پتا چلا تھا کہ مینا کی پہلی منگنی بری طرح سے ناکام ہوئی تھی۔
وہ رشتہ جو امید بن کر آیا تھا، ادھورا چھوڑ کر چلا گیا تھا۔ اس ٹوٹنے نے مینا کے دل میں ایک مستقل سا ڈر بسا دیا تھا۔ نیا رشتہ بنانے کا خیال ہی اسے بے چین کر دیتا۔
اس کا سابق منگیتر اور دور کا کزن فیصل نجیب اپنی کولیگ سمعیہ کو ٹوٹ کر چاہتا تھا مگر گھر والوں کے دباؤ میں آ کر اس نے مجبوراً مینا سے منگنی کر تو لی تھی مگر دل سے یہ رشتہ قبول نہیں کر سکا تھا۔ مینا کے گھر والوں کو کچھ خبر نہ ہوئی شادی کی تیاریاں شروع ہو گئیں اور شادی کے کارڈ تک بٹ گئے۔
فیصل نے سمعیہ کے مجبور کرنے پر گھر والوں سے چھپ کر اپنی محبت سے شادی کر لی اور گھر چھوڑ کر چلا گیا۔
فیصل کے گھر والوں نے بھانڈا پھوٹنے پر سارا الزام مینا پر ڈال دیا کہ اس کا کردار ٹھیک نہیں ہے اور ان کا بیٹا اسی لیے یہ شادی نہیں کرنا چاہتا ہے اور ان کی باتوں نے مینا کو پورے شہر میں بدنام کر دیا تھا، خاندان میں الگ مینا کی فیملی پر تھو تھو ہوئی۔
ان سب کے لیے یہ حادثہ نہیں بلکہ سانحہ تھا مگر مینا بہت ہمت والی لڑکی نکلی اس نے ہنسی کے نقاب میں اپنا غم چھپا لیا اور دوبارہ پڑھائی شروع کرتے ہوئے حالات کا ڈٹ کر مقابلہ کیا یہاں تک کہ سچ نے اپنا راستہ ایک دن ڈھونڈ ہی لیا۔ فیصل نے ایک خاندانی تقریب میں ان کے کردار کی تعریف کرتے ہوئے اصل بات کا اعتراف کر ہی لیا۔
اور اب اسے خوف تھا۔
''کہیں پھر سب ٹوٹ نہ جائے......''
یہ جملہ وہ اکثر کہہ نہیں پاتی تھی، مگر ہر خاموشی میں محسوس کیا جا سکتا تھا۔
اور سمیع، وہ اس خوف کو دیکھتا، سمجھتا اور بغیر کسی شکوے کے اسے سہارا دیتا رہا۔ کیونکہ بعض محبتیں وعدوں سے نہیں، صبر سے زندہ رہتی ہیں۔

☆☆☆

ادھر سمیع کی ماں، نوشابہ خاتون، کو جب بیٹے کی طویل لو اسٹوری کا علم ہوا تو انہوں نے حسب روایت معاملہ سنجیدگی سے لینے میں ایک لمحہ بھی ضائع نہ کیا۔ بیٹیوں کو فوراً بلا لیا گیا، کمرے میں مشورہ ہوا اور چند ہی لمحوں میں سب نے متفقہ فیصلہ سنا دیا۔
''جب محبت کی کہانی اتنے دنوں سے چل رہی ہے تو اب اس کا انجام بھی جلد ہو جانا چاہیے!''
جوش اور خوشی کے عالم میں بیٹے سے باقاعدہ پوچھنے کی زحمت بھی نہ کی گئی۔ سیدھی مینا کی ماں کو کال ملائی گئی اور بڑے اعتماد کے ساتھ رشتے کا عندیہ دے دیا گیا، جیسے سب کچھ پہلے ہی طے شدہ ہو۔
ادھر جب مینا کو اس پیش رفت کا علم ہوا تو اس کے دل میں جیسے ہلچل مچ گئی۔ اس نے اپنی ماں کے سامنے دوٹوک انداز میں کہہ دیا
''یہ شادی دو دن بھی نہیں چلے گی۔ ہمارے خیالات میں زمین آسمان کا فرق ہے۔ میں شادی نہیں کرنا چاہتی!'' یہ کہتے ہوئے اس کی آواز میں ضد نہیں، خوف بول رہا تھا۔ وہی پرانا ڈر، وہی ٹوٹنے کا خدشہ۔
غصے اور دل کی الجھن میں اس نے سمیع سے بات چیت بند کر دی۔ دل میں ایک ہی سوال گردش کر رہا تھا۔
اس نے مجھ سے پوچھے بغیر یہ سب کیسے ہونے دیا؟
ادھر سمیع حیرت کے عالم میں گم تھا۔ اسے سمجھ ہی نہیں آ رہا تھا کہ چند گھنٹوں میں سب کچھ کیسے بدل گیا۔ کل تک جس رشتے میں سکون تھا، آج وہاں خاموشی اور فاصلے کیوں آن کھڑے ہوئے تھے۔ وہ پہلی بار اپنی محبت کو یوں پھسلتا ہوا محسوس کر رہا تھا، جیسے ریت مٹھی سے آہستہ آہستہ سرک رہی ہو۔

☆☆☆

ادھر مینا کے گھر کا ماحول دن بہ دن گمبھیر ہوتا جا رہا تھا۔ ماں کی پریشانی بھی اپنی جگہ درست تھی، چھوٹی بہنوں کی شادیاں کرنی تھیں، اور معاشرے میں بڑے فیصلے اکثر ایک دوسرے سے جڑ جاتے ہیں۔ باتیں اشاروں میں شروع ہوئیں، پھر صاف لفظوں میں بدل گئیں۔ دباؤ بڑھتا گیا اور مینا خاموشی سے سب سنتی رہی۔
ویسے بھی فیصل نے اس کی بے گناہی کی گواہی ایک چھوٹی سی خاندانی تقریب میں دے دی تھی مگر بدنامی کا سایہ پورے زمانے میں پھیلا ہوا تھا اسی لیے مینا کی ماں یہ موقع ہاتھ سے کھونے نہیں دینا چاہتی تھی۔

سمیع کی چاہت مینا کے دل کے کسی کونے سے مسلسل پکار رہی تھی۔ چند دنوں سے اس سے بات نہیں ہو پا رہی تھی تو دل بجھ گیا تھا اور وہ اس کے بغیر زندگی گزارنے کا سوچ رہی تھی۔

وہ یہ بھی جانتی تھی کہ سمیع ہر لحاظ سے مکمل تھا۔ کردار، سنجیدگی، خلوص......کوئی کمی نہ تھی۔ اسی لیے یہ رشتہ اسے خوشی بھی دیتا تھا، مگر ڈر اس خوشی پر بھاری پڑ جاتا تھا۔ وہ شادی سے نہیں، ٹوٹنے سے ڈرتی تھی مگر ان دونوں کے بیچ آئے فاصلہ نے انہیں بہت کچھ سکھا دیا تھا۔

ماں کے بار بار اصرار پر آخر کار مینا نے ایک شرط رکھ دی۔ لہجہ پُرسکون تھا، مگر فیصلہ مضبوط۔

''میں شادی کی بات سمیع کے منہ سے سننا چاہتی ہوں۔''

یہ شرط دراصل ضد نہیں تھی، یقین کی طلب تھی۔ وہ چاہتی تھی کہ فیصلہ کسی مجبوری یا خاندانی دباؤ کا نتیجہ نہ ہو، بلکہ سمیع کے اپنے دل کی آواز ہو۔ وہی آواز جس نے کبھی فون کے اُس پار اس کا ہاتھ تھام رکھا تھا۔

☆☆☆

چاندنی رات کی خاموشی میں، جب شہر کی ہلکی ہلکی روشنی کھڑکیوں سے جھانک رہی تھی، سمیع نے دل کی دھڑکن سنبھالتے ہوئے فون اٹھایا۔

آواز میں معمول کی ہلکی ہچکچاہٹ نہیں، بلکہ سنجیدگی اور پختگی کی مٹھاس تھی، جیسے ہر لفظ دل سے نکل رہا ہو۔ ''میں...... میں تم سے شادی کرنا چاہتا ہوں مینو۔ کیا تم کرو گی؟'' فون کی دوسری طرف کچھ لمحے کی خاموشی چھا گئی۔

مینا کے دل کی دھڑکنیں بھی جیسے رُک گئیں، آنکھیں بند ہوگئیں، اور دل نے ایک ہی سانس میں ہر خوف اور شکوک کو پیچھے چھوڑ دیا۔

پھر دھیمی مگر پختہ آواز میں اس نے کہا۔ ''ہاں...... کروں گی۔ کیوں نہیں۔''

یہ لمحہ، یہ جملہ، صرف ایک رشتے کا آغاز نہیں تھا۔ یہ دو دلوں کا میل، دو روحوں کا اتفاق اور تمام خوف و ہچکچاہٹ کا خاتمہ تھا۔

فون کے اس پار سمیع نے جیسے پہلی بار پوری دنیا پالی ہو، اور مینا نے محسوس کیا کہ وہ لمحہ صرف ان کا ہے۔ دنیا کی ہر ہلچل اور ہر دباؤ کے باوجود، محبت نے اپنے رنگ دکھا دیے تھے۔

یہ وہ رومان تھا جو کسی فلم یا شاعری میں نہیں، بلکہ حقیقت میں زندگی کے ہر سانس کے ساتھ جیتا جا رہا تھا۔

☆☆☆

دونوں کی شادی ایک شاندار اور عظیم الشان تقریب میں ہوئی، جس میں ہر خوشی، ہر مسکراہٹ اور ہر آنکھ میں آنسو شامل تھے۔

وہی لوگ موجود تھے جو کبھی ہنس کر کہتے تھے۔ ''فون پر ہونے والی محبتیں کہاں چلتی ہیں!''

مینا نے ماں سے طنز بھرے لہجے میں کہا تھا۔ ''یہ شادی دو دن بھی نہیں چلے گی۔''

مگر آج...... پانچ سال سے زیادہ گزر چکے ہیں، اور یہ رشتہ ہر گزرتے دن کے ساتھ پہلے سے کہیں زیادہ مضبوط ہو چکا ہے۔

وجہ سادہ مگر گہری تھی۔

سمیع نے مینا کے دل سے پچھلی منگنی کے ٹوٹنے کا خوف نکال دیا۔ اس کے کردار پر پڑنے چھینٹوں کو اپنی محبت سے دھو دیا تھا وہ خوف جو کبھی راتوں کو نیند چھین لیتا تھا، آج صرف یاد رہ گیا۔ وہ بڑے خاندان کی معزز بہو بن کر شہر بھر میں سر اٹھا کر چلتی تھی۔

اور مینا نے سمیع کو صرف شوہر نہیں بنایا، بلکہ دوست، ہم سفر اور زندگی کا سب سے بھروسے مند حصہ بھی بنایا۔

وہ محبت جو فون کال پر شروع ہوئی شادی کے بعد محض رواج یا رسم کی پابند نہیں رہی، بلکہ محبت، احترام، دوستی اور اعتبار کی بنیاد پر قائم رہی۔

اور آج بھی، جب مینا فلم دیکھتے ہوئے دل کھول کر تالیاں بجاتی تو سمیع مسکرا کر کہتا۔

''میں نے تو پہلی قطار میں بیٹھ کر صرف فلم نہیں دیکھی تھی...... بلکہ اپنی پوری زندگی دیکھ لی تھی۔''

یہ لمحہ نہ صرف ایک یادگار منظر ہے بلکہ اس محبت کی زندہ مثال ہے، جو وقت اور حالات کے سامنے کبھی کمزور نہیں پڑی۔

آج بھی جب وہ ساتھ چلتے ہیں، ہنس دیتے ہیں یا تالیاں بجاتے ہیں، ہر لمحہ ان کی پہلی ملاقات اور پہلی ہنسی کی یاد تازہ کر دیتا ہے۔ یہ کہانی یاد دلاتی ہے کہ سچی محبت کبھی ختم نہیں ہوتی، بلکہ وقت کے ساتھ اور بھی مضبوط ہوتی جاتی ہے۔

ان کی محبت کی کہانی ہمیں بتاتی ہے کہ کبھی کبھی زندگی کی سب سے خوبصورت فلم دل کی پہلی قطار سے شروع ہوتی ہیں۔

++

آج میں شام سے ہی بڑی اداس تھی طبیعت میں ایک الجھاؤ سا محسوس کر رہی تھی۔ میں نے اپنا بیگ کندھے پر ڈالا اور پارلر کی ورکر لڑکیوں کو ہدایت دے کر گاڑی میں آ بیٹھی۔ دینو بابا جو کہ میرا ڈرائیور تھا اس نے حیران ہو کر میری طرف دیکھا پھر بولا۔ ”بی بی جی ابھی تو چھ بھی نہیں بجے۔“

”ہاں بابا آج میری طبیعت ٹھیک نہیں۔“

بابا نے کہا۔ ”اچھا۔“ اور گاڑی اسٹارٹ کر دی۔

میں اس وقت بھی خیالوں کی دنیا میں کھوئی ہوئی تھی کہ اچانک زور سے بریک لگنے کی وجہ سے خیالوں کا سلسلہ منقطع ہو گیا۔ میں نے گھبرا کر بابا کی طرف دیکھا۔ بابا نے کہا بیٹا آج کل کے نوجوان پتا نہیں کیسی گاڑیاں چلاتے ہیں اگر اس وقت میں بریک کنٹرول نہیں کرتا تو پتا نہیں کیا ہو جاتا۔ بالکل اوورٹیک کرتا ہوا سامنے آ گیا تھا۔

میں نے بابا کی بات کا کوئی جواب نہیں دیا۔

تھوڑی دیر کے بعد میں نے بابا سے کہا۔ ”گھر جانے کے بجائے گاڑی اولڈ کلفٹن کی طرف موڑ لیں۔“

جھوٹا حلف

محترم مدیر

السلام علیکم!

یہ میری آپ بیتی ہے۔ اس میں صرف اپنا اور اپنے شوہر کا نام تبدیل کیا ہے۔ باقی سب سچ ہے۔ میری آپ بیتی سے آپ کو احساس ہو جائے گا کہ جو لوگ جھوٹا حلف اٹھاتے ہیں ان کی زندگی کس قدر تلخ ہو جاتی ہے۔

نسرین

(کراچی)

انسائیکلوپیڈیا (Encyclopaedia)

یونانی لفظ۔ اس سے مراد ایسی کتاب ہے جو ابجدی ترتیب کے علاوہ موضوع وار بھی دنیا بھر کی مختلف اشیا اور علوم وفنون کے متعلق مفصل معلومات بہم پہنچاتی ہے۔ اردو میں اسے دائرہ معارف کہتے ہیں۔ دنیا کی پہلی انسائیکلوپیڈیا، ارسطو کے عہد میں، یونانی علماء نے مرتب کرنے کی کوشش کی تھی۔ دسویں صدی عیسوی کے آخر میں۔ عرب دانشوروں نے جن کا نام اخوان الصفا تھا اسے عملی شکل دی۔ اس انسائیکلوپیڈیا کی 52 جلدیں یا رسائل تھے۔ خرد دشمنی کے اس دور میں تنگ نظر مذہبی علماء ان دانشوروں کی یہ جسارت برداشت نہ کر سکے اور ان کے حکم پر اس بیش بہا مخزن علوم وفنون بغداد میں برسرعام جلا دیا گیا۔ اٹھارویں صدی کے وسط میں چند فرانسیسی اہل علم نے ایک انسائیکلوپیڈیا مدون کی لیکن تنگ نظر مذہبی رہنماؤں کے ہاتھوں اس کا بھی حشر ہوا جو اخوان الصفا کے انسائیکلوپیڈیا کا ہوا تھا۔ دنیا کی پہلی انسائیکلوپیڈیا جو جدید سائنسی بنیادوں پر مرتب کی گئی انسائیکلوپیڈیا بریٹینکا (Encyclopaedia Britanica) ہے۔ انگلستان 1767ء میں تجربہ کار ایڈیٹروں کی ایک جماعت بنائی گئی جس نے تین سال کے عرصے میں یہ انسائیکلوپیڈیا تالیف کی۔ یہ انگریزی کے تمام انسائیکلوپیڈیاؤں سے زیادہ مستند اور معلومات افزا سمجھی جاتی ہے اور معلومات کا تقریباً پورا ذخیرہ اس میں قلمبند ہے۔ اردو کی پہلی انسائیکلوپیڈیا 1962ء میں شائع ہوئی۔ جسے فیروزسنز نے شائع کیا تھا۔ اس کا دوسرا ایڈیشن 1967ء، تیسرا 1984ء اور چوتھا 2004ء میں شائع ہوا۔ ازاں بعد جامعہ پنجاب نے اردو دائرہ معارف اسلامیہ کے نام پر 88-1987ء میں 23 جلدوں پر مشتمل انسائیکلوپیڈیا شائع کی۔ اسے یکبارگی شائع نہیں کیا گیا۔ اسی اثناء میں شیخ غلام علی اینڈ سنز لاہور نے اردو جامع انسائیکلوپیڈیا زاہد حسین انجم کی نظر ثانی اور اضافوں کے بعد 1988ء میں شائع کی۔ یہ دو جلدوں میں ہے۔ سید قاسم محمود نے شاہکار اسلامی

''اچھا بیٹی۔'' بابا نے کہا۔

تھوڑی دیر کے بعد گاڑی اولڈ کلفٹن پر پہنچ چکی تھی۔ میں گاڑی سے اتر کر سیدھا اسی جگہ پر گئی جہاں میں اکثر آ کر گھنٹوں بیٹھی رہتی تھی۔ آج بھی میرا یہی ارادہ تھا۔ میں پتھر کی بنی ہوئی اونچی سی بینچ پر بیٹھ گئی۔ دور دور اکا دکا جوڑے اپنے بچوں کے ساتھ ٹہل رہے تھے۔ مگر میں اپنی سوچوں میں گم بیٹھی ہوئی تھی۔

یہ وہ جگہ تھی جہاں میں اپنے شوہر خالد کے ساتھ اکثر آتی تھی اور اپنی بے بسی و پریشانیاں دونوں ایک دوسرے سے کہتے تھے آج پھر مجھے خالد شدت سے یاد آ رہا تھا مگر میں اسے کیوں یاد کر رہی ہوں؟ ان آٹھ سالوں میں اس نے کبھی مجھ سے وفا نہیں کی پھر وہ کیوں اتنا یاد آتا ہے؟

خالد سے میری شادی 1982ء میں ہوئی تھی۔ شادی کے ایک مہینے کے بعد ہی ساس اور نندوں نے اپنا روایتی رویّہ اختیار کر لیا تھا بلکہ اس سے بھی کہیں زیادہ۔

جب شادی کر کے لائی تھیں تو بڑی چاہت کا اظہار کیا کہ ہمارا ایک ہی بھائی ہے، ایک ہی بیٹا ہے۔

خالد اپنی ماں کا ایک ہی بیٹا تھا اور چاروں بہنوں سے چھوٹا تھا۔ بھائی کے اوپر چاروں بہنوں کا راج تھا بلکہ یوں کہنا چاہیے کہ وہ Under Pressure تھا۔ ہر کوئی اس سے اپنی بات منواتا۔ چاروں بہنوں کی شادی ہو چکی تھی مگر بھائی پر Dominate تھیں۔

خالد کو مجھ سے دور رکھنے کے لیے بہانے بناتیں، کبھی کوئی بہن اپنے گھر بلا لیتی کبھی کوئی۔ ماں کی ہدایت پر عمل کرتے ہوئے میرے خلاف کان بھی بھرتی رہتیں۔ جھوٹی شکایتیں لگاتیں جن کی وجہ سے میرے اور خالد کے درمیان کشیدگی بڑھنے لگی۔ اپنی ماں اور بہنوں کی باتوں کو وہ سچ مانتا اور میری ہر بات کو جھٹلاتا۔ کبھی کبھار تو وہ حد سے بڑھ جاتا، اپنے ماں باپ اور بہنوں کا فیور کرتا۔

میری ماں کے انتقال کو 15 سال کا عرصہ ہو چکا تھا۔ ہم بھی چار بہنیں تھیں، میں سب سے چھوٹی تھی اور گھر والوں کی لاڈلی تھی۔ تینوں بہنوں کی شادی ہو چکی تھی۔ اللہ کے فضل سے وہ اپنے گھر میں خوش تھیں۔

میں جب بھی اپنے گھر جاتی خالد کی ماں مجھ سے رقم کا مطالبہ کرتی کیونکہ میرے سسرال والے لالچی ثابت ہوئے تھے۔ وہ وقفے وقفے سے رقم منگواتے تھے اور میں ان کی ضروریات کو کسی حد تک پورا کرتی رہتی تھی کیونکہ میرے والد ایک بڑے لینڈ لارڈ تھے۔ انہوں نے اپنی سب بیٹیوں کے نام

انسائیکلو پیڈیا کے نام سے انسائیکلو پیڈیا شائع کی۔ 1991ء میں مقبول اکیڈمی نے انسائیکلو پیڈیا قائداعظم مرتبہ زاہد حسین انجم طبع کی۔ اکادمی ادبیات پاکستان نے پاکستان کی پچاسویں سالگرہ کے حوالے سے ایک ضخیم انسائیکلو پیڈیا شائع کرنے کا پروگرام بنایا ہے۔ اسی طرح سندھی ادبی بورڈ نے 1996ء میں انسائیکلو پیڈیا کی اشاعت کا اعلان کیا۔ 1996ء میں چینی زبان میں پہلی اسلامی انسائیکلو پیڈیا بیجنگ سے شائع ہوئی۔ یہ انسائیکلو پیڈیا 80 مسلم دانشوروں کی چھ سالہ محنت شاقہ کا نتیجہ ہے۔ اس میں تین سو سے زائد موضوعات کا احاطہ کیا گیا ہے اور اسے اٹھارہ حصوں میں تقسیم کیا گیا ہے۔ انسائیکلو پیڈیا میں اہم اسلامی تاریخی واقعات پر مشتمل ایک ضمیمہ بھی شامل ہے۔ 1997ء میں سید قاسم محمود نے پاکستانیکا شائع کی۔ چیمبرز، ہچنسن نیو ٹوئنٹیتھ سنچری، کولمبیا اور کامپٹن مشہور یک جلدی انسائیکلو پیڈیا بھی اشاعت پذیر ہو چکی ہیں۔ امریکانا، برٹینکا انسائیکلو پیڈیا کے بعد دوسری بڑی انسائیکلو پیڈیا ہے۔ عربی زبان میں پہلی عالمی انسائیکلو پیڈیا الموسوعہ العربیہ العالمیہ شائع ہوئی یہ تیس جلدوں اور 162200 صفحات پر مشتمل ہے۔ یہ انسائیکلو پیڈیا ایک لاکھ بیس ہزار عنوانات اور ایک جامع عربی انگریزی لغت 18000 تصاویر پر محیط ہے۔ انسائیکلو پیڈیا کی تیاری میں ایک ہزار کے لگ بھگ اہل قلم و دانش نے حصہ لیا اور یہ سات سال میں مکمل ہوئی۔ انسائیکلو پیڈیا میں پانچ ہزار کے لگ بھگ اہم شخصیات کی سوانح شامل کی گئی ہیں۔ 1997ء ہی میں حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی سیرت مبارک پر بارہ جلدوں پر محیط عربی زبان میں انسائیکلو پیڈیا طبع ہوئی۔ انسائیکلو پیڈیا کو چالیس دانشوروں نے سات سال کی شبانہ روز محنت سے مدون ہوئی۔ یہ انسائیکلو پیڈیا چھ ہزار صفحات اور 360 عنادین پر مشتمل ہے۔ اس کی تیاری پر 20 لاکھ ڈالر لاگت آئی۔ اس کے اردو، فرانسیسی، انگریزی، ترکی، فارسی اور دیگر زبانوں میں تراجم تیار کرانے اور اسے انگریزی میں انٹرنیٹ پر لانے کا منصوبہ بھی بنایا ہے۔

مرسلہ: زاہد شیخ۔ چنیوٹ

جائیداد تقسیم کی ہوئی تھی۔ اس کے اکاؤنٹ میں ہر ماہ کافی رقم جمع ہوتی تھی۔ اس طرح میں اپنے ذاتی اکاؤنٹ سے رقم نکال کر اپنے سسرال والوں کا منہ بھرتی تھی۔ ان کی خواہشات پوری کرتی رہتی تھی لیکن جب سے میری ازدواجی زندگی میں سسرال والے زہر بھرنے لگے، خالد بھی ہر وقت کھنچا کھنچا رہتا۔ رات کو بھی ساس صاحبہ خالد کو دودھ کا گلاس پلا کر سلا دیتی وہ جب تک سو نہ جاتا ساس صاحبہ کمرے سے نہ جاتیں۔ خالد کے جاگتے ہوئے میں اس کمرے کا دروازہ بند نہیں کر سکتی تھی۔ یہ ساس کا حکم تھا۔ اس طرح Privacy بالکل ختم ہو گئی تھی اور دوسری طرف وہ بیوی کے حقوق بھی ادا نہیں کر سکتا تھا۔

وہ جمعہ کا دن تھا۔ خالد کو نماز کے لیے جانا تھا۔ میں نے جلدی جلدی کھانا چڑھا کر کپڑے استری کر کے لٹکائے اور خالد کو اطلاع دینے ڈرائنگ روم میں چلی گئی۔ کمرے کا دروازہ بند تھا۔ میں واپس آ گئی۔ تھوڑی دیر کے بعد خالد خود ہی بیڈ روم میں آئے۔ کپڑے تبدیل کیے اور نماز پڑھنے جانے لگے۔ میں باورچی خانے میں روٹی پکا رہی تھی۔ میں نے دیکھا کہ خالد کی ماں خالد کا ہاتھ پکڑ کر ڈرائنگ روم میں لے گئی اور دروازہ بند کر لیا۔ میں روٹیاں پکا کر اپنے سسر کو کھانا دینے گئی پھر نماز سے فارغ ہوئی تو میں نے وقت دیکھا ساڑھے تین بجے تھے اور خالد کی چپلیں ڈرائنگ روم کے باہر اسی طرح پڑی تھیں۔ میرے دل میں عجیب شک و شبہات ابھرے کیونکہ ساس کے تیور صحیح نہیں تھے۔ میں نے ہمت کر کے ڈرائنگ روم کی کھڑکی سے اندر جھانکا تو قالین پر ساس صاحبہ صوفے سے ٹیک لگائے بیٹھی تھیں اور ان کی گود میں خالد کا سر تھا اور وہ آہستہ آہستہ اس سے باتیں کر رہی تھیں۔ ان کی انگلیاں مسلسل خالد کے بالوں میں چل رہی تھیں۔ یہ منظر دیکھ کر میں گھبرا گئی۔ میں نے دل میں سوچا، آج کوئی نیا تماشا ہوگا۔ میں اپنے کمرے میں آ گئی اور بستر درست کرنے لگی۔

اتنے میں ساس کی آواز آئی۔ ''آج کھانا نہیں ملے گا کیا؟''

میں گھبرائی ہوئی باہر گئی اور کہنے لگی۔ ''امی جان خالد کا انتظار ہے۔ وہ نماز پڑھ کر آ جائیں تو کھانا لگاتی ہوں۔''

میں نے جان بوجھ کر جھوٹ بولا تا کہ انہیں خبر نہ ہو کہ میں یہ سب کچھ دیکھ چکی ہوں۔

میں کھانا نکالنے باورچی خانے میں چلی گئی۔ خالد ڈرائنگ روم سے نکل کر سیدھے بیڈ روم میں گئے اور بیڈ پر لیٹ گئے۔ ان کا چہرہ اترا ہوا تھا۔ وہ پریشان دکھائی دے رہے تھے۔ میں نے کھانا ٹیبل پر لگا کر بیڈ روم میں جا کر آہستہ سے کہا۔

"خالد کھانا کھالو۔ نماز پڑھ کر کب آئے؟"

خالد نے غلط بیانی کی۔ "ابھی آیا ہوں۔ مجھے بھوک نہیں ہے۔ تم لوگ کھالو۔"

میں نے کہا۔ "اگر آپ کو بھوک نہیں ہے تو میں بھی نہیں کھاؤں گی۔"

ساس کی کرخت آواز سماعت سے ٹکرائی۔ "شوہر سے بجائے اس کی پریشانی اور نہ کھانے کی وجہ پوچھنے کے الٹا اس سے کہہ رہی ہے میں بھی نہیں کھاؤں گی۔ خود تو پیٹ بھر کے ناشتا کرتی ہے اب اس غریب کا ہی خیال کر جو ہفتہ میں ایک دن کے لیے گھر آتا ہے۔"

خالد کی ڈیوٹی حب ڈیم پر تھی۔ وہ جمعرات کی شام کو آتے اور ہفتہ کی صبح سات بجے چلے جاتے۔ کیونکہ ان دنوں جمعہ کی تعطیل ہوتی تھی۔

میں نے حیران ہو کر ساس کی طرف دیکھا جو اتنا بڑا سفید جھوٹ بول رہی تھی کیونکہ میں ناشتا کرتی ہی نہیں تھی بلکہ کرنے کا موقع ہی نہیں ملتا تھا۔ سارا وقت میں اپنے ساس سسر کی خدمت میں گزار کر جب رات کے گیارہ بارہ بجے سونے لیٹتی تو تھک کر بھی مجھے گھنٹوں نیند نہ آتی۔ Sleeping Pulles کھا کر سوتی کیونکہ مجھے سویرے اٹھنا ہوتا تھا۔ کس قدر مجبور اور بے بس تھی۔ خالد مجھے اپنی مرضی یا خواہش سے حب ڈیم پر نہیں لے جاسکتے تھے۔ چند دنوں کے لیے بھی ساس کی اجازت نہیں تھی۔ رو رو کر سارا گھر سر پر اٹھا لیتی تھی۔ بہنوں سے شکایت کی جاتی وہ سب کی سب میری خوب کھنچائی کرتیں۔

اس دن بھی ایسا ہی ہوا تو میں نے حیران ہو کر خالد کی طرف دیکھا تو بجائے خالد میرا فیور کرنے کے اپنی ماں کی ناجائز بات کی حمایت کرنے لگا۔ اس پر مجھے غصہ آگیا۔ آخر برداشت کی حد ہوتی ہے میں اس کی بیوی تھی میرے لیے ناشائستہ زبان استعمال ہو رہی تھی۔ خالد مجھے برا بھلا کہتا رہا اور میں روتی رہی۔ وہ بار بار اپنی ماں کے الفاظ دہرا رہا تھا کہ تم اپنے باپ سے ایک لاکھ روپے لا کر دو مجھے کاروبار کرنا ہے۔ نہیں تو میں تم کو تمہارے باپ کے گھر کبھی نہیں جانے دوں گا۔

میں غصے میں آکر فوراً بولی۔ "تمہاری اس ناجائز خواہش کو کبھی پورا نہیں کروں گی۔"

خالد تلملاتا ہوا باہر گیا اور تھوڑی دیر بعد اس کی بہن جو اس کے گھر سے تھوڑے فاصلے پر رہتی تھی اسے لے کر آگیا۔ خالد، اس کی بہن اور ماں نے مجھے بہت برا کہا۔ گالیاں دیں۔ میری مردہ ماں کو گالیاں دیں۔ باپ کو بہنوں کو سب کو برے الفاظ سے پکارا اور پھر آخر میں اپنی ماں اور بہنوں کے کہنے میں آکر وہ مجھے اپنے بہنوئی کی سوزوکی کار میں بیٹھا کر والد کے گھر چھوڑ گیا۔

ابو نے میرے چہرے کی اداسی کی لکیروں کو پڑھ لیا۔ مگر منہ سے کچھ نہ پوچھا۔ میں خاموشی سے اپنے کمرے میں چلی گئی۔ عشاء کی نماز پڑھ کر میں اپنے کمرے سے باہر آئی تو ابو کو اپنا منتظر پایا۔

وہ بڑی دیر سے میرا انتظار کر رہے تھے۔ بڑی بی نے کھانا لگادیا تھا۔ ابو نے اپنے پیار بھرے انداز میں میری پلیٹ میں چاول نکالتے ہوئے کہا۔ "بیٹا سب باتوں کو بھلا کر اس وقت خوشی خوشی کھانا کھاؤ پھر باتیں کریں گے۔"

میں نے بھی مصنوعی مسکراہٹ کے ساتھ کھانا شروع کیا۔ کیونکہ مجھے معلوم تھا کہ میرے والد دل کے مریض ہیں اور اگر زیادہ افسردگی کا اظہار کروں گی تو انہیں بہت دکھ ہوگا۔ اب جو ہونا تھا وہ ہو چکا تھا۔ اس وقت ان کو پریشان نہیں کرنا چاہیے۔ انشاء اللہ سب ٹھیک ہو جائے گا۔

کھانے کے بعد میں اپنے ابو کے ساتھ ٹی وی لاؤنج میں آگئی۔ تھوڑی سی گفتگو کے بعد ابو نے سوال کر ہی دیا۔ "بیٹا اس دفعہ کچھ پریشان نظر آرہی ہو؟"

میں نے سوچا کہ اگر میں نے جھوٹ بولا تو اس بات کا ابو کو بعد میں علم ہوگا تو وہ بہت ہی دکھی ہوں گے۔ لہٰذا انہیں پہلے ہی سب بات بتادوں۔ میں نے شروع سے آخر تک ساری بات ابو کو بتادی۔

وقت گزرتا رہا۔ مہینا گزر گیا۔ نہ تو خالد آیا اور نہ ہی اس نے کوئی فون کیا۔ جب بھی میں اس کے آفس فون کرتی تو پتا چلتا کہ وہ چھٹی پر ہے۔ ایک دن میں اپنی دوست کی شادی اٹینڈ کر کے واپس آرہی تھی کہ دیکھا خالد کی موٹر سائیکل گیٹ کے باہر کھڑی ہے۔ میری خوشی کی انتہا نہیں رہی مگر اس کی بے مروتی پر غصہ بھی آرہا تھا کہ اتنے دنوں بعد اسے خیال آیا۔ میں مصنوعی غصے کے ساتھ ڈرائنگ روم کے باہر کھڑی ہوگئی۔ پھر آہستہ سے پردے کا کونا سرکا کر اندر جھانکا۔ سامنے صوفے پر خالد بیٹھا تھا، اس کے سامنے ابو۔ خالد کے چہرے پر شرمندگی کے آثار دکھائی دے رہے تھے اور وہ ابو سے بار بار یہی کہہ رہا تھا۔ "آپ مجھے معاف کردیں ابو، آپ نے تو مجھے کچھ کہا ہی نہیں۔ میں مجبور تھا۔ میں ان لوگوں کے سامنے اپنی کسی خواہش کا اظہار نہیں کرسکتا۔ وہ سب مجھے شروع سے بچہ سمجھتی ہیں۔ مجھے کوئی فیصلہ نہیں کرنے دیتیں۔ کسی مشورے میں شامل نہیں کرتیں۔ بس حکم صادر کرتی

ہیں۔آپ سے میری ایک Request ہے کہ آپ نے جہاں ... ہم پر اتنے احسانات کیے ہیں ایک احسان اور کردیں کہ ہمیں اس پلاٹ پر مکان بنوادیں ہم لوگ وہیں رہیں گے۔"

وہ غالباً اسی پلاٹ کا ذکر کررہا تھا جو ابو نے مجھے شادی سے پہلے، ڈیفنس میں لے کر دیا تھا۔ میں خاموشی سے اپنے کمرے کی طرف بڑھ گئی اور پھر میں نے بڑی بی کو آواز دے کر بلایا اور کہا۔"خالد صاحب کب آئے؟"

بڑی بی نے بتایا۔"ابھی تمہارے آنے سے پانچ منٹ پہلے آئے ہیں۔"

میں اپنی سوچوں میں گم ڈریسنگ ٹیبل کے پاس بیٹھی اپنے زیورات اتار رہی تھی کہ اچانک کمرے کا پردہ ہٹا اور خالد اندر آگئے۔

میں تھوڑی دیر کے لیے سکتے میں آگئی۔ خالد نے مسکرا کر میری طرف دیکھا پھر آہستہ آہستہ چل کر میرے بالکل قریب آگیا۔ میں نے گھبراہٹ میں سلام بھی نہیں کیا تھا۔ جب خالد نے مجھے بانہوں سے پکڑ کر اپنی طرف کیا تو مجھے ہوش آیا اور پھر میں نے اسی گھبراہٹ میں سلام کیا اور طبیعت پوچھی۔

خالد نے مسکرا کر جواب دیا اور سینے سے لگالیا۔ کچھ لمحے ہم دونوں خاموشی سے کھڑے رہے پھر آنسوؤں سے خالد کی قمیص گیلی محسوس ہوئی تو خالد نے مجھے اپنے سے الگ کرتے ہوئے میرے آنسو پونچھے اور معافی مانگی۔ تھوڑی دیر کی خفگی کے بعد ہم دونوں خوشی خوشی باتیں کرنے لگے۔ باتیں کرتے کرتے رات کے دو بج گئے اچانک اسے خیال آیا کہ اتنی رات ہوگئی۔ خالد کو اپنے گھر بھی جانا ہوگا۔

میں نے خالد سے کہا۔"گھر میں امی آپ کا انتظار کررہی ہوں گی؟"

خالد نے ہنس کر کہا۔"میں انہیں ڈیم پر جانے کا بول کر آیا ہوں۔ آج میں یہیں رکوں گا۔ صبح سیدھا یہیں سے ڈیم جاؤں گا۔"

میں بہت خوش ہوئی۔

صبح بڑی بی نے جلدی اٹھادیا کیونکہ میں رات کو کہہ کر سوئی تھی کہ خالد کو ڈیم پر جانا ہے۔

ناشتے سے فارغ ہوکر خالد ڈیم کے لیے روانہ ہوگئے۔

پھر تو مہینے میں ایک بار ضرور خالد آتے اور فون پر تو تقریباً ہر دوسرے دن بات ہوجاتی تھی۔ اسی طرح پورے سات مہینے گزر گئے۔ ایک دن خالد نے بتایا کہ صبح انہیں تربیلا جانا ہے۔ دو مہینے کی ٹریننگ ہے۔

میں اداس ہوگئی۔ خالد نے مجھے بہت سمجھایا کہ ابو جو مکان ہمارے لیے بنارہے ہیں۔ ہم اسی مکان میں رہیں گے۔ صرف دو مہینے کی تو بات ہے۔ میں آجاؤں گا تم مکان مکمل کروا کر رکھنا۔

رات کا کھانا دونوں نے جلد ہی کھالیا کیونکہ خالد کو واپس گھر جا کر پیکنگ بھی کرنی تھی۔

صبح خالد نے رخصت ہونے سے پہلے مجھے فون کیا اور وہاں پہنچ کر خط لکھنے اور فون کرنے کا وعدہ کیا۔

پندرہ دن گزر گئے۔ ایک دن اچانک بڑی بی نے ایک لفافہ لاکر دیا۔ وہ یقیناً خالد ہی کا خط تھا۔ خالد نے مجھے بڑا پیارا خط لکھا تھا جو کہ پہنچتے ہی لکھا تھا اور مجھے پورے پندرہ دن کے بعد ملا تھا۔ اس میں اس کا مکمل ایڈریس اور فون نمبر بھی تھا۔ میں کئی بار اس خط کو پڑھ چکی تھی۔

دوسرے دن صبح ناشتے کے بعد فون کی گھنٹی بجی۔ میں نے دل میں سوچا اتنی صبح کس کا فون ہوگا۔ ابھی سوچ ہی رہی تھی کہ بڑی بی نے بتایا کہ تربیلا سے خالد صاحب کا فون ہے۔ میں تیر کی طرح بھاگتی ہوئی فون کے پاس پہنچی۔ مختصر سی سلام دعا کے بعد خالد نے تاکید کی کہ ہر خط کے جواب میں مجھے فون کرتی رہنا۔ میں نے وعدہ کرلیا۔ پھر تو میرا کا معمول ہوگیا ہر دوسرے دن ... خالد کو فون کرتی اور پندرہ بیس منٹ تک مکان کی، سہیلیوں کی، ابو کی، محلے والوں کی باتیں ہوتیں اور ابو میری خوشی میں خوش تھے۔ روزانہ صبح صبح زیر تعمیر بنگلے پر چلے جاتے اور اپنے سامنے کام کرواتے کیونکہ انہیں ٹھیکیداروں کا کام پسند نہیں تھا۔ ابو نے بڑی محنت اور محبت کے ساتھ بنگلا بنایا تھا۔

اور یوں پلک جھپکتے میں چار مہینے گزر گئے۔ خالد تربیلا سے کراچی پہنچ گئے۔ مجھے خالد کے آنے کا شدت سے انتظار تھا۔ میں نے بڑی بی کے ساتھ مل کر مزے مزے کی ڈشیں بنائی تھیں۔ میں صبح سے مصروف تھی۔ ایک منٹ بھی آرام نہیں کیا تھا۔ جب رات ہوگئی اور نہ ہی فون آیا اور نہ ہی خالد تو مجھے فکر لاحق ہوئی۔ میں نے بڑی بی سے تربیلا فون کروایا تو پتا چلا کہ خالد کراچی کے لیے روانہ ہوچکے ہیں۔ دل میں عجیب عجیب سے وسوسے جاگتے رہے۔ پوری رات میں بے چین سی کروٹیں بدلتی رہی۔ صبح سے میں نے کچھ کھایا بھی نہیں تھا۔ دوسرے دن 15 نومبر کی شام کو خالد آگئے۔ ان کا چہرہ اترا ہوا تھا۔ مجھے لگا کہ وہ مجھ سے مل کر خوش نہیں ہوئے ہیں۔ میں گھبرائی ہوئی تھی۔ کسی نئی آفت یا مصیبت کی آمد منتظر نظر آرہی تھی کیونکہ آج بھی خالد کے چہرے پر وہی اداسی اور خاموشی تھی جیسی اس دن مجھے

''ایسپرگلوسیس'' ان مختلف بیماریوں کا ایک گروپ ہے جس کا سبب Aspergillus نام کی ایک پھپھوند ہوتی ہے۔ یہ پھپھوند یا فنگس عموماً سانس لینے کے نظام کو اپنا نشانہ بناتی ہے جس میں سانس کی نالی، چہرے اور آنکھوں کے گرد ہڈیوں کے گڑھے یا جوف (Sinuses) اور پھیپھڑے شامل ہیں لیکن یہ مرض جسم میں کہیں بھی پھیل سکتا ہے۔ ''ایسپرگلاسیس'' کی علامتیں شدت کے لحاظ سے مختلف ہوسکتی ہیں۔ معتدل قسم کی شکایت میں سینے سے سیٹی جیسی آواز نکل سکتی ہے اور اگر مرض شدت اختیار کرلے تو مریض کو خون کی الٹیاں ہو سکتی ہیں۔ جن لوگوں کا جسمانی مدافعتی نظام کمزور ہوتا ہے وہ اس عارضے میں زیادہ مبتلا ہو سکتے ہیں۔ یہ مرض اس وقت لاحق ہوتا ہے جب کوئی شخص اس پھپھوند کے بہت ہی چھوٹے ذرات کو سانس کے راستے جسم میں داخل کرتا ہے جن لوگوں کا Immune System توانا ہوتا ہے وہ جسم میں داخل ہوتے ہی اس۔۔پھپھوند کو پھیپھڑوں تک پہنچنے سے پہلے ہی الگ کر کے ختم کر دیتا ہے لیکن کمزور جسمانی دفاعی نظام اس سے شکست کھا جاتا ہے اور پھپھوند اس میں جگہ بنا لیتی ہے۔ ''ایسپرگلوسیس'' متعدی مرض نہیں ہے اور انسانوں سے دوسرے انسانوں یا جانوروں کو منتقل نہیں ہوتا۔

مرسلہ: نوشین عارف۔ کراچی

بدحواسی

گاؤں کے ایک گھر میں مولوی صاحب کو بچے کے کان میں اذان دینے کے لیے بلایا گیا۔ مولوی صاحب نوجوان تھے اور انہوں نے گاؤں کی مسجد میں دو چار دن پہلے ہی ذمے داریاں سنبھالی تھیں۔ پہلی بار کسی بچے کے کان میں اذان دینے جا رہے تھے۔ گھر میں داخل ہو کر خوش خلقی کے اظہار کے لیے بچے کے باپ سے کسی قدر نروس انداز میں مخاطب ہوئے۔ ''ماشاء اللہ ماشاء اللہ...... لڑکا ہے یا لڑکی؟ عمر کیا ہے...؟ میرا خیال ہے یہ آپ کا سب سے چھوٹا بچہ ہے......''

اپنے گھر سے نکال کرتی۔

میں نے پریشان انداز میں خالد سے پوچھا کہ کیا پریشانی ہے تو تھوڑی سی توقف کے بعد خالد نے اپنی پریشانی کا ذکر اس طرح بیان کیا کہ تم نے مجھ سے ہمیشہ یہی کہا کہ خدا اور رسولؐ کے بعد تم کو اپنا سمجھتی ہوں کہ آج تم میری ایک خواہش پوری کردو۔ میں گھبرا گئی کہ پتا نہیں کیا بات منوانا چاہتے ہیں۔ میں نے گھبرائے ہوئے لہجے میں کہا کہ آپ بات تو بتائیں۔ میں پوری کوشش کروں گی۔

خالد نے کہا کہ میں نے تم سے وعدہ کیا تھا کہ ہم دونوں اسی بنگلے میں رہیں گے مگر میں مجبور ہوں۔ مجھے امی نے اس بات کی اجازت دینے سے انکار کردیا ہے اور کہا ہے کہ اگر میں نے ایسا کیا تو میں ان کا مرا ہوا منہ دیکھوں گا اور یہی بات ابو نے کہی ہے۔ سب بہنیں مجھ سے خفا ہیں۔ میں اتنے سارے لوگوں کو ناراض کر کے تمہارے ساتھ اس بنگلے میں نہیں رہ سکتا۔ ہم اس بنگلے کو بیچ کر امی ابو کے پاس مکان لیں گے کیونکہ ان کی شرط ہے کہ مکان اپنے محلے میں ہی لیا جائے اور وہ لوگ بھی ساتھ رہیں گے کیونکہ مکان کا کرایہ بہت زیادہ ہے اب وہ لوگ افورڈ نہیں کر سکتے۔

میں یہ سب سن کر سکتے میں رہ گئی۔ خالد کے جھنجوڑنے پر میں نے کہا۔ ''خالد خدا بھی اپنے بندوں پر اتنا بوجھ ڈالتا ہے کہ جتنا وہ اٹھا سکیں۔ تم بھی مجھ سے وہ بات منواؤ جو میں پوری کرسکوں۔ میں تمہاری اور تمہارے ماں باپ کی اس خواہش کو پورا نہیں کرسکتی۔''

خالد ناراض ہوگئے اور مجھے پھر سے اسی روپ میں نظر آئے جن میں وہ مجھے میرے والد کے گھر چھوڑ کر گئے تھے۔ وہی چہرے پر غصہ تلاطم اور زبان پر گالیاں تھیں۔

خالد کے جانے کے بعد بڑی دیر تک میں روتی رہی۔ دوسرے دن میری آنکھیں سوجی ہوئی تھیں اور بخار بھی تھا۔ ناشتے کی ٹیبل پر ابو کا سامنا کرتے ہوئے مجھے شرم آرہی تھی۔ اس بڑھاپے میں انہیں میری وجہ سے اتنا دکھ دیکھنا پڑرہا تھا اور ساتھ میں محنت کرنا پڑرہی تھی۔ صبح سے شام تک وہ کس لگن سے کام کرواتے تھے اس کا انہیں خالد نے یہ صلہ دیا تھا۔ میں اپنے دل میں اپنی بدنصیبی کو کوس رہی تھی۔ ابو کی آواز نے مجھے چونکا دیا۔ ابو کہہ رہے تھے۔ ''بیٹا ہر کام میں خدا کی مصلحت ہے۔ تم صبر کا دامن ہاتھ سے مت چھوڑنا۔ خدا سے مایوس مت ہونا۔ نماز کے بعد یہ دعا مانگا کرو کہ خدا تمہارے حق میں بہتر کرے۔ جلد بازی مت کرنا۔''

میں چپ چاپ ابو کی باتیں سنتی رہی اور اپنے ابو کی عظمت کو داد دیتی رہی کہ ایک میرے ابو کی سوچیں ہیں۔ اتنا کچھ کر کے اور اتنی باتیں سن کر بھی خالد اور اس کے گھر والوں کو ایک لفظ برا نہیں کہتے۔ دوسری طرف میرے سسرال والے ہیں۔ انہوں نے مجھے کبھی اپنی بیٹی نہیں سمجھا۔ ہر وقت میرے خلاف خالد کے کان بھرے اور اسے برے اور غلط راستے پر چلنے کو کہتے رہے۔

چار مہینے اسی طرح گزر گئے۔ نہ خالد نے فون کیا اور نہ ہی ملنے آیا۔ میں کئی کئی فون خالد کے دفتر کرتی مگر وہ بات کرنے سے انکار کر دیتا۔ 5 فروری کو کورٹ سے سمن میرے نام آیا۔ میں گھبرا گئی۔ جب میں نے پڑھا کہ مجھے کورٹ میں پیش ہونا ہے اور خالد نے جھوٹا کیس کیا ہے کہ میں اس کی غیر موجودگی میں اپنا سب سامان لے کر اس کے باپ سے جھگڑا کر کے اپنے والد کے گھر چلی گئی ہوں اور وہ اس کو رکھنا چاہتا ہے۔

میں یہ سب پڑھ کر چکرا گئی۔ تھوڑی دیر کے بعد مجھے ہوش آیا تو ابو سرہانے بیٹھے تھے۔ ڈاکٹر صاحب جو کہ فیملی ڈاکٹر تھے میری نبض چیک کر رہے تھے۔ ماتھے پر ٹھنڈے پسینے آئے ہوئے تھے۔ رنگ پیلا ہو رہا تھا۔ خوف سے برا حال تھا۔ نبض آہستہ آہستہ چل رہی تھی۔ ڈاکٹر صاحب دوائی اور نیند کا ایک انجکشن دے گئے۔ ڈاکٹر صاحب کا کہنا تھا کہ دماغ پر کسی گہرے صدمے کا اثر ہے۔ خدا کا شکر ہے کہ خطرہ ٹل گیا ورنہ برین ہیمرج کا خطرہ تھا۔

کئی دن اسی تکلیف میں گزر گئے۔ رات دن میں خالد کی بے وفائی اور اس قدر گھٹیا قدم اٹھانے پر روتی رہی تھی۔ ابو نے بھی بہت بڑا وکیل کیا تھا۔

آج کورٹ میں پیشی تھی۔ میں ابو کے ساتھ کورٹ میں گئی۔ خالد بھی آیا ہوا تھا۔ اس کے چہرے پر ایک عجیب سا تاثر تھا۔ شاید وہ اپنے کیے پر شرمندہ نہیں تھا۔ جج کے سامنے دونوں پیش ہوئے۔ جج نے خالد سے کہا کہ آپ نے کیس کیوں فائل کیا ہے۔

خالد نے جھوٹا قصہ سنا کر کہا۔ ''وہ اس کے ساتھ رہنا نہیں چاہتی۔''

جب جج نے مجھ سے سوال کیا کہ آپ کیوں خالد کے ساتھ نہیں رہنا چاہتی تو میں نے کہا کہ ''سر میں ان کے والدین کے ساتھ نہیں رہنا چاہتی وہ لوگ میری ازدواجی زندگی میں مداخلت بہت کرتے ہیں۔ میں خالد کے ساتھ الگ رہنا چاہتی ہوں۔ جوائنٹ فیملی کے ساتھ نہیں رہنا چاہتی۔''

☆ جھیل Baikal اپنے کشیدی نظام کے حوالے سے بھی منفرد مقام کی حامل ہے جس کے باعث یہ دنیا کی صاف و شفاف جھیل ہے۔ اس جھیل میں بعض نایاب ترین حیاتیاتی اقسام بھی پائی جاتی ہیں جو دنیا کی اور کسی جھیل میں نہیں پائی جاتی جیسا کہ میٹھے پانی کی سیل (Fresh Water Seal) ہے۔ گرم چشموں کے ذریعے جھیل کو تازہ پانی Living water مہیا ہوتا ہے جو آکسیجن سے لبریز پانی کو جھیل میں پمپ کرتے ہیں جس کی وجہ سے اس جھیل کی گہرائی میں بھی زندگی پائی جاتی ہے اس کے برعکس تمام گہری جھیلوں کی گہرائی مردہ ہوتی ہے اس سے ظاہر ہے کہ یہ کوئی عام جھیل نہیں۔

.....☆.....☆.....

☆ سطح سمندر سے 12 ہزار 5 سو فٹ بلندی پر (Peru) کی جھیل Titicaca دنیا کی بلند ترین جھیل ہے جس میں کسی بڑے بحری جہاز کی مدد سے گھوما جاتا ہے۔

☆ سطح سمندر سے ایک ہزار 3 سو 16 فٹ نچائی پر دنیا کی سب سے نیچی جھیل بحیرہ مردار ہے جو اردن اور اسرائیل کے درمیان ہے۔

☆ دنیا میں رقبے کے حوالے سے بڑی 25 جھیلوں میں سے 10 شمالی امریکا میں ہیں ان میں سے 9 کینیڈا میں ہیں (جو کہ دنیا میں کسی بھی ملک میں سب سے زیادہ بڑی جھیلوں کی تعداد ہے) جب کہ 7 ایشیاء میں (جن میں دو بڑی ترین ہیں) یورپ میں کوئی نہیں۔ دو جنوبی امریکا اور ایک آسٹریلیا میں واقع ہے۔

☆ امریکا میں موجود چھ بڑی جھیلیں آئس ایج کی پیداوار ہیں پانچ جھیلیں ایسی جگہوں پر ہیں جہاں آئس ایج میں گلیشیر ہوتے تھے۔

مرسلہ: راحت علی۔ کراچی

جج نے خالد کو بہت سمجھایا مگر وہ اپنی ضد پر قائم رہا۔ آخر جج نے اگلی تاریخ دے دی۔ اس طرح تقریباً دو سال کیس چلا۔ خالد نے اپنے بیانوں میں خدا اور رسول کی جھوٹی قسم کھا کر یہ حلف اٹھایا کہ اس نے میرا حق مہر ادا کر دیا تھا اور نہ وہ مجھے میرے والد کے گھر چھوڑ کر گیا تھا بلکہ میں خود آئی تھی اور سب سامان خود لے کر آئی تھی۔ اس گھر میں کوئی سامان نہیں ہے ایسی ہی جھوٹی باتیں اس نے حلف اٹھا کر کہیں۔

آخر کار دو سال کے بعد اس کیس کا فیصلہ ہو گیا جو کہ میرے حق میں تھا کہ خالد مجھے علیحدہ مکان میں رکھے اور اپنے ماں باپ سے الگ رکھے۔ میرے حقوق ادا کرے اور حق مہر جو کہ عند وطلب ہے [illegible] وہ ادا کرے۔

میرے حق میں فیصلہ ہونے کے بعد خالد روپوش ہو گیا۔ اس کا کوئی پتا نہ تھا۔ اس کے دوست احباب جو بھی اس کے گھر آتے تھے وہ بھی شرمندگی کی وجہ سے اب نہیں آتے تھے۔

☆☆☆

دینو بابا کی آواز پر میں چونکی۔ ”بیٹا رات ہو گئی ہے۔ صاحب پریشان ہو رہے ہوں گے۔“

ایک دم خیال آیا کہ میں گھر میں نہیں بلکہ باہر ہوں اور اتنی دیر سے اپنے ماضی میں کھوئی ہوئی ہوں۔

آسمان پر تارے چمک رہے تھے۔ چاند بھی پورا نکلا ہوا تھا۔ میں جلدی سے اٹھی اور گاڑی میں جا بیٹھی۔ بابا نے بڑی احتیاط سے گاڑی چلائی اور میں وقت سے بہت دیر بعد گھر میں داخل ہوئی۔ گھڑی میں دس بج رہے تھے۔ ابو کھانے کی ٹیبل پر بیٹھے میرا انتظار کر رہے تھے۔ مجھے اپنے اوپر بڑا غصہ آیا کہ میں ابو کا بھی خیال نہیں کرتی۔ ابو نے مجھے دیکھ کر پوچھا۔ ”کیوں بیٹا آج کیا زیادہ دلہنیں آ گئی تھیں جو دیر ہو گئی۔“

میں نے کہا۔ ”نہیں ابو میں تو شام کو ہی پارلر سے آ گئی تھی۔“ (ابو نے مجھے بیوٹی پارلر کھول دیا تھا۔ میں نے بیوٹیشن کا ڈپلوما جو کر رکھا تھا اور اب میں اسے چلاتی تھی۔ اچھا وقت گزر جاتا تھا) بس ذرا دل گھبرا رہا تھا تو اولڈ کلفٹن چلی گئی تھی۔ وہاں بیٹھے بیٹھے وقت کا احساس ہی نہیں ہوا۔

ابو میری سچائی پر بہت خوش ہوئے۔ کھانے سے فارغ ہو کر میں اپنے کمرے میں آ گئی۔ طبیعت میں بھاری پن محسوس ہو رہا تھا۔ میں نے نہ چاہتے ہوئے بھی الماری میں سے اپنی شادی کا البم نکالا اور ہر ایک تصویر کو بغور دیکھتی رہی۔ کافی دیر تصویروں سے دل بہلاتی رہی مگر جو اندرونی گھبراہٹ تھی وہ کم نہیں ہو کر دے رہی تھی۔ پھر نجانے ایک دم سے مجھے خالد کے ایک دوست کا خیال آیا جو اکثر ہمارے گھر آتا تھا اور اس نے مجھے اپنی بہن بنا رکھا تھا مگر جب سے کیس میرے حق میں ہوا تھا اس کو بھی خالد سے زیادہ دوستی ہونے کے سبب میرے سامنے آتے ہوئے شرم آتی تھی۔ اب تو میں نے بھی تین چار سال سے اس سے بات کرنا چھوڑ دیا تھا۔

اس خیال کے آتے ہی میں نے ڈائری اٹھائی اور اس کا نمبر ڈائل کرنا شروع کر دیا۔ چار پانچ بیل کے بعد کسی عورت نے فون اٹھایا، شاید اس کی بہن تھی۔ میں نے سلام کے بعد اپنا مدعا بیان کیا تو انہوں نے بدر کو بلا دیا۔

سلام دعا کے بعد اس نے مجھ سے شکایت آمیز لہجے میں کہا۔ ”مجھے معلوم ہے کہ تم نے مجھے کیوں فون کیا ہے۔ تم کو خالد کا پتا چل گیا ہوگا۔“

میں ایک دم چونک گئی۔ ”کیا پتا چل گیا ہوگا بدر بھائی۔ مجھے کچھ معلوم نہیں۔“

انہوں نے کہا۔ ”بنومت تمہیں سب خبر ہے۔ اس کو اس کے کیے کی بڑی سزا ملی ہے۔“

میں نے کہا۔ ”آپ پہیلیاں نہ بوجھائیں مجھے کچھ علم نہیں۔“

انہوں نے حیران ہو کر کہا۔ ”تمہارا مقدمے کا فیصلہ سن کر خالد لاہور چلا گیا تھا۔ ساتھ میں اس کے ماں باپ اور بہنیں بھی چلی گئی تھیں۔

انہوں نے اس کی دوسری جگہ شادی کر دی اس کی ماموں زاد سے۔ ایک ہفتہ بعد خالد کے پیر پر چھوٹا سا زخم نکلا جو تیزی سے پھیلنے لگا۔ ٹیسٹ وغیرہ ہوئے تو پتا چلا کہ یہ کوڑھ ہے۔ خالد کی دوسری بیوی اسے چھوڑ کر اپنے ماں باپ کے پاس چلی گئی اور اس سے خلع لے لی۔ آہستہ آہستہ خالد کے پورے جسم پر کوڑھ پھیل گیا اور پھر تو اس کی ماں اور بہنیں گھن کھانے لگیں۔ اسے اس کے جھوٹے حلف اٹھانے پر بڑی سخت سزا ملی ہے۔ اسے اس کے رشتہ داروں نے خیراتی اسپتال میں داخل کر دیا جہاں دو ہفتے پہلے اس کا انتقال ہو گیا۔ اس کی تین بہنوں کو طلاق ہو گئی۔ وہ سب لاہور میں اپنے ماں باپ کے پاس رہتی ہیں۔ باپ کو فالج کا اٹیک ہوا تھا۔ اب وہ بالکل چلنے پھرنے اور بات کرنے سے معذور ہے۔ اسے بھی جھوٹی گواہی دینے کی سزا ملی ہے۔ ایک بہن جس نے تمہیں گھر سے نکالا تھا اس کی دونوں لڑکیاں مر گئیں۔ اب وہ بے اولاد ہے اور کراچی میں ہی ہے۔

قربانی

جناب ایڈیٹر سرگزشت
السلام علیکم!
انسان خطا کا پتلا ہے۔ خطا سرزد ہونا ضروری ہے لیکن خطا دانستہ سرزد کی جائے تو وہ خطا نہیں مفاد پرستی ہے۔ اس نے بھی مفاد پرستی کا مظاہرہ کیا اور اپنی محسنہ کو ہی گورستان پہنچا دیا۔
اس سچ بیانی میں، میں نے دانستہ کچھ تبدیلیاں کی ہیں، اپنا اور دیگر کرداروں کے نام مقام اور پیشہ تبدیل کر دیا ہے تاکہ میرے حلقہ احباب بھی میری آپ بیتی کو پڑھ کر مجھ سے نفرت نہ کرنے لگیں۔
اپنی روداد صرف اس لیے رقم کررہا ہوں کہ میری طرح کوئی اور یہ غلطی نہ کر بیٹھے۔

عرفان رضا
(کراچی)

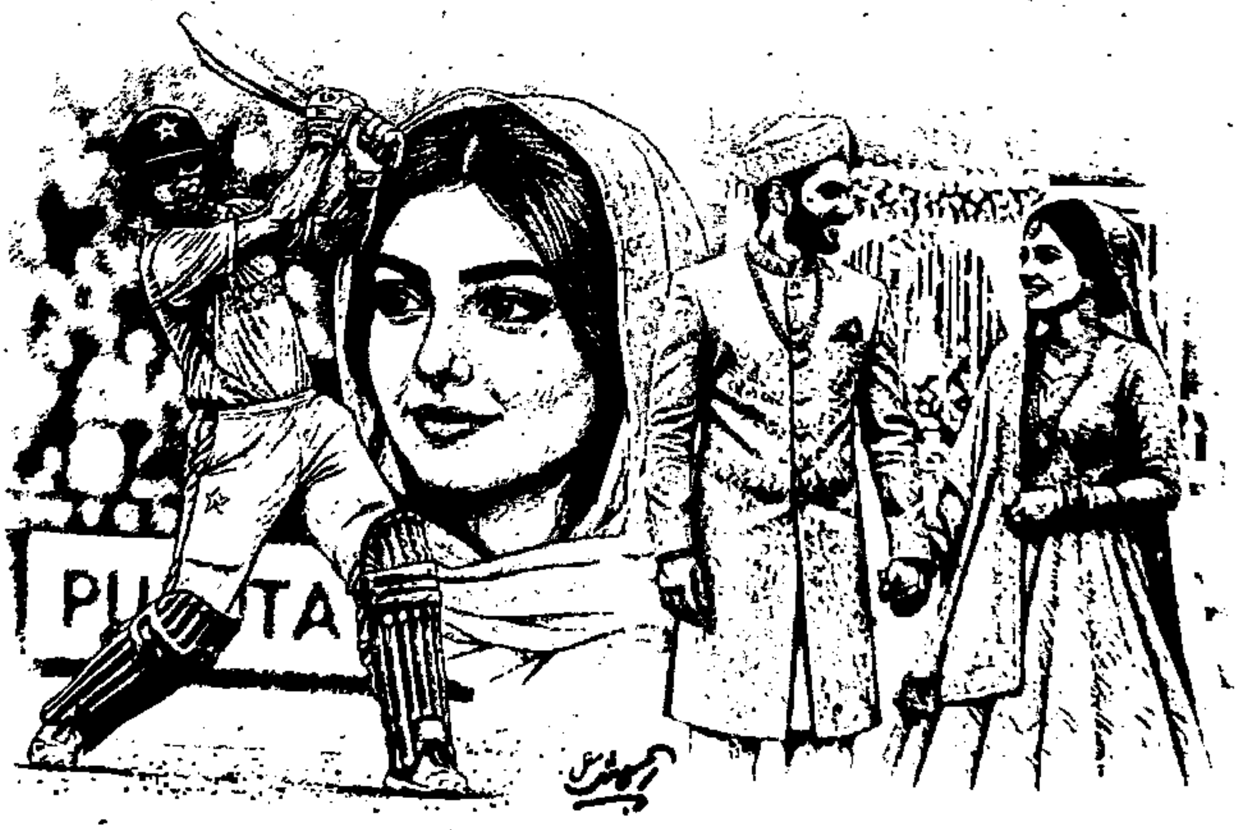

میں نے شاٹ زیادہ زور سے نہیں لگایا تھا۔ اس کے باوجود گیند ہوا میں بلند ہوئی اور میدان پار کرتی ہوئی سامنے والی گلی کے کارنر والے مکان تک جا پہنچی پھر زوردار چھنا کے کی آواز آئی اور مکان کی بالائی منزل کے ایک کمرے کا شیشہ چکنا چور ہو گیا۔
میں نے پلٹ کر دیکھا، وکٹ کیپر سمیت ہر کھلاڑی غائب ہو چکا تھا۔ محلے کے سب لڑکے جانتے تھے کہ وہ مکان عثمانی صاحب کا ہے۔ عثمانی صاحب ریٹائرڈ ایس پی

تھے۔ غصہ تو ان کی ناک پر دھرا رہتا تھا۔ خاص طور پر وہ محلے کے ان لڑکوں سے بہت چڑتے تھے جو وقت بے وقت کرکٹ کھیلتے رہتے تھے۔ ان کے مکان کے بجائے کسی اور مکان کا شیشہ ٹوٹا ہوتا تو شاید کوئی لڑکا بھی میدان چھوڑ کر فرار نہ ہوتا مگر عثانی صاحب کسی بھی رورعایت کے قائل نہیں تھے۔ وہ پولیس کے ریٹائرڈ ایس پی تھے، ہاتھی مر کے بھی سوا لاکھ کا ہوتا ہے۔ کئی دفعہ وہ محلے کے کئی لڑکوں کو پولیس کے ذریعے پٹوا بھی چکے تھے۔

میں نے چاہا کہ دوسرے لڑکوں کے ساتھ میں بھی بھاگ جاؤں مگر یہ میری غیرت نے گوارا نہ کیا۔ میرے فرار کی صورت میں وہاں کھیلنے والا ہر لڑکا زیرِ عتاب آجاتا۔ دوپہر کا وقت تھا اور میں جانتا تھا کہ یہ عثانی صاحب کے آرام کا وقت ہے۔ سونے پہ سہاگا یہ ہوا تھا کہ شیشہ بھی انہی کے بیڈروم کا ٹوٹا تھا۔ اس صورت میں تو جو کچھ نہ ہو جاتا، وہ کم تھا۔

میں دل کڑا کر کے آگے بڑھا ہی تھا کہ عثانی صاحب کے بیڈروم کا دروازہ کھلا اور وہ پیر پٹختے ہوئے ٹیرس میں نمودار ہوئے۔ انہوں نے چیخ کر پوچھا۔ ”کس کمینے کی حرکت ہے یہ؟“

”انکل! وہ...... دراصل...... ہم لوگ...... میں...... معافی چاہتا ہوں۔“ میں نے ہکلاتے ہوئے کہا۔

”معافی کے بچے!“ وہ چنگھاڑ کر بولے۔ ”یہ کھڑکی کا شیشہ کیا تیرا باپ لگوائے گا؟ اور جب میدان موجود ہے تو گلی میں کرکٹ کھیلنے کی کیا ضرورت ہے؟“

مجھے بھی ایک دم غصہ آگیا۔ میں نے بھنا کر کہا۔ ”کھڑکی کا شیشہ میرا باپ نہیں، بلکہ میں لگوا دوں گا اور ہم گلی میں نہیں بلکہ میدان ہی میں کھیل رہے تھے۔ شاٹ کچھ زور سے لگ گئی اس لیے......“

”دفع ہو جاؤ یہاں سے۔“ وہ چنگھاڑے۔ ”میں شام کو تمہارے باپ سے بات کروں گا۔“

”انکل پلیز!“ میں نے جلدی سے کہا۔ ”میں معافی چاہتا ہوں۔ آئندہ کبھی ایسا نہیں ہوگا۔“ میں جانتا تھا کہ اگر عثانی صاحب نے ابو سے شکایت کر دی تو کم از کم ایک ہفتے تک میرے کھیلنے پر پابندی لگ جائے گی۔ میں نے خوشامدانہ لہجے میں کہا۔ ”انکل پلیز، میری بال تو دے دیں۔ میں......“

”گیٹ لاسٹ!“ وہ حلق کے بل دہاڑے۔ ”نہیں ملے گی بال۔“ یہ کہہ کر انہوں نے زوردار آواز سے کمرے کا دروازہ بند کر لیا۔

میرا دل چاہا، پتھر مار کے ان کے گھر کے سارے شیشے توڑ ڈالوں۔ یہ آخر خود کو سمجھتے کیا ہیں؟ میں نے بھی سوچ لیا تھا کہ شام کو ٹیم کے ہر لڑکے سے بات کروں گا۔ ہم سب اکٹھے ہو کر ان کے گھر آئیں گے اور بال تو میں ضرور لے کر جاؤں گا۔ وہ چاہے پولیس بلوائیں یا فوج!

میں جانے کے لیے مڑا ہی تھا کہ ایک مترنم نسوانی آواز آئی۔ ”سنو عرفان!“

میں جاتے جاتے رک گیا اور گھوم کر دیکھا۔ عثانی صاحب کی بیٹی ثمینہ گیٹ کے پاس کھڑی تھی۔ میں نے اسے کئی برس پہلے دیکھا تھا۔ وہ شاید لاہور یا پنڈی میں اپنے ماموں کے پاس رہتی تھی۔ میں نے اسے دیکھا تو دیکھتا ہی رہ گیا۔ ان چند برسوں میں اس نے خوب روپ نکالا تھا۔ سرخ و سفید رنگت، گھنے سیاہ لمبے بال، خوب صورت نقوش اور سانچے میں ڈھلا ہوا جسم۔

”تم فکر مت کرو۔ میں ڈیڈی کو سمجھا لوں گی اور موقع دیکھ کر بال بھی تمہیں دے دوں گی۔“ اس کی مترنم آواز میں عجیب سی کشش تھی اور آواز میں کیا، وہ تو سرتاپا قیامت تھی۔ میں جواب میں کچھ بھی نہ کہہ سکا۔

”ایسے آنکھیں پھاڑ پھاڑ کے کیا دیکھ رہے ہو؟“ وہ مسکرائی۔ ”کیا مجھے پہچانے نہیں، ارے بھئی، میں ثمینہ ہوں۔“

”میرا حافظہ ابھی اتنا کمزور نہیں ہوا ہے۔“ میں نے بھی ہنس کر کہا۔ ”میں تو تمہیں پہلی ہی نظر میں پہچان گیا تھا۔“

ثمینہ نے مسکرا کر گیٹ بند کیا تو مجھے اچانک ایسا لگا جیسے اردگرد کا ہر منظر بے رنگ، بے نور ہو گیا ہو۔

ہم کراچی کی ایک متوسط درجے کی آبادی میں رہتے تھے۔ وہاں کھیلنے کے لیے چھوٹا سا ایک گراؤنڈ تو تھا مگر اس کے اردگرد گولائی میں مکانات تعمیر ہو چکے تھے۔ اب یہ ہماری بدقسمتی تھی کہ عثانی صاحب کا مکان بالکل کارنر کا تھا۔ اکثر دوسرے مکانوں میں بھی گیند چلی جاتی تھی، شیشے بھی بعض اوقات ٹوٹ جاتے تھے مگر کوئی محلے والا اتنے شدید ردِعمل کا مظاہرہ نہیں کرتا تھا۔ ایسا عموماً میرے ہی شاٹ سے ہوتا تھا۔ کوئی اور لڑکا اتنی زوردار ہٹ لگا ہی نہیں سکتا تھا۔

مجھے کرکٹ کا جنون تھا۔ تپتی دوپہر ہو یا شدید سردی،

مجھے کبھی موسم کی پروا نہیں ہوتی تھی۔ ان دنوں تو یوں بھی میں نے میٹرک کا امتحان دیا تھا اور رزلٹ کا انتظار کر رہا تھا۔ میرے کلاس فیلوز اور محلے کے کئی لڑکے مختلف کورسز کر رہے تھے مگر مجھے تو کرکٹر بننے کا جنون تھا۔ پڑھائی میں میرا دل ہی نہیں لگتا تھا البتہ میں اپنے اسکول کی کرکٹ ٹیم کا کپتان تھا۔

میں عثمانی صاحب کے گھر سے آگے نکلا تو دوسرے لڑکے بھی مختلف گلیوں سے نکل کر آگئے۔ وہ سب مجھ سے پوچھ رہے تھے کہ عثمانی صاحب سے کیا بات ہوئی؟ میں نے بھی رعب جمانے کے لیے کہہ دیا کہ عثمانی صاحب سے میں نے بول دیا، مجھے آپ کی پروا ہے، نہ پولیس کی۔ کرکٹ تو میں کھیلوں گا۔ آپ اگر مجھے روک سکتے ہیں تو روک لیں۔

کچھ لڑکوں نے میری اس لاف گزاف پر اعتبار کیا، کچھ طنزیہ انداز میں ہنسنے لگے۔ میں بھی ہنستا ہوا چلا گیا۔ مجھے سب سے بڑی پریشانی یہ تھی کہ اگر عثمانی صاحب نے ابو سے شکایت کردی تو نہ جانے کیا ہو؟ اس شام ہم میں سے کوئی کرکٹ کھیلنے بھی نہیں آیا۔ میدان کے دوسرے سرے پر ضیا کا مکان تھا۔ اس کے آگے چبوترہ بھی تھا۔ ہم سب اسی چبوترے پر بیٹھے باتیں کرتے رہے۔

شام ڈھلے عثمانی صاحب اپنے گھر سے نکلے تو سب لڑکے ایک مرتبہ پھر بھاگ گئے۔ ان کا رخ میرے ہی گھر کی طرف تھا۔ میرا دل انجانے خدشات سے بری طرح دھڑکنے لگا۔ وہ یقیناً میری شکایت کرنے ابو کے پاس جا رہے تھے۔ وہ ہماری گلی میں داخل ہوئے تو میں بھی جھپٹ کر گلی کے نکڑ پر پہنچ گیا پھر یہ دیکھ کر میری حیرت کی انتہا نہ رہی کہ وہ ہمارے گیٹ پر رکنے کی بجائے سیدھے نکلتے چلے گئے۔ اس لمحے میرے تصور میں ثمینہ کا دلکش سراپا لہرا گیا۔ گویا اس نے اپنے نک چڑھے ڈیڈی کو سمجھا بجھا کر شکایت نہ کرنے پر راضی کرلیا تھا۔ ثمینہ کا خیال آتے ہی میرے دل میں گدگدی سی ہونے لگی۔ وہ ایسی لڑکی تھی کہ کوئی بھی اس کی تمنا کرسکتا تھا۔

پھر کئی ہفتے یونہی گزر گئے۔ کرکٹ ہم اب بھی کھیلتے تھے مگر اب ہم نے وکٹوں کا رخ تبدیل کردیا تھا۔ خاص طور پر میری کوشش ہوتی تھی کہ میں بال کو ہٹ لگاؤں تو گیند عثمانی صاحب کے گھر کی طرف نہ جائے۔ بعض اوقات سچویشن ایسی ہوتی کہ گیند مجھ تک پہنچتی اور مجھے اندازہ ہوجاتا کہ یہ ہٹ عثمانی صاحب کے گھر تک جائے گی۔ ایسے میں عین وقت پر میں اپنا فیصلہ بدل دیتا اور کوشش کرکے اتنی ہی زور دار ہٹ مخالف سمت میں لگا دیتا۔ شروع شروع میں مجھے ایسا کرتے ہوئے خاصی دشواری ہوئی مگر پھر غیر محسوس طریقے سے میں اس میں مہارت حاصل کرتا گیا۔ یہ بھی ایک طرح سے میری خوبی بن گئی۔ مخالف ٹیم کا کپتان بالر کے لحاظ سے فیلڈ سیٹ کرتا مگر میں غیر متوقع شاٹ کھیل کر اس کی ساری حکمت عملی پر پانی پھیر دیتا۔

انہی دنوں ہمارا رزلٹ آگیا۔ میں حسب توقع پاس تو ہوا مگر ڈی گریڈ میں۔ مجھے اس کی کوئی پروا نہیں تھی۔ صرف ابو کی لعن طعن سے خوف آتا تھا۔ انہیں اس بات کی پریشانی تھی کہ اب مجھے کسی اچھے کالج میں ایڈمیشن نہیں ملے گا، اچھا کالج تو درکنار مجھے تو کہیں بھی داخلہ ملنا مشکل ہے۔ بھلا ڈی گریڈ کو کون پوچھتا ہے۔

انہی دنوں ایک دن طارق روڈ پر شاپنگ کرتے ہوئے مجھے ثمینہ نظر آئی۔ وہ اپنی کسی دوست کے ساتھ ہنس ہنس کر باتیں کر رہی تھی۔ ثمینہ گلابی رنگ کے سادے سے شلوار سوٹ میں ملبوس تھی مگر اس کی دوست مجھے الٹرا ماڈرن لگ رہی تھی۔ اس نے اسکن ٹائٹ جینز اور ٹی شرٹ پہن رکھی تھی۔ مجھے اُمید نہیں تھی کہ ثمینہ اس وقت مجھ پر کوئی توجہ دے گی۔

اچانک اس کی نظر مجھ پر پڑ گئی اور اس نے انتہائی گرم جوشی سے کہا۔ ''ارے عرفان، تم کہاں گھوم رہے ہو؟ اس دن کے بعد تو تم نظر ہی نہیں آئے، میرا مطلب ہے کہ ہمارے گھر کی طرف نہیں آئے۔''

''میں تو روز ہی گراؤنڈ میں ہوتا ہوں۔'' میں نے ہنس کر کہا۔ ''یہ کہو کہ میری گیند تمہارے گھر نہیں آتی۔''

''ویسے تو میں تمہیں روز ہی کھیلتے ہوئے دیکھتی ہوں۔ تم بہت اچھا کھیلتے ہو۔'' پھر اچانک اسے اپنی دوست کا خیال آیا اور وہ اس سے بولی۔ ''شائستہ، یہ عرفان ہے، بہت اچھا کرکٹر ہے اور......''

''بس، اتنی تعریف کافی ہے۔'' میں نے ہنس کر کہا۔ ''شائستہ صاحبہ، میں تو ابھی کرکٹ کھیلنا سیکھ رہا ہوں۔'' پھر میں نے رسمی طور پر ثمینہ سے کہا۔ ''اور کیا خدمت کروں آپ کی، چائے پئیں گی آپ؟''

''اب چائے یہاں کھڑے کھڑے تو نہیں پی جاسکتی۔'' ثمینہ ہنس کر بولی۔ ''ایسا کرتے ہیں کسی پُرسکون جگہ بیٹھ کر چائے پیتے ہیں۔ اس شور شرابے میں تو کان پڑی آواز سنائی نہیں دے رہی ہے۔''

مجھے اُمید نہیں تھی کہ ثمینہ میرے ساتھ چائے پینے پر رضامند ہو جائے گی۔ دوسری بات یہ تھی کہ میری جیب میں کل باون روپے پڑے تھے مگر اب کیا ہو سکتا تھا۔ میں نے اسے ٹالنا چاہا مگر وہ چائے پینے پر بضد رہی۔

نزدیک ہی جدید ماڈل کی ہنڈا سوک پارک تھی۔ جب شائستہ نے اس گاڑی کا دروازہ کھولا تو میں اچانک اس سے مرعوب ہو گیا۔ مجھے اندازہ نہیں تھا کہ وہ اتنی دولت مند ہو گی۔ وہاں سے ہم گلشن اقبال کے ایک پُرسکون ریسٹورنٹ تک پہنچے تو میری روح فنا ہو گئی۔ میں جانتا تھا کہ وہ خاصہ مہنگا ریسٹورنٹ ہے۔

''آج کی یہ چائے میری طرف سے ہے۔'' ثمینہ نے ہنس کر کہا۔ شاید اسے اندازہ تھا کہ میں وہاں کا بل افورڈ نہیں کر سکوں گا یا پھر اس نے میرے چہرے کے تاثرات سے بھانپ لیا تھا۔

''تمہاری وہ گیند اب تک میرے پاس محفوظ ہے۔'' ثمینہ نے ہنس کر کہا، پھر شائستہ کو ہنس ہنس کر وہ واقعہ بتانے لگی پھر مجھ سے بولی۔ ''تم اپنی گیند لینے ہی کے بہانے آجاؤ۔'' اس کے لہجے میں بہت اپنائیت تھی۔

''تاکہ اس مرتبہ تمہارے ڈیڈی مجھے پولیس کے حوالے کر دیں۔'' میں نے ہنس کر کہا۔ ''وہ گیند تم اپنے پاس ہی رکھو۔''

میری بات پر ثمینہ اور شائستہ دونوں ہنسنے لگیں پھر ہم نے انتہائی خوشگوار ماحول میں چائے پی۔ باتوں کے دوران میں مجھے معلوم ہوا کہ شائستہ کے والد محکمہ داخلہ کے ڈپٹی سیکریٹری ہیں۔ وہ اسلام آباد میں رہتی تھی اور ان دنوں کسی شادی کی تقریب میں شرکت کے لیے کراچی آئی ہوئی تھی۔

''کرکٹ کے علاوہ آپ کے کیا مشاغل ہیں عرفان صاحب؟'' شائستہ نے پوچھا۔

''میں نے ابھی میٹرک پاس کیا ہے اور اب کالج میں ایڈمیشن لوں گا۔''

''ارے، آپ تو ہم سے بہت جونیئر ہیں۔'' شائستہ نے کہا۔ ''میں اور ثمینہ تو اس سال انٹر کا ایگزام دیں گے۔'' پھر وہ ہنس کر بولی۔ ''اب تو ثمینہ بھی کراچی شفٹ ہو گئی ہے۔ اس کے بغیر تو میرا دل بھی وہاں نہیں لگے گا۔ سوچ رہی ہوں، میں بھی کراچی آجاؤں۔''

انہی باتوں کے دوران میں تقریباً ایک گھنٹا گزر گیا۔ میرا تو اٹھنے کو دل ہی نہیں چاہ رہا تھا۔ ثمینہ کو بھی کوئی خاص جلدی نہیں تھی مگر شائستہ کو جلدی تھی۔ وہ اپنے کسی کزن کی گاڑی لائی تھی اور اب اسے گاڑی واپس کرنا تھی۔

پھر مجھے کرکٹ ہی کی بنیاد پر شہر کے ایک اچھے کالج میں ایڈمیشن مل گیا۔ زندگی میں پہلی بار ابو نے میری کرکٹ کی تعریف کی۔ وہ چاہتے تھے کہ میں پڑھ لکھ کر کچھ بن جاؤں۔ خود انہوں نے بہت مصائب میں زندگی گزاری تھی۔ وہ کسی سرکاری ادارے میں یو ڈی سی تھے، بس جیسے تیسے گھر کی گاڑی گھسیٹ رہے تھے۔

پھر ثمینہ سے اکثر ملاقاتیں ہونے لگیں، کبھی کسی ریسٹورنٹ میں، کبھی پارک میں اور کبھی یونیورسٹی میں۔ انٹر کرنے کے بعد اس نے بی اے آنرز میں ایڈمیشن لے لیا تھا۔

انہی دنوں مجھے کراچی کے ایک بڑے کرکٹ کلب سے کھیلنے کی آفر ہوئی۔ ثمینہ نے بھی مجھے مشورہ دیا کہ تم وہ کلب جوائن کر لو۔ وہاں رہ کر قائداعظم ٹرافی کھیلنا آسان ہے ورنہ اچھے اچھوں کو موقع نہیں ملتا ہے۔ میرے دوستوں نے بھی مجھے یہی مشورہ دیا۔ یوں میں نے شہر کا وہ معروف کلب جوائن کر لیا۔

میں نے اس کلب میں رہ کر کئی میچ کھیلے اور انتہائی شاندار کارکردگی کا مظاہرہ کیا۔ ہر میچ کے موقع پر میں ثمینہ کو خاص طور پر مدعو کرتا تھا۔ وہ ہمیشہ اگلی صف میں ہوتی تھی اور اسے دیکھ کر میرا حوصلہ دو چند ہو جاتا تھا۔ میں اس کی موجودگی میں ایسے ایسے اسٹروک کھیلتا تھا کہ دیکھنے والے بھی حیران رہ جاتے تھے مگر ابھی تک مجھے فرسٹ کلاس کرکٹ کھیلنے کا موقع نہیں ملا تھا۔ البتہ اب میرے پاس اتنے پیسے ضرور ہوتے تھے کہ میں ثمینہ کے ساتھ کسی اچھے ریسٹورنٹ میں چائے پی لیتا تھا۔

اس دن ہم لوگ کلفٹن پر بوٹ بیسن کے نزدیک ایک جدید ریسٹورنٹ میں بیٹھے تھے۔ ثمینہ اس دن کچھ زیادہ ہی رومینٹک ہو رہی تھی۔ میں نے ہنستے ہوئے کہا۔ ''تمہیں ایک عجیب بات بتاؤں ثمینہ، جب تم میرا میچ دیکھنے نہیں آتی ہو تو مجھ سے کھیلا ہی نہیں جاتا ہے۔ میں کوئی بھی اچھا اسٹروک نہیں کھیل سکتا ہوں۔''

''تم کیا چاہتے ہو عرفان، میں ہمیشہ تمہارے ساتھ رہوں؟'' اس نے عجیب سے لہجے میں پوچھا۔

میرا دل بے اختیار زور زور سے دھڑکنے لگا۔ ''کون نہیں چاہے گا کہ تم جیسی خوب صورت اور پُرکشش لڑکی ہمیشہ

اس کے ساتھ رہے۔" میں نے ہمت کر کے کہہ دیا۔

"میں تو ہمیشہ سے تمہاری ہوں عرفان!" وہ اچانک جذباتی ہو گئی۔ "تم جانتے ہو، میں اسلام آباد سے کراچی کیوں آئی ہوں، محض تمہاری وجہ سے۔ جب تم اس تپتی ہوئی دوپہر میں ہمارے گھر گیند لینے آئے تھے، اس وقت میرے دل نے تمہیں پسند کر لیا تھا۔ میں نے اپنے گھر کی چھت سے پہلے بھی تمہیں کھیلتے ہوئے دیکھا تھا اور آرزو کی تھی کہ کاش تم بھی مجھے مل جاؤ پھر تم ملے بھی تو کن حالات میں۔" وہ بے ساختہ ہنسنے لگی۔

اس کی شخصیت کی طرح اس کی ہنسی بھی بہت دلکش تھی۔ میں نے جذباتی انداز میں کہا۔ "ثمینہ، میں بھی اسی دن سے تمہارے خواب دیکھنے لگا ہوں مگر ڈرتا ہوں کہ کہیں......"

"نہیں عرفی!" اس نے میری بات کاٹ دی۔ "کوئی ایسی بات منہ سے مت نکالنا۔"

اس دن گویا میں ہواؤں میں اڑ رہا تھا۔ ثمینہ جیسی خوب صورت بلکہ حسین لڑکیاں قسمت والوں کو ملتی ہیں پھر لمحوں میں، میں اور تو کا فرق مٹ گیا اور مجھے ایسا لگنے لگا جیسے میں اور ثمینہ برسوں سے ایک دوسرے سے بے تکلف ہیں۔ اس نے جذبات سے مخمور لہجے میں کہا۔ "عرفی، تمہیں اندازہ نہیں ہے کہ آج میں کتنی خوش ہوں۔ میرا دل چاہ رہا ہے کہ میں چیخ چیخ کر سب کو بتاؤں عرفی میرا ہے۔ کرکٹ کا ایک اسٹار بیٹسمین میرا ہے۔"

"اسٹار بیٹسمین!" میں نے ہنس کر کہا۔ "ابھی تو میں نے فرسٹ کلاس کرکٹ بھی نہیں کھیلی۔"

"کھیلو گے، انشاءاللہ تم بہت جلد قومی ٹیم میں کھیلو گے مگر اسٹار بننے کے بعد مجھے بھول تو نہیں جاؤ گے؟"

"تم نے ابھی سے طنز بھی شروع کر دیا۔" میں نے مصنوعی خفگی سے کہا۔ "میں خود کو بھول سکتا ہوں مگر تمہیں نہیں بھول سکتا۔" میں بھی جذباتی ہو گیا اور بے اختیار اس کا نرم و نازک ہاتھ تھام لیا۔

قائداعظم ٹرافی کے لیے کھلاڑیوں کی لسٹ بنی تو اس میں میرا نام نہیں تھا۔ اس دن میں انتہائی مایوس تھا۔ ہم لوگ ساحل سمندر پر اپنے پسندیدہ ریسٹورنٹ میں بیٹھے تھے۔ ثمینہ مجھے بچوں کی طرح بہلا رہی تھی۔

"میں بچہ نہیں ہوں مینو!" میں نے دل گرفتگی سے کہا۔ "اس ملک میں ٹیلنٹ نہیں بلکہ سفارش دیکھی جاتی ہے، فیملی بیک گراؤنڈ دیکھا جاتا ہے۔ ہم جیسے بے مایہ لوگوں کے لیے کہیں بھی کوئی گنجائش نہیں ہے۔"

"کم آن عرفی!" ثمینہ ہنس کر بولی۔ "ابھی صرف لسٹ بنی ہے، فائنل نہیں ہوئی ہے۔ تم ابھی سے مایوس ہو گئے۔ ابھی تو وہ لسٹ فائنل ہونے میں کم از کم ایک ہفتہ لگے گا۔"

"اس سے کیا ہوگا؟" میں تلخ لہجے میں بولا۔ جیسے لسٹ بنانے کی ذمے دار ثمینہ ہی ہو۔

"دعاؤں میں بہت اثر ہوتا ہے عرفی!" ثمینہ ایک دم سنجیدہ ہو گئی۔ "میں دن رات تمہارے لیے دعائیں کرتی ہوں اور مجھے یقین ہے کہ آج تک میری کوئی دعا ایسی نہیں ہے جو قبول نہ ہوئی ہو۔" پھر وہ ہنس کر بولی۔ "تم سے ایک بات کہنا تھی مگر تم وعدہ کرو گے برا نہیں مانو گے۔"

"تمہاری بات کا بھی برا مان لیا تو میں زندہ کیسے رہوں گا مینو!" میں ایک دم جذباتی ہو گیا۔ "کہو کیا کہنا چاہتی ہو؟ میں تمہارے ہی سہارے پر تو زندہ ہوں۔"

"میں نے ایک کمیٹی ڈالی تھی۔ مجھے کل ہی پچاس ہزار روپے ملے ہیں۔ میں...... چاہتی ہوں کہ......تم ان پیسوں سے......کوئی بائیک لے لو۔ دیکھو عرفی، تم انکار مت کرنا۔ میری خاطر پلیز!"

میں حیرت سے اسے دیکھتا رہ گیا۔ وہ کوئی سرمایہ دار نہیں تھی۔ عثمان صاحب بھی ریٹائر ہو چکے تھے۔ یوں بھی وہ انتہائی ایمان دار اور فرض شناس افسر تھے اسی لیے متوسط طبقے کی اس آبادی میں رہتے تھے ورنہ ان سے کہیں جونیئر افسروں کے ڈیفنس اور کلفٹن کے پوش علاقوں میں بنگلے تھے۔ میں جانتا تھا کہ اس نے نہ جانے کیا کیا جتن کر کے وہ کمیٹی ڈالی ہوگی۔

"مگر مینو! میں......"

"کوئی اگر مگر نہیں۔" ثمینہ نے اپنا پرس اٹھاتے ہوئے کہا۔ "عرفی پلیز!" اس نے پرس سے نوٹ نکال کر میری طرف بڑھا دیے۔ میں نے دیکھا، اس کی آنکھوں میں آنسو تیر رہے تھے۔ "پلیز عرفی!" اس نے خوشامد بھرے لہجے میں کہا۔

میں نے ہچکچاتے ہوئے وہ نوٹ لے لیے اور کہا۔ "مینو، میں......"

"بس کچھ نہیں۔" وہ روتے روتے ہنس دی۔ "تم کل ہی بائیک لے لو۔ اب ہم بائیک پر گھوما کریں گے۔"

میں جانتا تھا کہ ابھی وہ خود بمشکل تمام اپنی تعلیم کے اخراجات پورے کر رہی ہے۔ یونیورسٹی کے بعد وہ کسی... کوچنگ سینٹر میں پڑھاتی تھی، پھر کچھ بچوں کو گھر پر بھی ٹیوشن دیتی تھی۔ میرا ضمیر مجھے بری طرح ملامت کر رہا تھا۔ حقیقت میں یہ اس کے خون پسینے کی کمائی تھی جو اس نے میری جھولی میں ڈال دی تھی۔

''کیا سوچ رہے ہو عرفی؟'' اس نے میرے خیالات کا سلسلہ توڑ دیا۔ ''سوچنا چھوڑ دو اور کل ہی بائیک لے لو۔''

''مجھے تمہارے حالات کا بھی اندازہ ہے مینو!'' میں نے کہا۔ ''پھر تم اتنی بڑی رقم......''

''کم آن عرفی!'' وہ برامان کر بولی۔ ''بس، اب اس موضوع پر کوئی بات نہیں ہوگی پھر ایک ہی سال کی تو بات ہے۔ اس وقت تک تم بھی اسٹار کرکٹ بن چکے ہوگے اور مجھے بھی کوئی اچھی جاب مل جائے گی پھر......''

''پھر؟'' میں نے اس کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے پوچھا۔ ''پھر کیا ہوگا۔ تم اس کے باوجود سروس کرو گی؟''

''وہ تو خیر بعد کا مسئلہ ہے۔'' وہ بری طرح شرما گئی۔

وہ شام میری زندگی کی حسین ترین شام تھی۔ میں اس شام کی رنگینی میں یہ بھی بھلا بیٹھا کہ میرا نام فرسٹ کلاس کرکٹ کھیلنے والوں کی لسٹ میں نہیں ہے۔

☆☆☆

اس دن صبح ہی سے آسمان پر بادل چھائے ہوئے تھے۔ امی اور ابو ایک شادی میں میر پور خاص گئے تھے اور تین دن سے پہلے ان کی واپسی ممکن نہیں تھی۔ اس دن میری طبیعت بھی کچھ مضمحل تھی، بخار کی سی کیفیت تھی۔ پہلے میں نے کلب جانے کا ارادہ کیا، پھر خود ہی مسترد کر دیا۔ میں اس روز گھر پر آرام کرنا چاہتا تھا۔ مجھے اس وقت چائے کی شدید طلب ہو رہی تھی مگر چائے بنانا بھی ایک مسئلہ تھا۔

اچانک کال بیل بج اٹھی۔ میں نے وال کلاک پر نظر ڈالی، شام کے ساڑھے سات بج رہے تھے۔ میرا خیال تھا کہ اس وقت ضیا آیا ہوگا۔ میں خوش ہو گیا۔ کم از کم اس بہانے مجھے چائے تو مل سکتی تھی۔ ضیا چائے بہت اچھی بناتا تھا۔ یوں بھی میں اکیلا بور ہو رہا تھا۔ اس کی باتوں میں کم از کم بوریت کا احساس تو نہ ہوگا۔

میں گیٹ کھولنے کے لیے باہر نکلا ہی تھا کہ موٹی موٹی بوندیں پڑنا شروع ہو گئیں پھر اچانک تیز بارش ہونے لگی۔

اسی وقت کال بیل دوبارہ بجی۔ میں نے جھنجلا کر کہا۔ ''صبر کرو یار، آرہا ہوں۔'' یہ کہتے ہوئے میں نے گیٹ کھولا تو حیران رہ گیا۔ دروازے پر ثمینہ کھڑی تھی۔ وہ اتنی سی دیر میں بری طرح بھیگ چکی تھی۔ میں نے حیرت سے اسے دیکھا، پھر بولا۔ ''ثمینہ تم۔ اس وقت...... میں تو سمجھا تھا کہ......''

''اندر بھی آنے دو گے یا میں یونہی کھڑی بھیگتی رہوں؟'' وہ مسکرا کر بولی۔ وہ ایک دو دفعہ پہلے بھی گھر آ چکی تھی اور امی تو اس کی بہت تعریف کرتی تھیں۔

میں نے بغیر کچھ کہے راستہ چھوڑ دیا۔ وہ اندر آئی تو میں نے گیٹ بند کیا اور ہم دونوں پھرتی سے برآمدے میں چلے گئے۔ میں اسے گھر میں بلاتے ہوئے جھجک رہا تھا کیونکہ اس وقت گھر میں کوئی بھی نہیں تھا۔

''آنٹی کہاں ہیں؟'' وہ ڈرائنگ روم میں داخل ہوتے ہوئے بولی۔ وہ امی کو آنٹی کہتی تھی۔

''امی اور ابو ایک شادی میں میر پور خاص گئے ہیں۔''

میں نے کہا۔ ''تم بیٹھو نا!'' میں نے صوفے کی طرف اشارہ کیا۔

''نہیں، پھر میں چلتی ہوں۔'' اس نے جلدی سے کہا۔ ''میں تو سمجھی تھی کہ آنٹی ہوں گی اس لیے......''

''ارے بابا، میں تو ہوں پھر اس دھواں دھار بارش میں تم کہاں جاؤ گی، ذرا بارش تو رکنے دو۔''

پھر میں چونک کر بولا۔ ''ارے، تم تو بہت بری طرح بھیگ گئی ہو۔ نمونیہ ہو گیا تو لینے کے دینے پڑ جائیں گے۔'' میں نے ہنس کر کہا۔ ''ایسا کرو، امی کے کپڑے پہن لو۔ میں ابھی دو منٹ میں تمہارے کپڑے استری سے سکھا دوں گا۔''

''میں بیٹھوں گی نہیں۔'' ثمینہ نے جلدی سے کہا۔ ''تمہیں ایک خوش خبری سنانے آئی تھی۔ میں نے کلب فون کیا تھا۔ معلوم ہوا کہ عرفان صاحب آج تشریف ہی نہیں لائے ہیں۔ اسی لیے گھر چلی آئی۔''

''میری طبیعت صبح ہی سے گڑبڑ ہے، بخار سا محسوس ہو رہا ہے، جسم بری طرح ٹوٹ رہا ہے۔'' میں نے کہا۔ ''چائے کی شدید طلب ہو رہی تھی مگر چائے وائے بنانا میرے بس کا کام نہیں ہے۔''

''ارے تو چائے میں بنا دیتی ہوں۔ تم بخار کے لیے کوئی ٹیبلیٹ بھی لے لو اور یہ بھیگے ہوئے کپڑے اتارو۔''

''ایک شرط پر!'' میں نے مسکرا کر کہا۔ ''میں چائے

بھی پیوں گا [illegible] لوں گا۔ پہلے تم اپنا حلیہ درست کرو ورنہ......

''عرفی، کیسی بچوں والی باتیں کر رہے ہو۔ اگر کسی نے مجھے یہاں دیکھ لیا تو تمہیں اندازہ ہے کہ کتنی باتیں بنیں گی؟''

''اتنی موسلا دھار بارش میں کون باہر نکلے گا؟'' میں نے منہ بنا کر کہا۔ ''بیمار پڑنے کا شوق ہے تو جاؤ، میں چائے بھی خود ہی بنالوں گا اور......''

''بس مان گئے برا؟'' وہ ہنس کر بولی۔ ''چلو تمہاری خاطر یہ بھی سہی، لاؤ آنٹی کے کپڑے دو۔''

میں اسے امی کے بیڈ روم میں لے گیا اور الماری سے ان کے کپڑے نکال کر اسے دے کر باہر نکل آیا۔

امی کے کپڑے اس کے جسم پر خاصے ڈھیلے تھے مگر ان میں بھی وہ قیامت ڈھا رہی تھی۔ میں نے ہنس کر کہا۔ ''تم جب تک چائے بناؤ، میں استری سے تمہارے کپڑے سکھا دوں۔''

''کوئی ضرورت نہیں ہے۔'' وہ جلدی سے بولی۔ ''میں خود ہی سکھا لوں گی۔ تم جا کر لیٹ جاؤ، میں چائے لے کر آتی ہوں۔'' پھر وہ جاتے جاتے بولی۔ ''ہاں، تم اس دوران میں کوئی پین کلر ٹیبلیٹ نکال لو اور پہلے گیلے کپڑے بدلو۔''

میں نے اپنے کمرے میں جا کر کپڑے بدلے، پین کلر ٹیبلیٹ لی اور کمبل اوڑھ کر بیڈ پر نیم دراز ہو گیا۔ ثمینہ نے پانچ منٹ کے اندر اندر چائے تیار کر لی اور کمرے میں داخل ہوتے ہوئے بولی۔ ''چائے حاضر ہے جناب عرفان صاحب!''

''واہ بھئی، تم تو بہت پھرتیلی ہو۔ ہاں، وہ خوش خبری کیا تھی؟'' میں نے چائے کا کپ اس کے ہاتھ سے لیتے ہوئے کہا۔

''ایسے نہیں، پہلے مٹھائی کھلاؤ۔'' وہ چہک کر بولی۔ ''مگر ابھی رہنے دو، اس بارش میں کہاں جاؤ گے۔'' وہ مجھے بیڈ سے اٹھتا دیکھ کر بولی۔

''اب بتاؤ گی بھی یا پہیلیاں ہی بجھواتی رہو گی؟'' میں جھنجلا گیا۔

''تو پھر سنو۔'' یہ کہہ کر وہ پھر خاموش ہو گئی اور کچھ توقف کے بعد بولی۔ ''تمہارا نام فرسٹ کلاس کرکٹ کھیلنے والوں کی فہرست میں شامل ہو گیا ہے۔''

ڈاکٹر انعام الحق کوثر

ممتاز ادیب اور معلم، وہ کنیاں کلاں، تحصیل نکودر، ضلع جالندھر میں میاں محمد مقبول کے ہاں پیدا ہوئے۔ ایم اے فارسی (1954ء) پنجاب یونیورسٹی سے درجہ اوّل میں پاس کیا۔ اس دوران میں جرنلزم میں ڈپلوما بھی کیا۔ 1963ء میں پی ایچ ڈی کی سند لی۔ 1954ء میں اقبال اکیڈمی کراچی کے علامہ اقبال پر کل پاکستان انعامی مضامین کے مقابلے میں پہلا انعام حاصل کیا۔ فیروز سنز کی اردو انسائیکلو پیڈیا کے دوسرے ایڈیشن میں فارسی زبان و ادب کے بارے میں نوٹس لکھے۔ ان کی منظر عام پر آنے والی کتابوں کے نام یہ ہیں: افغانیز، لائف اینڈ ورکس (1963ء)، بولان نامہ، بلوچستان میں فارسی شاعری، بلوچستان میں اردو، مقدمہ جوہر معظم دیوان، ناطق مکرانی، منتخبات از شعرائے فارسی گوئی ارمغان کوثر، شعر فارسی در بلوچستان، نیکی کی کلیاں، گلمپسز آف پرشین پوئٹری، تذکرہ صوفیائے بلوچستان، کلیات محمد حسین براہوی، بلوچستان میں اردو کی قدیم دفتری دستاویزات، علامہ اقبال اور بلوچستان، جدوجہد آزادی میں بلوچستان کا کردار، اقبال شناسی اور بلوچستان کے کالج میگزین (جلد اوّل۔ دوم)، اقبال شناسی اور ادبائے بلوچستان کی تخلیقات (دو جلدیں)، مکاتیب یوسف عزیز مگسی، اقبالیات کے چند خوشے، بلوچستان میں بولی جانے والی زبانوں کا تقابلی مطالعہ، قرارداد پاکستان صحافتی محاذ پر، سیرت پاک کی خوشبو، بلوچستان میں تحریک تصوف۔ 1968ء میں بلوچستان میں اردو پر رائٹرز گلڈ انعام ملا۔ وہ متعدد ادبی انجمنوں کے سرپرست بھی رہے۔ گورنمنٹ ڈگری کالج لورالائی کے پرنسپل کی حیثیت سے ریٹائر ہوئے۔

مرسلہ: احمد جاوید۔ کوئٹہ

''واقعی؟'' میں مارے خوشی کے اچھل پڑا۔ ''کہیں تم مجھ سے مذاق تو نہیں کر رہی ہو؟'' مجھے واقعی یقین نہیں آ رہا تھا۔

''میں تم سے اتنا سنگین مذاق کر سکتی ہوں؟'' وہ ایک دم سنجیدہ ہوگئی۔ ''کل تمہیں خود ہی معلوم ہو جائے گا۔''

''مگر یہ سب ہوا کیسے؟'' میں نے بے تابی سے پوچھا۔ ''اور تمہیں کیسے معلوم ہوا؟''

''بھئی شائستہ کے ڈیڈی کے ایک دوست سلیکٹرز میں شامل ہیں۔ میں نے شائستہ سے کہا، بس پھر کام بن گیا۔''

''یو آر گریٹ مینو!'' میں نے جذباتی ہو کر اس کے دونوں ہاتھ تھام لیے۔ ''تم واقعی......''

''بس بس!'' اس نے میری بات کاٹ دی۔ ''میں تو تمہیں کرکٹ کے آسمان کی بلندیوں پر دیکھنا چاہتی ہوں۔ میں چاہتی ہوں تمہیں بین الاقوامی شہرت ملے پھر لڑکیاں مجھ سے حسد کریں کہ یہ ہے عرفان کی......'' وہ بولتے بولتے ایک دم خاموش ہوگئی۔ شرم سے اس کا چہرہ گلنار ہوگیا۔

''ہاں، کیا ہے عرفان کی؟'' میں نے شوخ لہجے میں کہا۔

''اچھا بس، زیادہ فری ہونے کی ضرورت نہیں ہے۔'' اس نے نظریں چراتے ہوئے کہا۔ اس کے ہاتھ ابھی تک میرے ہاتھوں میں تھے۔ ''بس میں چاہتی ہوں کہ تمہارا نام بچے بچے کی زبان پر ہو، لوگ تمہارے اسٹائل کی نقل کریں اور......''

اس کا جملہ ادھورا رہ گیا۔ اچانک لائٹ چلی گئی۔ کمرے میں گھپ اندھیرا ہو گیا۔ اس کے ساتھ ہی بجلی خوفناک انداز میں کڑکی تو وہ بے اختیار مجھ سے لپٹ گئی اور خوف زدہ لہجے میں بولی۔ ''عرفی، مجھے بادلوں کی گرج سے بہت ڈر لگتا ہے۔ بچپن ہی سے یہ میری کمزوری ہے۔''

اس کی گرم گرم سانسیں میرے سینے اور گردن کو گویا جھلسائے دے رہی تھیں۔ اس کے بالوں اور جسم سے عجیب سی مہکار پھوٹ رہی تھی۔ میں نے زور سے اسے بانہوں میں بھینچ لیا۔

''عرفی، مجھے جانے دو۔'' وہ کسمسائی۔ اس لمحے بادل پھر گرجے۔

''بارش رک جائے تو چلی جانا مینو!'' میں نے جذبات سے بوجھل لہجے میں کہا۔

پھر اس بارش اور بادلوں کی گھن گرج میں وہ کچھ ہو گیا جو نہیں ہونا چاہیے تھا۔

بارش تھم چکی تھی مگر ثمینہ بری طرح سسک رہی تھی، پھر وہ بلک بلک کر رونے لگی۔ میں خود بھی پچھتاووں میں گھرا ہوا تھا۔ اسے بھلا کیا تسلی دیتا۔ میں نے اسے رونے دیا تاکہ اس کے دل کی بھڑاس نکل جائے۔ وہ رو رو کر نڈھال ہوگئی تو میں نے اس سے کہا۔ ''مینو، میں تم سے بہت شرمندہ ہوں مگر......''

''قصور صرف تمہارا ہی تو نہیں ہے۔'' وہ پھر رونے لگی۔ ''اپنی تباہی کی میں خود ذمے دار ہوں۔''

''کیسی تباہی!'' میں نے کہا۔ ''تم میری ہو اور ہمیشہ میری رہوگی۔ تم کیا مجھے اتنا کم ظرف سمجھتی ہو؟''

''کم ظرف تو میں ہوں عرفی!'' وہ سسکتے ہوئے بولی۔ ''آج تو میں اپنی نظروں میں خود ہی گر گئی ہوں۔''

''اچھا خدارا، اب یہ رونا دھونا بند کرو ورنہ......'' میں نے جملہ ادھورا چھوڑ دیا۔

''اچھا تم ناراض مت ہو۔'' وہ جلدی سے بولی پھر اٹھ کھڑی ہوئی۔ ''اب میں چلتی ہوں۔ ممی اور ڈیڈی پریشان ہو رہے ہوں گے اور اب تک میری تمام فرینڈز کے گھر فون کر چکے ہوں گے۔''

''چلو، میں تمہیں چھوڑ آؤں۔'' میں نے کہا۔ ''بارش تو اس وقت بھی موسلا دھار ہو رہی ہے۔''

''میں چلی جاؤں گی۔'' اس نے جلدی سے کہا۔

''تمہاری طبیعت یوں بھی خراب ہے۔ مجھے کوئی موم بتی دو تاکہ میں کپڑے بدل سکوں۔'' میں نے بیڈ کے سائیڈ ریک سے نکال کر اسے موم بتی اور ماچس دی اور خود اندھیرے میں ہی بیٹھا رہا۔

تھوڑی دیر بعد وہ کپڑے بدل کر آ گئی۔ اس وقت بھی موسلا دھار بارش ہو رہی تھی مگر ثمینہ اب رکنے پر آمادہ نہیں تھی۔

اس کا گھر گراؤنڈ کے اس پار تھا۔ وہاں تک جاتے جاتے وہ نہ صرف بری طرح بھیگ جاتی بلکہ مٹی اور کیچڑ میں لت پت بھی ہو جاتی۔

دوسرے دن میں کلب پہنچا تو واقعی میرا نام ان کھلاڑیوں کی فہرست میں شامل تھا جو فرسٹ کلاس کرکٹ کے لیے سلیکٹ ہوئے تھے۔ ہر شخص مجھے مبارک باد دے رہا تھا، سوائے ان لڑکوں کے جنہیں اس فہرست سے نکالا گیا

تھا۔

میرا پہلا میچ راولپنڈی میں تھا۔ میں پابندی سے کیمپ میں جارہا تھا مگر اس دوران میں ثمینہ نے مجھ سے ایک مرتبہ بھی رابطہ نہیں کیا تھا ورنہ وہ دن میں کئی کئی مرتبہ فون کرتی تھی۔

میں ہمیشہ ون ڈاؤن کی پوزیشن پر کھیلتا تھا۔ میچ شروع ہوا تو بسم اللہ ہی غلط ہوگئی۔ ہماری ٹیم کا اوپنر ساجد محمود صرف پانچ رنز بنا کر کیچ آؤٹ ہوگیا۔ میں پیڈ باندھے تیار بیٹھا تھا۔ کرکٹ کے شائقین نے میرا نام تو سن رکھا تھا مگر مجھے کبھی کھیلتے نہیں دیکھا تھا اس لیے کراؤڈ نے کسی خاص گرم جوشی کا اظہار نہیں کیا۔

میں نے پہلی گیند کو اسٹڈی کرنے کی خاطر بلے پر روکنا چاہا تو وہ ٹوئسٹ ہوگئی سائیڈ سے نکل گئی۔ میرا دل اچھل کر گویا حلق میں آگیا لیکن خدا کا شکر ہے کہ گیند چند انچ کے فاصلے سے وکٹ کے پاس سے گزر گئی۔

اسی وقت اوور ختم ہوگیا۔ ٹیم کا دوسرا اوپنر وسیم اخلاق بھی بہت بہترین کھلاڑی تھا اور ہمیں اس سے بہت امیدیں وابستہ تھیں۔ اس نے دو گیندوں پر سنگل رنز لیے، پھر اوور کی آخری گیند پر ہٹ لگاتے ہوئے وہ بھی کیچ آؤٹ ہوگیا۔

اس کی جگہ حسن محمود آیا۔ وہ خاصہ جذباتی کھلاڑی تھا۔ میں نے اسے سمجھایا کہ تیز اسٹروک کھیلنے کی بجائے ذرا احتیاط سے کھیلنا تاکہ ان کے بالرز تھک جائیں۔

"تم نے اب تک کتنے ون ڈے میچ کھیلے ہیں؟" وہ برا سا منہ بنا کر بولا۔ "اپنی فکر کرو، مجھے مشورے مت دو۔"

اس کی بات پر میں بہت ڈپریس ہوگیا۔ گویا ان لوگوں نے اب تک مجھے دل سے قبول ہی نہیں کیا تھا۔ اس نے سنگل رن لیا اور اب اس خطرناک بالر کو فیس کرنے کی ذمے داری میری تھی۔ میں نے اس کی پہلی گیند کھیلنے کی کوشش نہیں کی صرف اس کی اسپیڈ، لائن اور لینتھ دیکھتا رہا۔

حسن محمود بھنا کر پچ کے درمیان آیا اور تحقیر آمیز انداز میں بولا۔ "برائن لارا صاحب، آپ صرف سنگل رن لینے کی کوشش کریں اور مجھے کھیلنے کا موقع دیں۔ ابھی اس خطرناک بالر کی چار بال باقی ہیں۔"

میری کھوپڑی بھی ایک دم گھوم گئی۔ وہ آخر خود کو سمجھ کیا رہا تھا؟ میں نے کیا پہلی دفعہ بیٹ پکڑا تھا۔ میں گزشتہ دس سال سے کرکٹ کھیل رہا تھا اور وہ مجھے بالکل بچے کی طرح ٹریٹ کر رہا تھا۔

چالیس فراعنہ

عام طور پر سمجھا جاتا ہے کہ فرعون کوئی ایک بادشاہ تھا جس نے حضرت موسیٰؑ کے زمانے میں خدائی کا دعویٰ کیا۔ یہ خیال صحیح نہیں۔ فرعون دراصل ایک لقب ہے جو مصر کے بادشاہ اختیار کرتے تھے۔ ایسے سینکڑوں فراعنہ گزرے ہیں جن میں سے صرف چالیس حنوط شدہ لاشیں یعنی ممیاں محفوظ رہ گئیں کیونکہ انہیں چوروں سے بچانے کے لیے بعد کے زمانوں میں پروہنوں نے اہرام سے نکال کر وادی شاہان کے ایک پہاڑ میں قدرتی غار نما ہال میں محفوظ کردیا۔ یہ ممیاں 1898ء میں اتفاقاً ایک چور کے ہاتھوں دریافت ہوئیں۔ یہ ممیاں مصری عجائب گھر کی اوپری منزل کے کمرا 52 میں رکھی ہوئی ہیں۔ ان میں اس فرعون کی ممی بھی ہے جس نے حضرت موسیٰؑ کی نبوت کو جھٹلایا تھا اور بنی اسرائیل کا تعاقب کرتے ہوئے بحیرۂ قلزم میں اپنے لاؤ لشکر سمیت ڈوب گیا تھا۔ اس کا نام فرعون منفتاح تھا۔ منفتاح رعمیس دوم کا بیٹا تھا جس نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کی پرورش کی تھی۔ منفتاح کی لاش 20 ویں صدی عیسوی میں سمندر سے نکالی گئی۔ قرآن کے فرمان کے مطابق لوگوں کے لیے باعث عبرت ہے۔ قرآن پاک میں لکھا ہے۔ "ہم تیرے بدن کو اخلاف کے لیے نشانی کے طور پر بچالیں گے۔" منفتاح کے نام کے ساتھ 1225 ق م لکھا ہوا ہے قد ساڑھے پانچ فٹ ہوگا۔ رنگ کھلتا ہوا گندمی ہے۔ اس کی لاش عجائب گھر میں پڑی ہوئی تمام ممیوں میں سب سے زیادہ ٹھیک حالت میں ہے اور ابھی تک بالکل محفوظ ہے، اس کے تمام اعضا صحیح وسالم ہیں جیسے ابھی ابھی حنوط کیا گیا ہو۔

مرسلہ: احسان سحر، میانوالی

میں وکٹ پر واپس پہنچا تو اچانک میری نظر وی آئی پی انکلوژر کی طرف اٹھ گئی۔ وہاں شائستہ کے ساتھ ثمینہ بھی بیٹھی تھی۔ اسے دیکھ کر گویا میرا کھویا ہوا اعتماد لوٹ آیا اور بدن میں بجلیاں سی بھر گئیں۔ میں نے ثمینہ کی طرف دیکھا تو اس نے چھکا لگانے کا اشارہ کیا۔

میں نے پہلی گیند پر اندازہ کر لیا تھا کہ وہ کہاں ٹپا کھاتی ہے۔ میں نے کریز سے آگے بڑھ کے ہٹ مارنے کا فیصلہ کیا۔ اس میں شدید رسک تھا۔ میں اگر ہٹ نہ لگا پاتا تو وکٹ کیپر مجھے لمحوں میں اسٹمپ آؤٹ کر دیتا مگر میں نے اس وقت رسک لینے کا فیصلہ کر لیا۔

بالر نے رگڑ رگڑ کر گیند کو چمکایا، خاصی دور جا کر اسٹارٹ لیا اور گیند بندوق سے نکلی ہوئی گولی کی طرح میری طرف آئی۔ میں نے ٹائمنگ کا اندازہ کیا اور گیند نے جونہی ٹپا کھایا، میں نے آگے بڑھ کر پوری قوت سے ہٹ لگا دی۔ وہ اتنی زور دار ہٹ تھی کہ گیند گراؤنڈ کراس کرتی ہوئی تماشائیوں میں جا گری۔

ہر طرف ایک شور سا مچ گیا۔ کچھ منچلے اسٹوڈنٹس میرے نام کے نعرے لگانے لگے۔ ''عرفان، عرفان، عرفان!''

بالر نے دوسری گیند اس سے بھی زیادہ تیزی سے پھینکی۔ میں نے پوزیشن بدل کر ایک دم مخالف سمت میں ایسی جگہ زور دار اسٹروک مارا کہ گیند دو فیلڈروں کے درمیان سے ہوتی ہوئی باؤنڈری لائن کراس کر گئی۔

پھر تو میں نے چوکوں اور چھکوں کی مدد سے تھوڑی ہی دیر میں نصف سنچری مکمل کر لی۔ میں نے دیکھا حسن محمود کا چہرہ دھواں دھواں ہو رہا تھا۔ وہ پچ کے درمیان میں آیا اور بولا۔ ''سنبھل کے کھیلو عرفان، ویسے بھی یہ تمہاری زندگی کا اہم ترین میچ ہے۔ یہ اوور کی آخری بال ہے۔ اس پہ کوئی رن مت لینا یا پھر دو رن لینے کی کوشش کرنا تا کہ دوسرے بالر کو میں فیس کر سکوں۔'' میں نے اثبات میں سر ہلایا اور واپس کریز پر چلا گیا۔ میں نے دیکھا، ثمینہ ایک مرتبہ پھر چھکے کی فرمائش کر رہی تھی۔ میں نے نفی میں سر ہلا دیا کہ ہر بال پر چھکا مارنا ممکن نہیں ہوتا۔ اب یا تو یہ میری خوش قسمتی تھی یا بالر کی بد قسمتی کہ اس کی بال اس انداز سے آئی کہ میں نے وایاں گھٹنا زمین پر ٹیک کر پوری قوت سے ہٹ لگا دی۔ چند لمحے تک تو مجھے گیند خود بھی نظر نہ آئی۔ امپائر کے اشارے اور گراؤنڈ کے شور سے مجھے معلوم ہوا کہ میں نے ایک مرتبہ پھر چھکا مار دیا ہے۔

اس میچ میں میری پرفارمنس اتنی بہترین تھی کہ پھر فرسٹ کلاس کرکٹ میں کوئی میرا راستہ نہیں روک سکا۔

ثمینہ ہر میچ کے موقع پر موجود ہوتی تھی مگر کامیابی اب بھی مجھ سے دور تھی۔ قومی ٹیم میں سلیکشن کے لیے جس پی آر اور فیملی بیک گراؤنڈ کی ضرورت ہوتی ہے، وہ میرے پاس نہیں تھا مگر ثمینہ مایوس نہیں تھی۔

اس وقت تک وہ یونیورسٹی سے فارغ ہو چکی تھی اور ایک ملٹی نیشنل کمپنی میں پی آر او تھی کیونکہ اس نے ماس کمیونی کیشنز میں آنرز کیا تھا۔ پی آر او کی حیثیت سے اخبار والوں سے اس کے تعلقات بہت اچھے تھے۔ وہ کوشش کر کے کسی نہ کسی اخبار میں میری تصویر انٹرویو اور خبر لگوا دیتی تھی۔

انہی دنوں ثمینہ پر صدمے کا پہاڑ ٹوٹ پڑا۔ عثمانی صاحب اور ان کی بیگم رات گئے ایک تقریب سے واپس آ رہے تھے کہ ایک ٹرالر سے ان کی گاڑی کا خوفناک تصادم ہو گیا۔ حادثہ اتنا شدید تھا کہ عثمانی صاحب تو موقع ہی پر جاں بحق ہو گئے، ان کی بیگم نے اسپتال پہنچتے ہوئے راستے میں دم توڑ دیا۔

میں ثمینہ کے گھر پہنچا تو وہ سکتے کی کیفیت میں تھی اور آنکھیں پھاڑے خلاؤں میں تک رہی تھی۔ میں نے اسے کئی بار آوازیں بھی دیں، لیکن اس کی پوزیشن میں کوئی فرق نہیں آیا۔ بہت مشکل سے دو دن بعد اس کا سکتہ ٹوٹا تو وہ اس بری طرح روئی کہ وہاں موجود ہر شخص اشک بار ہو گیا۔

وقت بڑے سے بڑا گھاؤ بھر دیتا ہے۔ آہستہ آہستہ ثمینہ زندگی کی طرف لوٹ آئی۔ اب وہ پہلے سے بھی زیادہ ٹوٹ کر مجھے چاہنے لگی۔ وہ اپنے گھر میں تنہا ہی رہتی تھی۔ میں نے چاہا کہ میں اس سے شادی کر لوں تا کہ اس کی یہ تنہائی ختم ہو سکے، لیکن اس نے سختی سے انکار کر دیا اور بولی۔ ''جب تک تم قومی ٹیم میں جگہ نہیں بنا لیتے، شادی کے بارے میں سوچنا بھی مت۔''

انہی دنوں قومی ٹیم کا اعلان ہونے والا تھا اور مجھے قوی امید تھی کہ میں ٹیم میں ضرور سلیکٹ ہو جاؤں گا۔ میری فرسٹ میچوں کی کارکردگی بہت شاندار تھی اس لیے سلیکشن بورڈ کے کئی ارکان بھی میرے حق میں تھے۔ مگر تقدیر میرے اس خواب پر مسکرا رہی تھی۔

سلیکشن سے دو دن پہلے میری بائیک ایک تیز رفتار گاڑی سے ٹکرا گئی۔ مجھے ہوش آیا تو میں اسپتال میں تھا۔

امی، ابو کے علاوہ وہاں ثمینہ بھی موجود تھی۔ میرے کئی کرکٹر دوست بھی وہاں آئے ہوئے تھے۔ ڈاکٹر بھی مجھے اچھی طرح پہچانتے تھے اس لیے مجھے وی آئی پی ٹریٹ منٹ دیا جا رہا تھا۔

اس دوران میں مجھے اطلاع ملی کہ قومی ٹیم کا سلیکشن ہوگیا اور وہ آسٹریلیا روانہ ہوگئی۔ میرے دل سے اک ہوک سی اٹھی لیکن میں کر بھی کیا سکتا تھا۔ مجھے تو ایسا لگ رہا تھا جیسے میں اب کبھی کھیل نہیں پاؤں گا۔

ایک دن موقع دیکھ کر میں نے ثمینہ سے پوچھا۔ ''مینو، مجھے سچ سچ بتاؤ کہ ڈاکٹرز کا میرے بارے میں کیا خیال ہے۔ میں سچ سننے کی ہمت رکھتا ہوں۔''

''ان کا خیال ہے کہ تم جلد ہی بالکل ٹھیک ہو جاؤ گے۔'' ثمینہ نے مجھ سے نظریں چراتے ہوئے کہا۔

''میری طرف دیکھ کر بات کرو مینو!'' میں نے کہا۔ ''مجھے صاف صاف بتاؤ کہ اصل بات کیا ہے؟ امی ابو کے چہروں سے تو نہیں لگتا کہ میں کبھی ٹھیک ہوسکوں گا، کبھی کھیل سکوں گا۔''

''تم کھیلو گے اور ضرور کھیلو گے۔'' ثمینہ نے پُرعزم لہجے میں کہا۔ ''تمہارے بائیں پیر کا فریکچر ذرا کمپلی کیٹڈ ہے مگر ڈاکٹرز کا خیال ہے کہ امریکا میں اس کا آپریشن ممکن ہے۔ تم بالکل پہلے کی طرح نارمل ہو جاؤ گے۔ تم جانتے ہو نواب منصور علی خان پٹودی کا اتنا شدید ایکسیڈنٹ ہوا تھا کہ اس کی بینائی تک متاثر ہوگئی تھی۔ اسے ایک کی بجائے دو گیندیں نظر آتی تھیں۔ اس نے اپنی لگن اور محنت سے اسی حالت میں کرکٹ کھیلی اور اتنی بہترین کرکٹ کھیلی کہ وہ بھارتی ٹیم کا کپتان بھی رہا، تمہارے پاؤں میں تو معمولی سا فریکچر ہے۔''

''مگر امریکا جانے اور علاج کے اخراجات کہاں سے پورے ہوں گے؟'' میرے لہجے میں مایوسی تھی۔

''تم اس کی فکر مت کرو۔ کچھ رقم میرے پاس ہے، کچھ میں شائستہ سے قرض لے لوں گی اور کچھ رقم اپنی کمپنی کے فنڈ سے لے لوں گی۔ یہ اتنا بڑا پرابلم نہیں ہے۔''

پھر اس نے واقعی اپنی بات سچ کر دکھائی۔ ایک ہفتے کے اندر اندر اس نے مجھے پندرہ لاکھ روپے کا ایک چیک دیا اور بولی۔ ''اب تم امریکا روانگی کی تیاری کرو۔ اللہ نے چاہا تو تم وہاں سے بالکل فٹ ہوکر آؤ گے۔''

میں دوسرے ہی ہفتے امریکا روانہ ہوگیا۔ ڈاکٹرز نے مجھے یقین دلایا تھا کہ تمہارے فریکچر کا ہنڈریڈ پرسنٹ علاج ہوسکتا ہے۔ تم پھر پہلے کی طرح زندگی گزار سکو گے، کرکٹ کھیل سکو گے۔ وہ امی ابو کے ساتھ مجھے ائرپورٹ پر سی آف کرنے بھی آئی اور بولی۔ ''بس تم جلدی سے ٹھیک ہوکر آجاؤ، پندرہ بیس لاکھ تو تم ایک ہی سیزن میں کما لو گے۔''

میرا علاج سو فیصد کامیاب رہا اور میں دو مہینے بعد بالکل نارمل حالت میں وطن لوٹ آیا۔ ثمینہ مجھے دیکھ کر اتنی خوش ہوئی کہ اگر ائرپورٹ پر امی ابو نہ ہوتے تو شاید وہ والہانہ انداز میں مجھ سے لپٹ جاتی۔

وطن واپس پہنچتے ہی میں نے ایک مرتبہ پھر کرکٹ کی پریکٹس شروع کردی اور آہستہ آہستہ اپنی پرانی فارم میں آگیا۔ دو تین اہم فرسٹ کلاس میچ کھیلنے کے بعد میں نے نہ صرف شائقین کو بلکہ سلیکٹرز کو بھی چونکا دیا۔ میرے کھیل میں اب بھی وہی جارحانہ پن تھا۔ میں ففٹی یا سنچری، دوڑ کر کم، چوکوں اور چھکوں کی مدد سے زیادہ بناتا تھا۔

آخر وہ دن بھی آ ہی گیا جس کا مجھے اور مجھ سے زیادہ ثمینہ کو انتظار تھا۔ مجھے پاکستان کی قومی ٹیم میں سلیکٹ کرلیا گیا۔ اس دن میرے پاؤں زمین پر نہیں پڑ رہے تھے۔ ہر اخبار میں ان کھلاڑیوں کی تصویریں تھیں جو کرکٹ سیریز کھیلنے ویسٹ انڈیز جا رہے تھے۔ اسپورٹس میگزین نے تبصرے بھی کیے تھے اور ہر تبصرے میں عرفان رضا یعنی میرے مستقبل کو تابناک بتایا گیا تھا۔

ٹیم کی روانگی کے وقت ثمینہ مجھے سی آف کرنے ائرپورٹ آئی تھی۔ اس نے بہت حسرت سے کہا۔ ''عرفی! کاش میں بھی تمہارے ساتھ جا سکتی مگر میری کمپنی مجھے فی الحال چھٹی نہیں دے گی۔''

''اب تم یہ جاب چھوڑ کیوں نہیں دیتیں؟'' میں نے کہا۔ ''اب تو ہمارے خوابوں کی تعبیر بھی مل گئی ہے۔''

''ابھی نہیں۔'' اس نے کہا۔ ''تم ٹیم میں اچھی طرح قدم جما لو، اپنی اہمیت منوا لو، خود کو ٹیم کے لیے ناگزیر ثابت کردو تو میں جاب چھوڑ دوں گی اور مجھے اُمید ہے کہ اس میں انشاءاللہ ایک سال بھی نہیں لگے گا۔''

اس دورے میں نیوزی لینڈ میں تو ہماری ٹیم کی مجموعی کارکردگی کچھ زیادہ اچھی نہیں رہی، لیکن میری انفرادی کارکردگی توقع سے بڑھ کر شان دار رہی تھی۔ میچ کے بعد آٹوگراف لینے والوں کا ایک جم غفیر میرے پیچھے ہوتا تھا۔ ان میں اکثریت لڑکیوں کی تھی۔ ہر قوم، ہر مذہب اور ہر ملک کی

خوب صورت ترین لڑکیاں تتلیوں کی طرح میرے اردگرد منڈلاتی تھیں۔

وہاں میں نے پہلی بار اپنے دوستوں کی تقلید میں شراب کو ہاتھ لگایا پھر اکثر شام کو میں شراب پینے لگا۔ آزاد خیال اور شرم و حیا سے عاری لڑکیوں کی بھی وہاں کوئی کمی نہیں ہے۔ میرے ساتھیوں میں چند ایک ایسے بھی تھے جن کی ہر شام ایک نئی لڑکی کے ساتھ گزرتی تھی۔

حسن محمود جو شروع میں مجھ سے جیلس تھا، اب وہ میرا بہترین دوست تھا۔ اس نے مجھے شراب کی لت لگائی اور شباب سے آشنا کیا۔ وہ اکثر کہتا تھا کہ ہماری یہ شہرت اور مقبولیت چند روزہ ہے۔ اس عرصے میں جتنا عیش کر سکتے ہو، کرلو۔

نیوزی لینڈ سے ٹیم کو آسٹریلیا جانا تھا۔ وہاں تین ٹیسٹ میچوں کی سیریز اور پانچ ون ڈے میچ تھے۔ پروگرام کے مطابق ہم نیوزی لینڈ سے آسٹریلیا روانہ ہوگئے۔

آسٹریلیا میں وہ "ون ڈے سیریز" کا دوسرا میچ تھا۔ دونوں اوپنر محض بائیس رنز بنا کر پویلین میں واپس آگئے تھے۔ میں گراؤنڈ میں اترا تو صورت حال بہت خراب تھی۔ مجھے امید نہیں تھی کہ ہم یہ میچ جیت سکیں گے۔ میں بہت سنبھل کر کھیل رہا تھا۔ ٹیم کے کپتان نے مجھے دو بار ٹوکا کہ یہ ٹیسٹ نہیں بلکہ ون ڈے میچ ہے، اوورز ضائع مت کرو۔

اچانک میری نظر وی آئی پی انکلوژر کی طرف اٹھ گئی۔ مجھے ایسا لگا جیسے ثمینہ مجھے (V) کا نشان دکھا رہی ہو۔ پہلے تو میں اسے اپنا وہم سمجھا مگر جب اس نے اپنے مخصوص انداز میں چھکا لگانے کی فرمائش کی تو مجھے یقین آگیا کہ وہ ثمینہ ہی ہے پھر میرے بدن میں گویا بجلیاں سی بھر گئیں۔ میں نے اپنے مخصوص خطرناک انداز میں کریز سے کئی قدم آگے بڑھ کر بال کو زوردار ہٹ لگائی، دوسرے ہی لمحے امپائر نے دونوں ہاتھ اٹھا کر چھکے کا اشارہ کیا۔ ایک ہی اسٹروک میں میرا اعتماد لوٹ آیا اور پھر میں خوب جم کر کھیلا۔ یوں ہم ہارا ہوا میچ جیت گئے۔

میں ڈریسنگ روم کی طرف بڑھا تو بے شمار مداحوں نے مجھے گھیر لیا۔ حسب معمول ان میں لڑکیوں کی اکثریت تھی۔ اچانک ثمینہ میرے سامنے آگئی اور مسکرا کر بولی۔

"آٹوگراف پلیز!" یہ کہہ کر اس نے اپنے بیگ سے کرکٹ کی ایک پرانی گیند نکالی اور میرے سامنے کردی۔ اس کے دوسرے ہاتھ میں ایک مارکر تھا۔ میں نے اس بال پر آٹوگراف دیا تو وہ ہنس کر بولی۔ "جانتے ہو عرفی یہ کون سی گیند ہے؟ یہ وہی گیند ہے جس نے ایک تپتی دوپہر میں ڈیڈی کے کمرے کا شیشہ توڑا تھا۔ میں نے اسے تمہاری یادگار کے طور پر سنبھال کر رکھ لیا ہے۔"

اسی وقت کئی لڑکیاں اسے دھکیل کر آگے آگئیں اور آٹوگراف بکس میری طرف بڑھا دیں۔

"ثمینہ تم شام کو میرے ہوٹل میں ملنا۔" میں نے اس سے کہا اور آٹوگراف دینے میں مصروف ہوگیا۔ یہ مجھے معلوم نہیں کہ ثمینہ پھر وہاں ٹھہری تھی یا اس وقت چلی گئی تھی۔

شام کو حسن محمود میرے کمرے میں آگیا اور بولا۔

"یار تم ابھی تک کمرے ہی میں پڑے ہو، چلو تمہیں آسٹریلین بیوٹی دکھاؤں، تم تو شاید پہلی دفعہ آسٹریلیا آئے ہو۔"

اسی وقت استقبالیہ کلرک نے فون پر بتایا کہ کوئی مس ثمینہ آپ سے ملنا چاہتی ہیں۔ میں نے اس سے کہا کہ انہیں میرے کمرے میں بھیج دو۔

"کون ہے؟" حسن محمود نے پوچھا۔

"میرا ایک مہمان ہے۔" میں نے گول مول جواب دیا۔ میرا خیال تھا کہ میرا جواب سن کر وہ چلا جائے گا مگر وہ وہیں جما بیٹھا رہا۔

تھوڑی دیر بعد ثمینہ کمرے میں داخل ہوئی تو حسن محمود نے کہا۔ "اوہو یہ ہے تمہارا مہمان؟ اب تو تم کھل جانے سے رہے۔ میں چلتا ہوں، گڈ ایوننگ بلکہ گڈ نائٹ!" یہ کہہ کر وہ چلا گیا۔

"تم اچانک یہاں کیسے آگئیں مینو؟" میں نے حیرت سے پوچھا۔

"بڑی مشکل سے آئی ہوں، صرف دو دن کے لیے، کل رات کی فلائٹ سے لوٹ جاؤں گی۔"

"چند دن ٹھہر جاؤ۔ میرے دو میچ تو اور دیکھ لو۔" میں نے کہا اور روم سروس کو کافی اور اسکاچ لانے کا آرڈر دیا۔

"عرفی!" ثمینہ نے حیرت سے کہا۔ "تم ڈرنک بھی کرنے لگے ہو؟"

"کبھی کبھار جب بہت زیادہ تھک جاتا ہوں تو ایک دو پیگ لے لیتا ہوں۔" میں نے کہا۔

اس نے کوئی جواب نہ دیا، بس پُرخیال انداز میں مجھے دیکھتی رہی۔ کافی پینے کے بعد اس نے جانا چاہا تو میں نے کہا۔ "تم ایک دن کے لیے تو آئی ہو، یہیں کیوں نہیں

ٹھہر جاتیں؟"

"مگر عرفی میں......"

"یہ ہمارا پرانا پس ماندہ محلہ نہیں، بلکہ آسٹریلیا ہے مائی ڈیئر، یہاں کوئی کسی کی ٹوہ میں نہیں رہتا۔"

"مگر مجھے خود بھی تو اچھا نہیں لگتا۔" ثمینہ نے کہا۔

"ٹھیک ہے، پھر جاؤ۔" میں نے منہ بنا کر کہا۔ "میچ دیکھنے آئی تھیں، وہ تو تم نے دیکھ لیا، اب کیا ہے؟"

"ایک تو غصہ تمہاری ناک پر دھرا رہتا ہے۔ تم اسی سے مجھے بلیک میل کرتے ہو۔ چلو تمہاری خاطر یہ بھی سہی۔"

میں نے فون پر استقبالیہ کلرک کو ہدایت کر دی کہ نہ تو میرے کمرے میں کوئی کال ٹرانسفر کی جائے نہ کسی ملاقاتی کو بھیجا جائے۔ کھانا ہم نے کمرے میں کھایا، پھر ثمینہ دیر تک مستقبل کی منصوبہ بندی کرتی رہی۔

اس رات نہ بارش ہو رہی تھی، نہ بجلی کی کڑک تھی، اس کے باوجود میں نے اپنی من مانی کی۔ ثمینہ نے شروع میں احتجاج کیا، پھر اس نے ہتھیار ڈال دیے۔

دوسرے دن وہ پاکستان کے لیے فلائی کر گئی۔

میں کراچی واپس پہنچا تو ثمینہ آفس کی طرف سے جرمنی گئی ہوئی تھی اس لیے اس سے ملاقات نہ ہو سکی۔ اگلے ہفتے شارجہ کپ شروع ہو رہا تھا۔ اس کے آنے سے پہلے میں شارجہ روانہ ہو گیا۔

وہاں میری ملاقات ڈولی سے ہوئی۔ وہ حسین گڑیا مجھے پہلی ہی نظر میں اچھی لگی۔ اب یہ اس کے حسن کی کشش تھی یا مختصر ترین لباس کی، یا پھر اس کے باپ کی بے تحاشا دولت کی۔ اس کا مجھے اندازہ نہ ہو سکا۔ اس کا باپ شہباز درانی دبئی کا بزنس ٹائی کون تھا۔ اس کا کاروبار نہ صرف دبئی میں، بلکہ دنیا کے بیشتر ملکوں میں پھیلا ہوا تھا۔ ڈولی اس کی اکلوتی اور لاڈلی بیٹی تھی۔

شارجہ میں وہ تقریباً روز ہی مجھ سے ملنے پہنچ جاتی تھی پھر ایک ملاقات میں اس نے اظہار محبت بھی کر دیا اور بولی۔ "ڈیڈ تم سے ملنا چاہتے ہیں۔ ان سے آج ہی مل لو ورنہ کل وہ نیویارک جا رہے ہیں۔"

ڈولی کا محل نما گھر دیکھ کر میری آنکھیں پھٹی رہ گئیں۔ شہباز درانی خاصہ مغرور شخص تھا۔ مجھ سے وہ یوں ملا جیسے مجھ پر احسان کر رہا ہو پھر وہ ٹھہرے ہوئے لہجے میں بولا۔ "دیکھو عرفان! میری بیٹی ڈولی نے تمہیں پسند کر لیا ہے۔ میں اس کی کوئی بھی خواہش ٹھکرانے کا تصور بھی نہیں کر سکتا۔ یوں بھی تم انٹرنیشنل ٹیم کے آدمی ہو، ڈولی کا انتخاب غلط نہیں ہے۔ یہ میری اکلوتی بیٹی ہے۔ میرے بعد اربوں کھربوں کی یہ دولت اسی کی ہوگی۔ میں چاہتا ہوں کہ کرکٹ کے ساتھ ساتھ تم مجھ سے کاروباری امور بھی سیکھتے رہو۔"

"اس کے لیے تو وقت پڑا ہے ڈیڈی! ابھی تو عرفان کرکٹ اسٹار ہے۔ اسے ابھی کرکٹ اسٹار ہی رہنے دیں۔"

"ڈولی چاہتی ہے کہ ایک ہفتے کے اندر اندر اس کی شادی تم سے ہو جائے۔ تم کیا کہتے ہو؟"

میری آنکھیں تو ڈولی کے قیامت خیز حسن سے زیادہ اس کی کروڑوں ڈالرز کی دولت سے چندھیا گئی تھیں۔ ایک لمحے مجھے ثمینہ کا خیال آیا مگر پھر فوراً ہی اس خیال کو میں نے ذہن سے جھٹک دیا۔ درانی کا ذاتی ہوائی جہاز تھا، ایک شپ تھا، گاڑیوں کا پورا ایک فلیٹ تھا اور دنیا کے تقریباً ہر ملک میں اس کے محل نما بنگلے تھے۔ میں نے فوراً شادی کی ہامی بھر لی۔

اگلے ہفتے ڈولی سے میری شادی ہو گئی۔ الیکٹرونک اور پرنٹ میڈیا نے اس شادی کو مناسب کوریج دی۔ میں جانتا تھا کہ ثمینہ کو بھی اس شادی کی اطلاع مل گئی ہوگی۔ ایک لمحے کو میرے ضمیر نے مجھے ملامت کیا، پھر میں نے اپنے ضمیر کو ڈالرز اور پاؤنڈز تلے دبا دیا۔

میں شادی کے بعد کراچی پہنچا تو وہاں کے ایک فائیو اسٹار ہوٹل میں ولیمے کی دعوت کا اہتمام کیا۔ اس موقع پر مجھے بے شمار تحائف موصول ہوئے۔ بے شمار مداحوں نے ہماری دعوتیں کیں مگر ثمینہ مجھے ایک بار بھی نظر نہیں آئی۔ اس کا نظر نہ آنا ہی اچھا تھا۔

ہمارا ارادہ تھا کہ ہنی مون ہم سوئزرلینڈ میں منائیں گے۔ انہی دنوں کرکٹ ٹیم انڈیا کے دورے پر جا رہی تھی۔ میں نے ہنی مون کا پروگرام فوری طور پر ملتوی کر دیا۔ ڈولی کو معلوم ہوا تو وہ بھڑک کر بولی۔ "میری خاطر تم یہ وزٹ کینسل نہیں کر سکتے؟"

"نہیں۔" میں نے سپاٹ لہجے میں کہا۔

"تمہیں اس وزٹ میں جتنے پیسے ملیں گے، اس سے دوگنے تم مجھ سے لے لو۔" ڈولی نے کہا۔

"بات پیسے کی نہیں ہے ڈولی بیگم، شوق کی ہے اور کرکٹ تو میرا جنون ہے۔ اس کے بغیر میں زندہ نہیں رہ سکتا۔"

"تو تم ہنی مون پر نہیں جاؤ گے؟" ڈولی نے تلخ لہجے

میں پوچھا۔
"کہہ تو دیا کہ نہیں جاؤں گا۔" مجھے بھی غصہ آگیا۔ اس کا لہجہ مجھے بہت شاق گزرا تھا۔

"مڈل کلاس والا ہمیشہ اسی کلاس میں زندہ رہتا ہے۔ میں ایسی ذہنیت والے کے ساتھ نہیں رہ سکتی۔"

"تم اپنی مرضی کی مالک ہو۔ میں نے تمہاری خوشامد نہیں کی تھی۔" میں نے چیخ کر کہا۔

"میں آج ہی ڈیڈ کے پاس نیویارک جا رہی ہوں۔" ڈولی بھی چیخ کر بولی۔

"میری طرف سے تم جہنم میں جاؤ۔" میں بپھر کر بولا۔

میں انڈیا کے ٹور سے واپس آیا تو ڈولی موجود نہیں تھی۔ اس کے باپ کے وکیل کی طرف سے مجھے ایک رجسٹرڈ خط موصول ہوا کہ ڈولی کو پہلی فرصت میں آزاد کر دو ورنہ میں تمہارا جینا دوبھر کر دوں گا۔

میں خود بھی اس کے ساتھ اب ایک پل بھی رہنا نہیں چاہتا تھا اس لیے میں نے اسے طلاق نامہ بھجوا دیا۔

لوگوں نے میری شادی پر جو گفٹ دیے تھے۔ وہ ابھی تک جوں کے توں پڑے تھے۔ میں نے سوچا انہیں کھول کر دیکھا جائے کہ آخر اس میں ہے کیا۔

کسی پیکٹ میں پرفیوم تھا، کسی میں قیمتی رسٹ واچ، کسی میں سوٹ پیس تو کسی میں پرائز بانڈ۔

اچانک میری نظر ایک چوکور ڈبے پر پڑی۔ میں نے وہ ڈبا کھولا تو مجھے شدید ذہنی دھچکا لگا۔ اس میں وہی گیند تھی جس پر ثمینہ نے مجھ سے آٹوگراف لیا تھا۔ اس کے ساتھ ایک خط بھی تھا۔

ثمینہ نے لکھا تھا۔ "عرفان رضا صاحب! آپ کو شادی کی ڈھیروں مبارک باد! یہ گیند میرے پاس آپ کی آخری نشانی تھی، میں اسے بھی لوٹا رہی ہوں۔ ہاں، مجھے ڈھونڈنے کی کوشش مت کیجیے گا کیونکہ اب میں آپ سے کسی بھی قیمت پر نہیں ملوں گی۔ خدا حافظ!"

اس کا خط پڑھ کر میری آنکھوں سے آنسو بہنے لگے۔ مجھے ایک ایک کر کے اس کے احسانات یاد آنے لگے۔

میرے پاس اس کا فون نمبر تھا۔ میں نے فوراً اس نمبر پر فون کیا تو معلوم ہوا کہ ثمینہ عثمانی وہ مکان بیچ چکی ہیں۔

اچانک مجھے شائستہ کا خیال آیا۔ وہ ثمینہ کے بارے میں ضرور جانتی ہوگی۔ میں نے اس کا اسلام آباد کا نمبر ملایا تو معلوم ہوا کہ وہ کراچی میں ہے۔

میں فون کرنے کی بجائے سیدھا اس کے بنگلے پر پہنچ گیا۔ شائستہ نے بہت طنزیہ انداز میں پوچھا۔ "فرمائیے مسٹر عرفان رضا صاحب! کیسے زحمت فرمائی؟"

"طنز مت کرو شائستہ مجھے بتاؤ کہ ثمینہ کہاں ہے؟ مجھے یقین ہے کہ تم اس کے بارے میں ضرور جانتی ہوگی۔"

"ہاں میں جانتی ہوں کہ ثمینہ کہاں رہ رہی ہے۔" شائستہ نے کہا۔

"پلیز، اس سے مجھے ملوا دو۔" میں نے اس کے آگے ہاتھ جوڑ دیے۔

"مگر وہ تم سے ملنا ہی نہیں چاہتی تو میں کیسے ملوا دوں۔" شائستہ نے ناگواری سے کہا۔

"تم مجھے اس کے پاس ایک دفعہ لے تو چلو یا مجھے ایڈریس بتا دو۔ میں اسے منا لوں گا۔"

"چلو۔ اگر وہ مان جائے تو منا لینا۔" شائستہ اٹھ کھڑی ہوئی۔

میں اپنی ہی گاڑی میں اسے لے کر روانہ ہوگیا۔ وہ مجھے راستہ بتاتی گئی پھر جب اس نے مجھ سے گاڑی روکنے کو کہا تو میرے ذہن کو شدید دھچکا لگا۔ وہ سخی حسن کا قبرستان تھا۔ شائستہ نے روتے ہوئے ایک قبر کی طرف اشارہ کیا۔

"یہاں رہتی ہے ثمینہ، منا سکتے ہو تو منا لو۔ وہ تو تمہارے ساتھ ساتھ مجھ سے بھی اسی دن روٹھ گئی تھی جب اس نے تمہاری شادی کی خبر پڑھی تھی۔ مجھے اس نے فون کر کے بلایا تھا، اس سے پہلے وہ خواب آور گولیوں کی پوری شیشی کھا چکی تھی۔ اس نے صرف مجھے ایک پیکٹ دیا کہ یہ عرفان کو بھجوا دینا۔ اس پیکٹ میں شاید کرکٹ کی کوئی گیند تھی اور جانتے ہو جب تمہارا ایکسیڈنٹ ہوا تھا تو پیسے کہاں سے آئے تھے۔ اس نے اپنا مکان بیچ دیا تھا۔ تم نے سب کچھ تو اس کا لوٹ لیا۔ اب منا سکتے ہو تو منا لو۔" یہ کہہ کر شائستہ سسکتی ہوئی قبرستان سے نکل گئی۔

میں نے ثمینہ کی قبر پر فاتحہ پڑھی، پھر بوجھل قدموں سے اس شہر خموشاں سے باہر نکل آیا۔ اس دن کے بعد میں نے کبھی کرکٹ نہیں کھیلی۔ میں بہت گناہگار ہوں۔ آپ سے درخواست ہے کہ میرے حق میں دعا کریں تاکہ مجھے کسی طرح سکون مل سکے۔

++